سَچ مُحبّت اور ذَرا سا کِینہ

آٹوبائیوگرافی

Khushwant Singh

خوشونت سنگھ

سچ، محبت اور ذرا سا کینہ

—— آپ بیتی ——

خوش ونت سنگھ

مترجم: محمد احسن بٹ

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور فون: 0092-42-7354205/7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

انتباہ!

نام کتاب: سچ، محبت اور ذرا سا کینہ

مصنف: خوش ونت سنگھ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز، 24- مزنگ روڈ، لاہور

فون: 0092-42-7354205/7322892

مطبع: المطبعۃ العربیۃ، لاہور

سال اشاعت: 2003ء

قیمت: -/280 روپے

فہرست

☆☆☆☆

تمہید: آپ بیتی لکھنے پر معذرت

میں نے اس آپ بیتی کو قدرے اضطراب کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ لازماً میری آخری کتاب ہوگی، میری آخری تحریر جو میں نے اپنی زندگی کی شام میں قلم بند کی ہے۔ میں تیزی سے ادیبانہ اہلیت و استعداد کھو رہا ہوں۔ مجھ میں ایک اور ناول لکھنے کی سکت (سٹیمنا) نہیں ہے۔ بہت سے افسانے ادھورے لکھے پڑے ہیں اور مجھ میں انہیں تکمیل دینے کی توانائی نہیں ہے۔ میری عمر ستاسی برس ہے۔ ہر روز مجھے آگاہی ہوتی ہے کہ بڑھاپا مجھ پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ میرا حافظہ، جس پر میں کبھی فخر کیا کرتا تھا، کمزور ہو رہا ہے۔ ایسا زمانہ بھی تھا کہ جب میں دہلی، لندن، پیرس اور نیویارک میں آباد اپنے پرانے دوستوں کو فون کیا کرتا تھا اور مجھے ان کے نمبروں کو ٹیلی فون ڈائریکٹریوں میں دیکھنے کا تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اب میں اکثر اپنا ہی نمبر بھول بیٹھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے جلد ہی میں سٹھیا جاؤں اور خود اپنے آپ کو فون کرنے کی کوشش کروں۔ میری دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے، میں سر کے درد میں مبتلا رہتا ہوں، مجھے ہلکی سی ذیابیطس ہے اور فشارِ خون (بلڈ پریشر) کے مسائل سے دوچار ہوں۔ میں بڑھے ہوئے پروسٹیٹ (غدودِ مثانہ) کا حامل ہوں، اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ بڑھا ہوا پروسٹیٹ صبحوں میں زبردست ایستادگی کی صورت میں مجھے عہدِ شباب کے سرابوں سے دوچار کر دیتا ہے، بعض اوقات اس کی وجہ سے یوں بھی ہوتا ہے کہ میرا پیشاب رفع حاجت سے پیشتر ہی خطا ہو جاتا ہے۔ جلد ہی مجھے پروسٹیٹ کو نکلوا دینا پڑے گا، اس کے ساتھ ہی کاذب ایستادگیاں اور پرشباب فنتاسیاں بھی چلی جائیں گی۔ میں لگ بھگ دو دہائیوں سے دہشت گرد تنظیموں کی ہٹ لسٹ پر چلا آ رہا ہوں۔ آج بھی میرے گھر پر محافظوں کا پہرہ ہوتا ہے اور جہاں کہیں بھی میں جاؤں۔

خواہ ٹینس کھیلنے' تیراکی کرنے' سیر کرنے اور پارٹیوں میں شرکت کرنے ۔۔۔ تین مسلح محافظ باری باری میرے ساتھ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے دہشت گرد مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ تاہم اگر وہ ایسا کرگزرتے ہیں تو میں ان کا شکرگزار ہوں گا کیونکہ اس طرح وہ مجھے بڑھاپے کی ذہنی اذیتوں سے بچالیں گے نیز بستر میں پاخانہ کرنے اور نرسوں کے میرے نچلے بدن کی صفائی کرنے کی ذلت سے مجھے بچالیں گے۔ میرے والدین نے طویل عمریں پائی تھیں۔ میرا باپ نوے برس کی عمر میں فوت ہوا تھا۔۔۔ سکاچ کی آخری چسکی بھرنے کے چند منٹ بعد۔ آٹھ سال بعد میری ماں نے اس کی پیروی کی' تب اس کی عمر چورانوے برس تھی۔ اس نے بہت ہی کمزور' بمشکل سنائی دی جانے والی آواز میں جو شے مانگی تھی' وہ تھی ''مدرا'' (شراب)۔ جو اسے پیش کردی گئی تھی۔ اس نے اسے چڑھالیا اور مزید نہیں بولی۔ مجھے امید ہے کہ جب میرا آخری وقت آئے گا تو میں بھی اس قابل ہوں گا کہ میں لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے گلاس اٹھالوں اور ایک جام پی لوں۔

جب میں نے اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کیں تو میں نے اپنے آپ کو تخلیقی سرگرمی کے چار یا پانچ برس دیئے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں جو کچھ بھی اپنے ماضی کی یادیں تازہ کرسکا انہیں ان برسوں میں ریکارڈ کرلوں گا۔ میں نے کبھی کسی شخص پر اپنا ماضی آشکار نہیں کیا ہے جیسا کہ اردو شاعر حکیم مخمور نے کہا تھا:

میں نے کسی کو اپنی داستانِ حیات نہیں سنائی
یہ زندگی تو مجھے بسر کرنی ہی تھی' سو میں نے بسر کی

میں نے کسی شرم یا ندامت کے بغیر اپنے آپ کو منکشف کردیا ہے۔ بنجامن فرینکلن نے لکھا تھا:

اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد تمہیں فراموش نہ کردیا جائے تو پھر یا تو پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھو یا لکھے جانے کے قابل کام کرو۔

میں نے ایسے کام تو انجام نہیں دیئے ہیں جنہیں کوئی شخص ریکارڈ کرنے کے قابل سمجھتا ہو۔ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد فراموش نہ کیے جانے کا واحد موقع یہی ہے کہ میں پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھ جاؤں۔ میں بہت سے تاریخی واقعات کا عینی شاہد رہا ہوں اور ایک صحافی کی حیثیت میں مَیں نے ان واقعات کی صورت گری میں فیصلہ کن کردار ادا

کرنے والے بہت سے افراد سے انٹرویو کیے ہیں۔ میں عظیم لوگوں کا قصیدہ خواں نہیں ہوں۔ وہ چند ایک عظیم لوگ جن کی قربت حاصل کرنے کا مجھے موقع ملا ہے وہ مٹی کے مادھو ثابت ہوئے تھے۔ وہ تصنع اور بناوٹ کرنے والے' غیر ذمہ دار' جھوٹے اور بے حد مبتذل تھے۔

میں لفظوں کا صناع (کرافٹس مین) ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا۔ گزشتہ پانچ دہائیوں میں متعین وقتوں (ڈیڈلائنز) کا سامنا کرنا پڑا تھا' اسی لیے مجھے متاثر ہونے' لفظوں کی زیرک شعبدہ گری میں پڑنے یا اپنے لکھے ہوئے کو اجالنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں اچھی نثر لکھنے کے بارے میں جو کچھ تھوڑا بہت جانتا تھا' اسے گنوا چکا ہوں۔ یہ آپ بیتی بوڑھے ہوتے ہوئے شیروں کا بچہ ہے۔ اس سے بہت زیادہ کی توقع مت باندھ لینا: تھوڑی گپ شپ ہے' تھوڑی گدگداہٹ ہے' کچھ نیک نامیوں کو لیر و لیر کیا ہے' کچھ تفریح ہے ــــ میرے پاس پیش کرنے کو سب سے بہتر یہی کچھ ہے۔

میری بیٹی مایا دیال نے' جس کے نام اس کتاب کا انتساب ہے' مجھے اس کو لکھنے کی تحریک دی۔ اسے اس کتاب کو لکھنے کے لیے مجھے استقلال کے ساتھ تحریک دینے پر نادم ہونے کا اچھا جواز مل گیا ہے۔ مجھے اپنی بھتیجی گیتا نجلی چندا کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا ہے۔ جس نے مسودے کو کئی مرتبہ ٹائپ کیا' متن میں موجود عیوب کی نشان دہی کی اور اکثر و بیشتر خود ہی انہیں درست کر دیا۔

پہلا باب

صحرا میں بستی

شروعات سے ابتداء کرنا ہی سب سے محفوظ ہے۔

جو لوگ میرے جنم کے وقت موجود تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا۔ میں نے کب جنم لیا تھا یہ معاملہ ہنوز قیاسی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میں ایک چھوٹے سے گاؤں ہڈالی میں پیدا ہوا تھا جو کہ صحرائے تھر کی ریت کے ٹیلوں میں گم دریائے جہلم کے مغرب میں تیس کلومیٹر اور جنوب کی طرف کھیوڑہ کے نمک کے سلسلۂ کوہ سے بھی تیس ہی کلومیٹر دور واقع تھا۔ ہڈالی اب پاکستان کے انتہائی وسط میں ہے۔ جس وقت میں پیدا ہوا میرا باپ سوبھا سنگھ اپنے باپ سجان سنگھ کے ساتھ دور دہلی میں تھا۔ جب یہ خبر اسے بھیجی گئی تو اس نے اسے اپنی ڈائری میں درج کرنے کا تردّد نہیں کیا۔ میں اس کا دوسرا بیٹا تھا۔ ہماری بستیوں میں ان زمانوں میں پیدائش اور اموات کے ریکارڈ نہیں رکھے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے برعکس، جو کہ اپنی اولاد کے جنم کا وقت لکھ لیا کرتے تھے تاکہ ان کی جنم پتری (زائچہ) بنوائی جاسکے، ہم سکھ ستاروں کے علم میں یقین نہیں رکھتے ہیں اور اسی لیے پیدائش کے مقام اور وقت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کئی برس بعد جب اُسے ماڈرن سکول دہلی میں ہمارے داخلے کے لیے فارم پر کرنا پڑے تو میرے باپ نے میرے بڑے بھائی اور میری پیدائش کی تاریخ قیاسی طور پر درج کردی تھی۔ میری پیدائش کی تاریخ 2 رفروری 1915ء درج کی گئی تھی۔ برسوں بعد میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ میں بدرو کے مقام پر — شاید اگست میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی پیدائش کی تاریخ مہینے کے وسط میں متعین کروں سو یہ طے ہوئی 15 راگست 1915ء اور میں نے خود کو اسد قرار دے لیا۔ بتیس برس بعد 15 راگست آزاد ہندوستان کا جنم دن (برتھ ڈے) بن گیا۔

میرے دودھ چھڑائے جانے کے کچھ عرصے بعد میرا باپ میری ماں اور بڑے بھائی کو دہلی لے جانے کے لیے آیا جہاں وہ اور اس کا باپ کچھ تعمیراتی ٹھیکے حاصل کر چکے تھے۔

مجھے میری دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ میری زندگی کے چند ابتدائی برسوں کے دوران میں وہ میری واحد ساتھی اور دوست تھی۔ اس کا نام' جو میں نے بعد میں دریافت کیا' لکشمی بائی تھا۔ ہم اسے بھابی جی کہا کرتے تھے۔ اُس کی طرح میری ماں کا بھی ایک ہندووانہ ـــ مہاراشٹری ـــ نام تھا' ویرن بائی۔ بچے اُسے بے بے جی کی حیثیت میں جانتے تھے۔

میں ہڈالی میں گزرے بچپن کے برسوں کی دھندلی یادوں کا حامل ہوں۔ یہ بستی لگ بھگ تین سو خاندانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بیشتر بلوچ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلوچ مرد بڑے قدآور ہوتے تھے' زیادہ تر برطانوی فوج میں ملازمت کر رہے تھے یا وہاں سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ وائسرائے کے محافظوں کی نمایاں تعداد ہڈالی سے تعلق رکھتی تھی۔ آج بھی ریلوے سٹیشن ماسٹر کے دفتر کی دیوار کے ساتھ سنگِ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں ہڈالی نے ہندوستان کی دوسری بستیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تعداد میں سپاہی مہیا کیے تھے۔ وہاں قریباً پچاس ہندو اور سکھ خاندان تھے جو تجارت' دکانداری اور ساہوکاری کرتے تھے۔ میرے آباؤاجداد ـــ میں انہیں صرف اپنے پڑدادا اندر سنگھ اور اُس کے باپ پیارے لال تک ڈھونڈ پایا ہوں' جس نے سکھ مت اختیار کر لیا تھا اور سوہل سنگھ بن گیا تھا ـــ تاجر پیشہ تھے۔ ان کے پاس اونٹوں کے کارواں تھے جن کے ذریعے وہ کھیوڑہ کا چٹانی نمک اور کھجوریں' ہمارے صحرائی مادرِوطن کا واحد پھل' لاہور اور امرتسر میں فروخت کرنے لے جایا کرتے تھے۔ وہ واپسی میں سوتی کپڑے' مٹی کا تیل' چائے' چینی' مصالحہ جات اور دیگر اشیاء دوسری پڑوسی بستیوں اور گاؤں گاؤں میں فروخت کرنے کے لیے لایا کرتے تھے۔ بعد میں میرا دادا اور باپ تعمیرات کے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے کالکا شملہ ریلوے پر چھوٹے گیج کی ریل کی پٹڑی بچھانے اور سرنگیں بنانے کے کام کا کچھ حصہ انجام دیا تھا۔

ہمارا خاندان ہڈالی کا سب سے زیادہ خوش حال خاندان تھا۔ ہم اینٹ گارے کے بڑے گھر میں رہتے تھے جس کے وسیع وعریض صحن کے احاطے میں بھینسوں کا باڑہ اور ہمارا ذاتی کنواں تھا۔ داخلی دروازہ لکڑی کا بہت بڑا پھاٹک تھا جو کبھی کبھار ہی کھلا کرتا تھا۔ اس میں لوگوں کے اندر آنے کے لیے ایک چھوٹا دریچہ بنا ہوا تھا۔ کافی تعداد میں ہندو اور سکھ منشیوں کے طور پر ہمارے ہاں ملازم تھے اور سامان کو منڈی تک لے جانے کے لیے مسلمانوں کی خدمات مستعار لی جایا کرتی تھیں۔ بہت سے مسلمان خاندان ہمارے مقروض تھے۔

ہمارے خاندان کی خوش حالی و ثروت ایک روایت سے منسوب کی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک برس' جب نمک کے پہاڑوں پر موسلا دھار بارش ہوئی تھی' سیلابی پانی چٹانوں

اور شیدا پیر نامی ایک مقدس مسلمان کو بہا لے گئے جو اپنے جھونپڑے کی گھاس پھونس کی چھت پر چڑھ گیا تھا۔ جس وقت وہ ہڈالی تک بہہ آیا' اس کے بدن پر سوائے لنگوٹی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے دادا سجان سنگھ نے اُسے کپڑے دیئے' مسلمانوں کے قبرستان کے نزدیک اُس کے لیے ایک جھونپڑا بنوا دیا اور اُسے کھانا بھجوایا۔ شیدا پیر نے اُسے دعا دی: ''میں تمہارے دو بیٹوں کو دہلی اور لاہور کی چابیاں دوں گا۔ وہ خوش حال ہوں گے۔'' اور وہ خوشحال ہوئے ـــــ ایک ٹھیکیدار کی حیثیت سے میرا باپ دہلی میں اور اس کا چھوٹا بھائی اُجل سنگھ تقسیم سے پہلے پنجاب کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ایک کی حیثیت میں۔ بعدازاں وہ قانون ساز اسمبلی کا رکن بنا اور آزادی کے بعد پنجاب کا مالیات کا وزیر بنا اور بعد میں اس کا گورنر بنا۔ اس نے اپنے کیریئر (عملی زندگی) کا اختتام تامل ناڈو کے گورنر کی حیثیت میں کیا۔

ہڈالی میں رہتے ہوئے ہم ہندوؤں اور سکھوں کا مسلمانوں کے ساتھ ایک بے سکون مگر پرامن تعلق تھا۔ گوکہ ہم ان کے بڑوں کو اپنوں کی طرح چچا یا خالہ کہا کرتے تھے تاہم سوائے شادیوں اور اموات کے ہم ایک دوسرے کے گھروں میں بہت ہی کم آیا جایا کرتے تھے۔ ہم مسلمانوں سے تھوڑی مرعوبیت کے ساتھ رہتے تھے کیونکہ وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ قدآور اور جسامت میں زیادہ بڑے ہوتے تھے۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ برادریوں...... وڈھلوں' مستیلوں' اعوانوں' جنجوعوں' نونوں اور ٹوانوں ـــــ میں بٹے ہوئے تھے اور زمین کے معاملے پر آپس میں مقدمہ بازیوں اور ایک دوسرے کے قتال میں الجھے رہتے تھے۔ ہم خود کو ان سے ایک محفوظ فاصلے پر رکھا کرتے تھے۔

میں بستی کی گلیوں سے گزرنے والے ان کے مردوں کو یاد کرتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر چھ فٹ لمبے ہوتے اور گویا بید کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے بالوں میں خوب تیل ملا ہوا ہوتا تھا جو کانوں کے پیچھے خم کھائے ہوئے ہوتے تھے اور ان میں لکڑی یا ہاتھی دانت کی کنگھیاں اُڑسی ہوئی ہوتی تھیں۔ عام طور پر وہ بھیڑوں یا اونٹوں کے پشمینے سے چرخوں پر اون کاتا کرتے تھے یا پھر اپنے کلاہ دار شاہینوں کو اُڑانے باہر لے جایا کرتے تھے۔ ان کی عورتیں بھی لمبی چھریری اور خوب متناسب ہوا کرتی تھیں۔ وہ اپنے سروں پر پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے اٹھا کر لے جاسکتی تھیں جبکہ ایک گھڑا دائیں ہاتھ اور کمر کے بیچ میں پکڑا ہوا ہوتا تھا۔ پانی ان کی مسلمانوں والی قمیضوں اور ٹخنوں تک لمبی لنگیوں پر بہتا جاتا اور اُن کی تنی ہوئی' تراشیدہ' سیاہ بھٹنیوں (Nipples) والی چھاتیوں کے ساتھ ساتھ ان کے گٹھے ہوئے اور

ہلکورے دار کولہوں کو عیاں کرتا جاتا تھا۔ اس بات سے آگاہ ہوتے ہوئے کہ مرد انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کھائے جا رہے ہیں وہ سبک خرامی سے گزر جایا کرتی تھیں اور کبھی زمین سے نظریں نہیں اٹھایا کرتی تھیں۔ اگرچہ میں بمشکل چار ہی برس کا ہوں گا مگر میں بھی ایک پرلے درجے کا نظارہ باز بن چکا تھا۔

ہڈالی میں کوئی بہت ولولہ خیز بات نہیں ہوا کرتی تھی۔ زندگی ایک خواب آور ڈھرے (روٹین) کی حامل تھی۔ میری دادی صبح ہونے سے کافی پہلے جاگ اٹھتی اور بھینسوں کا دودھ دوہتی اور دودھ کو مٹی کی ہانڈی میں ڈال کر بھینس کے گوبر سے بنے ہوئے گوہوں کے سلگتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیتی تھی۔ وہ ہمسایہ عورتوں کے ساتھ کھلے میں رفعِ حاجت کے لیے جایا کرتی تھی۔ وہ کنویں سے پانی کی دو بالٹیاں نکالتی اور ستاروں کی روشنی میں صبح کی پرارتھنا ''جاپ جی'' بڑبڑاتی ہوئی نہایا کرتی تھی۔ اگلا آدھا گھنٹہ وہ معمول کے مطابق مکھن اور لسی بلونے' مناجات پڑھنے میں گزارتی۔ پھر وہ مجھے جگا دیتی۔ مجھے گھر کی چھت پر رفعِ حاجت کی اجازت تھی جہاں سورج ہر کھلی شے کو جلا دیا کرتا۔ میں اپنے آپ کو دھوتا۔ وہ میری بودی کی کنگھی کرتی اور اسے چوٹی کی طرح گوندھتی: سکھ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے بال ترشواتے نہیں تھے۔ میں اپنی لکڑی کی تختی جس پر پیلی گاچی لگی ہوتی' اپنی سرکنڈے کی قلمیں اور مٹی کی دوات اٹھاتا۔ وہ گزشتہ شام کی بچی ہوئی باسی روٹیاں اپنے دوپٹے میں باندھ لیتی۔ ہم دھرم شالہ کی طرف چل پڑتے جو کہ سکول بھی تھا۔ گلی کے کتے ہماری دہلیز پر ہمارے منتظر ہوتے۔ ہم چپاتیوں کے ٹکڑے کر کے ان کتوں کے آگے پھینک دیتے تھے۔ ہم کچھ چپاتیاں اپنے واپسی کے سفر کے لیے بچا رکھتے تھے۔

دھرم شالہ ہمارے گھر سے تھوڑی دوری پر تھا۔ مجھے بھائی ہری سنگھ کے حوالے کر دیا گیا جو کہ گرنتھی بھی تھا اور استاد بھی۔ میں دوسرے ہندو اور سکھ لڑکوں کی طرح فرش پر بیٹھ گیا اور لہک لہک کر پہاڑے یاد کرنے لگا۔ میری دادی ایک بڑے ہال میں چلی گئی جہاں گرنتھ صاحب کے تین نسخے پہلو بہ پہلو ایک نیچی سی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میز کے نیچے ایک جوڑی عینک رکھی تھی جنہیں پوجا کرنے والوں نے مسترد کر دیا اور وہاں ایسے شخص کے لیے رکھ دیا تھا جس کے لیے وہ استعمال میں موزوں ہوں۔ پہاڑے رٹوانے کے بعد بھائی ہری سنگھ ایک تختے (بورڈ) پر ہمارے نقل کرنے کے لیے گورمکھی کے حروفِ تہجی لکھ دیتا۔ اگرچہ عمر کی وجہ سے وہ جھک گیا تھا مگر اس کا مزاج بہت خوفناک تھا۔ ہماری لکڑی کی تختیوں پر اُسے کوئی غلطی نظر آ جاتی

تو وہ ہمارے کولہوں پر زوردار ٹھوکریں مارا کرتا تھا۔ کرم یہ تھا کہ سبق کا دورانیہ ایک گھنٹہ ہی ہوا کرتا تھا۔ میری دادی اور میں واپس لیتے' بستی کے کتوں کو بچ رہنے والی ساری چپاتیاں پھینکتے ہوئے۔ جب وہ فرش پر جھاڑو لگانے' بستروں کو لپیٹنے اور دوپہر کا کھانا پکانے میں مصروف ہوتی تب میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا یا سات سمندر کھیلنے باہر چلا جایا کرتا تھا۔

ہمارے شام کے کاموں کا انحصار سال کے وقت پر ہوتا تھا۔ صحرا کا سردیوں کا موسم بہت سرد اور دن بہت ہی چھوٹے ہوتے۔ کرنے کو کام بہت سے ہوتے تھے اور وقت بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ لیکن سردیوں کا حقیقی موسم' بمشکل چالیس دن کا ہی ہوتا تھا۔ بہار کے مختصر سے موسم کے بعد گرمیوں کا لمبا موسم ہمیں آ لیتا تھا۔ یہ روز بروز گرم تر ہوتا جاتا اور 125 درجے فارن ہائیٹ تک جا پہنچتا تھا۔ بارش کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ٹوبے (تالاب) نمک کی پہاڑیوں سے بہہ آنے والے بارش کے کھارے پانی سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ پانی کنوؤں میں رِس جاتا تھا۔ ان میں سے محض چند ایک کنویں ہی اینٹ اور سیمنٹ کے بنے ہوئے تھے جن سے انسانی ضروریات کے لیے موزوں پانی لے جایا جا سکتا تھا۔ بعض وجوہات کے تحت کھارے پانی والے کنوؤں کو مذکر اسم دیا گیا تھا یعنی ''کھارا کھو''۔ وہ کنویں جو میٹھا پانی فراہم کرتے تھے انہیں اسم تصغیر اور مونث نام دیا گیا تھا یعنی ''مٹھی کھوئی''۔ ہم میں سے بیشتر کے دانت پیلے زرد ہوتے تھے' اوپری دانتوں پر' بھورے رنگ کی افقی لکیر ہوتی تھی۔ یہ ناخالص پانی پینے کا نتیجہ تھی۔ سال کا کوئی بھی وقت ہوتا میری دادی سہ پہر کے وقت چرخہ کاتا کرتی تھی اور گرو ارجن کی ''سکھ منی'' ـــ امن کی مناجات ـــ بدبدایا کرتی تھی۔ دادی کے حوالے سے میری یادیں گھومتے ہوئے چرخے کی صدا اور مناجات کی گنگناہٹ سے مربوط ہیں۔

گرمیوں کے لمبے مہینے ایک سخت آزمائش ہوتے تھے۔ گرم ریت انسان کے تلووں کو جلا دیتی۔ ایک گھر سے دوسرے گھر کو جانے کے لیے ہمیں سائے کی خاطر دیواروں سے لگ کر' بچوں کے فضلے کی ڈھیریوں سے بچ بچا کر چلنا پڑتا تھا۔ ان بچوں نے بھی ان سایوں کو رفعِ حاجت کے لیے سب سے ٹھنڈی جگہیں پایا ہوتا تھا۔ ہم دن کا بیشتر وقت گھروں کے اندر گپ شپ کرتے ہوئے یا اونگھتے اونگھتے پنکھے جھل کر مکھیاں اُڑاتے ہوئے گزارا کرتے تھے۔ اونٹوں اور بھینسوں کو سہ پہر میں دیر گئے ہی ٹوبوں پر پانی پلانے لے جایا جاتا تھا۔ گدلے تالابوں میں بھینسیں ہی سب سے زیادہ خوشی سے نہاتی تھیں۔ بچے بھینسوں کو اچھال تختوں (جمپنگ بورڈرز) کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ سورج غروب ہونے پر جانوروں کو گھر واپس ہانکا

جاتا تھا' بھینسوں کو دوہا جاتا اور چولہے روشن ہو جایا کرتے تھے۔ ساری بستی اونٹوں کے جلتے ہوئے خاروں اور پکتی ہوئی روٹیوں کی خوشبو سے مہک اٹھتی تھی۔ لڑکے ریت کے ٹیلوں میں رفعِ حاجت کے لیے جانے کو ٹولیاں بنا لیتے تھے۔ جب ہم رفعِ حاجت کر رہے ہوتے تھے تو گوبر کے بھونرے ہمارے پاخانے کو سنگِ مرمر کی گولیوں کی جسامت میں اکٹھا کر لیتے اور ریت میں بنے ہوئے اپنے بلوں میں لڑھکا کر لے جاتے تھے۔ اپنی صفائی کا ہمارا ایک منفرد طریقہ تھا۔ ہم چوتڑوں کے بل ایک قطار میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک مقررہ اشارے (سگنل) پر ہم اپنی ٹانگیں اوپر کو اٹھا لیتے تھے اور ہاتھوں کے بل جیت کے مقام تک خود کو دھکیلتے چلے جاتے تھے۔ ''گھیسی'' کہلانے والی ریس کے اختتام پر ہمارے چوتڑ صاف تو ہو جاتے تھے مگر ریت سے بھر جاتے تھے۔ بعد میں رات کے وقت اور چاند کے ابتدائی مرحلوں میں ہم ''کوٹلا چھپاکی'' کھیلا کرتے تھے جو کہ بلائنڈ مینز بف نامی کھیل کا ہمارا روپ (Version) ہے۔ ریت کے ٹیلوں پر پورے چاند کی راتیں میری یادوں میں نقش ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہتے تا آنکہ رات کے کھانے کے لیے گھروں سے پکار پڑتی۔ ایک دھمکی جو اپنا کام دکھاتی تھی' یہ تھی کہ ہمیں ڈکیت اغوا کر کے لے جائیں گے۔ ہم تورا اور سلطانا جیسے بدنام اشتہاری مجرموں کے ناموں سے واقف تھے جنہوں نے بے شمار قتلوں اور اغواؤں کی وجہ سے دیہاتوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔

ڈکیتیوں کے بعد ہم سب سے زیادہ ریت کے طوفانوں سے خوف کھاتے تھے۔ ہم دھول اڑانے والی ہواؤں (آندھیوں) اور ریت کے چکراتے ہوئے شیطانوں (گردبادوں) سے تو مانوس تھے لیکن ''ہنیری'' یا ''جھکڑ'' چیزے دیگر تھے۔ وہ ایسے اندھا کر دینے والے قہر و غضب کے ساتھ آتے تھے کہ ہم ریت کو اپنے نتھنوں' آنکھوں اور کانوں میں گھسنے سے بچانے کے لیے اپنے سروں کو گھٹنوں میں چھپا کر زمین پر دبک جانے کے سوا کچھ بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی کبھار تو ایسا ہوتا کہ اتنی ریت اڑتی کہ ریل کی پٹڑی اس کے نیچے چھپ جاتی اور جب تک ریت کو ہٹایا نہیں جاتا تھا کوئی ٹرین گزر نہیں پاتی تھی۔ تاہم وہ جھکڑ مکھیوں اور حشرات سے ہوا کو پاک کر دیتے تھے اور آنے والے ایک یا دو دنوں تک تو ہوا زیادہ صاف اور زیادہ ٹھنڈی ہوا کرتی تھی۔

شام کے کھانے کے بعد ہم سونے کے لیے اپنی اپنی چھتوں پر چلے جاتے تھے۔ میری دادی جو پہلے ہی اپنی شام کی عبادت ''ریہہ رس'' کر چکی ہوتی تھی' دن کی آخری عبادت

''کیرتن سوہیلا'' کرتی۔ وہ میری کمر پر جمی ہوئی ملائی ملتی۔ اگر اس کی نرمیلی مالش سے مجھے نیند نہیں آتی تو وہ مجھے گروؤں کی زندگیوں کی حکایات سنایا کرتی تھی۔ اگر میں تب بھی جاگ رہا ہوتا تو وہ میری توجہ ستاروں کی طرف مبذول کرواتی اور مجھے سرزنش کرتی: ''دیکھتے نہیں ہو کیا وقت ہو گیا ہے؟ اب چپ ـــ خاموش۔''

گرمیوں کے موسم کا سب سے عمدہ وقت صبح کا وقت ہوتا تھا۔ صحرا پر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی جس میں ہمارے صحن میں کھلے ہوئے گلابوں اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو شامل ہوتی تھی۔ یہ نیم غنودگی اور خیال آرائیوں کا وقت ہوتا تھا۔ وہ بے حد مختصر ہوتا تھا۔ سورج گرم ہو جاتا' اس کے ساتھ مکھیاں اور کرخت آواز میں کائیں کائیں کرتے ہوئے کوے ہوتے تھے۔ وہ مہربان آدھا گھنٹہ جسے اردو شاعر بادِ نسیم ـــ صبح سویرے کی ہوا ـــ کا وقت قرار دیتے ہیں' ایک اچانک اختتام سے دوچار ہو جاتا تھا۔

ہماری روزمرہ کی روٹین کی کوفت میں راحت دلانے والا کوئی واقعہ کم ہی رونما ہوا کرتا تھا۔ ہر دوسرے برس وہاں ایک یا دو قتل ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ قتل مسلمانوں تک ہی محدود رہا کرتے' اس لیے ہم ان پر بہت زیادہ پرجوش نہیں ہوتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ ریلوے سٹیشن کے نزدیکی میدان میں نیزہ بازی کے مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے۔ گھڑ سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر ایک صف میں کھڑے ہو جاتے اور ایک مقررہ اشارے پر اپنے نیزے لہراتے ہوئے نعرے لگاتے ''اللہ بیلی ہو'' ـــ اللہ میرا بہترین دوست ہے ـــ میخوں کی طرف لپکتے تھے۔ میخوں کو اکھاڑنے کے بعد وہ انہیں سب کو دکھانے کے لیے فتح مندانہ انداز کے ساتھ لہراتے تھے۔ وہ اکثر گزرنے والی ٹرینوں سے دوڑ لگاتے اور اس وقت تک ان کے ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑاتے جب تک کہ ان کے گھوڑے بے دم نہیں ہو جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ایک سکھ ہڈالی میں پہلی مرتبہ ایک بائیسکل لایا۔ اس نے شیخی بگھاری کہ وہ کسی بھی گھوڑے کو ہرا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی گھڑ سوار اس کا چیلنج قبول کر پاتا ہم لڑکوں نے اسے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہڈالی میں کوئی پختہ سڑک نہیں تھی اور سائیکل سوار ہنوز پہیوں پر ڈگمگا رہا تھا۔ اس نے اتنے اناڑی پن سے سائیکل چلائی کہ وہ ریت میں دھنس گئی۔ وہ بستی میں تماشا بن کر رہ گیا اور اس کو ''سیکل بہادر'' کا خطاب دے کر مذاق کا نشانہ بنایا جانے لگا۔

میں دہلی منتقل ہونے کے بعد تین مرتبہ ہڈالی گیا ہوں۔ پہلی مرتبہ گرنتھ صاحب پڑھنے کے لیے باضابطہ اجازت کے واسطے گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی' میرے ایک کزن

اور میں نے ایک مذہبی اجتماع کے سامنے بلند آواز میں ''جاپ جی'' پڑھی اور ہم سے حلف لیا گیا کہ ہم ہر روز کم از کم ایک مناجات پڑھا کریں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی زیادہ لمبی مدت تک اس عہد کی پاس داری نہیں کر پایا تھا۔ دوسری مرتبہ میں وہاں تب گیا جب لاہور میں قانون کی پریکٹس کر رہا تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ہڈالی گیا تھا جس کا کزن نمک کی کانوں کا منیجر تھا۔ جونہی ہم ریلوے سٹیشن کے نزدیک پہنچے آنسو میری آنکھوں سے تیزی سے رواں ہوگئے۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھکنے اور زمین کو چومنے کی بے پناہ خواہش کو دبا لیا۔ میں دھرم شالہ گیا اور اس گھر گیا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ ایک شخص نے جو کہ وائسرائے کے محافظوں کا رسالدار تھا' مجھے پہچان لیا اور بستی میں خبر پھیلا دی۔ جس وقت میں روانہ ہو رہا تھا ایک ہجوم مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع تھا۔

میں نے ہڈالی کا آخری دورہ 1987ء کے سردیوں کے موسم میں کیا۔ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم وہاں کی آبادی میں مکمل طور پر تبدیلی لا چکی تھی۔ ایک بھی ہندو یا سکھ نہیں بچا تھا۔ ہمارے گھروں پر ہریانہ سے آنے والے مسلمان مہاجروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ہماری خاندانی حویلی کے تین برابر برابر حصے کر دیئے گئے تھے' ہر حصے میں روہتک سے آنے والے مسلمان مہاجر رہتے تھے۔ اس وقت ہڈالی والوں کی ایک نئی نسل' جس نے کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا تھا' چالیس کے پیٹے میں تھی۔ ان کی طرف سے میرا استقبال میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اس نسل سے میرا واحد رابطہ ان چند نوجوان سپاہیوں کے ساتھ ملاقات کے ذریعے تھا جنہوں نے 1971ء میں پاک بھارت جنگ میں حصہ لیا تھا اور جنہیں ڈھاکہ کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ میں نے انہیں ڈھونڈ نکالا تھا اور ان کے والدین کو لکھا تھا کہ وہ محفوظ ہیں اور صحت مند ہیں۔

میں لاہور سے روانہ ہو کر سہ پہر کی ابتداء ہی میں ہڈالی پہنچ گیا تھا۔ بستی کے بڑے سڑک کے کناروں پر چاندی اور سونے کی جھالروں والے ہار تھامے خوش آمدید کے الفاظ کے ساتھ میرے منتظر تھے — یہ الفاظ ان ہاروں پر اردو میں کندہ تھے۔ میں نے جن جن لوگوں سے ہاتھ ملایا ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پہچانا۔ مجھے پوری شان و شوکت کے ساتھ ہائی سکول کے میدان میں لے جایا گیا۔ جہاں ایک ڈائس پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہڈالی کے دو ہزار باشندے کرسیوں اور زمین پر صفیں باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ غلط تلفظ کے ساتھ مسجع و مرصع اردو میں کی جانے والی تقریروں میں مجھے ہڈالی کا فرزند قرار دیا گیا۔ میرا دل تشکر سے بھر

گیا تھا۔ میں نے بستی کی بولی میں تقریر کی۔

میرے لیے اس سے بہتر کوئی شے نہیں کہ مجھے ہڈالی کی گلیوں میں پھرنے اور اپنی پیدائش والے گھر کی دہلیز پر سر رکھنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ تب جذبہ مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں رونے لگا۔ وہ سمجھ گئے اور انہوں نے درگزر کر دیا۔ مجھے میرے سابقہ گھر لے جایا گیا ساری بستی میرے پیچھے تھی۔ آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ عورتیں گھروں کی چھتوں پر کھڑی مجھ پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ کس نے یہ جھوٹ گھڑا ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے سے دشمنی کی قسم کھا رکھی ہے؟ ہڈالی کے مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کو کسی نفرت نے تلخ نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں نے سکھ ہندو دھرم شالہ کو چھیڑا بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے جدا ہو جانے والے کزنوں کی عبادت گاہ رہا ہے۔

کبھی ہمارا گھر رہنے والی حویلی کو اس میں آباد رہتک کے خاندانوں نے رنگ برنگے غباروں اور کاغذی جھنڈیوں سے سجا رکھا تھا۔ بستی کے ان بوڑھوں نے جو کبھی میرے باپ کو جانتے تھے' میرے اعزاز میں ضیافت برپا کی تھی۔ میں ہڈالی کی جن چیزوں سے آشنا تھا وہ بہت کم دکھائی دیں۔ ریت کے وہ ٹیلے جو میرے بچپن کے برسوں میں کھیل کے میدان رہے تھے ختم ہو گئے تھے۔ ایک نہر صحرا کو سرسبز و شاداب بنا چکی تھی۔ ٹوبے نرسلوں سے بھری دلدل میں تبدیل ہو چکے تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں حصہ لینے والے لوگوں کی خدمات کی یادگار سنگِ مرمر کی لوح ہٹائی جا چکی تھی۔ میں سورج غروب ہونے سے ذرا ہی پہلے ہڈالی سے رخصت ہوا تھا' یہ جانتے ہوئے کہ میں یہاں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔

دوسرا باب

بچپن سے عنفوانِ شباب تک: سکول کا زمانہ

کسی شخص کے ذہن اور جسم کی تشکیل میں پانچ سے پندرہ برس کی عمر کے درمیانی دس برس ممکنہ طور پر سب سے زیادہ اثر انگیز ہوتے ہیں۔ خاندان کے افراد جنہوں نے کبھی جذباتی سہارا فراہم کیا ہوتا ہے ان کی جگہ رفتہ رفتہ وہ اجنبی لے لیتے ہیں جو کسی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں بتدریج زیادہ اہمیت کے حامل ہوگئے ہوتے ہیں۔ جنسی خواہش روز بروز مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ تم اس کے اظہار کے لیے موقعے ڈھونڈتے ہو۔ تم الجھے ہوئے اور غیر یقینی ہوتے ہو کہ ایسا کچھ کس طرح کرنا ہے۔ سکول کے ساتھی' اساتذہ' گھریلو ملازمین' کزن اور بڑے رشتہ دار تمہیں رہنمائی دے سکتے ہیں یا گمراہ کر سکتے ہیں۔ تم ہم جنس پرستی اور محرمات سے مباشرت کی خواہش سے گزرتے ہو۔ تم اعضائے تناسل کے گرد اگ آنے والے بالوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہو اور دفعتاً ایک روز جبکہ تم اپنے آپ سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہو ایک انوکھا احساس تمہارے جسم میں بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ سرور انگیز ہوتا ہے' یہ اذیت دہ ہوتا ہے۔ اگر تم نر (Male) ہو تو جب تمہارے عضوِ تناسل سے مادۂ منویہ زور سے خارج ہوتا ہے تو تم سر سے پاؤں تک ہل کر رہ جاتے ہو۔ تم ایک مرد بن چکے ہو' عورت کو حاملہ کر دینے اور باپ بننے کے اہل ہو چکے ہو۔

میں اس باب میں انہی تشکیلی برسوں کے بارے میں لکھوں گا۔

مجھے وہ برس درست طور پر یاد نہیں ہے جس برس میری دادی اور میں دہلی میں میرے والدین' میرے بھائیوں اور بہن سے ملے۔ پہلی عالمی جنگ نے میرے خاندان کو تجارت' زمین داری اور ٹھیکیداری سے اٹھا کر صنعت کاری میں پہنچا دیا تھا۔ جنگ کے لیے سپاہیوں کو بھرتی کرنے اور چندہ جمع کرنے کی اس خاندان کی کوششوں کے صلے میں اسے نہروں سے سیراب ہونے والی زمین کے وسیع قطعات سے نوازا گیا۔ میاں چنوں اور خانیوال (اب پاکستان کے ضلع ملتان میں) کے درمیان میں ایک بڑا رقبہ تھا۔ اب بھی ان دونوں کے درمیان ایک ریلوے سٹیشن کوٹ سجان سنگھ خاندان کی وہاں موجودگی کی نشانی ہے۔ انہیں ایک

اور قطعۂ اراضی لائل پور ضلع (اب فیصل آباد پاکستان) میں جڑانوالہ کے قریب عطا کیا گیا تھا۔ میرے دادا اور اس کے دو بیٹوں نے ان گاؤں میں کاٹن جننگ اور سپننگ ملز اور تیل نکالنے والا بیلنا لگایا۔ میرا چچا اجل سنگھ جو خاندان کا کالج جانے والا اور ماسٹر ڈگری حاصل کرنے والا پہلا فرد تھا' پنجاب میں ملوں اور زمینوں کا انچارج بنایا گیا۔ میرا باپ تعمیراتی ٹھیکیدار بن گیا۔ وہ لوگ ٹیکسٹائل کے کاروبار میں بھی چلے گئے گویا پہلے والے کاروبار ناکافی تھے۔ انہوں نے دہلی کی سبزی منڈی کے قریب ایک کاٹن مل خرید لی۔ اس کا اصل نام جمنا ملز تھا' اس کو قابلِ شناخت سکھ نام دے دیا گیا یعنی خالصہ کاٹن سپننگ اینڈ ویونگ ملز۔ ہم داخلی پھاٹک (گیٹ) کے اُوپر ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ سابقہ مالکوں کے تحت مل کی کارکردگی بہت ناقص رہی تھی۔ اس کی کارکردگی میرے دادا اور باپ کے زیر انتظام زیادہ بری رہی۔ انہیں کسی بڑی مل کو چلانے کا تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کے پاس اتنا نقد روپیہ تھا کہ وہ پرانی مشینری تبدیل کر کے نئی مشینری لگا دیں۔ وہ مل اکثر بند رہتی تھی۔ ٹھیکیداری سے کمایا گیا پیسہ اس مل میں ہونے والے خساروں نے ہڑپ کر لیا۔ وہ خاندان کو دیوالیہ ہونے کے قریب لے آئی تھی۔ 1919ء میں آگ لگنے سے بیشتر مل راکھ بن گئی۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ آگ انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے لگائی گئی تھی۔

ٹیکسٹائل کے کاروبار کے ختم ہونے سے پرانے شہر کے ساتھ ہمارا ربط ٹوٹ گیا۔ ہم ان عمارتوں کے نزدیک ایک مقام پر منتقل ہو گئے جنہیں تعمیر کرنے کا میرے باپ نے ٹھیکہ حاصل کیا ہوا تھا' اسی نے بعد کو نئی دہلی بننا تھا۔ تاہم جب میں سکول میں داخل ہوا ہوں تو اس وقت ہم مل کے داخلی پھاٹک کے اوپر والے اپارٹمنٹ ہی میں رہا کرتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے باپ نے اس خاص سکول کو میرے لیے کیوں منتخب کیا تھا۔ وہ پرانے دہلی کے چند قدیم اور آسودہ حال خاندانوں کا آشنا بن گیا تھا' انہیں میں ایک جین خاندان رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ اور اس کے بیٹے رگھوبیر سنگھ پر مشتمل تھا۔ وہ شہر میں قابل لحاظ جائیداد کے مالک تھے۔ رگھوبیر سنگھ کو کاروبار میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے سینٹ سٹیفن کالج سے آرٹس میں ڈگری حاصل کی تھی اور اس کالج کے عیسائی پرنسپل ایس۔ کے۔ رودرا کا پرجوش مداح بن گیا تھا۔ جب وہ کالج میں تھا تو اس کو ایک پرائیویٹ ٹیوٹر پڑھایا کرتا تھا جس کے دہشت گردوں کے ساتھ روابط تھے۔ وہ ٹیوٹر بعدازاں 1912ء میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو قتل کرنے کی سازش کے الزام میں پکڑا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ نوجوان رگھوبیر سنگھ قوم پرست (نیشنلسٹ) بن گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی ہندوستانیوں کی ایک محبِ وطن اور مغربیت پذیر (Westernized) نئی نسل کو تیار کرنے کے

لیے وقف کر دے گا۔ اس نے اپنے باپ کو قائل کیا کہ وہ اسے دریا گنج میں قدیم مغلیہ شہر کی دیوار کے ساتھ واقع منہدم محل' جس کے وہ مالک تھے' سونپ تھے اور اس کو سکول بنا دیا۔ عین اسی زمانے میں وہ ایک بنگالی عیسائی خاتون کملا بوس سے ملا' جو سکول کے پرنسپل کے طور پر کلکتہ سے دہلی آنے پر آمادہ تھی۔ جلد ہی اس کو کملا بوس سے گہری جذباتی وابستگی ہوگئی۔ اس کی بیوی' جس نے اسے دو بیٹے اور ایک بیٹی دی تھی' ایک پست قد' موٹی اور کم تعلیم کی حامل عورت ہونے کے سبب سے اسے کوئی رفاقت مہیا نہیں کرتی تھی۔ گو کہ کملا بوس حسین و جمیل نہیں تھی' اس کی بیوی ہی کے مانند چھوٹے قد کی' موٹی اور زیادہ کالی ہونے کے باوجود وہ بہتر تعلیم یافتہ تھی۔ اس نے اسے وہ کچھ دیا جس کا وہ کسی عورت میں متلاشی تھا — دانش ورانہ تحرک اور بامعنی دوستی۔ انہی دونوں چیزوں کے نتیجے میں انہوں نے ہندوستان کے بہترین سکولوں میں شمار ہونے والا ایک سکول قائم کر دیا۔ یہ سکول انگریزوں کے قائم کردہ ان پبلک سکولوں کی نقل سے زیادہ ہندوستانی تھا جو کہ اشرافیہ کے لڑکوں کے لیے قائم کیے گئے تھے اور دوسرے تعلیمی اداروں کی نسبت زیادہ لبرل تھا۔

اس سکول میں مہاتما گاندھی' رابندر ناتھ ٹیگور' ڈاکٹر انصاری' مولانا آزاد' سروجنی نائیڈو اور پنڈت نہرو جیسے نیشنلسٹ آیا کرتے تھے۔ کمانڈر انچیف لارڈ چیٹ وڈ' ریورنڈ سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور دوسرے بہت سے ممتاز انگریزوں نے اس سکول کا دورہ کیا۔ سٹاف میں چند انگریز خواتین بھی تھیں۔ وہ دہلی کا پہلا مخلوط تعلیم والا سکول تھا۔ اگرچہ انگریزی ذریعہ تدریس تھی تاہم ہندوستانی زبانیں مثلاً سنسکرت' ہندی اور اردو بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ معمول کے تعلیمی کورسوں کے علاوہ سکول موسیقی' مصوری' فرنیچر سازی' گھڑسواری سیکھنے' سکاؤٹنگ' ایک انگریز سارجنٹ کی زیر نگرانی فوجی تربیت حاصل کرنے اور اجتماعی کھیل مثلاً ہاکی اور فٹ بال سیکھنے کے مواقع بھی مہیا کرتا تھا۔ رگھوبیر سنگھ اور کملا بوس نے اپنے بچے کو ایک شاندار اور پرشکوہ نام دینے کے بجائے اپنے زمانے سے آگے کا ایک نام دیا تھا یعنی ماڈرن۔ میرے دادا کی خواہشات کے برخلاف' جو کہ لڑکوں کو عورتوں کے ذریعے تعلیم دینے کے حوالے سے مضبوط رائے کا حامل تھا' میرے باپ نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو وہاں رجسٹر کروا دیا۔ میرا دادا صرف اور محض ایک مرتبہ ایک سالانہ تقریب کے لیے سکول آیا تھا۔ جب اس نے اپنے پوتوں کو ستار اور ایسرج بجاتے دیکھا تو غصے میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ ''تم اپنے بیٹوں کو میراثی بنانا چاہتے ہو؟'' اس نے طیش کے عالم میں پوچھا تھا۔ بعدازاں وہ ہمیشہ ہمیں رن مرید کہا کرتا تھا — یعنی پست عورتوں کے شاگرد۔

ہم سکول یونیفارم پہنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں یہ چیز انجانی

تھی۔ ہم گہرے نیلی جیکٹیں اور شارٹس (نیکر) پہنا کرتے تھے۔ جیکٹ پر سکول کا امتیازی نشان آویزاں ہوا کرتا تھا۔۔۔ پانی کے تالاب کے اوپر چھائے ہوئے برگد کے درخت مع ایک پوری طرح کھلے ہوئے کنول کے پھول کے ساتھ تیرتے ہوئے ہنس کے۔ اس کے نیچے سکول کا ماٹو سنسکرت میں ہوتا تھا۔۔۔ ''نا ئیم آتما بال ہینے نالبھیا'' ۔۔۔ ایک بزدل ذہن کبھی سچ کو دریافت نہیں کر سکتا ہے۔

سکول اور شہری زندگی سے تال میل پیدا کرنے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ اس سے دادی کے ساتھ میرا قریبی رشتہ ڈھیلا اور اس پر میرا انحصار کم ہو گیا۔ اگرچہ میں اب بھی کمرے میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا تاہم میں نوکروں کی مدد سے جلدی جلدی رفع حاجت' نہانے' لباس بدلنے اور ناشتے وغیرہ سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ پھر ہم دونوں بھائی سبزی منڈی کے ٹرمینل سے ٹرام لیتے اور اس پر سوار ہو کر پر رونق بازاروں سے گزرتے ہوئے جامع مسجد تک پہنچتے۔ وہاں سے ہم ٹانگے میں منتقل ہو جاتے جو ہمیں دریا گنج میں ہمارے سکول لے جاتا۔ ہم شام میں دیر سے گھر لوٹتے تھے۔ جب میں رات کا کھانا کھا رہا ہوتا تو دادی میرے پاس بیٹھ جاتی اور پوچھتی کہ میں نے کیا پڑھا ہے۔ تاہم وہ میرے ہوم ورک میں میری مدد نہیں کر سکتی تھی یا عبادات کے لیے مجھے پھسلا نہیں سکتی تھی۔ ماڈرن سکول صرف تیس طلبہ کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ستائیس لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی ایک سکھ انجینئر کی بیٹی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اور دو کزن اس کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اس لڑکی کول ملک نے دو دہائیوں بعد انگلینڈ میں میری زندگی میں دوبارہ نمودار ہونا تھا' میری منگیتر بننے کے لیے اور دہلی واپسی پر میری بیوی بننے کے لیے۔ دوسری لڑکی ریتا رگھوبیر سنگھ کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے دو بڑے بھائیوں کے ساتھ سکول آتی تھی۔ سب سے بڑا پرتاپ سنگھ میری جماعت میں تھا۔ تیسری لڑکی کے بارے میں نام کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں ہے...... کوشلیا۔ اس سکول میں میرے دس برسوں کے دوران میں کچھ دوسری لڑکیوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ داخلہ لیا اور چند ماہ بعد ہی چلی گئیں۔ ماڈرن سکول صرف نام کا مخلوط تعلیم والا سکول تھا۔

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ سکول کے برس کسی شخص کی زندگی کے تفکرات سے پاک اور سب سے زیادہ پر مسرت برس ہوتے ہیں۔ ایسا میرے ماڈرن سکول کے زمانے کے حوالے سے درست نہیں ہے۔ میں کملا بوس' آنے والے امتحانوں اور سکول کے فتنہ پردروں سے سہا رہتا تھا جنہوں نے مجھے آسان ہدف پایا تھا۔ میرا آغاز برا تھا۔ زیادہ تر لڑکے بڑے شہروں سے آئے ہوئے تھے اور انگریزی کی شدبد رکھتے تھے۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے آیا تھا اور صرف اپنی بستی کی بولی ہی بول سکتا تھا۔ لڑکوں نے لفظ ہڈالی کو بہت پر مزاح پایا تھا

اور وہ مجھے اس کی یاد دلاتے رہتے تھے: ''تم کہتے ہو کہاں پیدا ہوئے تھے تم؟ ہمیں دوبارہ بتاؤ۔'' پھر میرا نام تھا' جو مجھے میری دادی نے دیا تھا: خوش حال سنگھ۔ میں نے اسے پسند نہیں کیا اور اسے خوش ونت سنگھ سے تبدیل کرلیا' اپنے بھائی کے نام بھگونت کا ہم قافیہ۔ لڑکوں کو میرے پہلے نام ـــــ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مختصر روپ شالی' جو میرے والدین میرے عرف کے طور پر استعمال کرتے تھے' کا پتا چل گیا۔ انہوں نے اس سے ایک تک بندی کی: شالی شولی باغ دی مولی' ـــــ یا وہ اسے خوشی' خسرو یا برے نام کھسرا میں تبدیل کردیتے تھے۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ میری دادی میرے بال دہی سے دھوتی ہے اور خوشبودار تیل کی جگہ میری کھوپڑی پر مکھن لگاتی ہے۔ سورج کے سامنے آنے سے اس میں سے بساند والے گھی کی سی بدبو آنے لگتی اور مکھیوں کے ہجوم کے لیے کشش انگیز ہوجاتی تھی۔ وہ میرے سر کو سونگھا کرتے' اپنے نتھنوں کو بھینچ لیتے اور چیختے ہوئے بھاگ پڑتے تھے: ''اُف! کتنا بدبودار ہے وہ! ضرور ہی اس کا سر جوؤں سے بھرا ہوا ہوگا۔'' صرف انہیں ہلاشیری دینے کے لیے مس بوس نے ایک روز میری گردن پر رینگتی ہوئی ایک جوں پکڑلی۔ مجھے اس نوٹ کے ساتھ گھر واپس بھیج دیا گیا کہ جب تک میرا سر جوؤں سے صاف نہیں ہوجاتا ہے میں سکول واپس نہیں آؤں اور میری دادی سے کہا گیا کہ وہ میرا سر دہی سے دھونا اور مکھن لگانا چھوڑ دے۔

دہلی میں پہلے ہی آجانے کی وجہ سے میرا بڑا بھائی ان ذلتوں سے بچ گیا تھا۔ مجھے مضحکہ خیز بنا دینے پر میں اپنی ماں اور دادی سے کبھی کبھی نفرت کرنے لگتا تھا۔ میری مصیبتوں میں اضافہ یوں ہوا کہ میں نہ تو پڑھائی میں اچھا تھا اور نہ کھیلوں میں۔ میں جن مضامین میں اچھا تھا وہ انگریزی اور جیومیٹری تھے۔ ریاضی ہمیشہ میں نہیں کر پایا۔ میں نے کئی مرتبہ سکول کے امتحانوں میں ریاضی میں صفر حاصل کیا۔ میں جتنا ہوسکتا تھا سکول سے غیر حاضر رہتا تھا۔ کسی خیالی بیماری کا بہانہ استعمال کرتے ہوئے میں دوائیں خریدنے ایک مہربان ڈاکٹر کی ڈسپنسری میں جایا کرتا تھا جو لال کنواں میں واقع تھی اور صبح کی کلاسوں کو ضائع کردیتا تھا۔ جب اس کا پتا چل گیا تو مجھے سخت جھاڑ پڑی۔

دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ماڈرن سکول میں جسمانی سزائیں نہیں دی جاتی ہیں۔ تاہم مس بوس چھڑی سے دست برداری میں یقین نہیں رکھتی تھی۔ وہ غلطی کرنے والے لڑکوں سے کہتی کہ اپنی ہتھیلیاں سامنے کریں اور انہیں اپنے فٹ رولر سے زور زور سے مارا کرتی تھی ـــــ کبھی کبھار وہ ہمیں اپنے ہاتھ الٹنے کا کہتی اور ہاتھ کی پشت پر پیمانے کے کنارے سے ضربیں لگاتی تھی۔ دوسری استانیاں اُس کی مثال کی پیروی کرتی تھیں۔ کچھ تھپڑ مارنے میں یقین رکھتی تھیں' کچھ کان اینٹھنے میں۔ زیادہ انگریز نما استاد' ہمارے ڈرل ماسٹر کی طرح' ہمارے کان پکڑوا دیتے

اور ہمارے چوتڑوں پر بید مارتے تھے۔ مجھے اپنے حصے سے زیادہ جسمانی سزا ملتی تھی۔ میرے ذہن میں کوئی ایک موقع بھی ایسا محفوظ نہیں ہے جب مجھے اس غلطی کی سزا نہ ملی ہو جو مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ کسی پاخانے کے اندر کوئی فحش بات لکھی ہوئی پائی گئی ہوتی۔ جو لڑکے اس سہ پہر تاش کھیلتے رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ بلیک بورڈ پر جملہ کس نے لکھا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ مجرم میری کلاس کا لڑکا امرجیت سنگھ ہے۔ اُس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے جملے کو بڑے حروف میں لکھا تھا۔ میں نے اُسے اپنی معمول کی لکھائی میں لکھ دیا۔ اساتذہ کے پینل نے فیصلہ کیا کہ میرا طرز تحریر قریب ترین مشابہت رکھتا ہے۔ مجھے سارے سکول کے سامنے بید مارے گئے۔ امرجیت سنگھ چند ماہ بعد سکول چھوڑ گیا تھا۔ وہ میری زندگی میں دوبارہ سینٹ سٹیفن کالج میں رونما ہوا جہاں وہ امتحان میں نقل مارتے ہوئے پکڑا گیا اور اُسے ایک برس کے لیے امتحان میں شرکت سے باز کر دیا گیا۔ تاہم وہ کیمبرج یونیورسٹی پہنچا اور ایک اچھی ملازمت حاصل کی۔ اس کی بہن اس لڑکی کے سب سے بڑے بھائی سے بیاہی گئی جو میری بیوی بنی۔

طلبہ کو ان کی عمروں کے مطابق مختلف جماعتوں میں چھانٹی کرنے میں تین چار برس لگ گئے۔ میرا بڑا بھائی تین طلبہ کے پہلے بیچ (Batch) میں تھا۔ اگلے بیچ میں چار طلبہ تھے۔ میں پانچ طلبہ کے تیسرے بیچ میں شامل تھا جس میں رگھوبیر سنگھ کا بڑا بیٹا پرتاپ اور دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار کا بیٹا اشوک سین بھی شامل تھے۔ ان میں آنند ناتھ بھی تھا جو بعدازاں دندان ساز (ڈینٹسٹ) بنا' ستیندر جس نے بعدازاں لندن میں مجھے دوا دی اور م—— 'جو کملا بوس کے ایک دوست کا بیٹا تھا اور اس کا پسندیدہ طالب علم تھا۔ ہماری کلاس کا واحد اچھا طالب علم آنند ناتھ تھا۔ دوسرے پڑھائی یا کھیلوں میں مجھ سے بہتر نہیں تھے۔ پرتاپ ریلوے ٹائم ٹیبل یاد کرنے کے علاوہ کسی کام میں بہتر نہیں تھا۔ اشوک ریاضی میں صفر لیا کرتا تھا اور دوسرے مضامین میں مجھ سے بھی برا تھا۔ م—— کو پڑھائی یا کھیلوں میں دلچسپی نہیں تھی اور وہ لامختتم حد تک تفریح کا رسیا تھا۔ وہ سخت جان تھا—— ہم اسے موٹا کہا کرتے تھے' اور اس کو چھیڑتے رہتے تھے۔ وہ ہم سب سے زیادہ جنسی طور پر آگے تھا۔ اگرچہ اس کا عضوِ تناسل چھوٹا سا تھا۔ تاہم ایستادہ ہونے پر وہ اسے نیکر سے باہر نکالنے اور ہمیں دکھانے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ ہمارے انگریزی کے سبق کے دوران میں' جو کملا بوس کی بھانجی لیا کرتی تھی جو کہ بیس کے پیٹے میں تھی' وہ اپنا ہاتھ اپنی نیکر کے اندر ڈال لیا کرتا' اسے تکتے ہوئے اپنے عضوِ تناسل کو کھینچتا رہتا تھا۔ اس وقت ہم میں سے کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے مگر وہ ہماری لیڈی ٹیچر کے اوسان خطا کرنے میں کامیاب رہا۔ موٹے کا اپنا ہی ضابطہ اخلاق تھا۔ اگر کوئی اُس سے لواطت کروانے کا خواہش مند ہوتا تو وہ لواطت کرتا تھا۔ اگر وہ اُس کے ساتھ لواطت کرنا چاہتے تو بھی وہ تیار ہوتا تھا۔ اُن نوازے

جانے والوں کے درمیان ہمارا سکاؤٹ ماسٹر بھی شامل تھا وہ ایک نوجوان پارسی تھا' جو کہ سینٹ سٹیفن کالج میں پڑھ رہا تھا۔ جب اُس نے دوسرے لڑکوں کو ورغلایا تو سکاؤٹ ماسٹر کے خلاف انضباطی کارروائی ہوئی۔ اس کے خلاف گواہی دینے والوں میں موٹا بھی شامل تھا۔ اگرچہ موٹا ہر معاملے میں ملوث تھا لیکن اس نے جھوٹ نہیں بولے۔

موٹے کا سب سے بڑا نشانہ اشوک سین ہوا کرتا تھا جس پر اُس نے ہوا خارج کرنے کا الزام لگایا۔ وہ اُسے سکول کے تمام اوقات میں تنگ کرتا رہتا۔ وہ اُس کو دھکے دیا کرتا' ٹھوکر مارتا اور کہتا: ''سوری' پاڈی! میں نے تمھیں دیکھا نہیں تھا'' وہ اشوک کی قمیض نیکر میں سے نکال لیتا تھا' بغیر اشتعال کے اُسے مکا مارتا اور کہتا: ''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا' مُنّے!'' بے چارہ اشوک اتنا کمزور تھا کہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ ''ایسا مت کرو'' چلانے کے بعد چند ایک مرتبہ وہ مدد کے لیے استانی کے پاس دوڑا گیا۔

موٹے کے حساب کا دن دو سال بعد آیا۔ ایک گرمیوں کے موسم میں چھ لڑکوں کا گروپ کسولی بھیجا گیا وہ اس میں شامل تھا۔ کسولی شملہ کے راستے میں ایک پہاڑی تفریحی مقام تھا جہاں انہیں ایک ہفتے کی چھٹی منانی تھی۔ ہمیں لالہ رگھوبیر سنگھ کے گھر میں رکھا گیا جس کا نام ''شانتی کنج'' تھا۔ اشوک نے عقل مندی سے کام لیا اور پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ موٹے نے ایک اور ہدف چن لیا۔ اُس نے مجھے منتخب کیا۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ مضبوط تھا تاہم میں اُس سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا۔ جب اُس نے مجھے مارا تو میں جواباً اسے ضرب لگا کر دوڑ پڑا اور وہ میرے پیچھے دوڑ دوڑ کر بے دم ہو گیا۔ اس نے اپنی توجہ دوسروں کی طرف مبذول کر دی تاہم اب ہم اسے مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر اس نے ہم میں سے کسی ایک کو بھی چھوا تو ہم مل کر اس سے نمٹیں گے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ موٹا فتنہ پروری پر مجبور تھا۔ کسولی میں آخری صبح اس نے مجھے لان میں گرا دیا۔ میں مدد کے لیے پکارا۔ چار لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے اور مار مار کر اس کو زمین چٹا دی۔ ایک اس کی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔ ایک اس کے پیٹ پر چڑھ بیٹھا اور باقی دو نے اس کے بازو پکڑ لیے۔ پھر ہم نے اس کو اس وقت تک تھپڑ اور مکے مارے جب تک ہمارے ہاتھ اور اس کے رخسار دکھنے نہیں لگے۔ اس نے ہمیں حرامی کہا اور اس لڑکے پر تھوک پھینکی جو اس کے پیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جواب میں ہم سب نے اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ چلانے لگا۔ ہم نے اس کو اس تنبیہ کے ساتھ جانے دیا کہ اگر اس نے ہم میں سے کسی کو بھی چھونے کی جسارت کی تو اس کے ساتھ دوبارہ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

وہ کسولی سے چیختا چلاتا اور انتقام کی قسمیں کھاتا ہوا رخصت ہوا۔ اسی شام ہم نے کالکا کے لیے بس لی جہاں سے ہم نے دہلی کے لیے ٹرین پکڑنا تھی۔ موٹا ٹیکسی کے ذریعے ہم

سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم ایک تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے' اس نے اپنے لیے دوسرے درجے کا ٹکٹ خریدا۔ اس نئے دہلی ریلوے سٹیشن پر ہمیں دیکھا تک نہیں۔ اس نے کملابوس سے شکایت کی۔ ہم نے اس کو واقعے کے بارے اپنے مؤقف سے آگاہ کیا۔ گوکہ وہ اس کا پسندیدہ طالب علم تھا تاہم وہ ہم سب کو سخت ڈانٹ پلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکی تھی۔ وہ ایک کے مقابلے میں چار کا معاملہ تھا۔ اس سلوک نے موٹے کی بدمعاشی بند کروا دی۔ سارے سکول نے کسولی میں واقع ہونے والی واردات کا سنا اور سارے میں بات پھیل گئی کہ اگر موٹے نے کسی کو چھیڑا ہو تو وہ مدد کے لیے ہمیں بلا سکتا ہے۔ آگے چل کر جو بہترین کام وہ کر سکتا تھا یہی تھا کہ وہ ہمیں چپکے چپکے گالیاں بکے اور اپنے خلاف گینگ بنانے پر ہمیں بزدل پکارے۔ جب میں انگلینڈ سے واپس آیا تو ہم دوست بن گئے اور مل کر کئی تجربے کیے' بشمول ایک چکلے کی سیر کے' اس ایڈونچر کا ذکر اس کے مناسب مقام پر آئے گا۔

سکول کے دن لمبے ہوتے تھے۔ ہم اس وقت جاگا کرتے جب ہنوز اندھیرا ہی ہوتا' جلدی جلدی ناشتہ کرتے اور ٹرین' ٹانگا' فٹن کے ذریعے یا بڑے ہونے پر سائیکل کے ذریعے روانہ ہو جاتے۔ ہم سکول میں شروعات صبح کی مناجات گانے سے کرتے تھے' جو عموماً ''جن گن من'' ہوا کرتی تھی' یہ بعدازاں ہندوستان کا قومی ترانہ بنی۔ اس کے بعد داناؤں کی تحریروں میں سے کچھ اقتباسات پڑھے جاتے۔: رابندر ناتھ ٹیگور کا ''جہاں ذہن بے خوف ہوتا ہے'' اکثر پڑھا جاتا۔ اس کے بعد پانچ منٹ کا خاموش مراقبہ کیا جاتا تھا۔ اہم مضامین ریاضی' انگریزی' تاریخ اور سائنس صبحوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ پی ٹی کے لیے ایک مختصر سا وقفہ ہوتا تھا۔ پھر ہم دوپہر کے کھانے کے لیے ایک زمین دوز ہال میں جاتے جو طعام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جو کے دلیے اور بینگنوں سے میری بددلی کا آغاز انہی کھانوں سے ہوا جہاں ہمیں ہر وہ شے کھانا پڑتی تھی جو فراہم کی جاتی تھی۔ ہمیں ایک گھنٹہ آرام کرنے کی اجازت تھی۔ قیلولہ کرنے کی عادت سکول ہی میں ہوئی تھی۔ سہ پہروں میں ہم عام طور پر ڈرائنگ' موسیقی اور فرنیچر سازی کرتے تھے۔ آخری کام اجتماعی کھیل مثلاً ہاکی یا فٹ بال ہوتا تھا۔ ہم کبھی کبھار ہی اندھیرے ہونے سے پہلے گھر واپس آتے تھے۔ ہمیں بہت سارا ہوم ورک دیا جاتا تھا۔ گھر پر کھیلنے یا ستانے کے لیے بہت کم وقت بچتا تھا۔

کچھ غیر اہم واقعات میرے حافظے سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ ایک واقعہ مناجاتوں کے بعد کیے جانے والے پانچ منٹ کے مراقبے کے دوران پیش آیا۔ الموڑا سے دو لڑکوں نے حال ہی میں سکول میں داخلہ لیا تھا۔ ہمیں مشکل سے ان کے ناموں ہی کا پتا چلا تھا کہ ایک صبح

بڑے لڑکے نے خاموشی کا پیریڈ زوردار پاد مار کر ختم کردیا۔ یہ ایسی چیز ہے جس کو دنیا کا کوئی بچہ بھی سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔ کچھ منہ دبا کر ہنسنے لگے اور کچھ نے اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ کملابوس کی درشت گھرکی بھی ایک ہنسی پر ختم ہوئی۔ لڑکے کو ''پڈو'' — عظیم پاد مارنے والے — کا خطاب دے دیا گیا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد واپس نہیں آیا۔

اگرچہ میں نہ تو پڑھائی اور نہ ہی کھیلوں میں اچھا تھا تاہم میں نے مذاق اور شرارتیں کرنے میں ایجاد پسندی کا مظاہرہ کیا۔ میری پسندیدہ شرارتوں میں سے ایک ادھ کھلے دروازوں پر پانی کا برتن یا جوتوں کی جوڑی رکھ دینا تھی۔ جو کوئی انہیں دھکیلتا اسے یا تو جوتا پڑتا یا اس پر پانی گرتا۔ گرمیوں کے مہینوں میں ہم گھر میں کھلے میں سویا کرتے تھے' عام طور پر ہمارے نئی دہلی والے گھر کے ''اندر'' اور ''باہر'' آنے جانے والے گیٹوں سے ملے ہوئے روڈ پر۔ ایک مرتبہ ایک دور کا رشتہ دار جو ہڈالی سے ہمارے ہاں آیا تھا' مجھ سے اگلی چارپائی پر سو رہا تھا۔ وہ رات بھر زور زور سے خراٹے لیتا رہا اور صبح سویرے ہی جاگ اٹھا۔ وہ فلش ٹائیلٹ استعمال نہیں کرسکتا تھا اور باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے رفعِ حاجت کو ترجیح دیتا تھا۔ رات کو لیٹنے سے پہلے وہ اپنے بستر کے نیچے پانی سے بھرا ہوا ایک پیتل کا لوٹا صبح کے وقت اپنے چوتڑ دھونے کے لیے رکھ لیتا تھا۔ ایک رات جونہی وہ سویا میں نے اس کے لوٹے میں گوند انڈیل دی۔ اگلی صبح وہ بھلا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے مقعد سے ایک لعاب دار چپچپے مادے کے اخراج کی شکایت کی جس نے اس کے تہمد کو اس کے چوتڑوں سے چپکا دیا تھا۔ میں نے اگلی دو راتیں اسی شرارت کو دہرایا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس مشورے کے لیے گیا اور اپنا پاخانہ معائنے کے لیے لے گیا۔ تب میں راز کو اپنے تک رکھنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ میرے والدین نے مجھے ڈانٹا تو تھا لیکن جب وہ دوسروں کو بتاتے کہ میں نے کیا کیا تھا تو ہنسی کے دوروں سے بچ نہیں سکتے تھے۔

ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے اپنے باغ میں ایک کوبرا دیکھا۔ اس کو مار مار کر لوتھڑا بنا دینے لیکن اس کا سر بچانے کے بعد ہم نے اسے ایک بسکٹ کے ڈبے میں بند کردیا' ڈھکن کو رسی سے باندھ دیا اور اپنے کیمسٹری کے استاد ڈاکٹر چوبے کے لیے تحفے کے طور پر سکول لے گئے۔ اس کے پاس لیبارٹری میں میتھیلیٹڈ سپرٹ سے بھرے ہوئے مرتبانوں میں سانپوں کا ذخیرہ تھا: افعی' زہریلے ایڈر' خمدار کریٹ' گھاس والے سانپ اور دوسری اقسام۔ لیکن کوبرا نہیں تھا۔ اس نے سپرٹ کا ایک مرتبان لیا اور بسکٹ کے ڈبے کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ جونہی اس نے رسی کھولی' ڈھکن ہوا میں اڑ گیا اور ایک بے حد مشتعل کوبرا پھن پھیلائے ہوئے اس کی طرف لپکا' اس کا چہرہ ایک انچ کے فرق سے بچا۔ بہت سال بعد میں نے اس واقعے کو ایک افسانے ''وشنو کا نشان'' کی صورت میں ڈھالا' یہ میرا پہلا افسانہ تھا جسے نیویارک کے ہارپر

میگزین نے قبول کیا تھا۔

ان دنوں سانپ دہلی میں اتنے غیر عام نہیں ہوتے تھے۔ دریا کے قریب اور قدیم مغل حصاروں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے ماڈرن سکول میں گرمیوں کے مہینوں میں چند سانپ نکل آیا کرتے تھے۔ کوئی مون سون ایسا نہیں گزرا جب کچھ سانپ اپنے بلوں سے باہر نہ نکلے ہوں اور انہوں نے کسی نہ کسی کو ڈس کر مار نہ دیا ہو۔ وہاں بچھو تھے، شہد کی مکھیوں اور سرخ بھڑوں کے چھتے تھے۔ ایک مرتبہ شری رام (جو ہندوستان کے سب سے بڑے صنعت کاروں میں سے ایک بن گیا) کے تیسرے بیٹا جیرت رام کے ٹخنے پر کسی شے نے کاٹ لیا جس کے بارے میں اس نے چلا چلا کر کہا کہ وہ زہریلا سانپ تھا۔ گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے اپنے بڑے بھائی بھرت اور دوستوں کو الوداع کہا۔ ڈاکٹر کے سانپ کے تریاق کے ساتھ آنے سے پہلے وہاں بہت زیادہ آہیں اور رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ ''بہت دیر ہوگئی'' جیرت چلایا تھا ''میں تو مر جاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے ڈسی جانے والی جگہ کا معائنہ کیا اور ایک ننھا سا سیاہ ٹکڑا نکالا۔ جیرت کو کسی مہلک شے نے نہیں بلکہ محض ایک بھڑ نے کاٹا تھا۔

سکول کے زمانے میں مجھے بھوتوں کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ ہمیں نوکروں نے بھوتوں کی کہانیاں سنا رکھی تھیں۔ شملہ میں چھٹیوں کے دوران میں وہ ہمیں ''مومیائی والے'' کے جتھوں کے بارے میں بتاتے کرتے جو ہلکی آگ پر لٹکا کر انسانی تیل (رام تیل) نکالنے اور اعضائے تناسل کاٹنے کے لیے کسی شکار کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ انگریزوں کے گماشتے ہیں جنہیں اس قیمتی تیل کی اپنی فوج کے لیے ضرورت ہے۔ کسی ''ممیائی والے'' کو پہچاننے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اس کے پیروں کو دیکھا جائے جو پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے تھے ـــ ایڑھیاں سامنے ہوتی تھیں، پنجے پیچھے ہوتے تھے۔ کبھی کسی نے کسی مومیائی والے کو نہیں پکڑا تاہم وقفوں وقفوں سے ان کے بارے میں خبر ملتی کہ وہ آئے ہوئے ہیں، لوگ اندھیرا چھا جانے کے بعد گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔

میرے بھوتوں کے خوف کی ایک اور ٹھوس بنیاد تھی۔ جب میں بچہ تھا تو موت مجھ پر آشکار ہو گئی تھی۔ جب میں میاں چنوں میں تھا تو میرا دادا سجان سنگھ، جو کہ اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں تھا، بیمار پڑ گیا۔ بستی کے ڈاکٹروں کو اس کی دیکھ بھال کے لیے بلوا لیا گیا۔ وہ ہچکیاں لیتا رہا اور ہر پانچ منٹ بعد مزید دوا طلب کرتا رہا۔ پھر اس نے اس طرح اپنا منہ کھولا گویا جماہی لے رہا ہو، ہچکی لی اور تکیے پر ڈھے گیا۔ میری دادی نے موت کی مناجات پڑھتے ہوئے بلند آواز میں دردناک چیخ ماری: ''دِیا میرا ایک نام دکھ وچ پیا تیل'' ـــ اُس نے اپنے ماتھے پر دو ہتھڑ مارا اور اپنی کلائیوں میں پہنی ہوئی شیشے کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ میں اپنے ماں باپ،

چچاؤں اور رشتہ داروں کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر سہم گیا تھا۔ ملازموں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میرے دادا کی روح کو کمرے سے باہر دھوئیں کے مرغولے کی طرح پرواز کرتے اور آسمان میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

میرے چچا اُجّل سنگھ کی پہلی بیوی کو مرتے ہوئے دیکھنا کہیں زیادہ دہشت انگیز تھا۔ یہ واقعہ بھی میاں چنوں میں رونما ہوا تھا۔ میں اپنی ماں کے ساتھ تھا جسے اس کی زچگی کی حالت کے دوران میں اس کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بچہ اس کی کوکھ ہی میں مر گیا تھا اور زہر اس کے سارے بدن میں پھیل گیا تھا۔ ہر شام جب اس کے بستر کو صحن میں لایا جاتا تھا تو وہ واہموں کا شکار ہو جاتی تھی۔ ''دیکھو!'' وہ اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ''وہ وہاں ہے' ڈائن ـــــ چڑیل۔'' میری دادی اور میری ماں اُس کو یقین دلاتیں کہ ادھر کوئی نہیں ہے اور بلند آواز میں مناجاتیں پڑھتی تھیں تا کہ بری ارواح بھاگ جائیں۔ پھر سرگوشیوں میں کہا جاتا کہ سورج غروب ہونے کے وقت باغ میں لیموں کے درخت سے ایک لیموں توڑنے کی وجہ سے اس کے اپنے سر میں شیطان گھس گیا ہے۔ یہ ایک عام عقیدہ تھا کہ ایسا کرنے والے شخص پر ایک چڑیل قبضہ کر لیتی ہے جس سے چھٹکارہ صرف جنتر منتر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس کے تکیے کے نیچے ایک مناجاتوں کی کتاب اور ایک کرپان رکھ دی گئیں۔ کوئی شے کارگر نہیں ہوئی۔ ڈائن اس پر قبضہ کیے رہی۔ ایک سہ پہر اس پر خوفناک تشنج طاری ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اتنی مڑ گئیں کہ صرف ڈائنیں ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس نے اپنی زبان کو اس قدر کاٹا کہ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ بے حد اذیت کے عالم میں مری۔ ایک مرتبہ پھر آہ و بکا شروع ہو گئی اور ماتھوں پر دوہتھڑ مارے جانے لگے۔ جونہی یہ خبر گاؤں میں پہنچی عورتیں ہجوم کی صورت میں آنے لگیں' وہ مل کر اپنی چھاتیاں پیٹ رہی تھیں اور پکار رہی تھیں ''ہائے ہائے!'' وہ لاش کے گرد گھیرے میں بیٹھ گئیں اور مردہ عورت کی تعریفیں کرنے لگیں' جس سے کہ وہ کبھی آشنا ہی نہیں رہی تھیں۔ ''وین'' ـــــ مرے ہوئے کی تعریفیں ـــــ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی تھیں۔ چونکہ اس کا اپنا بیٹا نریندر دور تھا اس لیے مجھی کو اس کی چتا کو آگ دکھانا پڑی۔ مجھے کبھی نہیں سمجھ آ سکی کہ میری عمر کے بچوں کو ایسے ہولناک مناظر کیوں دکھائے جاتے ہیں۔

ایک اور مرتبہ شملہ میں' میں اور میری بہن نے گھر واپس آتے ہوئے ایک روڈ رولر کو کھڈ میں لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ ڈرائیور اور اس کے اسسٹنٹ ہر دو کے سر اور اعضاء ان کے جسموں سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ ہم اپنے آپ کو اس خونیں منظر سے دور نہیں کر پائے تھے اور ہم ان کے اعضاء کو جمع کرتے اور ایک جگہ رکھے جاتے اور ان کی خون آلود لاشوں کو سٹریچروں پر پڑے لے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس رات ہم اتنے خوف زدہ تھے کہ تنہا سو

نہیں سکتے تھے لہٰذا ہم ایک ہی بستر میں سوئے۔

بھوتوں کے خوف نے مجھے کبھی نہیں چھوڑا۔ میں مرتے ہوؤں کی طرف اس طرح کھنچا چلا جاتا ہوں جس طرح لوہ چون (لوہے کے ذرّات) مقناطیس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ میں مرگھٹوں اور قبرستانوں کا دورہ کرتا ہوں تاکہ اس خوف سے اپنے آپ کو پاک کروں۔ لیکن ابھی اندھیرا ہوا نہیں ہوتا کہ میں مرے ہوؤں کے روحوں کی رحم و کرم پر ہوتا ہوں۔ میں بھرے پرے بازاروں میں رہنے والے لوگوں اور فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سونے والوں سے کسی بچے کی طرح حسد کرتا ہوں۔ بھوت پر ہجوم جگہوں پر ڈراتے نہیں ہیں نا۔ اب بھی اگر میں گھر میں اکیلا ہوں تو مجھے سکون کے ساتھ سونے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

میرے سکول کے غیر ممتاز برسوں کے کچھ مثبت حاصلات بھی تھے۔ میں نے انگریزی زبان سے محبت کرنا سیکھا۔ نیز شاعری سے' انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں۔ میری آنکھیں بھی خوبصورت چیزوں کے لیے زیادہ کشادہ ہو گئیں۔ میں نے انگریزی کو خود ہی بہت تیزی سے سیکھا۔ چونکہ گھر پر میری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے اسے بچوں کے انگریزی رسالے ''پک'' میں کارٹونوں' پہلی عالمی جنگ کی تصویروں کے بغور مشاہدے' بائبل اور ''دی بک آف نالج'' کی جلدوں میں شائع شدہ باتصویر کہانیوں کو پڑھ پڑھ کر سیکھ لیا۔ اپنے آپ ہی میں ایڈگر رائس بروکی سیریز ''ٹارزن دی ایپ مین'' اور افریقہ کے حوالے سے رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں کو پڑھنے لگا۔ اکثر اوقات میں لفظوں کے غلط معانی لے لیتا اور انہیں غلط تلفظ میں پڑھتا تھا۔ میں غلط تلفظ کی تک بندی کیا کرتا تھا۔

میری کمپوزیشنوں (نظموں) میں سے ایک میاں چنوں میں ہمارے شوفر کے دیئے ہوئے ایک مصرعے پر لکھی گئی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ ہندوستانی طوائفیں کس طرح برطانوی سپاہیوں کو بلاتی ہیں: "O Sahab! O Sahab! Come haeyyur" (او صاحب! او صاحب! کم ہیر) پھر میرے کزن نے youth کا غلط تلفظ yath (یتھ) کیا اور put کا putt (پُٹ)۔ ایک بھائی ٹینس کورٹ میں گیند کے لیے چیختے ہوئے پکارتا تھا ''سٹ گولی گل'' بجائے اس کے کہ صرف ''گولی'' (گیند) کے لیے کہتا۔ وہ tyre کو taiyyar (ٹیر) بولا کرتا تھا۔ یہ لفظ کوئی معنی تو نہیں رکھتے تھے تاہم انہوں نے ہماری نجی تک بندیوں کو جنم دیا:

O Sahab! O Sahab! come haeyyur

yath, patt, gul, taiyyar

انگریزی میں میری دلچسپی اس وقت زیادہ منظم ہوگئی جب ایک نوجوان انگریز خاتون

مس بڈن نے انگریزی کی کلاس لی۔ بیزار کردینے والی نصابی کتابوں کی بجائے وہ ہمیں آئیوان ہو (Ivanhoe)' لاسٹ آف دی بیرنز (Last of the Barons) اور ٹیس (Tess) پڑھاتی تھی۔ وہ ہمیں آسکر وائلڈ کی بچوں کی کہانیاں اور شیکسپیئر کی چھوٹی نظمیں پڑھاتی تھی۔ ایک روز اُس نے "Under the greenwood tree....." پڑھ کر سنائی۔ شعروں نے تو میرے دل کی تار ہلا دی۔ میں نے اس نظم کو اور اس کی سنائی ہوئی ٹینی سن' ورڈز ورتھ اور دوسرے شاعروں کی کئی نظموں کو یاد کرلیا۔ اتوار کو ہم اس کا وضع کردہ لفظوں کا ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی ڈکشنریاں دے دی جاتی تھیں۔ وہ ایک لفظ بولتی تھی' جو سب سے پہلے اس لفظ کو ڈکشنری میں ڈھونڈ لیتا تھا فاتح قرار پاتا تھا۔ اس سے میں نے جب کبھی کسی لفظ کے درست معانی کے حوالے سے شبہ ہو تو ڈکشنری دیکھنے کی عادت سیکھی۔

اردو شاعری کی محبت میرے اندر مولوی شفیق الدین نے پیدا کی۔ میں ان کا واحد طالبعلم تھا۔ انہیں مجھے چار سال میں میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی دلانا پڑی۔ مجھے اکثر ان کے گھر پڑھنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ میں نے اردو نثر کو بہت غیر متاثر کن پایا لیکن اس کی شاعری انگریزی کے مقابلے میں چند لفظوں کے اندر ملفوف زیادہ موسیقی اور معانی کی حامل ہوتی ہے۔ مولوی صاحب خود ایک شاعر تھے اور بچوں کی بے شمار نظمیں لکھ چکے تھے۔ جب سبق ختم ہو چکتا تو وہ غالب' ذوق' ظفر اور اکبرالہ آبادی جیسے شاعروں کی شاعری سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سے شعر یاد کروائے۔ وہ آج بھی مجھے یاد ہیں۔

مہینے میں ایک مرتبہ ہمیں دہلی کی قدیم یادگاروں میں پکنک کے لیے لے جایا جاتا تھا۔ ہمیں ان کی تاریخ بتائی جاتی تھی اور مقبروں' مسجدوں اور محلات میں گھومنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ سال میں دو مرتبہ ہم ہندوستان کے مختلف حصوں میں سیر و تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔ کچھ تجربے میرے ذہن میں رہ گئے ہیں۔ پہلا تجربہ میرا سمندر کو پہلی مرتبہ دیکھنے کا ہے۔ یہ تجربہ بمبئی میں ایک سکاؤٹ جمہوری کے موقع پر ہوا۔ میں پانی کے لامحدود پھیلاؤ کو دیکھ کر متحیر اور گم سم ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ایک بڑھتی آ رہی موج سے ملنے دوڑا اور ایک چلو بھر لیا کہ دیکھوں اس کا ذائقہ کیسا ہے۔ اور ایک دم اسے باہر تھوک دیا۔ ہماری راجستھان کی سیر زیادہ شاندار تھی۔ جن جگہوں پر ہمیں لے جایا گیا ان میں چتوڑ کا وسیع و عریض راجپوت قلعہ بھی تھا جو ایک پہاڑی کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ محلات اور مندروں کے کھنڈرات میں گھومنے کے بعد پہاڑی سے اُتر کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ جب سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ تب سینکڑوں مور قلعے کی منڈیر پر آ بیٹھے۔ پھر' جیسے ان کے لیڈر نے انہیں اشارہ کیا ہو' سارا جھنڈ پی ہو' پی ہو پکارتا ہوا نیچے اڑ آیا' غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں ان کی سنہری' سبز اور

نیلی لمبی دمیں چمک رہی تھیں۔ کون ہے جو ایسے منظر کو کبھی فراموش کرسکتا ہو! اسی سیر کے دوران میں ہمیں اجمیر اور اودے پور لے جایا گیا تھا۔ ہم نے قلعے' محلات اور جھیلیں دیکھیں۔ ایک شام کوئی لڑکا کیکٹس کا بھٹا لے آیا اور اسے کمرے میں لیمپ پر لٹکا دیا۔ ایک دم سے کمرہ اس کی تیز مدھر خوشبو سے مہک اٹھا۔ کیوڑہ اور خس جو بارش کے پہلے قطرے گرنے کے بعد پیاسی زمین کی خوشبو دیتی ہے' میری پسندیدہ خوشبوئیں رہی ہیں۔ نیز میں یادگاروں کی سیر اور ان کے بارے میں لکھنے سے کبھی نہیں تھکا ہوں۔

ان سیروں میں سے سب سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل فتح پور سیکری اور آگرہ کی سیر تھی۔ ہمیں سیکری کے سرخ پتھروں سے بنے ہوئے محلات اور مسجدوں میں گھنٹوں پیدل چلنے کے بعد آگرہ قلعے لے جایا گیا۔ یہ بھی سرخ اور مٹیالے پتھروں اور سفید سنگِ مرمر کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ میں تھک چکا تھا اور بیزار ہو رہا تھا۔ تب ہم تاج محل کے داخلی دروازے پر قطار میں کھڑے تھے اور ایک اور لیکچر: ''اب بچو! تم دنیا کے سات عجائب میں سے ایک کو دیکھو گے۔ اس کو شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنی ملکہ ممتاز محل کی آخری آرام گاہ کے طور پر تعمیر کروایا تھا۔'' بیزاری کے اس لمحے میں مجھے نہ تو دنیا کے عجائبات کی کوئی پروا تھی اور نہ ہی شہنشاہ کی اپنی عورت کے ساتھ محبت کی۔ لیکچر ختم ہوگیا' ہمیں ایک قطار میں مارچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ تاج کا نظارہ یک دم نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ مجھے اس کے عظیم شکوہ نے بھونچکا بنا دیا اور میں کھلے منہ کے ساتھ اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میں مزید آگے جانے کا خواہشمند نہیں تھا۔ میں تو بس دروازوں کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا اور سارا کچھ من میں سمیٹ لیا۔

اگرچہ میں نے ماڈرن سکول میں دس برس گزارے اور برسوں بعد اس لڑکی سے شادی کی جس کو میں نے پانچ برس کی عمر میں پہلی بار دیکھتے ہی دل کے سنگھاسن پر بٹھا لیا تھا تاہم میں نے سکول میں کوئی دیرپا دوستیاں قائم نہیں کی تھیں۔ شفیق الدین نیرّ جیسے کچھ اساتذہ سے میں ملتا جلتا رہا۔ روما بسواس' نوجوان خاتون اساتذہ میں سے ایک' میری زندگی میں اس وقت دوبارہ آئی جب میں لاہور میں کالج میں تھا اور جب میں پہلی مرتبہ انگلینڈ گیا تب مختصر وقت کے لیے۔ میں نے لندن میں متعدد بار سیتندر سے ملاقاتیں کیں اور ہم نے اپنی تعطیلات اکٹھے پیرس میں گزاریں۔ جب وہ کینیڈا چلا گیا تو میں اس کی دید سے محروم ہوگیا۔ موٹا قریباً واحد ہم جماعت تھا جس سے میں بعد کے برسوں میں کبھی کبھار ملتا رہا تھا۔

قابل اساتذہ اور چھوٹی جماعتوں کے باوجود ماڈرنائٹ (ماڈرن سکول میں تعلیم پانے والے) میٹریکولیشن کے امتحانات میں اعلیٰ درجوں پر نہیں آئے۔ فیل ہونے والا تو کوئی نہیں تھا تاہم ٹاپ کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سکول کے منتظمین کے لیے یہ بڑی بدقسمتی کی

بات تھی۔ ہندوستانی امتحانات کے نظام میں زور ایک سے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات پر ہوتا تھا (اور ہے) ماڈرن سکول میں اسے ناپسند کیا جاتا تھا اور اگرچہ امتحانات میں ان کی کارکردگی غیر تسلی بخش تھی تاہم بیشتر طلبہ نے بعد کی زندگی میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ایس۔کے۔رودرا (پرنسپل سینٹ سٹیفن کالج) کے نام پر ایک سالانہ انعام اس طالب علم کے لیے جاری کیا گیا تھا جو ''کردار اور تعلیم'' کے حوالے سے سب سے زیادہ اچھا طالبعلم ہو۔ یہ انعام میرے بڑے بھائی بھگونت سنگھ کو اس کے پہلے برس میں دیا گیا۔ جب 1930ء میں ہم نے میٹریکولیشن کا امتحان دیا ہے تو میری کلاس میں پانچ طلبہ تھے۔ پانچوں میں پڑھائی میں سب سے زیادہ میڈیا کرلڑ کا پرتاپ سنگھ تھا جس نے کمزور بینائی کی وجہ سے کھیلوں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کی پڑھائی باقی چاروں سے کم تھی۔ ہم تو انجان ہی رہے' ضرور وہ اعلیٰ کردار کا حامل رہا ہوگا۔ اساتذہ نے متفقہ رائے سے اس کو رودرا انعام کے لیے منتخب کرلیا۔ اس کا باپ سکول کا بانی جو تھا۔

توقع کے مطابق میں نے دوسرے درجے (سیکنڈ ڈویژن) میں میٹریکولیشن پاس کرلی۔ سکول کا سب سے بڑا مسئلہ اشوک سین تھا جس کا ریاضی میں صفر لینے کا ناقابل شکست ریکارڈ تھا۔ ریاضی لازمی مضمون تھی جس میں تمہیں پاس مارکس لینا پڑنے تھے—یا پورے امتحان میں فیل ہونا پڑتا تھا۔ اشوک بھی دوسرے درجے کے ساتھ میٹریکولیشن میں پاس ہوگیا۔ اس کا باپ دہلی یونیورسٹی کا رجسٹرار جو تھا۔ ماڈرن سکول نے مجھے زندگی کے اطوار سے آگاہ کرادیا۔

ماڈرن سکول کے برسوں (1920-30ء) نے ہمارے خاندان کے مقدر اور میری شخصیت میں بہت سی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ میرے باپ نے ٹیکسٹائل میگنٹ بننے کی لاحاصل کوشش ترک کرنے کے بعد عمارتیں بنانے پر توجہ مرکوز کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں خالصہ ملز کے داخلی دروازے کے اوپر والے کمروں سے نکلنا اور رائے سینا جانا پڑا' نئی دہلی بننا جس کا مقدر تھا۔ پہلے ایک یا دو سال کے لیے ہم اس علاقے میں رہے جو بعد میں اولڈ ملز روڈ (اب رفیع مارگ) کہلایا کیونکہ وہاں ایک آٹے کا کارخانہ واقع تھا۔ اس کے سامنے آج کا سن سد مارگ (پارلیمنٹ سٹریٹ) تھا' اس مقام کے قریب دو سیکرٹریٹ' شمالی اور جنوبی تعمیر ہونا تھے۔ میرے باپ نے جنوبی بلاک کی تعمیر کا ٹھیکہ حاصل کرلیا جبکہ بساکھا سنگھ نے' جو اس کا قریب ترین دوست بن گیا' شمالی بلاک کا ٹھیکہ حاصل کیا۔ ہماری رہائش گاہ کے سامنے سے ایک تنگ پٹڑی کی ریلوے لائن دہلی سے باہرہ میل دور جنوب میں واقع بستی بدر پور سے آج کے کناٹ سرکس تک جاتی تھی۔ اس کو بدر پور سے پتھر' بجری اور روڑا عمارتوں کے مقام تک لانے کے لیے بچھایا گیا تھا۔ پتھر کاٹنے والی مشینوں کو رکھنے اور انہیں دیئے گئے نمونوں کے

مطابق پتھروں کو تراشنے والے کاریگروں کے لیے عین ہمارے نئے گھر کے سامنے بڑے بڑے شیڈ بنا دیئے گئے۔ صبح کے وقت ہم پتھر کاٹنے والی مشینوں کی گرجدار آواز اور بھر بھرے پتھروں کو بسولیوں سے ضربیں لگانے والے کاریگروں کے شور سے جاگ اٹھتے تھے۔ یہ سلسلہ سورج طلوع ہونے سے غروبِ آفتاب تک جاری رہتا تھا۔ چھٹیوں میں ہم امپیریل دہلی ریلوے کی چھوٹی ٹرین کی پتھر اور روڑے کو اتارنے کے لیے آمد کے منتظر رہتے تھے تا کہ ہم کناٹ سرکس تک اور واپسی کا مفت سفر کرسکیں۔

میرے باپ کے پاس اس کے ٹھیکیداری کے کاروبار کے عروج کے دنوں میں چھ ہزار مزدور اور درجنوں سپروائزر، کلرک اور اکاؤنٹنٹ تنخواہ دار ملازم تھے۔ مزدور راجستھان کے بگاڑی تھے۔ مردوں کو آٹھ آنے (آدھ روپیہ) فی یوم اور ان کی عورتوں کو اپنے سروں پر اینٹیں، سیمنٹ اور گارے کی تغاریاں ڈھونے کے چھ آنے ملا کرتے تھے۔ انہیں بھاری بھاری پتھر کی سلوں (بلاکوں) کو ان کی موزوں جگہوں تک کھینچنا ہوتا تھا، جب وہ انہیں کھینچتے تو وہ مل کر گاتے: ''ہائی ساہ! ہائی ساہ! رام بھروسے ہائی ساہ! جور لگا دے ہائی ساہ!'' یہ بڑی محنت طلب مزدوری تھی۔ وہ کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ ان کے حقوق کے لیے لڑنے والی کوئی مزدور یونینیں نہیں تھیں۔ وہ جو کچھ کماتے تھے اس سے بمشکل ہی ان کا پیٹ بھرتا تھا لیکن ہر شام جب میرا باپ اور اس کے کلرک اپنے منافعوں کا حساب کتاب کرتے ہوئے لڑتے جھگڑتے تو بگاڑز زبردست جذبے کے ساتھ گاتے اور رقص کرتے ہوئے اپنے جھونپڑوں کی طرف جا رہے ہوتے تھے۔

اُن دنوں وہاں سٹریٹ لائٹس نہیں ہوا کرتی تھیں چونکہ ہم گرمیوں کے مہینوں میں کھلے میں سویا کرتے تھے، اس لیے ہم گھڑی کے وقت کی نسبت چاند کے مراحل اور ستاروں کی حرکات سے زیادہ آگاہ تھے۔ چاند راتوں کو اکثر پکنکوں کے ذریعے منایا جاتا یا رات کے کھانے کے بعد آئندہ بننے والے پارکوں اور راؤنڈ اباؤٹس میں چہل قدمی کی جاتی تھی۔ ہر رات گیدڑ ویرانوں میں بولتے تھے۔ ہم الوؤں کی چڑ چڑ سنا کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے چوکیداروں کی تحفظ دلاتی ہوئی صداؤں کو سنتے ہوئے سوتے ''خبردار ہو!''

وہاں حکومتی میٹریل بہت بڑی مقدار میں بچا پڑا تھا جو ٹھیکیداروں نے اپنی ذاتی جائیدادوں میں استعمال کرلیا۔ انہوں نے اپنے گھر تعمیر کرنے کیلئے جنتر منتر روڈ پر تین تین ایکڑ کے متصل پلاٹ خرید لیے۔ وہ سب سکھ تھے۔ اگرچہ وہ پنجاب کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تھے اور دہلی آمد سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے تاہم وہ ایک ہی خاندان کے افراد بن گئے۔ وہاں نہ تو مواقع کا کال تھا اور نہ ہی ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کی ضرورت تھی۔ جنتر منتر روڈ امیر سکھ ٹھیکیداروں کی کالونی بن گیا۔ خود میرے باپ نے ایک دو منزلہ

مکان تعمیر کرایا۔ پچھواڑے میں کلرکوں اور ملازمین کے کوارٹر‘ گائے بھینسوں کے لیے شیڈز اور اس کی فٹن کھینچنے والے گھوڑوں کے لیے اصطبل اور دو گیراج تھے۔ گھر کے بیرونی دروازے کے قریب اس نے مہمانوں کے لیے دو کمروں پر مشتمل دفتر کے لیے ایک انیکسی تعمیر کروائی۔ سامنے سنگِ مرمر کے فوارے والا بڑا باغ تھا۔ وہاں ایک طرف ٹینس کورٹ اور دوسری طرف پھلوں اور سبزیوں کا باغ تھا۔ اس نے اپنے پھولوں کی کاشت کے ذوق کی تسکین کے لیے کلکتہ اور بمبئی سے بیج منگوائے۔ اُسے گلابوں کا جنون تھا اور اس نے پورٹیکو سے ہو کر گزرنے والی داخلی دروازے سے بیرونی دروازے تک جانے والی سڑک کے کناروں پر کئی غیر ملکی قسمیں کیاریوں میں اگائی ہوئی تھیں۔ دوسرے ٹھیکیداروں نے بھی مساوی طور پر بڑے بڑے گھر تعمیر کرائے تھے۔ ایک شخص دھرم سنگھ سیٹھی نے‘ جو ڈھول پور سے سنگِ مرمر‘ گرینائٹ اور بھربھرے پتھر کی فراہمی پر اجارہ داری رکھتا تھا‘ پتھر اور سنگِ مرمر کا سب سے بڑا گھر تعمیر کرایا۔ آج کل اس میں کانگرس سمیت بہت سی سیاسی جماعتوں کے دفتر قائم ہیں۔ بلاشبہ نئے شہر میں ہمارا گھر ڈیزائن اور نہایت پر کشش باغات کی وجہ سے سب سے اچھا تھا۔ میرے والد نے فخر کے ساتھ اسے نام دیا تھا: بیکنٹھ ــــ جنت۔ برسوں بعد اس نے جن پتھ اور البوقرق روڈ (اب تیس جنوری مارگ) کے مقام اتصال پر ایک زیادہ بڑا اور زیادہ پر کشش گھر بنایا۔ اس نے اسے بیکنٹھ کا نام دے دیا۔ اصل جنت جہاں میں نے اپنے سکول کے برسوں کا بیشتر حصہ گزارا ٹراونکور کے مہاراجا کو فروخت کر دی گئی۔ جب وہ اپنی ریاست سے محروم ہوا تو یہ ریاست کیرالہ کی حکومت کا گیسٹ ہاؤس بن گئی۔

میرے خاندان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے زیادہ تبدیلیاں میرے ذہن اور جسم میں برپا ہوئیں۔ میں ایک دادی کے دلدادہ سے پروان چڑھ کر جنس سے مخبوط بالغ بن گیا۔ اس ارتقاء کو باورچی خانے میں کام کرنے والے لڑکوں (منڈوں) نے تیز کر دیا۔ وہ قریباً ایک ہی عمروں کے تھے اور ایک سی ہی جسمانی تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے سیکھا کہ ہم کس طرح اپنے اپنے عضوِ تناسل سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ جب ایک کزن لڑکی سردیوں کی چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارنے کے لیے آئی تو اسے میرے ساتھ میرے بستر کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی اس لیے کہ ہم چھوٹے بچے تھے اور ''بہن بھائی'' جیسے تھے۔ میں نیند میں ہونے کا دکھاوا کرتے ہوئے اس کا پاجامہ اتار دیتا‘ وہ بھی میری حرکتوں کے دوران میں سوئے ہوئے ہونے کی بناوٹ کرتی تھی۔ ہم دونوں ہی کو اس کام کا دھندلا سا خیال بھی نہیں تھا جو کہ بالغ مرد اور عورت اکٹھے سوتے ہوئے کرتے ہیں تاہم ہمیں ایک دوسرے کو

بھینچنا بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ مجھ میں عورت کو ننگا دیکھنے کی زوردار خواہش پروان چڑھ چکی تھی۔ اکثر بگاڑی عورتیں ایک کلرک کے صحن میں نہانے کے لیے آیا کرتی تھیں جہاں ایک دستی نلکا (ہینڈ پمپ) نصب تھا۔ میں ایک نیم کے درخت پر چڑھ جایا کرتا تھا اور اپنے ٹھکانے سے انہیں اپنی چھاتیوں پر صابن ملتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا' وہ اپنے آپ کو پوری طرح ننگا نہیں کیا کرتی تھیں۔ جب کبھی رشتہ داروں نے دہلی ریلوے سٹیشن سے شام کی گاڑی پکڑنا ہوتی تو میں انہیں الوداع کرنے جاتا تھا۔ فٹن پر سوار ہو کر چوڑی بازار اور اجمیری گیٹ کے راستے واپسی کے دوران میں مجھے بازار کے دونوں طرف بنی بالکونیوں میں کھڑی طوائفوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے کا موقع ملتا۔ ایک مرتبہ مجھے ایک عورت نے نوازا جس نے مجھے آنکھ ماری اور ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ میں کئی راتیں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بارہ برس کی عمر تک مجھے نہیں پتا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی عمل کس طرح ہوتا ہے۔ ایک چاندنی رات کو ہم صحن میں ساتھ ساتھ بچھی ہوئی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ میرا باپ کلب سے گھر آیا' اس نے اپنا تہمد تبدیل کیا اور میری ماں کے بستر کی طرف گیا۔ میں نے اس کا احتجاج سنا: ''کہیں بچے نہ جاگ جائیں!'' واضح طور پر اُس نے بہت زیادہ پی ہوئی تھی۔ اس نے بیوی کی تنبیہ کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے اُسے اپنا تہمد اٹھاتے اور اس کے اوپر لیٹے ہوئے' چند ایک مرتبہ اوپر نیچے گھسے لگاتے اور ڈھیر سا ہوتے ہوئے دیکھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے سوائے اس کے کہ وہ کام اچھا نہیں تھا۔ میرا ذہن کئی روز گڑبڑایا رہا اور میں اُس سے بات نہیں کر سکا۔

میاں چنوں میں ہماری گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں ہم سے عمر میں چند برس بڑے نوجوان لڑکے نے اپنے سکول کی لواطت کی کہانیاں سنا سنا کر ہمارے دلوں کو ورغلا لیا۔ معشوق ہمیشہ ایک خوبصورت لڑکا ہوتا تھا جس کے عمدہ گول گول کولہے ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں جنس کے لیے زنانہ اوصاف والے لڑکوں سے لواطت ہوا کرتی تھی۔ عورتیں کس لیے ہوتی تھیں؟ اس نے ہمیں بتایا کہ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر تم کسی عورت سے لواطت کرو گے تو وہ حاملہ ہو جائے گی۔ چودہ برس کی عمر تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ کسی بالغ عورت کے جنسی اعضاء کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں نے دیکھے' یہ ایک ایل فریسکو ڈنر کا موقع تھا جو ورانا سی کے ایک پروفیسر کے باغ کے لان میں ماڈرنائٹس (ماڈرن سکول میں تعلیم پائے ہوؤں) کو دیا گیا تھا۔ مجھے ایک صف کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملا جس میں ہماری سینئر ٹیچرز میں سے ایک

درمیان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جونہی وہ گھاس پر جھکی اس کی ساری اٹھ گئی اور اس کی رانوں کے درمیان کوئی بہت بالوں والی شے نمایاں ہوگئی۔ میں تو دہل کر رہ گیا تھا۔

ماڈرن سکول سے میٹریکولیشن کا امتحان دینے کے بعد سکول چھوڑا تو میرا ذہن لڑکوں سے ہٹ کر لڑکیوں کی طرف راغب ہوا۔ مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا۔ میں بولنے اور حرکت کرنے کی توانائی سے محروم ہوگیا تھا۔ میری دیکھ بھال کے لیے ایک نوجوان لڑکی کو رکھا گیا۔ مجھے اس کے بارے میں جو کچھ یاد پڑتا ہے یہی ہے کہ وہ بہت کالی تھی' کمزور کاٹھی کی تھی' اس کی چھاتیاں چھوٹی اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ ہر چند گھنٹوں بعد میرا درجۂ حرارت (ٹمپریچر) لینے اور مجھے دوائیں دینے کے علاوہ وہ صبحوں میں میری صفائی بھی کرتی تھی۔ صفائی کے ان اوقات کے دوران میں ایسا ہوا کہ وہ رغبت کے ساتھ میرا عضوِ تناسل اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتی اور اُسے چوم لیتی۔ ''تمہارے چھوٹے سے ''پودنی'' کے اردگرد بال اگنا شروع ہو گئے ہیں۔ جلد ہی تم آدمی بن جاؤ گے اور یہ بڑا اور مضبوط ہو جائے گا۔'' میں اُسے سن تو سکتا تھا لیکن جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ میرے نحیف ہاتھوں کو بھی تھام لیتی اور ان سے اپنی چھاتیاں مسلتی تھی۔ میں سنسنی کو پسند تو کرتا تھا لیکن ان پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں اس کی حرکتوں پر ردعمل کرنے اور کچھ بڑبڑانے کے قابل ہوگیا تو اس کو سبک دوش کر دیا گیا۔ اس نوجوان عورت نے' جس کے نام سے میں کبھی آگاہ نہیں ہوسکا' میرے خیالات کا رُخ محبت اور شہوت کے لیے عورت کی طرف پھیر دیا تھا۔ اس وقت سے مجھے یقین نہیں ہے کہ عورت جنس کے لیے مرد جتنی خواہش مند ہوتی ہے تاہم میرا خیال تھا کہ وہ ایسا صرف اپنے مردوں کو خوش کرنے کے لیے کرتی ہیں۔ میرے سکول کے دن تمام ہوئے۔

❁ ❁ ❁

تیسرا باب

دہلی اور لاہور میں کالج کا زمانہ

میٹریکولیشن کا نتیجہ آنے کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے سینٹ سٹیفن کالج میں داخلے کے لیے درخواست جمع کروا دی۔ وہ اس وقت بھی' آج کی طرح' دہلی کا سب سے باوقار کالج تھا۔ اس زمانے میں داخلے اتنے دشوار نہیں ہوا کرتے تھے جتنے چند برس بعد ہوگئے۔ ماڈرن سکول کے لڑکوں کو' خوش حال خاندانوں سے آئے ہونے اور دوسروں کی نسبت انگریزی پر بہتر دسترس کی وجہ سے بخوشی داخلہ دے دیا جاتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں جس بات پر متفکر تھا وہ یہ تھی کہ نئے داخل ہونے والوں کی گت بنائی جاتی تھی۔ اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ برطانوی یونیورسٹیوں کی بہترین روایات میں سے تھی اور اسے ان لڑکوں کو سیدھا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اپنے بارے میں رنگ برنگے تصورات کے حامل ہوتے تھے۔ ان میں کچھ تو بے ضرر ہوتی تھیں لیکن بالکل احمقانہ: نوواردوں سے گانا گانے یا رقص کرنے کا کہنا۔ یا اس نوع کے اشتہار اٹھوانا کہ ''میں فرسٹ ایئر فول ہوں۔'' اگر نیا داخل ہونے والا مزاحمت کرتا تو اس کے ساتھ بے ہودگی کی جاتی۔ ہاسٹلوں میں نئے لڑکوں کو اکثر تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا جاتا۔ مثلاً ان سے کپڑے اتروائے جاتے اور مشت زنی کروائی جاتی۔ ایسی مثالیں بھی تھیں کہ زنانہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ لواطت کی گئی۔ میں لمبی بیماری کی وجہ سے پہلی ٹرم ضائع ہوجانے کے باعث رگڑے سے بچ گیا۔

اس زمانے میں ٹائیفائیڈ کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں تھی۔ یہ تشخیص کرنے کے لیے کہ تمہیں کس قسم کا بخار ہے خون' تھوک یا دیگر ٹیسٹوں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جو واحد دوا تجویز کی جاتی تھی وہ ایک بدبودار تلخ جوشاندہ تھی۔ ٹھوس غذا کی ممانعت ہوجاتی تھی۔ اس کو میعادی بخاروں میں سے ایک قسم کے بخار کے طور پر جانا جاتا تھا جو گیارہ یا بائیس دن پر محیط ہوتا تھا۔ مجھے دو مرتبہ ٹائیفائیڈ ہوا۔ دوسری مرتبہ بیمار ہوجانے پر ڈاکٹروں نے اپنے سر ہلائے اور تبصرہ کیا کہ میری قسمت عظیم گرو کے ہاتھوں میں ہے۔ میں کوما میں چلا گیا۔ میرے والدین چاول' آٹے' گھی اور چینی سے بھری طشتریاں مجھے چھو کر فقیروں کو دیتے تھے۔ انہوں نے میری

دیکھ بھال کے لیے دن اور رات کام کرنے والی نرس رکھ لی۔ جب مجھے زندہ رکھنے کی جنگ ہاری جاتی ہوئی دکھائی پڑنے لگی تو میری دادی کو بلا بھیجا گیا جو اس وقت میرے چچا کے ہاں میاں چنوں میں قیام پذیر تھی۔

جب وہ پہنچی تو مجھے اس کی موجودگی کا مبہم سا ادراک ہوا۔ اس نے میرے علاج کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس نے میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ ایک رنگ دار دھاگہ باندھ دیا۔ پھر اُس نے گرو ارجن کی مناجات ''سکھ منی'' الاپنا شروع کر دی۔ سارا دن اور رات گئے تک ایسا ہی جاری رہا۔ وہ اسی کمرے میں سوئی اور اگلی صبح دوبارہ مناجات پڑھنے لگی۔ سہ پہر تک میں کوما سے باہر آ چکا تھا۔ شام تک بخار نے پُراسرار طور پر مجھے چھوڑ دیا۔ یا ہو سکتا ہے یہ اتفاق ہی ہو: دوسرے بائیس دنوں کی میعاد ختم ہو گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ میں زمین پر پاؤں دھر سکتا' میری شوخی لوٹ آئی۔ میں سونے کا دکھاوا کرتا' جب میرے منہ سے تھرمامیٹر پھسل جاتا اور ڈاکٹر میری نبض جانچنے کے لیے میری کلائی تھام لیتا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے میں کہنی کے نیچے خاموشی سے نبض کو دبا دیتا تاکہ بازو کے نیچے اس کا بہاؤ رک جائے۔ ڈاکٹر بدحواسی کے ساتھ میری نبض ڈھونڈتا پھر میرے پپوٹے الٹ کر دیکھتا کہ میری آنکھوں میں زندگی ہے۔ میں اسے حوصلہ بخش مسکراہٹ سے نوازتا۔ ان تین مہینوں میں' جو میں نے بستر پر لیٹے ہوئے گزارے' میرا قد تین انچ لمبا ہو گیا تاہم میرا جگر ہمیشہ کے لیے کمزور ہو گیا۔ اس وقت سے سوتے ہوئے میرے منہ سے رال ٹپکتی ہے اور اخراج کرتے ہوئے آنتوں کو تحریک دینی پڑتی ہے۔ جلاب' مسہل اور انیما میری روزمرہ زندگی کا جزو بن گئے۔

میں نے پہاڑیوں میں ایک لمبا عرصہ افاقہ یابی کی حالت میں گزارا۔ لوگوں کا اپنے بارے میں پریشان ہونا اور میری خواہش کے مطابق عمل کرنے کا شائق ہونا بہت خوش گوار لگتا تھا۔ میں نے شملہ میں اپنے چچا اور اس کی دوسری بیوی کے ساتھ دو مہینے گزارے۔ میرے چچا کی بیوی ایک من موہنی' کنول کی سی آنکھوں والی عورت تھی جو تصویر اتارے جانے کی حد تک دلکش تھی۔ میں بھلا چنگا ہو گیا۔ میں نے جاکوہل کے گرد چکر لگا کر مال پر ختم ہونے والی لمبی چہل قدمی شروع کر دی۔ تب وہ دو اعلیٰ درجے کے ریستورانوں کے بیچ انتہائی مسحور کن روشن کھڑکیوں والا نصف میل تھا' ایک سرے پر ڈیویکوز تھا اور دوسرے پر وینگر۔ مرکز میں' جہاں چار سڑکیں ایک دوسری کو قطع کرتی ہوئی گزرتی تھیں' سکینڈل پوائنٹ تھا' چاہت کی ملاقاتوں کا مقام۔ یہاں آپس میں گپ شپ کرنے والے لوگ جمع ہوتے اور لوگ خوبصورت عورتوں کو پیار بھری نظروں سے تکتے اور ان کے پیچھے رہ جانے والے خوشبو

دار ہوا کو مشام جاں میں بسا لیتے تھے۔ تم سینئر انگریز افسروں' پنجاب کے گورنر' کمانڈر انچیف اور دوسروں کو چہل قدمی کرتے ہوئے یا گیئٹی تھیٹر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ تم ہر شام پنجاب کے طویل القامت' خوبصورت سر خضر حیات ٹوانہ کو اپنی کلغی دار پگڑی باندھے رکشا پر' جسے باوردی اردلی کھینچ رہے ہوتے تھے' سوار جاتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ خود کو مال سے گھر کی طرف دور لے جانا مشکل تھا۔

شملہ میں گرمیوں کے ان مہینوں نے مجھے ہمالیہ کی خوبصورتی سے آگاہ کروایا۔ میں نے شعر کہنا شروع کر دیئے ـــــ بہت ناقص شعر۔ میں نے ستار بجانا سیکھا ہوا تھا۔ میں سخت اداسی کے ساتھ خواہشمند تھا کہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں۔ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ کس سے اور کس عمر والی سے فقط اسے عورت ہونا چاہیے تھا۔ چونکہ میں اپنی محبت کا جواب دینے والی کسی کو نہیں پا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے امرتسر کی ایک لڑکی کو محبت نامے لکھنا شروع کر دیئے' جس کے والدین نے پڑوس والا بنگلہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔

میں دہلی واپس آیا اور سینٹ سٹیفن کالج میں دوسری ٹرم میں شامل ہو گیا۔ رگڑے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے انگریزی ادب' تاریخ' فلسفے اور معاشیات کے لیے مجوزہ کتابیں حاصل کیں۔ وہ سب سے زیادہ مقبول مضامین ہوتے تھے کیونکہ وہ امتحانات میں پاس ہونے کے حوالے سے آسان ترین تھے۔ میں بائبل کلاسز میں بھی حاضر ہوا کرتا تھا' جہاں حاضری لازمی نہیں تھی: میں وہاں اپنے عیسائی پروفیسروں خصوصاً کے۔ ایم۔ سرکانہ کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے جایا کرتا تھا' جو ہمیں انگریزی ادب پڑھایا کرتا تھا۔ اس کا زور نئے عہدنامے (The New Testament) پر ہوتا تھا۔ میں نے پرانے عہدنامے (The Old Testament) کو اس کے الفاظ کی بلند آہنگی اور اثر آفرینی کی وجہ سے زیادہ دلچسپ پایا۔ میں نے ''سلیمانؑ کے گیتوں'' اور ''حمدوں'' کے کئی ٹکڑوں کو یاد کر لیا تھا۔ ''کتابِ ایوبؑ'' (The Book of Job) میری پسندیدہ ترین کتاب بن گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی شخص کو اچھی نثر لکھنے کے لیے بائبل اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ کی پریوں کی کہانیوں' نرسری کی نظموں اور حتیٰ کہ ایڈورڈ لیئر کی بے تکی تُکموں جیسی بکواسیات تک سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ میں نے انہیں تفریح کے لیے نہیں بلکہ ادب کی اساسیات کے طور پر پڑھا۔

میری خوش حالی' کھلے جیب خرچ اور اس حقیقت نے کہ اپنے بڑے بھائی کی طرح میرے پاس بھی کالج جانے کے لیے موٹر سائیکل تھی' میرے ان ہم جماعتوں کو میرے پیچھے لگوا دیا جو کہ مفت لیمونیڈ پینا اور چکن پیٹیز کھانا اور میری اے۔ جے۔ ایس پر سواری کرنے کے شائق تھے۔ انہی کے بیچ ای۔ این منگت رائے بھی تھا جس نے بعد میں میری زندگی میں ایک

بہت بے جا مداخلت کرنے والا کردار ادا کرتا تھا۔

اس کا پورا نام ایڈورڈ نرمل منکت رائے تھا۔ وہ ایک پنجابی ہندو باپ' جو عیسائی ہو گیا تھا اور ایک بنگالی عیسائی ماں کا تیسرا بچہ اور دوسرا بیٹا تھا۔ باپ حکومتی ملازمت کرتا تھا اور اس کا کیریئر انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت پر اختتام پذیر ہوا۔ تمام منکت رائے بچے قبول صورت اور مغربیت پذیر (Westernized) تھے۔ سب سے بڑی پری او بالا کالج پروفیسر بن گئی اور کنیئرڈ کالج لاہور کی پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی۔ اس نے کنوارا رہنا ہی منتخب کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد کا زمانہ ایڈن برگ میں گزارا۔ دوسرا' چارلس فوج میں چلا گیا' اس نے ایک امریکی عورت سے شادی کی اور بریگیڈیئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ وہ کینیڈا میں سکونت پذیر تھا۔ یوگا ٹیچر تھا اور اپنی بیوی کی وفات کے بعد اُس نے اپنے سے بہت کم عمر کینیڈین لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ ایڈورڈ نرمل تیسرا تھا۔ تیسری' شیلا ایک چھوٹے قد والی چیری بلاسم حسینہ تھی جس نے آئی سی ایس کے آرتھر ایس لال کے ساتھ تباہ کن شادی کر لی تھی۔ اس نے اسے ایک بیٹی ٹو کی دی تھی جو تیس کے پیٹے میں کیلی فورنیا میں کینسر سے مر گئی۔ آرتھر کو طلاق دینے کے بعد شیلا بوتل اور منشیات پر لگ گئی۔ کولو میں واقع اپنے سیب کے باغ کی دیکھ بھال کے لیے ہندوستان واپسی سے پہلے وہ محبت کرنے والوں کی قطار کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے اس کے اپنے ہی نوکروں نے قتل کر دیا۔ میں نے سارے منکت رایوں اور لالوں کو بیان کر دیا ہے کیونکہ وہ سب مختلف ادوار میں میری زندگی میں دوبارہ نمودار ہوئے تھے۔

ای۔ این' جیسا کہ میں اُسے کہتا ہوں' اور ہم جونہی ملے میری اس سے خوب نبھے گی۔ اگرچہ وہ لمبا تھا تاہم وہ تھوڑا زنانہ سا تھا۔ زنانے لڑکے میری طرف کھنچے چلے آتے تھے شاید میری عجیب اور اکھڑ مگر صدق دلانہ ظاہری وضع قطع کی وجہ سے۔ جن چیزوں نے مجھے ابتدأ ای این کی طرف راغب کیا تھا وہ تھیں اس کی تعلیمی کامیابیاں اور اس کا غیر روایتی پن۔ وہ جماعت کا بہترین طالب علم تھا اور عمومی طور پر ٹرم امتحانوں میں تمام مضامین میں اعلیٰ درجوں (ٹاپ پوزیشنوں) پر آتا تھا۔ سالانہ انعامات کی تقسیم کے دن اس کی حاصل کردہ کتابوں اور کپوں کا ایک متاثر کن ڈھیر بن جایا کرتا تھا۔ وہ اچھی گفتگو کرنے والا بھی تھا۔ وہ ہر مفروضے اور تسلیم شدہ مذہبی شعائر اور سماجی اصولوں پر سوال اٹھایا کرتا تھا۔ اس نے روایتی تصورات کے تحت پروان چڑھنے والے لڑکوں کے ذہنوں سے جالے صاف کیے تھے اور تعریف کرنے والوں کی بڑی تعداد حاصل کر لی تھی جن میں ایک میں تھا۔ ہم اسی کی طرح بحث کا آغاز کرتے اور اس کی گفتگو کے انداز کی نقل کرتے تھے۔ چونکہ اس نے میری دوستی کو ترجیح دی تھی اس لیے دوسرے لڑکے میری خوشامد کیا کرتے تھے۔ جماعت میں اور کھیل کے میدان میں ہم ہمیشہ

اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ اکثر ہفتہ وار تعطیلات میرے گھر پر گزارتا تھا۔ غلط طور پر فرض کر لیا گیا تھا کہ ہمارا تعلق غیر فطری ہے۔ تاہم پرنسپل ایس۔ این۔ مکھر جی نے افواہوں پر کان دھرے اور رائے کو چھٹیوں میں ہاسٹل چھوڑنے سے منع کر دیا۔

سینٹ سٹیفن کالج کے دو برسوں نے مجھ پر ایک ایسا ہندوستان منکشف کر دیا جس کو میں ماڈرن سکول کی محصور فضا میں نہیں جان پایا تھا۔ ادھر عجیب ناموں والے لوگ ہوتے تھے مثلاً سرکار جس کا مطلب ہوتا ہے حکومت۔ باوجود اس کے کہ میں نے اپنی زندگی کے چند ابتدائی برس مسلمانوں کے غلبے والی بستی میں بسر کیے تھے اور اپنے اردو کے استاد مولوی شفیق الرحمٰن کا معترف ہونے کے باوجود مجھے یہ دریافت کر کے اذیت ہوئی کہ کالج کے زیادہ تر مسلمان اپنے آپ کو دوسرے ہندوستانیوں سے جدا کمیونٹی تصور کرتے ہیں۔ اس زمانے میں قوم پرست تحریک عروج پر تھی۔ گاندھی مہاتما بن چکا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت اور کچھ عیسائیوں کے سوا سب اسے ہندوستان کا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ سینٹ سٹیفن کالج میں میرے دوسرے برس کے دوران میں تین انقلابیوں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ سزا کے خلاف احتجاج کے طور پر سارے ہندوستان کے سکول اور کالج بند کر دیئے گئے۔ سینٹ سٹیفن بند نہیں ہوا۔ صبح کی اسمبلی کے بعد میں نے اور ایک دوسرے لڑکے نے نعرہ لگایا ''بھگت سنگھ، زندہ باد۔'' ہم نے سینٹ سٹیفن کالج کے علامتی نشان سرخ صلیب اور کالج کے ماٹو ''خداوند کی شان کے لیے'' کی جگہ کالج کے جھنڈا لہرانے والے کھمبے پر ہندوستانی ترنگا لہرا دیا۔ ہمیں مونک نامی انگریز عارضی پرنسپل نے اپنے دفتر میں بلوا بھیجا۔ اس نے ہمیں ڈانٹا ڈپٹا اور تنبیہ کی کہ اگر ہم نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو ہمیں کالج سے نکال دیا جائے گا۔ میں نے مونک سے خود پر قابو پانے کا وعدہ کیا اور اس سے التجا کی کہ میرے بارے میں میرے باپ کو رپورٹ نہیں دی جائے۔

ایک واقعہ جو کئی برس تک میرے ذہن میں کھٹکتا رہا اس وقت رونما ہوا جب میں اپنے چچا اور چچی کے ساتھ شملہ میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ وہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کا رکن تھا اور وزیر یا نائب وزیر بنائے جانے کا بے حد مشتاق تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی وکالت کے لیے گورنر، وزیر اعلیٰ اور پنجاب کابینہ کے دوسرے ارکان سے ملاقاتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ بلاشبہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ قابل سکھ سیاست دان تھا لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ باوجود ایک بڑا زمیندار ہونے کے، وہ ایک جٹ زراعت کار کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں پنجاب کی سیاست جٹ اساس (Jat Oriented) ہوا کرتی تھی۔ واحد غیر جٹ وزیر ایک ہندو تھا، سکھ وزیر سر سندر سنگھ مجیٹھیا ایک اشرافی تصنع والا جٹ تھا۔ میرے

چچا نے مال اور لکڑ بازار کے درمیان واقع ایک سینما گھر کے اوپر نئی حاصل کردہ عمارت کی خوشی میں ڈیویکوز میں ایک بڑی ٹی پارٹی کا اہتمام کیا۔ شملہ سوسائٹی کے اشراف میں سے تین چار سو لوگوں بشمول پنجاب حکومت کے وزیروں کے موجود تھے۔ میں اس زمانے میں آٹوگراف اکٹھے کرنے کا شائق ہوا کرتا تھا اور میری البم میں دوسروں کے علاوہ جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو کے دستخط موجود تھے۔ میں بھگت سنگھ کے دستخط حاصل نہیں کر سکا تھا اسی لیے میں نے ایک صفحے پر اس نوجوان کی ایک تصویر چسپاں کر رکھی تھی۔ میں ٹی پارٹی میں معروف لوگوں سے دستخط لیتا پھر رہا تھا۔ وہ بغیر کسی تبصرے کے ایسا کر دیتے تھے۔ سب سے آخر میں میں سر سندر سنگھ مجیٹھیا کے پاس گیا۔ اس نے میری البم کے صفحے الٹ کر یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ کن کن لوگوں کے دستخط میں لے چکا ہوں اور بھگت سنگھ کی تصویر تک پہنچ گیا۔

''تم نے اس شخص کی تصویر یہاں کیوں لگا رکھی ہے؟'' اُس نے غصے سے پوچھا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ میرا ہیرو ہے۔'' میں نے بغیر کسی مرعوبیت کے جواب دیا تھا۔ ''ہیرو!'' نائٹ نے حقارت کے ساتھ کہا: ''وہ تو غدار ہے۔'' (بھگت سنگھ' ایک سکھ نے اپنے لمبے بال کٹوا دیئے تھے اور ڈاڑھی کی شیو کروا دی تھی) ''میں اپنا نام ایسی البم میں درج نہیں کروں گا جس میں ایک غدار کی تصویر موجود ہے۔'' اس نے چلا کر کہا تھا۔ پھر اس نے میری البم ہال کے پار پھینک دی۔ میں دہل کر رہ گیا اور رونے لگا۔ سیوا سنگھ اور اس کی بیوی جو میرے والد کے دوست تھے الٹ کر مجیٹھیا پر چلائے: ''تمہیں اس لڑکے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ اسے بھگت سنگھ کی تحسین کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم سب اس کی تحسین کرتے ہیں۔'' مجیٹھیا تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ پارٹی مضحکہ خیز ناکامی سے دوچار ہوگئی تھی۔ میرے چچا اور چچی کی پریشانی سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے کبھی سر سندر سنگھ مجیٹھیا کو اس کے غیر مہذبانہ رویئے پر معاف نہیں کیا۔۔۔ نہ ہی اس کے بیٹوں اور پوتوں کی طرف سے دوستی کے اشاروں کا جواب تک دیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سوائے ایک لڑکے کے جو گاندھی ٹوپی اور کھادی پہنتا تھا' دوسرے سرخ ترکی ٹوپی کو ترجیح دیتے اور ممتاز مسلم لباس پہنتے تھے۔ وہ قوم پرستی کی زبان نہیں بولتے تھے۔ سٹاف میں تاریخ کا ایک پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھا جو مستقل طور پر اپنے اسلامی ورثے کا راگ الاپتا رہتا تھا اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کی حمایت کرتا تھا۔ وہ سب سے پہلے پاکستان ہجرت کرنے والوں میں شامل تھا اور بعد میں اس کا وزیر تعلیم بنا۔ مسلمانوں کے اس علیحدگی کے احساس نے مجھے اداس کر دیا۔ میں نے انہیں دوست بنانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میں تھوڑا ہی کامیاب ہوا۔

یہ کہنا بالکل درست نہیں ہے کہ میں نے کوئی مسلمان دوست نہیں بنایا۔ ایک بہت پرمسرت اور مکمل طور پر غیر متوقع تحفہ میری بہن کے ذریعے ملا جو کہ اس وقت لیڈی اروِن کالج برائے خواتین میں پڑھ رہی تھی۔ وہ حیدرآباد کی ایک مسلمان لڑکی غیورالنسا حفیظ کی دوست بن گئی تھی۔ وہ اسے اتواروں کو چائے پر بلاتی تھی۔ پہلی مرتبہ وہ برقعہ اوڑھ کر آئی اور میری بہن کو اسے قائل کرنا پڑا کہ ہمارے گھر میں تو وہ اسے اتار دے۔ وہ ایک نازک سی، زرد رنگت والی لڑکی تھی جس کے بال گھنگھریالے، ہلکے بھورے تھے۔ پردے کے باوجود وہ ہمارے گھر میں خود سے ملنے والے لڑکوں کے ساتھ گفتگو اور برتاؤ میں بہت شوخ تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا۔ مجھے یہ بھی ادراک ہوا کہ ہمارے درمیان مذہب کے پیدا کردہ فاصلے کی وجہ سے مجھے اس کی قربت حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں۔ جبکہ میں صرف اسی بات پر بے حد خوش تھا کہ میں ایک مسلمان لڑکی کو اپنی دوست تو کہہ سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ بہادر (Bold) تھی۔ ایک شام میری بہن اور میں اسے فلم دکھانے کے لیے لے گئے۔ روشنیاں مدھم پڑنے تک وہ برقعہ اوڑھے رہی۔ میں دونوں لڑکیوں کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی فلم شروع ہوئی میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنا ہاتھ نرمی کے ساتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے تو مجھے یقین نہیں آیا کہ کیا اس کو پتہ ہے کہ اس کا ہاتھ کہاں بھٹک گیا ہے یا اس نے برضا و رغبت اسے رکھا ہے۔ میرے شبہات ختم کرنے کے لیے اس نے میرا ہاتھ نرمی سے دبایا اور اپنی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنسا لیں۔ جوش اور خوشی سے میں بدحواس سا ہوگیا اور فلم میں ساری دلچسپی کھو بیٹھا۔ وقفے (انٹرول) میں جب میری بہن کی توجہ کسی اور طرف تھی، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اسے لکھ سکتا ہوں اور اسے باہر لے جا سکتا ہوں۔ اس نے اپنا سر ہلایا۔ وہ بولی: ''مجھے تمہاری بہن کے ساتھ جانے کی اجازت ہے۔ تم مجھے لے جانے اور واپس چھوڑنے کے لیے آسکتے ہو۔''

میری بہن کو پتہ بھی نہیں تھا، میں نے اس کی سہیلی کو ہر اتوار کی سہ پہر اس کے گھر سے لینا اور لمبی ڈرائیو پر باہر لے جانا شروع کردیا۔ اس وقت میرے باپ کے پاس دو کاریں تھیں: ایک نئی اس کے اپنے استعمال کے لیے اور ایک پرانی فیاٹ خاندان کے استعمال کے لیے۔ اس فیاٹ میں کلچ کے قریب ایک لیور تھا جس کو گھما کر آف کیا جا سکتا تھا تا کہ پٹرول کا بہاؤ کاربوریٹر کی طرف بند ہو جائے۔ اپنے بائیں ہاتھ سے میں اس کے ہاتھ کو تھاما کرتا تھا جبکہ دایاں ہاتھ سٹیئرنگ وہیل پر ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھے مزید آزادیاں نہیں دیا کرتی تھی۔ ایک روز میں نے پہاڑی سلسلے کے ایک تنہا مقام پر لیور کو آف کردیا اس امید میں کہ میں اسے اپنی بانہوں میں کھینچ سکوں گا۔ وہ اس قسم کی ترکیبوں سے واقف تھی، اس نے لیور آن کردیا۔ اس

نے مجھے تنبیہ کی ''اگر تم ضبط نہیں کرو گے تو میں تمہیں دوبارہ نہیں ملوں گی۔'' میں غیور کو لاہور اور انگلینڈ سے محبت نامے لکھنے سے زیادہ اس کے قریب نہ آ سکا۔ ایسے خط تو میں دوسری لڑکیوں کو بھی اسی طرح لکھا کرتا تھا۔

تیس سے زیادہ برسوں کے بعد غیور میری زندگی میں واپس آئی' ایک بار پھر میری بہن کے ذریعے' جو کہ اب بھی لاعلم تھی کہ اس کی پیٹھ پیچھے ہمارے درمیان کیا ہو چکا تھا۔ تب تک غیور دو خاوندوں کو ان کی قبروں تک دیکھ چکی تھی اور اٹھارہ برس کی ایک پیاری سی لڑکی فریسہ کی ماں تھی جو اپنی ماں کی طرح اسی کالج لیڈی اروِن میں پڑھتی تھی۔ غیور نے مجھے اپنا مقامی سرپرست مقرر کر دیا۔ فریسہ اپنی ماں کی طرح ڈھل گئی تھی۔ کئی موقعوں پر اس نے اپنے مقامی سرپرست سے ملنے کا کہہ کر کالج چھوڑا اور میرے گھر آنے کی بجائے وہ پارٹی منانے باہر چلی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے بغیر کسی مسئلے کے یہ خط لکھوا لیتی کہ اس نے دن ہمارے ساتھ گزارا ہے۔

غیور 80 کے پیٹے میں بھی میری دوست رہی۔ جب بھی میں حیدر آباد جاتا تھا' میں ہر مرتبہ فالتو وقت اسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ غیور کی میرے ساتھ انسیت ہی نے مجھے مسلمانوں سے گرم جوش محبت کرنے والا بنا دیا۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمان کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر تم کسی کمیونٹی سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس سے تعلق رکھنے والے عورت یا مرد کی محبت میں مبتلا ہو جاؤ۔

میں تحریکِ آزادی میں ہندوستانی عیسائیوں کی عدم شرکت کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ میرے متعصب ذہن کے مطابق ان میں سے اکثر لوگ نچلی ذاتوں سے مذہب تبدیل کر کے عیسائی بنے ہیں۔ ہم ان کے اختیار کردہ برطانوی ہندوستانی ناموں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مثلاً رابرٹ مسیح' ہربرٹ مر یا اس معاملے میں ایڈورڈ نرل۔ برطانوی حکمرانوں سے ان کی مشابہت اختیار کرنے کی کوششیں مضحکہ خیز ہو سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب میں نے بادشاہ کی سالگرہ کے دن کالج کی عمارت پر لہرانے والے یونین جیک کے حوالے سے اہانت آمیز تبصرہ کیا تو بٹالہ سے آئے ہوئے ایک پنجابی عیسائی ہربرٹ مر نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''ہم تمہارا اپنا پرچم لہرانا برا محسوس نہیں کرتے ہیں' تمہیں سال میں ایک بار ہمارے اپنا پرچم لہرانے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔'' منگت رائے اس موضوع پر مضبوط رائے کا حامل نہیں تھا ایک حکومتی ملازم کا بیٹا ہونے اور آگے بڑھنے کی اپنی ذاتی خواہشات کے سبب سے وہ کبھی ''سوراج (آزادی) کے حق یا مخالفت'' کی بحث میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا۔

سینٹ سٹیفن کالج کے دو برسوں میں میں نے کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا۔ میں بس

امتحانات میں کامیاب ہوجایا کرتا تھا۔ میں کتابوں کے مطالعے سے زیادہ وقت ٹینس کھیلنے میں صرف کرتا تھا۔ لیکن ٹینس میں بھی میں کالج کی بی ٹیم میں شامل ہونے کا بھی اہل نہیں تھا۔ سکھ ہونے کی حیثیت میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے سپاہ گری کے بارے میں کچھ جاننا چاہیے۔ میں نے یوٹی سی (یونیورسٹی ٹریننگ کور) کی رکنیت لے لی' جو لال قلعے میں ہر دوسرے ہفتے مشقیں کرتی تھی۔ چلچلاتی ہوئی گرمیوں میں ہمیں جسم سے چمٹی ہوئی گرم خاکستری اونی قمیضیں' ٹانگوں کے گرد موٹی موٹی پٹیاں اور پیروں میں کیلوں والے بوٹ پہننے پڑتے تھے۔ میں جلد ہی مشقوں سے بے زار ہوگیا اور یوٹی سی کو چھوڑنے کا خواہشمند ہوگیا۔ قانون کے مطابق کسی کو اندراج کے بعد چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی: اس کو بھگوڑا پن تصور کیا جاتا تھا اور قید کی سزا دی جاتی تھی۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ ہمیں ہر سال ایک ہفتہ ایک کیمپ میں بھی گزارنا ہوتا تھا۔ جس میں حاضری لازمی ہوتی تھی۔ ہمارے خیمے آج کنگز وے کیمپ کے نام سے جانی جانے والی جگہ پر لگائے گئے تھے' جہاں 1911ء میں شاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے نئی دہلی کے سنگ ہائے بنیاد (فاؤنڈیشن سٹونز) رکھے تھے۔ 1930ء کا کنگز وے کیمپ کانٹوں والی جھاڑیوں اور سانپوں اور بچھوؤں سے بھرا ہوا ویرانہ تھا۔

یوٹی سی کیمپ میں خاندانی ناموں کے حروفِ تہجی کے حساب سے خیمے مختص کیے جاتے تھے اور میں نے اپنے آپ کو پانچ دیگر سکھوں کے ساتھ پایا' سب کے سب سکھ تھے مختلف کالجوں سے آئے ہوئے۔ دو لانس کارپورل' دو کارپورل اور ایک سارجنٹ تھا۔ میں ان کے درمیان واحد پرائیویٹ اور سٹیفنیئن (سٹیفن کالج کا طالب علم) تھا۔ وہ سخت جان اور گھنے بالوں والے سکھ تھے جو دوڑوں اور میدانی مقابلوں میں جیت کا عزم لے کر آئے تھے' یہ کھیل کیمپ میں گزرنے والے ہفتے کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ سارجنٹ نے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں کھیلوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کروں گا تو وہ مجھے لانس کارپورل بنائے جانے کی سفارش کرے گا۔

میں نے اپنے ساتھی سکھوں کے ساتھ رہنے کو بہت دشوار پایا۔ وہ زوردار خراٹے لیتے تھے اور میرے قیلولوں اور رات کی نیندوں کو خراب کردیتے تھے۔ وہ دیہاتی گنوار تھے اور اپنی بستی کی بولیوں میں فحش لطیفے سنایا کرتے تھے۔ کھیلوں میں میری بری کارکردگی نے میرے لیے انہیں مزید اہانت انگیز بنا دیا تھا۔۔۔۔ وہ سب کسی نہ کسی مقابلے میں جیت چکے تھے۔ وہ مجھے تنگ کرتے: ''تم سکھ ہو یا بنیا؟'' جب میں ان سے عاجز آگیا تو میں نے انہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا: میں نے نسوار کا پیکٹ خرید لیا۔ ایک سہ پہر جب وہ قیلولہ کررہے تھے' میں نے نسوار ان کے نتھنوں کے قریب مونچھوں پر چھڑک دی اور ایک دوسرے خیمے کی طرف بھاگ لیا۔

جہاں سینٹ سٹیفن سے آئے ہوئے کچھ لڑکے قیام پذیر تھے۔ میں نے انہیں کہا: ''ذرا تماشا دیکھو۔'' چند ایک منٹ بعد ہی وہ پانچوں بری طرح چھینکتے ہوئے خیمے سے باہر نکل آئے۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ انہیں بیک وقت اتنا زیادہ چھینکنے کے دورے کیوں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے سارے یوٹی سی دستے کو زوردار قہقہے لگاتے ہوئے پایا۔ شرارت کے منبع کو دریافت کر کے انہوں نے مجھ سے نمٹ لینے کی سوگندیں اٹھائیں۔

میری بے وقوفی ملاحظہ ہو کہ دو دن بعد میں نے اسی شرارت کو دہرانے کی کوشش کی لیکن میرے خیمے کے ساتھی سونے کی محض اداکاری کر رہے تھے۔ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے' مجھے میرے سارے کپڑوں سے محروم کر دیا اور مجھے خیمے سے باہر پھینک دیا۔ پھر انہوں نے سارے کیمپ کو پکار پکار کر تماشا دیکھنے کی دعوت دی۔ ہمارا حساب برابر ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے صلح کر لی اور اسے بہت سودمند پایا۔

سٹیفنینز کے درمیان ذ...... نامی ایک پہلوان بھی تھا' جو لواطت میں بھی مبتلا تھا۔ جب ہم صبح اور سہ پہر میں ایک خیمے میں نہاتے تو ذ...... اپنے ممکنہ شکار تاڑ لیتا۔ اس نے کیرالہ کے اتیارہ نامی لڑکے اور مجھے چن لیا۔ اس نے ہمیں کہا: ''کسی ایک کو یہ کام کرنا ہی ہوگا' تم فیصلہ کر لو کہ تم میں سے کون ایسا کرے گا یا پھر میں تم دونوں ہی سے لواطت کروں گا۔'' میں نے اور کیرالیہ کے لڑکے نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں مل کر اس پہلوان سے لڑائی کریں گے۔ میں نے اپنے خیمے کے ساتھیوں سے مدد کی درخواست کی۔ سکھ سارجنٹ نے' جو ذ...... سے زیادہ سخت جان تھا' لوطی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ''میں تو عادلانہ مبادلے...... ''واری وٹہ'' کا قائل ہوں۔ پہلے میں تم سے لواطت کروں گا' پھر تم مجھ سے کرنا' لیکن اگر تم نے اپنے ہاتھ اس سکھ لڑکے پر رکھے تو میں تمہاری جان نکال لوں گا۔'' یہ ذ...... کا علاج تھا۔

ایک گرم سہ پہر' جب ہم اونگھ رہے تھے' ایک بڑا کوبرا ایک لڑکے کی گردن پر سے رینگتا ہوا دوسری طرف گیا۔ لڑکا دہشت زدہ چیخ مار کر جاگ گیا اور اس نے سانپ کو اپنے بدن سے اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ وہ پھنکارتا ہوا ایک دوسرے لڑکے کے سینے پر گرا۔ ہم نے خیمے سے نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ اس افراتفری میں ہم نے خیمے کا درمیانی کھمبا گرا دیا اور خیمہ ہمارے سروں پر آن گرا' ہم کوبرے سمیت اس کے نیچے پھنس گئے تھے۔ ہم نے تڑپ کر نکلنے کی کوشش کی مگر کوبرے نے بھی ایسا ہی کیا۔ یوٹی سی کے لڑکے رائفلوں سے مسلح تھے مگر کسی گولی نے سانپ کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہم ٹانگوں والوں سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو کوبرے والا واقعہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ میں نے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ جمع کروایا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ سال بھر پہلے کی طویل بیماری کے سبب

میں مشقیں اور پریڈیں کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے عنفوانِ شباب کے سپاہی بننے کے ارادے کا خاتمہ ہوگیا۔

میں نے 1932ء میں انٹرمیڈیٹ آرٹس کا امتحان دیا۔ توقع کے مطابق میں نے سیکنڈ ڈویژن حاصل کی اور توقع کے مطابق منکت رائے نے کئی مضامین میں یونیورسٹی میں اعلیٰ تر درجہ حاصل کیا۔

میں پریقین نہیں ہوں کہ میں نے بیچلرز ڈگری کے لیے سینٹ سٹیفن چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیوں کیا۔ میرے مستقبل کی صورت گری میں میرے باپ کا کردار فیصلہ کن ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ' جب کہ میں ابھی سکول ہی میں تھا' پرنسپل کملابوس کو میری انگریزی کی استانی مس بڈن نے کہا کہ میں ادیب کے طور پر اپنا کیریئر بنا سکتا ہوں۔ اس نے کئی روز تک اس بات پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ کوئی شخص ادب سے روزی رزق نہیں کما سکتا ہے۔ زیادہ بہتر طور پر اس کو کسی پیشے کے ساتھ ضمناً اپنایا جا سکتا ہے۔ چونکہ میں بہت زیادہ باتیں کیا کرتا تھا — میری ماں مجھے اکثر ''گلادھر'' (باتونی) کہا کرتی تھی — اور ہمیشہ بحثوں میں الجھا رہتا تھا' میرے والدین نے فیصلہ کیا کہ میں قانون کے لیے سب سے بہتر طور پر موزوں ہوں۔ ہمارے خاندان میں کوئی وکیل نہیں تھا اور میرے باپ کو خاندانی کاروبار اور جائیداد سے متعلقہ مقدمے بازی کے لیے وکلاء کو بھاری معاوضے ادا کرنا پڑتے تھے۔ ممکن ہے یہ بات اس وقت اس کے ذہن میں ہو جب اس نے ماڈرن سکول میں مجھے ہندی سے اردو کی طرف تبدیل کر دیا تھا' کیونکہ عدالتی ریکارڈ اردو میں رکھا جاتا تھا۔ دہلی کی عدالتیں لاہور ہائیکورٹ کے دائرہ اختیار میں تھیں۔ بلاشبہ میرے باپ نے یہی بہتر تصور کیا کہ مجھے لاہور میں قانون کی پریکٹس شروع کرنے سے پہلے لاہور سے مانوس ہو جانا چاہیے۔ زندگی بسر کرنے کے حوالے سے میرے کوئی مضبوط خیالات نہیں تھے۔ میں واضح نہ کی جاسکنے والی ذاتی وجوہات کے تحت لاہور جانے پر راضی ہوگیا۔ میں لوگوں اور مقامات سے جلد ہی تھک جاتا تھا' جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے اور ہمیشہ تازہ چراگاہوں کا متلاشی اور نئے لوگوں کو جاننے کا خواہشمند رہتا تھا۔ آج کی طرح اس وقت بھی میں دیرپا دوستیاں بنانے سے قاصر تھا۔

گورنمنٹ کالج اپنی کھیلوں میں اور تعلیمی کامیابیوں ہردو کے حوالے سے شمالی ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور و معروف تعلیمی ادارہ تھا۔ اس وقت ہندوستان کی اولمپک کھیلنے والی ہاکی ٹیم میں کپتان سمیت چار کھلاڑیوں کا تعلق اسی کالج سے تھا۔ ہندوستان کی کرکٹ اور ایتھلیٹکس کی ٹیموں کا وسیع تناسب بھی اسی کالج سے تعلق رکھتا تھا۔ کالج کا صدر ایک ریٹائرڈ برطانوی کرنل ایچ۔ ایل۔ اوگیرٹ' ایک طویل القامت اور کرخت انسان تھا' جو

ادارے کو اس طرح چلا رہا تھا گویا یہ کوئی رجمنٹل مرکز ہو۔ سٹاف میں اور بھی برطانوی شامل تھے۔ چند ایک ہندوستانی لیکچرار آکسفورڈ یا کیمبرج کے ڈگری یافتہ تھے ـــــ جن میں دو ممتاز سائنس داں بیربل ساہنی اور ڈاکٹر کیشپ شامل تھے۔ کالج میں داخلے محدود تھے۔ دولت، خاندانی پس منظر اور سیاسی رتبے کے مقابلے میں میرٹ کم تر شمار ہوتا تھا۔ ایچی سن چیفس کالج سے آنے والے زمین دار اشرافیہ کے بیٹوں کو بغیر کسی دشواری کے داخلہ دے دیا جاتا تھا خواہ انہوں نے سکول میں کتنی ہی ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ دوسروں کا انٹرویو ان کے باپوں یا سرپرستوں کے ہمراہ ہوا۔ مجھے اپنے چچا اجل سنگھ کے ساتھ بورڈ کے روبرو لے جایا گیا تھا، جو اپنے وقت میں کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان رہا تھا، جس نے وہاں سے ماسٹر ڈگری حاصل کی تھی اور جو پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کا رکن تھا۔ بورڈ کے کسی رکن نے مجھ سے سوال پوچھنے کا تردّد نہیں کیا۔ گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے میرا چچا میرا پاسپورٹ اور ویزا تھا۔

میرے سینٹ سٹیفن چھوڑنے سے منگت رائے پریشان تھا۔ اس نے چھٹیوں کے دوران میں نئی ٹرم شروع ہونے سے پہلے مجھے لمبے لمبے خط لکھے تھے اور جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نے لاہور جانے کا ارادہ کرلیا ہے تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں اپنی اے۔ جے۔ ایس موٹر سائیکل پر لاہور گیا اور دہلی سے لاہور تک 300 میل کا فاصلہ گرینڈ ٹرنک روڈ پر آٹھ گھنٹوں میں طے کیا۔ ان دنوں اس ہائی وے پر بہت کم ٹریفک ہوا کرتی تھی۔

میں لاہور میں شروع کے چار مہینے اپنے چچا کے ہاں رہا جس نے جیل روڈ پر ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس کی بیوی نے ذرا پہلے ہی دو جڑواں لڑکیوں کو جنم دیا تھا۔ وہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات لڑنے میں بھی مصروف تھا۔ وہاں سیاست دانوں، حامیوں (سپورٹرز)، کمپین چلانے والوں اور اسی طرح کے لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ رہتی تھی۔ میرے کزن، جس نے بھی کالج میں داخلہ لیا ہوا تھا، اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہم کالج کے ہاسٹل منتقل ہو جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج کے دو ہاسٹل تھے: کواڈرینگل عام لوگوں کے بیٹوں کے لیے اور خصوصی کمروں کے ساتھ زیادہ مہنگا نیو ہاسٹل زمینداروں کے بیٹوں کے لیے، جن میں چند ایک کے ہمراہ ان کی دیکھ بھال کے لیے نوکر بھی ہوتے تھے۔ ہمیں ایک کونے میں ایک کمرہ ملا جہاں سے ڈی۔ اے۔ وی کالج اور عدالتیں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ ہماری کھڑکی کے نیچے وہ جگہ تھی جہاں سے بھگت سنگھ اور راج گرو نے لاہور ریلوے سٹیشن کے باہر سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی مظاہرے کے دوران میں لالہ لاجپت رائے کو مارنے پر اینگلو انڈین پولیس انسپکٹر سانڈرس پر گولی چلا کر اسے قتل کر دیا تھا۔ عدالتوں کا نظارہ بہت مسرت بخش نہیں تھا۔ ہم صبح کے وقت ہتھکڑیاں پہنے اور پیروں میں بیڑیاں ڈالے قیدیوں کو سیاہ بسوں سے اترتے ہوئے اور شام کو انہیں واپس

لے جائے جاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ نیز مقدمے بازوں اور وکلاء کو دیکھا کرتے تھے جو عدالت کی دیواروں کے ساتھ بیٹھ کر پیشاب کیا کرتے تھے۔

گورنمنٹ کالج کی عمارت خوبصورت تھی جو کسی پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر کیے گئے گوتھک گرجا سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ سامنے کھیل کے وسیع وعریض میدان تھے' اس کے مغربی پہلو میں ٹینس کورٹس اور نہانے کے تالاب تھے اور مشرقی پہلو میں کواڈرینگل تھے۔ کالج ایک دائرہ نما پارک کے ایک سرے پر واقع تھا' جسے گول باغ کہتے تھے' جو عجائب گھر اور ایک بڑی توپ' بھنگیاں دی توپ تک جاتا تھا۔ جسے سکھوں سے چھینا گیا تھا اور بعد میں اس کا نام رڈیارڈ کپلنگ کے ناول کے ہیرو کے نام پر کم کی توپ رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں سے مال شروع ہو جاتی تھی' جو ہائیکورٹ' قانون ساز اسمبلی کی عمارت اور لارنس گارڈنز کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک نہر تک جاتی جو شہر کی انتہائی مشرقی حد تھی۔ لاہور کا مرکزی بازار انارکلی کالج سے صرف ایک فرلانگ دور تھا اور لاہور کا مشہور جسم فروشی کا علاقہ ہیرامنڈی زیادہ دور نہیں تھا' جس کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک منظور نظر راجا ہیرا سنگھ ڈوگرا کے نام پر رکھا تھا۔ مقامی لوگ اسے ٹبی بازار کے نام سے جانتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے چند ایک لڑکوں نے ٹبی کی طوائفوں پر اپنا کنوارا پن نچھاور کیا۔

گورنمنٹ کالج میں میرے بہت سے ہم عصروں نے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ایک تو انگریزی کے پروفیسر اے۔ ایس بخاری تھے' جو بعد از عشائیہ بہترین مقرر' اردو میں ہلکی پھلکی نثر کے لکھاری (پطرس کے مضامین) اور عورتوں کا ذوق رکھنے والے مشہور شخص تھے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اور پھر اقوام متحدہ کے شعبۂ صحافت (ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ) کے سربراہ بنے۔ ان کی موت اچانک واقع ہوئی۔ شفقت محمود جو اس وقت نیو یارک میں پاکستانی قونصلیٹ میں متعین تھے اور بخاری کے قریبی دوست تھے' ان کے اپارٹمنٹ ان کے سامان کی فہرست بنانے کے لیے پہنچے۔ ہاؤس کیپر نے شفقت کو بتایا کہ بخاری اپنی مطالعہ گاہ میں گھنٹوں مصروف رہتے ہیں اور کسی کو اس میں آنے کی کبھی اجازت نہیں دیتے۔ تاہم اس نے اپنی جیب میں چابی ڈھونڈی اور شفقت کو دے دی۔ اس نے مطالعہ گاہ کو کھولا۔ اس میں ہائی فائی آلہ اور ریکارڈڈ ٹیپوں سے بھری ہوئی شیلفیں تھیں۔ یہ مختلف فورموں (Forums) پر کی گئی بخاری کی تقریروں کی ٹیپیں تھیں۔ وہ گھنٹوں خود اپنی آواز اور حاصل کردہ تحسین کو سنتے رہتے تھے۔

بخاری کے ساتھ بہت سے ممتاز اردو شاعروں کے مراسم تھے بشمول امتیاز علی تاج' محمد تاثیر اور فیض احمد فیض ـــــ علامہ اقبال کے بعد پاکستان کے عظیم ترین شاعر۔ تاثیر کی بیوی

سکاٹش تھی جس کی چھوٹی بہن ایلس بعدازاں فیض سے بیاہی گئی۔ ان کا ایک بہت محدود حلقہ تھا جس میں سب مرد ہی شامل تھے جو اردو یا فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس پرکشش حلقے میں بار نہیں پا سکا تھا۔

میں نے گورنمنٹ کالج میں سینٹ سٹیفن سے کوئی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے اساتذہ غیر متاثر کن تھے۔ بخاری تدریس میں بہت تھوڑی دلچسپی لیتے تھے اور پینتالیس منٹوں میں سے بیشتر وقت انگلینڈ میں اپنی کارگزاریوں کی شیخی بگھارنے میں گزار دیتے تھے۔ ایم۔ جی سنگھ زیادہ باضمیر تھے مگر خود کو شاعروں اور ادیبوں پر رائے دینے تک ہی محدود رکھتے تھے اور طلبہ کو سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ چونکہ انگریزی ادب میں میری دلچسپی جنون میں تبدیل ہو چکی تھی' میں نے اپنی نصابی کتاب کی بہت سی نظمیں یاد کر لی تھیں' نیز شیکسپیئر کے دو ڈرامے اے مڈسمر نائٹس ڈریم (A Midsummer Night's Dream) اور رچرڈ II (Richard II) یاد کر لیے تھے' جو کہ ہمارے نصاب میں شامل تھے۔ جو کچھ میں نہیں جانتا تھا وہ انجانا ہی رہا۔ میں دوسرے لوگوں کا عظیم ادیبوں' ڈرامہ نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات کا تجزیہ یا تنقید کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک تتلی کو چیرنا پھاڑنا اور قتل کر دینا تھا۔ میری اپنی تحریری کوششوں کو سراہا نہیں گیا۔ میں نے کالج کے رسالے ''راوی'' میں دو چیزیں بھیجیں' دونوں ہی مسترد کر دی گئیں' ان کے اقتباسات ڈبلیو۔ پی۔ بی (ویسٹ پیپر باسکٹ ـــــ ردی کاغذوں کی ٹوکری) نامی کالم میں شائع کیے گئے' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ بے کار اور ردّی تھے۔

ہمارے تاریخ اور معاشیات کے اساتذہ برسوں پہلے ترتیب دیے گئے نوٹس ہی پڑھ دیتے تھے۔ نہ تو وہ تبادلۂ خیال کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور نہ ہی اپنے اپنے مضامین کی نئی شائع ہونے والی کتابوں کی پروا کرتے تھے۔ نوبل انعام یافتہ ممتاز سائنس داں سر سی۔ وی۔ رمن کے دورے کے حوالے سے کالج میں ایک قصہ مشہور ہوا۔ پرنسپل گیریٹ انہیں کالج کی نئی لیبارٹری کا چکر لگوانے لے گیا۔ ماہر تعلیم بن جانے والے انگریز کرنل نے پوچھا: ''سر سی۔ وی! آپ کا ہماری لیبارٹری کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ذہین تامل نژاد نے جواب دیا: ''سنگِ مرمر کا فرش بہت اچھا ہے۔'' گیریٹ نے' جو سی۔ وی۔ رمن کی بات نہیں سمجھا تھا' اپنا سوال دہرایا۔ اُس نے دوبارہ وہی جواب دیا۔

گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کو دوست بنانے کی میری کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئیں۔ وہ اپنے آپ تک ہی محدود رہتے تھے۔ ان کا اپنا میس ہوتا تھا جہاں حلال گوشت پیش کیا جاتا تھا اور ان کی اپنی ٹک شاپ (Tuck Shop) تھی۔ ہندو اور سکھ طلبہ کی

اپنی اپنی سبزی خور (Vegetarian) اور غیر سبزی خور (Non-Vegetarian) کینٹینیں اور الگ الگ ٹک شاپس تھیں۔ اگرچہ ہم اکٹھے ٹیبل ٹینس، کیرم اور دیگر ان ڈور کھیل کھیلتے تھے اور اپنی جماعتوں میں پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے مگر مسلمانوں کے ساتھ قریبی دوستی کی مثالیں چند ایک ہی تھیں۔ چند دوستیاں معلوم ہوئیں تو ان پر فوری طور پر ہم جنس پرستی کی تہمت لگا دی گئی۔ ایک زنانہ سے نوجوان سکھ، جس نے ایک اچھا باکسر بن جانا تھا، کے بارے میں مشہور تھا کہ ہاکی ٹیم کا مسلمان کپتان اس کے ساتھ سدومیت کرتا ہے۔ دو برسوں کے بعد وہ سکھ خود خوبصورت نوواردوں کا دوست بنا ہوا تھا۔ مفعول ہم جنس پرستوں (Catamites) سے فاعل ہم جنس پرست (Sodomites) بن جانے والوں کے لیے اردو میں عمومی تبصرہ یہ تھا: ''جب چھبکچھے بھر گئے، ٹوٹیاں بہنے لگیں'' ــــ جب ٹینکیاں بھر جاتی ہیں تو پانی پائپوں میں سے بہنے لگتا ہے۔

کچھ عرصے بعد میں نے ان کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے خود کو راضی برضا کرلیا جنہیں میں نے ہم مزاج پایا۔ ان میں سے ایک بہت خوش شکل لڑکا چیتن آنند تھا ــــ دل کش، لڑکیوں جیسا، گھنگھریالے بالوں اور خوابوں جیسی آنکھوں والا۔ اس نے پرانے طلبہ کو دھوکا دینے میں بہت سخت وقت گزارا تھا جو اس کے پیچھے کے حریص تھے۔ اس نے خود کو میرے ساتھ جوڑ لیا۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کے اسلوب میں شعر کہا کرتا تھا اور اکثر میرے لیے بے قافیہ، بلاسبب رقت انگیز نظمیں، کہا کرتا تھا۔ ہم اکٹھے جماعتوں میں جایا کرتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھا کرتے تھے، ٹینس کھیلتے تھے اور عموماً فلم دیکھنے اکٹھے جایا کرتے تھے۔ ہم مختصر وقت کے لیے دوبارہ انگلینڈ میں ملے تھے۔ جب میں لاہور میں قیام پذیر تھا تو اس نے ایک موسم گرما میرے ساتھ بسر کیا تھا۔ تب وہ فلم پروڈیوسر کے طور پر قسمت آزمانے بمبئی گیا تھا مگر زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔ وہ دینے والا نہیں لینے والا تھا۔ ہمارے گروپ میں این۔ اقبال سنگھ بھی تھا جو ایک نقشِ کوچک (منی ایچر) سکھ تھا، اس کا قد پانچ فٹ چار انچ سے زیادہ نہیں تھا اور اس کی آواز لڑکیوں جیسی باریک تھی۔ اس کا عرف چوچی تھا۔ اس نے بھی میرے ساتھ کئی مہینے دہلی، لاہور اور لندن میں بسر کیے۔ چیتن کے مانند وہ بھی دینے والا نہیں لینے والا شخص تھا۔ میں دوسروں کی نسبت لینے والوں سے جلد ہی اکتا جاتا ہوں اور میز بانی میں یکطرفہ ٹریفک کو برقرار رکھنے سے قاصر رہا ہوں۔ گورنمنٹ کالج میں دوسرے طلباء بھی تھے جو بعدازاں فلموں کے حوالے سے ممتاز و معروف ہوئے مثلاً بلراج ساہنی، ایک بہت دل کش اور پسند کیا جانے والا شخص، جو کہ مجھ سے دو برس بڑا تھا اور ایک ہم جماعت بی۔ آر چوپڑا، جو بمبئی میں ایک صفِ اول کا فلم پروڈیوسر بنا۔

ادھر کرپال سنگھ چاولہ بھی تھا' ایک آسودہ حال کاروباری کا سب سے بڑا بیٹا' جس نے زندگی میں تو کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی' مگر اسے یاد کرنے کی میرے پاس خوب وجہ ہے۔ وہ میرا دوست اس لیے بن گیا کہ اس کے پاس بھی موٹر سائیکل تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ کھاتے پیتے لوگوں کے بیٹوں کو ایک بھائی چارہ قائم کرنا چاہیے۔ وہ ہمیشہ خوب صورت تراش کے لباسوں' ایک بوٹائی (Bow-Tie) 'ایک صاف بندھی ہوئی پگڑی' جس کے بلوں سے ایک کئی رنگوں والا ربن جھلک رہا ہوتا پہنے ہوئے بن ٹھن کر باہر نکلتا تھا۔ وہ اپنی چھدری ڈاڑھی کو موم لگا کر' اپنی مونچھوں کو اوپر کی طرف بل دے کر اور سینہ پھلا کر اپنی موٹر سائیکل پر سواری کرتا تھا۔ وہ مجھے بہتر لباس پہننے اور موٹر سائیکل پر جھک کر نہ بیٹھنے کی نصیحت کرنے سے شروع ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا: ''ہم لوگ جو اپنی جیبوں میں چار پیسے رکھتے ہیں' ہمیں اپنے سینے تانے رکھنا چاہیے۔''

اس نے مجھے اپنے گھر بلانا شروع کر دیا۔ اس کا باپ بھی بے حد احتیاط کے ساتھ لباس پہنا کرتا تھا اور انگلینڈ سے درآمد شدہ ٹائیاں باندھتا تھا۔ انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اس کی ناف تک لٹکی ہوئی لمبی خاکستری ڈاڑھی کے نیچے چھپی ہوتی تھیں۔ اس نے دوسری شادی کر رکھی تھی اور دونوں بیویوں سے اس کے چند ایک ہی بیٹے اور شادی کے قابل بیٹیاں تھیں۔ وہ گھر پر سکھ دوستوں کو مدعو کرنے کے حوالے سے اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ باغ میں گیراج کے اوپر کرپال کا ذاتی کمرہ تھا۔ وہ خوش ذوق نوجوان تھا اور اس کے پاس ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے بہت سے ریکارڈ موجود تھے۔ وہ وچتر وینا بجایا کرتا تھا اور اس میں اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن میں اسے پرفارم کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس کو نرم جلد والی عورتوں کا خبط تھا۔ وہ ایک تخیلاتی لڑکی کو بانہوں میں تھامے ہوئے کہا کرتا تھا: ''کشمیری پنڈتوں کی بیٹیوں جیسی کوئی لڑکی نہیں ہوتی۔ اگر کبھی میں نے کسی سے شادی کی تو وہ پنڈتانی دوشیزہ ہو گی۔ مگر میں شادی نہیں کروں گا کیونکہ میری زندگی کی لکیر ظاہر کرتی ہے کہ میں تیس برس کی عمر سے پہلے پہلے مر جاؤں گا۔'' وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھول لیا کرتا تھا' یہ دکھانے کے لیے کہ اس کی زندگی کی لکیر کتنی مختصر تھی۔ نرم جلد والی عورت کو حاصل کرنے کا اس کا شوق اس وقت پورا ہو گیا جب وہ ابھی کالج ہی میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایسا کس طرح ہوا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر' جب وہ اپنی کشمیری حسینہ کے تصور میں گم تھا' اس کو زبردست ایستادگی ہو گئی۔ وہ مشت زنی کرنے ہی لگا تھا کہ دھوبن اپنے سر پر کپڑوں کا گٹھڑ اٹھائے ہوئے آ پہنچی۔ وہ ایک موٹی' درمیانی عمر کی عورت تھی اور بچوں کی ایک جھول کی ماں

تھی۔ وہ صاف جلد والی بھی تھی۔ کرپال نے بس اُسے بستر پر دھکیلا اور اس پر چڑھ گیا۔ دھوبن نے کرپال جو کچھ کرنے کا خواہشمند تھا' اس کے کرنے سے پہلے ہلکا سا احتجاج کیا۔ مگر یہ احتجاج زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ اس نے اس کو بخشش کے طور پر دس روپے کا نوٹ دیا۔ وہ اسے لے کر خوش ہوگئی تھی۔ اس نے کپڑوں کی فہرست ملاحظہ کی اور اس کو دھونے کے لیے دینے کی خاطر میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا۔ وہ شوخی کے ساتھ اسے کہنے لگی: ''آپ نے تو ایک آگ بھڑکا دی ہے' اب آپ ہی کو اسے بجھانا ہوگا۔'' سو اس نے دوسری مرتبہ فعل کیا جس نے بوڑھی دھوبن کو اس کے دیئے ہوئے دس روپے کے دوسرے نوٹ سے بھی زیادہ سرور اور لذت بخشی۔ یہ معاملہ ایک مسلسل چلنے والے تعلق میں ڈھل گیا۔ وہ اس کی ہفتہ وار آمد کا منتظر رہنے لگا۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی کہ اگر میں بھی دس کے نوٹ کو خرچ کرنے پر راضی ہوں تو اس لذت میں شریک ہوسکتا ہوں۔ میں کسی کو بھی اپنی احمقانہ جنسی آوارگیوں سے آگاہ کرنے کا شائق نہیں تھا اور میں نے نرمی سے اس کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ کرپال چالیس کے پیٹے میں کنوارا ہی فوت ہوگیا۔

میں پر یقین نہیں ہوں کہ شاعری' موسیقی اور فنون میں میری دلچسپی کیسے عود کر آئی۔ ہوسکتا ہے یہ چیتن کی نظمیں ہوں یا کرپال چاولہ کے کمرے میں ممتاز ستار بجانے والوں کو سننا ہو ــــ میں نے اپنے ستار کے سبق دوبارہ شروع کرنے اور مصوری پر ہاتھ رواں کرنے کی کوشش کا فیصلہ کیا۔ جب گرمیوں کی پہلی چھٹیاں نزدیک تھیں' میں نے شانتی نکیتن میں ٹیگور یونیورسٹی کو لکھا کہ میں کلا بھون' اس کے موسیقی اور فنون کے مرکز' میں داخلہ لینے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے ایک داخلہ فارم ملا جس میں کہا گیا تھا کہ ایسا حوالہ فراہم کیا جائے جسے وہ جانتے ہوں۔ اشوک سین کے باپ کا شانتی نکیتن میں ایک قطعۂ اراضی تھا اور وہاں اُسے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ میں نے اسے اپنے لیے ایک سفارشی خط دینے کا کہا۔ ''اکالی! (وہ مجھے ہمیشہ اکالی کہا کرتا تھا کیونکہ میں اکالی تحریک کے دوران میں کالی پگڑی باندھا کرتا تھا) تم شانتی نکیتن میں کیا کرو گے؟'' میں نے اس کو آگاہ کیا۔ وہ ایک مہربان بوڑھا تھا اور اس نے وشو بھارتی کے رجسٹرار کے لیے فوراً خط لکھ دیا۔

شانتی نکیتن جانا میرا ذاتی طور پر کیا جانے والا پہلا ٹرین کا سفر تھا۔ میں نے ہاوڑا میں بول پور کے لیے ٹرینیں تبدیل کرتے ہوئے تھرڈ کلاس میں سفر کیا۔ مون سون ذرا پہلے ہی شروع ہوا تھا۔ ہاوڑا اور بول پور کے درمیان کا دیہی علاقہ پانی کا ایک بہت وسیع پھیلاؤ بن چکا

تھا۔ میں نے ایک بیل گاڑی کرائے پر حاصل کی اور ایک گھنٹے بعد یونیورسٹی کے رجسٹرار کو اپنی آمد کی اطلاع کی۔ مجھے بغیر فرنیچر والا ایک کشادہ کمرہ دکھایا گیا جہاں مجھے سری لنکا سے آئے ہوئے منجوسری نامی بدھ بھکشو کے ساتھ قیام کرنا تھا اور پھر کھانے کے ہال اور کلا بھون کا چکر لگوایا گیا۔ جس وقت میں نے کیمپس کا دورہ مکمل کیا اندھیرا چھا چکا تھا اور بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور اپنا بستر فرش پر لگا دیا۔ منجوسری لیمپ کی روشنی میں مطالعہ کررہا تھا ـــ ہمارے کمروں میں بجلی کی بتیاں (الیکٹرک لائٹس) نہیں تھیں۔ ہم نے انگریزی میں ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کا تبادلہ کیا کیونکہ وہ ہندوستانی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ شانتی نکیتن آرکائیوز میں چند پالی مسودات پر کام کررہا تھا اور تجرد (کنوارا رہنے کا) عہد کرچکا تھا' جس کا تقاضا تھا کہ وہ عورتوں سے بات بھی نہیں کرے۔ اس کا مجھ سے پہلا ہی سوال ان لڑکیوں کے بارے میں تھا جنہیں میں جانتا تھا۔

مجھے درست طور پر نیند نہیں آئی کیونکہ میں سخت فرش پر سونے کا عادی جو نہیں تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔ میں خوابوں کی سرزمین میں اونگھتا رہا۔ میں نے گنگناتی ہوئی آوازوں کو دور فاصلوں سے اپنے نزدیک آتے ہوئے سنا۔ مجھے ادراک ہوا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ میں اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا۔ پھوہار کی نفیس جالی سے دھندلی چاندنی چھن رہی تھی۔ میں نے بے داغ سفید لباس میں ملبوس نوجوان مردوں اور عورتوں کی پارٹی کو دیکھا جو لالٹینیں اور شمعیں اٹھائے گاتی ہوئی آرہی تھی۔ میں تب تک مسحور سا کھڑا رہا جب تک وہ میرے دروازے کے آگے سے گزر نہیں گئے۔ منجوسری نے مجھے آگاہ کیا: ''یہ ورشا منگل ہے' بارشوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے۔ وہ ٹیگور کے گیت گاتے ہوئے کیمپس کا چکر لگائیں گے۔''

یہ شانتی نکیتن کا بہت خوش گوار تعارف تھا۔ گیت اور حسن کا تصور کئی برسوں تک مسلسل مجھے تحریک دیتا رہا۔ سریندر ناتھ کر کے پاس ایک فنون کے طالبعلم کے طور پر اندراج ہونے اور ستار کا ایک استاد تفویض کیے جانے کے بعد اور بہت کچھ ہونا تھا۔ میں نے دن آلہ خریدنے اور خود کو گردوپیش سے واقف کروانے میں گزارا۔ سہ پہر میں ٹیگور کیمپس میں آئے۔ انہوں نے طلبہ سے اودے شنکر اور اس کے فرانسیسی رقاص رفیق (ڈانسنگ پارٹنر) سمکی کو' جو اپنے پہلے یورپی دورے سے لوٹے تھے' متعارف کروایا۔ ٹیگور ایک چبوترے (پلیٹ فارم) پر ایک بڑی بازوؤں والی کرسی (آرم چیئر) پر بیٹھ گئے اور شنکر کو حکم دیا: ''مجھے اپنا رقص دکھاؤ!''

وہاں نہ کوئی میک اپ تھا' نہ کوئی آلہ' نہ سٹیج لائٹس' نہ آرکسٹرا۔۔۔ فقط تمر باران تھا جو سرود بجاتا تھا۔ اودے شنکر نے سمکی کو پاروتی بنا کر تانڈو رقص کیا۔ میں نے ہیجڑوں کے بھدے چکروں اور رادھا کرشن کی کہانی کو پیش کرنے والے اناڑی کتھک رقاصوں کے علاوہ کسی ہندوستانی کو رقص کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سرود کے سروں کے ہمراہ رقص کرتے ہوئے اودے شنکر اور سمکی کی پیچدار حرکات نے مجھے تو مسحور کر دیا۔ اس رات میں سو نہیں سکا تھا' موسیقی اور رقص میرے اندر گہرا اتر گئے تھے۔

شانتی نکیتن نے میری آنکھوں کو بنگال کے دیہاتوں کے حسن و جمال سے بھی آشنا کروایا۔ میں نے اپنے برس پنجاب کے چپٹے ہموار خاکی میدانوں میں اور گرمیوں کے موسم کسولی یا شملہ میں ہی بسر کیے تھے۔ شانتی نکیتن مختلف تھا۔ وہ سنتھال علاقہ تھا' جہاں جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور گدلی تیز رو ندیاں تھیں۔ مون سون کا زمانہ ہونے کی وجہ سے بیشتر ندیاں طغیانی ہو رہی تھیں۔ جب بارش رک جاتی تو علاقہ سانپوں اور بچھوؤں سے بھر جاتا تھا۔ اول اول تو میں دہل گیا اور میں نے یہ جانے بغیر کہ وہ تو بالکل بے ضرر تھے دو سانپوں کو مار دیا۔ (عورتوں کو ستانے کا سب سے پسندیدہ طریقہ یہی تھا کہ ان کے بستر کی چادروں (بیڈ شیٹس) کے نیچے چند ایک ہائیلا سانپ چھوڑ دیئے جاتے تھے) ایک مرتبہ میں نے زوردار بارش کے دوران میں خود کو کمر تک گہرے' گدلے' گردابی پانی میں پایا۔ میں نے ایک کانٹوں والی جھاڑی کی ایک شاخ کو توڑ لیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ اس پر تو سانپ' بچھو' مینڈک اور زمینی چوہے گچھوں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ مشترکہ خطرے میں وہ ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ دیہاتوں کی ان سیروں کے دوران میں اکثر میرا آمنا سامنا سر پر ایندھن اٹھائے ہوئے نیم عریاں سنتھال لڑکیوں سے ہو جاتا تھا۔ وہ آبنوسی رنگت اور تراشے ہوئے خطوط کی حامل ہوتی تھیں اور سٹیج پر رقص کرنے والوں کی طرح چلتی تھیں۔ گرو دیو ٹیگور سنتھال راجا کے نام سے معروف ہونے کو پسند کرتے تھے۔

ہفتے میں ایک مرتبہ ہمیں ٹیگور کے عظیم الشان محل اُترآیان (حلقۂ سرطان) میں اس کا درشن کرنے کی اجازت تھی۔ وہ عام طور پر دندان سازوں جیسی بڑی کرسی پر بیٹھا ہوتا تھا۔ یہ مچھر دانی سے ڈھکی ہوئی ہوتی تھی اور اس میں دو پیالے لگے ہوئے تھے جن میں بخورات سلگتے رہتے تھے۔ صرف مراعات یافتہ مثلاً نندلال بوس اور چند ایک دیگر لوگوں کو اس کے پاؤں چھونے کی اجازت تھی۔ طلبہ فرش پر بیٹھے ہوئے اس کی گھنی مونچھوں اور ڈاڑھی والے منہ سے

دانش کے موتیوں کے چھلکنے کے منتظر رہتے۔ وہ ہم سے کبھی کبھار ہی چند جملوں سے زیادہ بولا کرتا تھا۔ میں اس ہفتہ وار سرگرمی کو بے کار تصور کرتا تھا۔

اپنے شانتی نکیتن کے قیام کے دوران میں ایک مرتبہ میں نے کلکتہ کی سیر کرنے کا اور روما بسواس سے ملاقات کرنے کی کوشش کا فیصلہ کیا' جو وہاں اپنی چھٹیاں گزارتی تھی۔ ہماری خط و کتابت عاشقانہ سی ہوگئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس سے تنہا ملاقات کرنا نفع بخش ثابت ہوسکتا ہے۔ میں نے بول پور سے ہاوڑا تک کا آخر ہفتہ کا دوطرفہ ٹکٹ (ویک اینڈ ریٹرن ٹکٹ) خریدا۔ میرے پاس ایک لفافے میں دس روپے کے صرف دو نوٹ تھے۔ میں پیدل ہاوڑا پل سے ہوکر پرہجوم بازاروں میں داخل ہوا۔ اس کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں مجھے تین گھنٹے لگ گئے۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازے کو تھپتھپایا۔ کسی نے اسے نہیں کھولا۔ ایک پڑوسی باہر نکل آیا' اس نے مجھے شکی انداز میں دیکھا اور بتایا کہ وہ ویک اینڈ کے لیے باہر گئی ہوئی ہے۔ میں نے اپنا نام لکھنے کے لیے لفافے کا ایک سرا پھاڑا اور دہشت زدہ سا رہ گیا کیونکہ میں نے اپنے دونوں کرنسی نوٹوں کو پھاڑ دیا تھا۔ میرے پاس انہیں تبدیل کروانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کیونکہ بینک بند تھے۔ میں گرتا پڑتا ہاوڑا واپس آیا' خبر نہیں تھی کہ کیا کرنا ہے' رات کہاں بسر کرنی ہے یا کھانا کہاں کھانا ہے۔ میں ایک مارواڑی دھرم شالے میں چلا گیا۔ منیجر نے مجھے نکل جانے کا حکم دیا: وہ صرف مارواڑیوں کے لیے تھا۔ اس نے مجھے کہا: ''چلو جاؤ اور اپنے گوردوارے میں قیام کرو۔'' میں نے ہاوڑا میں گوردوارہ ڈھونڈا۔ گرنتھی نے مجھے دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک کمرے میں حصہ داری کی اجازت دے دی۔ مجھے گوردوارے کے باورچی خانے سے مفت دال چپاتی کا کھانا مہیا کیا گیا اور میں اپنی پگڑی تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر زمین پر سویا۔ اگلی صبح' میں سوائے ہاوڑا پل اور پرہجوم بازاروں کے اور کوئی شے دیکھے بغیر پہلی ٹرین سے بول پور واپس چلا آیا۔ سچی محبت کا راستہ کبھی ہموار نہیں ہوا کرتا۔ وہ صرف سچی محبت ہی نہیں تھی: فقط ایک ٹین ایجر کی ایک بڑی عمر کی عورت کے لیے جس نے اس کے مسائل کو سمجھنے کا وعدہ کیا تھا' دھماکہ خیز شہوت تھی۔

یہ دریافت کرنے میں مجھے زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ میں کبھی ایک مصور نہیں بن پاؤں گا۔ چند ایک ہفتے خاکے بنانے کی کوشش کے بعد میں نے ترک کردیا۔ میں ستار زیادہ بہتر بجا سکتا تھا۔ میں نے استاد سے ایک پرانا ستار خرید لیا' جس نے واضح طور پر اس سودے میں نفع کمایا تھا۔ اس کے بعد وہ میرے سبقوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگا اور اکثر اپنے گھر میں مجھے

راگوں کی ریاضت کروانے لگا۔ میں اپنے کمرے میں گھنٹوں ستار بجانے کی ریاضت کرتا رہتا جبکہ سری لنکا کا بھکشو میرا واحد سامع ہوا کرتا تھا۔ میں نے ایک پارسی لڑکی مہر کو بھی دوست بنا لیا تھا جو اکثر سننے اور مجھ سے گپ شپ کرنے کے لیے آ جایا کرتی تھی۔ بھکشو نے کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی تاہم اسے کمرے سے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے پوچھتا تھا کہ کیا کوئی پیش رفت ہوئی۔ ''کیا تم نے اس کا ہاتھ پکڑا؟ اسے چوما؟'' میری ناکامیوں پر وہ بہت مایوس ہوتا تھا۔

شانتی نکیتن میں میرا عارضی قیام ایک بے ڈھنگے اور اچانک انجام سے دوچار ہوا۔ باوجود اس کے کہ میرے اردگرد مچھر دانی ہوا کرتی تھی اور میں اپنے بدن پر مچھر بھگانے والی کریمیں لگایا کرتا تھا' مجھے مچھروں نے بری طرح کاٹا اور میرے سارے بدن پر دانے نکل آئے۔ ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ جتنا تیزی سے ممکن ہو میں شانتی نکیتن سے نکل جاؤں۔ ایک صبح جن لوگوں کو میں نے دوست بنایا تھا ان میں سے کسی ایک سے بھی الوداعی ملاقات کیے بغیر میں نے بھکشو منجوسری کے پاؤں چھوئے اور دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نئی ٹرم کی شروعات کے لیے لاہور واپس آیا تھا' اس مرتبہ ایک ستار اور میٹرونوم کے ساتھ۔

میں نے گورنمنٹ کالج میں واحد کامیابی مباحثے میں حاصل کی تھی۔ میں نے سالانہ یونیورسٹی مباحثے کے لیے اپنا نام درج کروا دیا تھا۔ کسی سکھ کے لیے ایسے سامعین کا سامنا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے جن میں غیر سکھ بہت بڑی تعداد میں موجود ہوں۔ سٹیج پر اس کے نمودار ہوتے ہی تضحیک آمیز قہقہوں اور پھبتیوں کے شور سے اس کا استقبال ہوتا ہے' اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ دوپہر کے بارہ بجے تمام سکھ پاگل ہو جاتے ہیں۔ تاہم جونہی میں نے تقریر شروع کی وہ خاموش ہو گئے۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو انہوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ ججوں کا پینل تین پروفیسروں پر مشتمل تھا' جس کی سربراہی اے۔ ایس۔ بخاری کر رہے تھے۔ مقررین میں مختلف کالجوں کے بہترین مباحثہ کرنے والے شامل تھے۔ بخاری نے پینل کے متفقہ فیصلے کا اعلان کیا: مجھے پہلا انعام دیا گیا تھا۔ میری فتح کسی حد تک میرے کزن اور رفیق کمرہ (روم میٹ) نریندر کے انجام سے پھیکی پڑ گئی تھی۔ وہ بے چارہ اپنے زور خطابت کی وجہ سے بیچ میں ہی جذبات سے مغلوب ہو گیا تھا۔

گورنمنٹ کالج کی چند ایک حماقتیں مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ پڑھائی سے اچاٹ ہونے کی وجہ سے میں نے دوسروں کو امتحانوں کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے بتیوں

کو فیوز کرنے کا آسان طریقہ دریافت کرلیا تھا۔ مجھے بس یہی کرنا ہوتا تھا کہ اپنے ٹیبل لیمپ کے بلب اور ساکٹ کے درمیان ایک سکہ رکھ دوں اور پھر اسے آن کر دوں۔ اس سے فیوز اڑ جاتا اور ہاسٹل تاریکی میں ڈوب جاتا۔ پھر میں چھت پر چلا جایا کرتا تھا اور ستاروں کی روشنی میں مزے سے چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔ ایک رات ہاسٹل کے رہنے والوں کو روشنی سے محروم کرنے کے بعد کی بات ہے کہ چھت پر چند لڑکے مجھے آ ملے۔ دفعتاً روشنی آ گئی اور ہم نے وارڈن پروفیسر امولک کھنہ کو اپنی بیوی کے ساتھ محبت کا فعل کرتے ہوئے خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ ہم نے چلا کر دوسرے کو نظارہ دیکھنے کے لیے بلایا مگر کھناؤں نے ہماری آوازیں سن لیں اور اپنی بتیاں بجھا دیں۔

چند دنوں بعد دیر گئے ہاسٹل لوٹنے والے کچھ لڑکوں نے کھنہ کی بے بی آسٹن جس کے ساتھ میں اپنی موٹر سائیکل کھڑی کرتا تھا' کے پٹرول ٹینک میں اپنے مثانے خالی کیے۔ میں ان میں شامل نہیں تھا لیکن کھنہ نے اس مفروضے کے تحت کہ چونکہ میرے پاس موٹر سائیکل ہے اس لیے فقط میں کار کی اناٹومی سے واقف ہوں' مجھ پر پچاس روپے کا بھاری جرمانہ عائد کر دیا۔ دراصل اسے پتہ چلا تھا کہ میں چھت پر موجود ان لڑکوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اسے اس کی بیوی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

امولک کھنہ بالکل ایک کیریکٹر تھا۔ وہ تاریخ کی' جسے وہ پڑھانے کی کوشش کرتا تھا' بہت معمولی آگاہی رکھتا تھا۔ مگر جسمانی مضبوطی کے حوالے سے وہ ایک شیطان تھا۔ وہ بہت چھوٹے قد کا آدمی تھا اور ٹینس اور ہاکی کا جاندار کھیل کھیلتا تھا۔ سرما کے سرد ترین دنوں میں وہ صبح کے وقت کالج کے تالاب میں آدھے گھنٹے تک تیرتا رہتا تھا۔ میں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی اور ٹینس کے بعد گھنٹوں تالاب کی لمبائیاں ماپتا رہا۔ لہٰذا مجھے کالج کی تیراکی اور واٹر پولو کی ٹیموں کے لیے منتخب کرلیا گیا۔

کالج کے تالاب پر ایک مزیدار واقعہ رونما ہوا۔ ایک بہت بال دار سکھ کو' جو کہ پہلوانی کی ٹیم میں تھا' تیراکی کے بعد نہانے کے وقت دوسروں کا صابن اٹھا لینے کی عادت تھی۔ ایک مسلمان طالب علم نے اس کے ساتھ مذاق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بال صاف کرنے والا صابن لیا اور تولیے سے بدن پونچھنے کے دوران میں اس صابن کو صابن دانی میں رکھ دیا۔ سکھ نے عادت کے مطابق اسے اٹھا لیا اور زور زور سے اپنے چہرے' ڈاڑھی اور بدن پر ملنے لگا۔ مسلمان خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔ اگلے چار دنوں تک ایک بے حد مشتعل سکھ اپنے

بیشتر بالوں سے محروم' اس طالب علم کی تلاش میں رہا جس نے اس کے ساتھ یہ گندی چال چلی تھی۔ مسلمان نے گورنمنٹ کالج چھوڑ دیا اور سیدھا اسلامیہ (کالج) میں داخلہ لے لیا۔

میں نے 1934ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ـــ تھرڈ ڈویژن میں۔ جو محنت میں نے کی تھی اس کے حساب سے میرا پاس ہو جانا خوش قسمتی ہی تھی۔ مگر پھر میں نے مختلف برطانوی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواستیں دے دیں۔ تھرڈ ڈویژن کے ساتھ آکسفورڈ یا کیمبرج میں داخلے کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے لندن یونیورسٹی کا فیصلہ کیا جو تین کالج مجھ پر کھلے تھے ان میں سے میں نے کنگز کا انتخاب کیا' اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ یونیورسٹی کالج یا لندن سکول آف اکنامکس سے زیادہ بولنے میں اچھا لگتا تھا۔ میں ایل۔ایل۔بی کے لیے درج کر لیا گیا اور اسی کے ساتھ میں نے بیرسٹر کے طور پر کوالیفائی کرنے کے لیے انر ٹیمپل کی رکنیت کی درخواست بھی دے دی۔

میں نے ہندوستان میں اپنی آخری گرمیوں کی چھٹیاں شملہ میں گل خاندان کے ساتھ ان کے وسیع گھر لانگ وڈ میں گزاریں' جو کبھی چارلس ڈکنز کے پوتے کی ملکیت تھا۔ سیوا سنگھ گل کا زندگی بسر کرنے کا انداز اس کے وسائل سے بالاتر تھا۔ میرے باپ کے دل میں اس کی بیوی کے لیے نرم گوشہ تھا اور وہ اکثر شام کو شراب پینے کے لیے جنتر منتر میں سڑک پار جایا کرتا تھا۔ تینوں اکٹھے یورپ کی سیر کر چکے تھے اور بظاہر بہت اچھا وقت گزار آئے تھے۔ میرا باپ جہاز میں اور یورپ کے مختلف شہروں میں رونما ہونے والے واقعات کی روداد سنانے سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ سیوا سنگھ کی بہن کی شادی منولی کے چیف امراؤ سنگھ کے ساتھ ہوئی تھی۔ امراؤ نے دوسری شادی کر لی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری شادی کو تکمیل تک پہنچا پائے اس کی پہلی بیوی نے ریذیڈنٹ پنجاب سٹیٹس کے ہاں امراؤ سنگھ سے جنم لینے والے ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی پیدائش کا اندراج کروا دیا۔ دونوں بچوں کو کسی ہسپتال سے لیا گیا تھا۔ بڑی لڑکی واضح طور پر کسی یورپی نرس کی اولاد تھی' لڑکے کی ولدیت غیر معلوم ہی رہی۔ امراؤ سنگھ کے حقیقت تک پہنچنے تک دونوں بچے بڑے ہو چکے تھے۔ وہ راضی برضا ہو گیا اور اس کی دوسری بیوی بھی خاموشی سے مان گئی' جو کہ ایک سچی مذہبی عورت تھی۔ امراؤ سنگھ' اس کی دو بیویاں اور بچے گل خاندان کے ساتھ لانگ وڈ میں شیر و شکر ہو کر رہا کرتے تھے۔

امراؤ سنگھ ایک رنگین مزاج اور نظارہ باز شخص تھا۔ وہ بلا کا مے نوش تھا' صبح سے دیر گئے رات تک شراب پیتا رہتا تھا۔ پھر دفعتاً وہ دو ماہ کے لیے شراب ترک کر دیتا یہاں تک کہ

شراب کی آرزو دوبارہ بیتاب نہ کر دیتی۔ میں جس زمانے میں ان کے ساتھ قیام پذیر ہوا تو ان دنوں وہ شراب نوشی کے دورے سے گزر رہا تھا۔ ایک رات اس نے گھریلو ملازمہ کو زبردستی میرے کمرے میں دھکیل دیا کہ وہ میرے ساتھ زنا کا ارتکاب کرے جبکہ وہ پردے کے پیچھے سے اس منظر کا نظارہ کرے گا۔ اپنے آقا کے اکسانے کے باوجود اس نے خود کو اپنی شلوار قمیض سے محروم کرنے سے انکار کر دیا۔ جب امراؤ سنگھ ایک اور جام بھرنے گیا تو وہ باہر کھسک گئی اور میں نے اس کے پیچھے کمرے کی اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑی ریاستوں کا ایک سربراہ لانگ وڈ میں شب بسری کے لیے آیا وہ بھی امراؤ سنگھ کی طرح زبردست نشے میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امراؤ اس سے محبت کرے۔ امراؤ نے اس کے شوفر کو اوپر بلا بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ سربراہ ریاست سے لواطت کرے۔ شوفر نے تعمیل کی۔ امراؤ مختلف زاویوں سے اچھل اچھل کر جوڑے کا نظارہ کرتا رہا اور تالیاں بجاتا رہا۔ بتایا جاتا تھا کہ وہ خود بالکل نامرد ہو چکا تھا۔

میں 1934ء کے گرمیوں کے موسم میں دہلی سے لندن روانہ ہوا۔ یہ ایک آنسوؤں بھرا الوداع تھا' میرے والدین' رشتہ دار اور دوست سٹیشن پر مجھے رخصت کرنے کے لیے ہار لیے موجود تھے۔ میرے بڑے بھائی اور اس کی بیوی امر جیت بمبئی تک میرے ساتھ گئے۔ وہاں سے میں اطالوی بحری جہاز کونٹ روسو پر سوار ہوا۔ میں بحری جہاز پر کسی کو بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی انگلینڈ میں میرا کوئی دوست تھا۔ صرف روما بسو اس مجھ سے پہلے اعلیٰ تعلیم کا ایک کورس کرنے وہاں گئی ہوئی تھی۔

چوتھا باب

انگلستان کو دریافت کرتے ہوئے

بحری جہاز کے سفر میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو ہم سفروں کو باقی ساری زندگی کے لیے دوستی کے بندھن میں باندھ دیتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کا بھی اس طرح تذکرہ کرتے ہیں گویا ایڈونچر کے رزمیوں کو کبھی نہیں بھلائیں گے۔ یہ اس دنیا' جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے ہوتے ہیں اور آنے والی نئی دنیا کے درمیان بےفکری کا زمانہ ہوتا ہے۔ ایک محدود جگہ پر رہنے کی حالت اس قسم کی رفاقت کا احساس پیدا کرتی ہے جو ایک ہی رجمنٹ میں خدمات انجام دینے والے لوگوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ بعد کی زندگی میں جب کبھی ان کی ملاقات ہوتی ہے ان کا ایک دوسرے سے دوبارہ تعارف یوں ہوتا ہے: کیا ہم نے بمبئی سے لندن تک ایک ہی جہاز میں سفر نہیں کیا تھا؟''

بمبئی سے ساؤتھمپٹن تک کے بحری سفر میں گیارہ دن لگے جس میں عدن اور پورٹ سعید پر چند گھنٹوں کا وقفہ بھی شامل تھا۔ جہاز اسمٰعیلیہ پر بھی مختصر وقفے کے لیے رکا تھا' ان مسافروں کو اتارنے کے لیے جو اہراموں اور قاہرہ کی سیر کرنے کے خواہش مند تھے اور جنہوں نے پورٹ سعید پر دوبارہ جہاز میں سوار ہو جانا تھا۔ اکثر و بیشتر جہازوں کو نہر سویز کے داخلی راستے پر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا' ان پائلٹوں کو لینے کے لیے جو بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کو ملانے والی ستر میل لمبی نہر سے انہیں گزار سکیں۔ یہ ایک سست رفتار سفر تھا' جہاز آگے پیچھے قطاروں میں رواں تھے اور دونوں طرف وسیع و عریض صحرا تھا جس میں گرد سے اٹی ہوئی بے نام بستیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔

کونٹ روسو پر اکانومی کلاس میں سفر کرنے والے زیادہ تر ہندوستان کے مختلف حصوں کے طلب تھے۔ وہاں سو سے زیادہ مرد اور درجن سے زیادہ عورتیں موجود تھیں۔ میں صرف ایک شخص ارجن سنگھ سے واقف تھا جو گورنمنٹ کالج میں میری کلاس میں ہوا کرتا تھا۔ وہ سال بھر پہلے انگلینڈ جا چکا تھا اور اپنے باپ باوا ڈنگا سنگھ' جو لکڑی کا ایک خوش حال ٹھیکیدار تھا' کے ساتھ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ ارجن نے مجھے اپنے پہلے دورے میں بیتے ہوئے

زبردست وقت کا حال سنایا تھا' سفید لڑکیوں کو پھانسنا کس قدر آسان تھا اور پورٹ سعید کے چکلوں میں کوئی شخص تھوڑے سے ہی پیسوں میں ابتدائی مشق کر سکتا تھا۔

میرا دوسرا واحد آشنا چہرا سوم ناتھ چبب کا تھا جو حال ہی میں دیال سنگھ کالج لاہور میں لیکچرر مقرر ہوا تھا۔ دو ہفتے پہلے اس کی شادی لاہور یونیورسٹی کی ایک معروف حسینہ ساوتری بھلہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک ہنی مون بحری سفر تھا۔ وہ اپنا وقت ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے اور سب کے سامنے چومنے میں گزارتے اور تیزی سے اپنے کمرے میں میں چلے جاتے تھے۔ ان کی اس سرگرمی سے بہت زیادہ حسد اور چہ میگوئیاں پیدا ہوئیں۔

ہم ایک کیبن میں چھ مرد تھے۔ تعارف کروائے جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کے لیے گھنٹہ (گانگ) بج گیا۔ کھانے کے کمرے میں جانے سے پہلے ہم جہاز کو بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہوتے دیکھنے اور اپنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو الوداع کہنے چلے گئے جو ہمیں رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ پھر ہم سمندر میں اپنے پہلے کھانے کے لیے سیڑھیاں اتر گئے۔ ابھی سوپ ہی پیش کیا گیا ہوگا کہ جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ یہ مون سون کا زمانہ تھا اور بحر ہند بہت طوفانی ہو رہا تھا۔ ہم نے سوپ ادھورے چھوڑ دیئے اور اپنے اپنے کیبنوں میں جا گھسے۔ کچھ لوگ واش بیسن میں قے کرنے چلے گئے' میں اپنی اوپر والی برتھ پر جیسے تیسے چڑھا اور متلی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا میں نے جہاز کو اس طرح چرچراتے ہوئے سنا گویا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے ہی والا ہو۔ میں اگلے تین دنوں میں اپنی دیوار گیر نشست میں سے صرف سانس بحال کرنے اور توازن برقرار رکھنے کے لیے نکلا تھا۔ کبھی کبھی کیبن سٹیورڈ (خدمت گار) مجھے روٹی اور پھل لا دیتا تھا جو میں واپس کر دیتا تھا۔ اذیت و کرب میں تین دن اور تین راتیں بسر کرنے کے بعد کونٹ روسو نے ہچکولے کھانے بند کر دیئے۔ ہم طوفانی پانیوں سے باہر نکل آئے تھے۔ اگلے روز جہاز عدن میں لنگر انداز ہوا۔

عدن کے بازاروں میں' جو زیادہ تر ہندوستانیوں کی ملکیت میں تھا' چند گھنٹے گھومنے پھرنے میں میری چند ہم سفروں سے شناسائی ہوگئی۔ میں صرف دو کا نام لوں گا جو میری بعد کی زندگی میں دوبارہ ظاہر ہوئے۔ ایک لکشمی کانت جھا تھا جس نے آئی سی ایس کیا اور ستر برس کی عمر میں مرنے سے پہلے حکومت میں کئی اہم عہدوں پر رہا۔ وہ ریزرو بینک آف انڈیا کا گورنر بنا' امریکہ میں سفیر رہا' جموں اور کشمیر کا گورنر رہا اور وزیراعظم لال بہادر شاستری کا معاشیات کا مشیر اعلیٰ رہا۔ وہ دست شناسی اور علم نجوم میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ ٹھگنا اور بلپلا تھا تاہم نوجوان اور خوب صورت عورتوں کا سرگرم والہ و شیدا تھا۔ جھا اور میں لندن میں چند مہینوں کے لیے ایک ہی ''پنشن'' میں رہے اور بعد کے برسوں میں ایک دوسرے سے

مسلسل ملاقات کرتے رہے۔ وہاں ایک خاص مس نہرو بھی تھے' آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم کی ایک دور کی رشتہ دار۔ وہ ہمیشہ ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی پہنا کرتی تھی اور ہمیں وعظ دیتی کہ ہندوستان کے سفیروں کی حیثیت میں ہمیں کس طرح ملک سے باہر جانا چاہیے۔ اس کے بارے میں مزید آگے چل کر۔

عدن کے بعد کا سفر بہت خوش گوار تھا۔ بحیرۂ احمر کسی جھیل کی طرح پرسکون تھا۔ ہم عرشے پر ٹینس' کوئٹس' ٹیبل ٹینس کھیلتے یا لڑکیوں کے ساتھ گپیں لگاتے تھے۔ قریبی صحراؤں سے گرم ہوائیں چلتیں۔ کبھی کبھار مہاجر پرندے جہاز پر اُتر آئے' اڑن مچھلی اکثر عرشے پر آجاتی۔ ایک شام جونہی سورج غروب ہوا' جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی سارے سمندر میں ڈالفن مچھلیاں پانی میں اندر باہر اچھلنے لگیں۔ رات کے وقت آسمان ان گنت ستاروں کی روشنی سے جگمگاتا تھا۔ چاندنی راتوں میں سمندر وسیع پھیلے ہوئے سیماب (پارے) کی طرح جھلملاتا تھا۔ بحری جہاز کا سفر میری بعد کی زندگی میں کیے جانے والے بے روک (نان سٹاپ) ہوائی سفروں سے کہیں زیادہ خوشگوار تھا۔۔۔ ہوائی سفروں میں تو شراب پیتے' محدود حالات میں جلدی جلدی زیادہ کھاتے ہوئے اور فلمیں دیکھتے ہوئے وقت کاٹنا پڑتا ہے۔

اہراموں کو دیکھنے کی خواہش مند پارٹی کو اتارتے ہوئے ہم نہر سویز میں داخل ہو گئے۔ عرشے سے پانی مشکل ہی سے دکھائی دے رہا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا گویا بہت بڑے رتھ پر سوار دھیرے دھیرے صحرا میں سے گزر رہے ہوں۔ مصری سمت نہر کے ساتھ ساتھ ایک سڑک تھی' چھوٹی ولاز گزرتیں اور کبھی کبھی بستیاں۔ دوسری سمت ایک وسیع' بنجر' ناہموار' ریت سے بھرا دشت تھا۔ سفر کے اسی مرحلے میں باوا ارجن سنگھ نے ان نوجوانوں کی فہرست بنائی تھی جو پورٹ سعید میں اپنا کنوارا پن گنوانے کے خواہش مند تھے' میں ان میں شامل نہیں تھا۔

ہم پورٹ سعید میں چھ گھنٹوں کے لیے لنگر انداز ہوئے۔ جونہی ہم نے قدم زمین پر رکھے ہمیں سرخ ترکی ٹوپیاں اور چیلابوں میں ملبوس چکنائی زدہ سے آدمیوں نے گھیر لیا' جو عریاں پوسٹ کارڈز فروخت کرنے اور ہمیں مصری چکلوں کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دینے کی کوشش کر رہے تھے! وہ ایک ہاتھ کی پہلی انگلی کو دوسرے ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے سے بنائے گئے سوراخ میں گھسیڑ کر کہتے: ''تم لب لب نہیں کرو گے؟'' ہم نے انہیں دھتکار دیا۔ کچھ دوسروں نے دلالی کے لیے ہماری منزل سائمن آرٹز ڈیپارٹمنٹ سٹور تک پیچھا کیا۔ میں نے اتنا بڑا سٹور کبھی نہیں دیکھا تھا' اس زمانے میں وہ ایشیا میں سب سے بڑا سٹور تھا۔ وہ یہودیوں کی ملکیت تھا مگر وہاں آسودہ حال مصری ہی زیادہ تر آیا کرتے تھے۔ میں کوئی شے خریدے بغیر تحیر اور مرعوبیت کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا پھرتا رہا۔ پھر میں اس تنگ

راستے پر چلنے لگا جو نہر سویز کے نقشہ گر (آرکیٹکٹ) فرڈینینڈ ڈی لیسیپ کے مجسمے تک جاتا تھا۔ جس وقت میں واپس پہنچا تو کونٹ روسو کی روانگی میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ عرشے پر جانے سے پہلے میں کھجوروں کا کارٹن خریدنے لگا۔۔۔ وہ کھجوریں' ان کھجوروں سے زیادہ بڑی' زیادہ سیاہ اور میٹھی تھیں' جو میں نے ہڈالی میں دیکھی تھیں۔ میں ٹھیلے والے سے ان کی قیمت آدھی کروانے میں کامیاب ہو گیا اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے فتح مندانہ انداز میں عرشے پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ درجن کھجوروں کی ایک تہہ کے بعد محض برادہ بھرا ہوا ہے۔

میں نے ہم سفروں کو خبردار کر دیا جو جہاز کے ساتھ ساتھ تیرتی ہوئی کشتیوں سے چیزیں خرید رہے تھے جبکہ ان اشیاء کو رسیوں سے لٹکی ہوئی ٹوکریوں میں رکھ کر اوپر بھیجا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے چاکلیٹ کے بکسے خریدے تھے' انہیں بھی پہلی تہہ کے نیچے کچھ نہیں ملا۔ کچھ لوگوں نے پرفیوم خریدے تھے' جن کے نام تو فرانسیسی برانڈوں کے سے تھے مگر ان میں خوشبودار تیل ہی بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں کئی مرتبہ پورٹ سعید اور قاہرہ سے گزرا مگر میں نے کبھی مصر سے دوبارہ خریداری نہیں کی۔

اس شام ہم نے ان مردوں کے ایڈونچر سنے جنہوں نے چکلوں کی سیر کی تھی۔ انہیں اپنے اوپر پھول نچھاور کرنے والی کوئی حور شمائل نہیں ملی تھی' بلکہ محض ادھیڑ عمر' موٹی' عرب اور سیاہ فام عورتیں ہی ملی تھیں۔ ایک مرتبہ چکلوں میں داخل ہو جانے کے بعد ان کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہیں سودے بازی کے بعد طے کیے گئے معاوضوں سے زیادہ رقم بخشیش کی صورت میں دینا پڑی تھی۔ عورت کے بدن سے ان کا پہلا اتصال ہونے کی وجہ سے دخول کرتے ہی انزال ہو گیا تھا۔۔۔ کچھ تو اتصال سے پہلے ہی فارغ ہوئے شتابی سے۔ جس بات کی انہیں زیادہ تشویش تھی وہ جنسی بیماریاں لگ جانے کا خوف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے حفاظتی ادویات کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اگلے روز تک وہ سوزاک اور آتشک کی سنی سنائی علامات کے تحت اپنے اپنے عضو تناسل کا معائنہ کرتے رہے۔ مردوں نے جو کچھ کیا تھا اس کی سن گن نہرو لڑکی کو بھی مل گئی۔ ایک صبح اس نے ہمیں اکٹھے ملاقات کے لیے بلا لیا۔ اس بات کا انکشاف کیے بغیر کہ اسے کیا سن گن ملی ہے اس نے ہمارے غیر شائستہ طرز عمل پر ہمار سرزنش کی۔ اس نے کہا:

''کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمہارے ملک کے بارے میں تمہارے پورٹ سعید کے کرتوتوں کی روشنی میں سوچا جائے۔''

بحیرۂ روم پرسکون ہی رہا اور سارے سفر میں دھوپ نکلی رہی۔ ہم خلیج بسکے میں آبنائے جبرالٹر سے گزرے جو اپنی طوفان خیزی کی وجہ سے بدنام تھی۔ ہم خوش قسمت ثابت

ہوئے۔ اسی طرح اپنی فتنہ انگیزی کے لیے جانی جانے والی انگلش چینل سے بھی سکون سے گزر گئے۔ ہم ساؤتھمپٹن میں لنگرانداز ہوئے اور بوٹ ٹرین سے لندن روانہ ہو گئے۔ میرے پاس کوئی رستا نہیں تھا کہ جانا کدھر کو ہے۔

روما بسواس وکٹوریا سٹیشن پر میرے استقبال کے لیے موجود تھی۔ جیسا کہ مین پہلے بیان کر چکا ہوں کہ میں اسے گورنمنٹ کالج سے عاشقانہ خط لکھا کرتا تھا۔ میں دہلی میں ایک مرتبہ چھٹیوں میں اس سے ملنے ماڈرن سکول بھی گیا تھا۔ چھت پر اس کا کمرہ تھا۔ ہم شام کو دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ جب ہم باہر نکلے تو پورا چاند نکلا ہوا تھا' اسے خدا حافظ کہنے کی بجائے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور زبردستی اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا۔ اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''سچ مچ' تم ایسا کر سکتے ہو؟'' میں سیڑھیاں اتر کر نکل بھاگا تھا۔ لاہور واپس آ کر میں نے اس کو خط لکھ کر اپنے طرز عمل کی معافی مانگی تھی۔ اس نے سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دیا تھا۔ تاہم اس کے خط بھی میرے خطوں کی طرح گرم ہو گئے تھے۔ میں پر یقین نہیں تھا کہ وہ میرا استقبال کس طرح کرے گی۔

میں زیادہ دیر دبدھے میں نہیں رہا۔ جونہی گوور سٹریٹ میں واقع ہندوستانی طلبا کی یونین کے ہاسٹل میں جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھے اس نے اپنے بازو میرے گرد ڈال دیئے اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے چپکا دیئے۔ ہم ٹیکسی کے ہاسٹل پہنچنے تک ایک دوسرے کو شدت جذبات کے ساتھ چومتے رہے۔ وہاں کوئی کمرہ دستیاب نہیں تھا۔ سیکرٹری نے سڑک پار ایک ''پنشن'' کی نشانی دہی کی اور ہمیں وہاں کوشش کرنے کا کہا۔ ہم میرے سفری تھیلے سمیت وہاں گئے۔ ایل۔ کے جھا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ پنشن کو سیرافینو نامی ایک اطالوی چلا رہا تھا' وہ ایک چھوٹے قد والا' سوکھا' جھریوں والا آدمی تھا جبکہ اس کی لمبی اور موٹی تازی بیوی کھانے پکایا کرتی تھی۔ انتظامیہ میں کام کرنے والی دو خادماؤں میں سے ایک نے مجھے اوپر ایک کمرہ دکھایا۔ سونے کے لیے بستر اور ناشتے کا خرچ میرے وسائل کے مطابق تھا۔ میں نے ابتدائی چند مہینوں کے لیے وہاں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی ہم نے تنہائی پائی' روما اور میں بستر میں گر گئے اور ایک دوسرے کو شدت جذبات سے چومنا شروع کر دیا۔ میں نے کبھی کسی عورت کی قربت کا تجربہ نہیں کیا تھا اور میں پر یقین نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو اتنا چوما کہ وہ دکھنے لگے۔ میں نے وحشت کے ساتھ اس کی ساری اتارنے کی کوشش کی۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ یہ حرکت اچھی نہیں تھی۔ مجھے کاملاً شرمندگی محسوس ہوئی اور میں اس کو مزید ملنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے مجھے جھاڑتے ہوئے کہا تھا: ''یہ محبت نہیں ہے' یہ تو ہوس ہے۔'' تاہم وہ بھی

گرم ہو چکی تھی اور اس نے مجھے جانے نہیں دیا۔ جونہی میں ندامت کے عالم میں بستر پر لیٹا وہ میرے اوپر چڑھ گئی۔ اس نے مطالبہ کیا: ''وعدہ کرو کہ دوبارہ ایسا کرنے کی کوشش نہیں کرو گے!'' وہ دھینگا مشتی ساری کی ساری دوبارہ برپا ہوئی۔ اور ایک بار پھر اسی طرح انجام پذیر ہوئی۔ مجھے اس سے اور اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

میں روما کے ساتھ مزید مواقع پانے کا خواہش مند نہیں تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ ہم نے ایک راستے میں واقع کیفے میں جا کر کھانا کھایا۔ کرم یہ ہوا کہ پنشن کے ضوابط اندھیرا چھا جانے کے بعد کسی عورت کے ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

اگر روما ٹین ایجرز سے معاملہ بندی میں زیادہ تجربہ کار رہی ہوتی تو وہ انگلینڈ میں میرے قیام کے سارے عرصے میں میری داشتہ بنے رہنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ جس میں وہ کامیاب ہوئی وہ یہی تھا کہ مجھے خود سے اور جنس سے کئی مہینوں کے لیے دور رکھے۔ اگلے چند روز تو اس نے پنشن کا محاصرہ کیے رکھا۔ میں اس کی خود کو کمرے میں تنہا پانے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتا تھا۔ وہ غصے میں آ کر چلی گئی اور ماڈرن سکول کے زیادہ پرانے تجربہ کار طالب علم سے ملنے جلنے لگی۔ میں اس کا راستہ کھو چکا تھا۔

لندن سے مجھے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ میں اس کی گلیوں' اس کی خوبصورتی سے بنی ہوئی دکانوں کی کھڑکیوں' اس کی بسوں' ٹرام کاروں' انڈر گراؤنڈ (زیرزمین ریلوے) اور اس کی خوشبوؤں کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر اس کی عورتوں نیز ان سے متعلق ہر ایک شے سے محبت کرنے لگا۔ میں نے ابتدائی چند دن اس سے واقف ہونے میں گزارے۔ میں ٹوٹنہام سرکس کے اوپر ہوتا ہوا آکسفورڈ سٹریٹ سے ماربل آرچ آتا اور واپس آکسفورڈ سرکس پہنچ کر ریجنٹ سٹریٹ سے ہو کر پکاڈلی سرکس' لائسسٹر اور ٹرافالگر سکوائرز پہنچتا۔ میں سینٹ مارٹن ان دی فیلڈز کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کبوتروں کو دانہ کھلاتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہتا' میں لاکھوں کی تعداد میں گرسلوں کو چہچہاتے ہوئے سنتا۔ جب شام کا دھندلکا تاریکی میں تبدیل ہونے لگتا تو میں سٹینڈ سے ہابرن' بلومسبری سے ہو کر عشائیے کے لیے وقت پر پنشن پہنچ جاتا۔

چند دنوں میں زندگی کا ایک لگا بندھا معمول بن گیا۔ صبح کا آغاز یونیورسٹی کالج میں رومن لا پر لیکچر سے ہوا کرتا۔ ہمارا استاد ڈاکٹر جولووٹز ایک بہت درشت رو اور زود رنج آدمی تھا۔ پھر میں سٹرینڈ میں واقع کنگز کالج کے لیے بس میں سوار ہوتا۔ وہاں ڈین آف سٹڈیز ڈاکٹر پوٹر ہمیں برطانوی قانون پر لیکچر دیتا۔ پھر آلڈوچ کے پار لندن سکول آف اکنامکس میں ہر دو ہفتے بعد سیاست پر پروفیسر ہیرالڈ لاسکی کا خطاب' ٹارٹ کے قانون پر پروفیسر ڈیویز کا لیکچر اور دستوری قانون پر پروفیسر آئیور جیننگز کا لیکچر سننے کے لیے جاتا۔ شام کو میں گیس لائٹوں سے

روشن ہابرن میں سے گزرتا' جہاں ساز بجانے والے مقبول عام دھنیں بجا رہے ہوتے' برٹش میوزیم سے ہو کر سیرافینو کے ادارے تک پہنچ جاتا۔ اکثر میں رات کا کھانا ہندوستانی طلبا کے ہاسٹل میں کھایا کرتا تھا کیونکہ یہاں چاول اور کڑھی سب سے سستے ملتے تھے۔ کبھی کبھی میں ایک اطالوی ریستوان بھی چلا جایا کرتا تھا جہاں تم پانچ شلنگ میں پستا کا بھرپور کھانا کھا سکتے تھے۔ ٹرم کے زمانے میں انر ٹیمپل میں ڈنر بھی ہوا کرتے تھے۔ آدمی کو سیاہ لباس اور سیاہ گاؤن پہن کر آنا ہوتا تھا۔ ہر چار کھانے والوں کے لیے پورٹ یا سرخ وائن کی ایک بوتل ہوا کرتی تھی۔ برطانوی طلبا ہمیشہ اضافی گلاس کے متمنی ہوتے تھے اور اپنے چوکے میں شامل کرنے کے مجھے ڈھونڈا کرتے تھے تاکہ وہ میرا حصہ لے سکیں۔

نومبر میں سردیاں آجاتی تھیں۔ پھر مٹر کی یخنی والی بھوری اور زرد رنگ کر دینے والی دھند چھانے لگتی۔ تم اپنے پھیلے ہوئے بازو سے آگے بہت ہی مشکل سے دیکھ سکتے تھے۔ مجھے سردی لگ گئی' جس کے ساتھ ہی کھانسی اور بخار نے آلیا۔ میں نے جس ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا اس نے مجھے لندن سے چند ایک روز کے لیے چلے جانے کا کہا۔ میں نے بکنگھم شائر میں کسی جگہ کے لیے ٹرین لی اور نیو فاریسٹ کے قلب میں واقع ایک شراب خانے کی چھت پر ایک کمرہ ڈھونڈا۔ جلد ہی تازہ ہوا اور بوقیذار' شاہ بلوط اور چیڑ کے درختوں کے درمیان سیروں نے میری چھاتی کو نزلے اور بلغم سے صاف کر دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں اور میں لندن واپس آنے کا شائق نہیں تھا۔

ایک رات کھانے کے بعد کی جنگلوں میں لمبی سیر کے بعد میں رکتے رکتے اپنے کمرے سے پہلی منزل پر آنکلا۔ میں نے داخلی ہال میں رات بھر کے لیے کمرے مانگنے کی آوازیں سنیں۔ زنانہ آواز جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے سے نکلا اور بالکونی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ وعظ و نصیحت کرنے والی نہرو خاتون تھی مع ایک نوجوان برطانوی مرد کے۔ اس نے مہمانوں کے رجسٹر میں بظاہر تو نام سنگھ لکھوایا تھا مگر اس وقت اس کے پاس کوئی انتخاب نہیں تھا اور وہ گریز نہیں کر سکتی تھی۔ جوڑے کو مجھ سے اگلا کمرہ دیا گیا اور انہوں نے رات وہاں اکٹھے بسر کی۔ اگلی صبح سویرے ہی وہ ناشتہ کیے بغیر ہی' جو کہ کرائے میں شامل ہوتا تھا' شراب خانے سے چلے گئے۔ جب میں نیچے کھانے کے کمرے میں گیا تو میں نے رجسٹر پر تیزی سے نگاہ دوڑائی: انہوں نے اپنے نام بطور مسٹر اور مسز فلاں یا فلاں برطانوی لکھوایا تھا: اس کے وطن سے باہر ہندوستانیوں کا اپنے ملک کے سفیر ہونے کے حوالے سے کیے گئے وعظوں کے عین مطابق اور ہندونسائیت کی پاکیزگی کے حوالے سے روایات کے عین مطابق! میرا اس کے ساتھ بہت سی تقریبات مثلاً گاندھی کی سالگرہ اور دیوالی میں آمنا سامنا

ہوا اور میں حیران رہ گیا کہ اس نے دوسروں کو غیر ملکوں میں کیسا طرز عمل اپنانا چاہیے کی نصیحتیں کرنے کی عادت سے چھٹکارہ نہیں پایا تھا۔

ایسے وقت بھی آتے تھے جب میں اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کرتا اور گھر کی یاد بے حد ستاتی۔ میری بہت ہی کم برطانوی طلبا کے ساتھ جان پہچان تھی اور وہ لندن کے دور دراز حصوں میں رہتے تھے۔ جن ہندوستانیوں سے میری میل ملاقات ہوئی وہ میرے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیلنے' ہندستانی طلبا کی یونین کے ہاسٹل میں ہر شام لازماً ملنے کے علاوہ مجھے اپنے دوستوں میں شامل نہ کرنے کی اپنی ہی خواہش کے حامل تھے۔ جھا آئی سی ایس کی تیاری کرنے میں بہت زیادہ مصروف ومحور ہا کرتا تھا اور میرے کمرے میں فقط میرے نوٹس مانگنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی پنشن کی دو برطانوی ملازمائیں' جو میرا بستر لگانے آیا کرتی تھیں' مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ میں انہیں جواب دینے کی اہلیتوں کا حامل نہیں تھا۔ انہوں نے جھا کو زیادہ قبولیت دینے والا پایا۔

میری کھڑکی سے دوسری جانب واقع یونیورسٹی کالج ہسپتال دکھائی دیتا تھا۔ اتوار کی راتوں کو وہاں ڈاکٹروں' طلبا اور نرسوں کے لیے رقص ہوا کرتے تھے۔ اپنی کھڑکی میں سے میں انہیں دائروں میں گھومتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ میں ویانا کے والزوں اور تازہ مشہور نغموں مثلاً ''ریڈ سیلز ان دی سن سیٹ'' (Red Sails In the Sunset) ''میوزک گوز راؤنڈ اینڈ راؤنڈ اینڈ کمز اپ ہیئر'' (Music Goes Round and Round and Comes up Here) اور ''لیمبیتھ واک'' (Lambeth Walk) سنا کرتا تھا۔ لوگوں کو خوشی مناتے اور لطف اندوز ہوتے دیکھ کر مجھے اپنی تنہائی کا احساس زیادہ ستانے لگتا تھا۔

ویک اینڈز تو بدترین ہوا کرتے تھے۔ میچم میں کالج کے میدانوں میں ٹینس یا ہاکی کھیلنے کے بعد میرے پاس لیکچر نوٹس کو صاف صاف لکھنے اور قانون کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ کرنے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ دلیر ہندوستانی مرد پکاڈلی سرکس میں چلے جایا کرتے تھے اور اپنے کرائے کے کمروں میں لے جانے کے لیے عورتیں لے لیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایسا کرنا بہت آسان تھا اور ان کا خرچ اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان عورتوں کو کسی شراب خانے سے ایک یا دو جام پلا دیئے جائیں اور گھر میں سینڈوچ کھلا دیئے جائیں۔ پھر وہ سٹرپ پوکر کھیلتے تھے۔ جو شخص سب سے چھوٹا پتا کھینچتا اسے ایک کپڑا اتارنا ہوتا۔ کھیل کے پندرہ منٹ ہی گزرتے اور دونوں اس طرح ننگے ہو جاتے جیسے وہ اپنے جنم دن تھے۔ پھر وہ فعل میں مصروف ہو جاتے۔ میں نے وہ سنسنی خیز کہانیاں سن رکھی تھیں' گرم بھی ہوا تھا مگر کبھی اتنا حوصلہ مجتمع نہیں کر سکا تھا کہ ان کی قائم کردہ مثالوں کی پیروی کروں۔ سب سے

بہترین جو میں کرسکتا تھا وہ تھا پکاڈلی سرکس' شیفرڈز مارکیٹ یا بیس واٹرروڈ کی ضمنی گلیوں کے چکر لگانا اور ان طوائفوں کو تاڑنا جو ان علاقوں میں کثرت سے موجود ہوتی تھیں۔ کبھی کسی نے مجھے بلاوا نہیں دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ان تک رسائی پاؤں گا تو وہ مجھے جھاڑ دیں گی' کسی اور وجہ سے نہیں صرف اس لیے کہ میں کالا تھا اور پگڑی باندھتا تھا اور ڈاڑھی والا تھا۔

اتواروں کو میں ہائیڈ پارک جایا کرتا تھا۔ میں ایک کشتی کرائے پر لے لیتا اور سرپینٹین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی کئی مرتبہ اسے کھیتا تاکہ جو اضافی توانائی میرے اندر درمیان میں کسی مقام پر مرتکز ہو گئی ہے اسے صرف کر دوں۔ ایسا کرنا زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ گھاس پر جوڑے زور سے جپھیاں ڈالے ہوئے بکھرے پڑے ہوتے تھے اور گزرنے والوں کو صاف نظر آتے تھے۔ برطانوی تاک جھانک میں بہت ادب آداب کا مظاہرہ کرتے مگر میرے جیسے مشرقی ان پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتے تھے۔ بعض اوقات وہ اپنے اوپر محض ایک میکنٹاش یا اوورکوٹ ہی اوڑھے ہوئے ایک دوسرے کے اوپر لیٹے ہوئے ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس طرح کی قربت سردخو والے برطانویوں کے لیے بھی بہت کافی ثابت ہوا کرتی تھی: ان کو ڈھانپنے والے کپڑے تیزی سے اوپر نیچے ہونا شروع ہو جاتے اور پھر ایک ڈھیر کی صورت میں ڈھے جاتے تھے۔ اگر وصال زیادہ ہی کھلا ڈلا ہو جاتا تو پولیس جوڑے کو نزدیکی پولیس سٹیشن لے جاتی تھی۔ انہیں تھوڑا سا جرمانہ ادا کرنے کے بعد جانے دیا جاتا تھا۔ سب سے بہترین جو میں کرسکتا تھا یہی تھا کہ اپنے کزن نریندر کو خط لکھ کر ان منظروں کو دوبارہ تخلیق کرتا۔ کبھی کبھی میں سٹرپ پوکر میں اپنے دوستوں کی جگہ خود کو دکھا دیا کرتا اور اس حیران کن وقت کے بارے میں اسے بتاتا جو میں نے گزارا ہوتا۔ سچ تو یہ تھا کہ انگلینڈ میں اپنے پہلے سال کے اختتام تک میں ہنوز ایک کنوارا ہی تھا۔

مجھے ایک ندامت تو یہ تھی کہ میں کسی برطانوی گھر میں نہیں رہ رہا ہوں۔ ایک برطانوی جس سے میری اچھی جان پہچان تھی وہ ہندوستانی پولیس کا سی۔ ایچ ایورٹ تھا' جو یونیورسٹی کالج میں قانون پر ایک کورس کر رہا تھا۔ وہ ایک شرمیلا اور کم گو آدمی تھا۔ یا ایں ہمہ اس نے ایک ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس افسر' جو کراچی کا کمشنر رہا تھا' کی بیٹی کے ساتھ اپنی شادی میں مجھے شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہنی مون کے بعد ایورٹ نے مجھے اپنی بیوی کے والدین کے دیہی مکان میں ایک ویک اینڈ گزارنے کی دعوت دی۔ وہ مہربان تو تھے مگر اپنے مہمان خانے میں ایک رنگ دار آدمی کی موجودگی سے قدرے تنگ سے تھے۔ میری بھی یہی کیفیت تھی۔ انہوں نے ڈنر کے لیے باقاعدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اعلیٰ طبقے کے برطانوی خاندانوں کی روایات کی سخت پاسداری کی ہوئی تھی۔ اگلی صبح وہ مجھے دیہی لومڑی کے شکار پر لے گئے۔ چونکہ

میں گھڑ سواری نہیں کر سکتا تھا' اس لیے مجھ سے معذرت کر لی گئی۔ تاہم میں نے نظارہ ضرور کیا: لباس کی رسومات' شکاری قسموں کے درمیان نظام مراتب' ہارنوں کے بجائے جانے' بگلوں کے تھمائے جانے' ایک بے چاری لومڑی کے مارے جانے اور اس کی دم (برش) کے کاٹے جانے کا۔ اپنا ہدف مار گرانے کے بعد انہوں نے کسی مذہبی سرگرمی کے بعد تقسیم ہونے والے پرساد کی طرح شیری کے جام لنڈھائے۔

گرمیوں کی چھٹیاں انگلینڈ میں گزارنے کی بجائے میں نے ہندوستان واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ میں ٹرین کے ذریعے جنیوا گیا اور ایک مرتبہ پھر بمبئی جانے کے لیے ایک لائیڈ ٹریسٹینو جہاز کونٹ ورڈے پر سوار ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ایک تجربہ کار مسافر کا سا طرز عمل ظاہر کیا۔ میں نے درجن بھر اطالوی الفاظ سیکھ لیے تھے اور چند مزید الفاظ اطالوی ریستورانوں کے دوروں کے دوران میں سیکھ لیے۔ Buon Giorno, Buono Sera, Grazie Si, No, Prefarvore, Quanto Costa? وغیرہ۔ مسافروں میں چب بھی اپنی چار ماہ کی بیٹی کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔۔۔ انہوں نے بلاخیز محبت کاری میں یہ عرصہ گزارا تھا۔ وہ اپنی کتابوں کے ساتھ لوٹ رہا تھا' اس کی بیوی نے اپنی بچی اٹھائی ہوئی تھی۔ ہم ایک ہی میز پر اکٹھے ہو گئے تھے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ (سٹاپ) برنڈیسی تھا جو کہ جنیوا سے براستہ سمندر چوبیس گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ برنڈیسی میں ہمارے لنگر انداز ہونے سے پہلے کی بات ہے کہ ساوتری چب نے جو کہ اطالوی بیروں سے مجھے گفتگو کرتا نوٹ کر چکی تھی' مجھ سے دریافت کیا: ''تم اطالوی بول سکتے ہو' کیا ایسا نہیں ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم مجھے بچی کے لیے گلیسرین کی بتیاں نہیں لا کر دے سکتے میری بیٹی کو قبض ہو گئی ہے اور میں اسے جلاب نہیں دینا چاہتی۔'' میں اس کا کام کرنے کے لیے تیار تھا۔

مجھے دواؤں کا ایک سٹور ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے شیلفوں کا جائزہ لیا تا کہ میں گلیسرین کی بتیوں کی طرف اشارہ کر سکوں' میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں نے اپنے درجن بھر الفاظ کے ذخیرے کے ذریعے اپنی ضرورت کی وضاحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوا فروش نے لفظ قبض سمجھ لیا اور مختلف قسم کی قبض کشا ادویات سامنے رکھ دیں۔ میں نے ''نہیں'' ''نہیں'' کہنے کے لیے اپنا سر ہلایا۔ پھر مڑی ہوئی انگلی کے ساتھ میں نے اپنے مقعد کی طرف اشارہ کیا۔ دوا فروش سمجھ گیا اور اس نے اینیما کرنے کا ایک آلہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں جان گیا کہ اب میں اپنی مطلوبہ شے کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ دفعتاً بچے کے لیے اطالوی لفظ

مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنا پیٹ تھپتھپایا (مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا) اور فتح مندانہ انداز میں چلایا ''بمبینو' پور بمبینو۔''

''اچھا' تو یہ بات ہے سینور!'' دوا فروش اس طرح بولا گویا سمجھ گیا ہو اور کاؤنٹر پر حمل روکنے کی گولیاں رکھ دیں۔ میں کسی بچے کی قبض دور کرنے والی بتیوں کے ساتھ نہیں بلکہ بہت سی پارٹیوں میں جان ڈال دینے والے لطیفے کے ساتھ کونٹ ورڈے واپس آیا۔

باقی کے سارے سفر میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ پورٹ سعید پر لیسیپ کے مجسمے تک ایک اور لمبی سیر کی گئی۔ میں نے کچھ بھی خرید نہیں کیا۔ ہم عدن میں لنگر انداز نہیں ہوئے اور بحر ہند پر سکون تھا۔ جلد ہی میں ہندوستان لوٹ آیا۔ میں نے دن تو بمبئی میں گھومتے پھرتے ہوئے گزارا اور شام کو ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

اس مرتبہ صرف میرے خاندان کے افراد ہی ریلوے سٹیشن پر میرے استقبال کے لیے آئے۔ وہ مجھے انہیں پرانے کپڑوں میں' جن میں مَیں ان سے رخصت ہوا تھا' ملبوس دیکھ کر مایوس ہو گئے۔ میری ماں نے مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا: ''تم ضرور عدن سے واپس آ گئے ہو گے۔'' ایسا ہی تب بھی کہا گیا جب میں شملہ میں اپنے چچا' چچی اور ان کی جڑواں بیٹیوں کے ساتھ ایک ہفتہ بسر کرنے کے لیے گیا۔ میرے چچی چچا نے' جب وہ لندن گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے چند سال پہلے لندن گیا تھا' وہاں گزارے جانے والے چند ہی مہینوں میں اس سے بہت زیادہ حاصل کر لیا تھا جو میں نے ایک سال میں حاصل کیا تھا۔ اس کے پاس دو جوڑے سیوائل روسوٹ تھے' وہ بہتر انگریزی بولنا سیکھ گئی تھی اور اس میں انگریزی سلاد کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی پسندیدہ شے کاہو کا سلاد (Lettuce) تھا' تاہم وہ اس کا تلفظ ''لیٹ اوسے'' (Let oose) کیا کرتی تھی۔ میری چچازاد لڑکیاں' جن کے ساتھ میں شام کو سیر کیا کرتا تھا' کہتی تھیں کہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے وہ ٹارزن کی چیخ ہے' جو وہ اپنے بندروں کے گروہ کو بلانے کے لیے مارتا ہے: یوہو۔۔۔ تاہم نریندر میری باتیں بہت شوق سے سنتا تھا جس کو میں برطانوی لڑکیوں کو پھانسنے کی گھڑی ہوئی کہانیاں سنا سنا کر مسحور کر دیا تھا۔

دو مہینے میری توقع سے زیادہ تیزی سے گزر گئے۔ میں نے بمبئی کے لیے فرنٹیئر میل لی' ایس۔ایس وکٹوریا پر سوار ہونے کے لیے۔۔۔ ایک اور لائیڈ ٹریسٹینو بحری جہاز (ہم ہندوستانی پی اینڈ او جہازوں سے گریز کرتے تھے کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ انگریز سٹیورڈ ہندوستانی مسافروں کی اتنی تعظیم نہیں کرتے تھے جتنی وہ انگریز مسافروں کی کرتے تھے) میں سہ پہر میں بمبئی پہنچا۔ میرے جہاز کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ میں نے وکٹوریا ٹرمینس سٹیشن میں کمرہ ڈھونڈا جہاں ٹرین سے اترا تھا۔ یہ کوئی اچھا انتخاب نہیں تھا مگر ذاتی وجوہات کے تحت

ایک یادگار انتخاب تھا۔

میں نے کمرے میں اپنا سامان رکھا اور اسے مقفل کر دیا۔ میں پاس پڑوس کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ میں نے خود کو ایک تنگ گلی میں پایا جہاں نیچے گھٹیا سی دکھائی دینے والی دکانیں اور اوپر والی منزل پر کھلی کھڑکیوں میں عورتیں بیٹھی تھیں۔ جونہی میری نظر اوپر پڑی ایک عورت مسکرائی اور اس نے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اس کے بلاوے کو ٹھکرا دیا اور چلتا رہا۔ میں نے جانا کہ میں تو طوائفوں کے علاقے کمتی پورہ میں موجود ہوں۔ میں گلی کے آخر تک گیا اور واپس آ گیا۔ جس عورت نے مجھے اشارہ کیا تھا وہیں اپنی کھڑکی میں موجود تھی۔ اس نے مجھے دوبارہ اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ ''کس راستے سے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اپنے کمرے تک آنے والے زینے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اندھیری سیڑھیوں سے گزرتا ہوا اوپر پہنچا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ عورت میرا استقبال کرنے کے لیے آئی ـــ وہ موٹی، کالی، درمیانی عمر کی تھی اور شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ ایک بھی خوش آمدیدی لفظ ادا کیے بغیر پنجابی میں بولی: ''اس کے دس روپے ہوں گے۔'' میں نے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے تھما دیا۔ اس نے لڑکے کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا اور حکم دیا کہ وہ اسے مکان مالک کو دے آئے۔ اس نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

وہ ایک تاریک، غلیظ کمرہ تھا جس میں ایک تیل کا لیمپ روشن تھا۔ اس کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ سوائے اس کی چارپائی کے، جس پر چکنائی دار دری بچھی تھی اور تکیہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا جس کا منہ لوٹے سے ڈھانپا گیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہونے کے لیے مڑی۔ اس نے میری ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''تم سردار کتنے اچھے دکھائی دینے والے لوگ ہوتے ہو، تم نے اس اپنی ٹھوڑی پر یہ جھاڑ کیوں اگایا ہوا ہے؟'' میں نے جواب نہیں دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میں ایک نوآموز ہوں۔ اس نے پوچھا: ''کیا تم پہلے کبھی عورت سے ملے ہو؟'' میں نے قدرے بیٹھی ہوئی سی آواز میں جواب دیا: ''نہیں تم پہلی ہو۔''

اس نے جواباً کہا: ''تم گھبرانا مت۔ میں بالکل صاف ستھری ہوں۔''

اس نے شلوار اتار دی اور قمیض کو اپنی کمر پر لپیٹ لیا۔ وہ گھڑے کی طرف گئی، لوٹا بھرا اور پانی کو اپنی رانوں کے درمیان بہایا اور کپڑے کے ایک میلے ٹکڑے سے اپنی اندام نہانی کو خشک کیا۔ وہ کمر کے بل چارپائی پر لیٹ گئی، اس نے دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا لیں، اس طرح کہ اس کے دونوں گھٹنے اس کی چھاتیوں پر مڑے ہوئے تھے۔ ''آؤ'' وہ اپنے بازو میری طرف پھیلاتے ہوئے بولی۔

اس وقت تک میں نے کسی عورت کی رانوں کے درمیان اتنی اچھی طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کملا بوس کے بالوں والے اعضائے مخصوصہ کی ایک سرسری سی جھلک نے مجھے گھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورت کے نچلے حصے کے متعلق میرا تصور وہی تھی جو میں نے سنگ مرمر کے مجسموں میں مشاہدہ کیا تھا' ان میں سے کسی کے ناف کے نیچے بال نہیں تھے۔ اس کالی موٹی عورت نے' جو میرے سامنے اپنی ٹانگیں اٹھائے لیٹی ہوئی تھی جس کے گھٹنے اس کی ٹھوڑی کو چھو رہے تھے' شیو کی ہوئی تھی۔ مجھے ٹھیک ٹھیک پتا نہیں تھا کہ مجھے دخول کہاں سے کرنا ہے۔ جونہی میں نے اپنی شلوار کھولی اور اس کے اوپر جھکا اس نے میرا عضو تناسل ایک ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے اس کے ہدف کی طرف لے گئی۔ جونہی میں نے اس میں دخول کیا' میں فارغ ہو گیا۔

وہ ایک مہربان طوائف تھی۔ اس نے ادراک کیا کہ میں نے اپنے پیسوں کے بدلے میں بہت تھوڑا حاصل کیا ہے۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی: ''اگر تم دوبارہ کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے تمہیں صرف پانچ روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔'' اسے دوبارہ کرنے سے پہلے میں پریقین نہیں تھا کہ اس عمل کو کتنا طویل ہونا چاہیے تھا اور معذرت کر لی۔ اس نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا: ''تمہارا جب دل چاہے چلے آنا' تمہیں میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں زیادہ بہتر لطف دوں گی۔ تم میری چھاتیوں کو چھو سکتے ہو اور مجھے چوم سکتے ہو۔''

میں وکٹوریا ٹرمینس میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اپنے مختصر ٹاکرے کا تصور میرے ذہن سے محو نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے طوائف کی طرف دوبارہ جانے اور ممکن ہو تو اس مرتبہ زیادہ اطمینان بخش پھیرا لگانے کا فیصلہ کیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سٹیشن کے دروازے بند ہیں' گورکھا محافظ نے مجھے بتایا کہ اگر میں باہر گیا تو مجھے صبح ہونے تک اندر آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ رکتے قدموں کے ساتھ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور تناؤ سے اپنے آپ کو نجات دلائی۔ میں پریقین نہیں تھا کہ میں اس مختصر ترین جنسی فعل کو بیان کر پاؤں گا' جس میں میں نے اپنا کنوارا پن گنوایا تھا۔ تاہم انگلینڈ کو واپس جاتے ہوئے بحری سفر کے دوران میں نے کئی اضطراری لمحے اپنے عضوِ تناسل کا معائنہ کرتے گزار دیئے کہ کہیں آتشک کے پھوڑے تو نہیں نکل آئے۔

چھٹیوں کے لیے روانہ ہونے سے پہلے میں سیرافینو کے پنشن سے ایک بورڈنگ ہاؤس منتقل ہو گیا تھا جس کی مالک مس وِیلے تھی۔ یہ بورڈنگ ہاؤس جنوب مغربی لندن میں کرسٹل پیلس سے قریب ہی تلسے ہل اور سٹریتھم کے درمیان نولیز روڈ پر واقع تھا۔ تین منزلہ پنشن ریلوے پٹڑی کے ساتھ واقع تھا جہاں سے ہر پانچ منٹ بعد ٹرینیں گزرا کرتی تھیں۔

مجھے ان سے مانوس ہونے میں دو دن لگ گئے تھے۔ مس ویلے کے بورڈنگ ہاؤس کے دیگر مکین تھے ایک بڑی عمر کا سکاٹ آدمی آرمسٹرانگ جو اس کی خواب گاہ کا شریک تھا' ایک درمیانی عمر کی لیڈی جو لانڈری کے معاملات دیکھتی تھی' دو عمر رسیدہ سکاٹ بہن بھائی' ڈنسمیورز' دو نرسیں مس میج برکھم اور مس للیئن بوتھ اور ایک نوجوان برطانوی کیمیادان۔

میرے لیے رہائش ہندوستانی طلبہ کے ہاسٹل کے سیکرٹری شورن سنگھ نے تلاش کی تھی' جس کا اپنا گھر اسی سڑک کے سٹریتھم والے سرے پر واقع تھا' جہاں وہ اپنی فرانسیسی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں اس کے ہاں ہفتے میں دو مرتبہ اس کی سوتیلی بیٹی سے فرنچ کے سبق لینے جاتا تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ میں ایک برطانوی لڑکی کے ہاں بال روم رقص سیکھنے کے لیے بھی جایا کرتا تھا۔

مجھے میج مارکھم کے کمرے سے اگلا بہت اچھا کمرہ ملا تھا۔ وہ تیس کے پیٹے کی سادہ سی عورت تھی۔ اس کی ہم پیشہ للیئن بوتھ قدرے کم عمر' پرشباب اور زیادہ پرکشش تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ زیادہ بہتر دکھائی دینے والی للیئن کے مقابلے میں سادہ دکھائی دینے والی میج کے ساتھ میرے امکانات زیادہ تھے۔ میج ہمارے لیے اپنے بھائی کے لکھے ہوئے ڈرامے کی ٹکٹیں لے کر آئی جو کہ ویسٹ اینڈ تھیٹر میں اچھا چل رہا تھا۔ میں نے اس پر چند مرتبہ نظریں ڈالیں اور حتیٰ کہ ایک رات پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا' اس کے احتجاج کے باوجود میں نے اسے چوم لیا۔ میں نے اسے ہندوستان سے خط لکھے تھے۔ اس نے میرے خطوں کے جوابات بھیجے۔

جب میں نولیز روڈ واپس پہنچا تو مجھے ذرا سے زیادہ کرائے میں پہلی منزل پر ایک زیادہ بڑا کمرہ دیا گیا۔ میں بورڈنگ ہاؤس میں دوسرے ہندوستانی طلبہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں ایک مکمل برطانوی اور سکاٹ معاشرتی ماحول میں تھا۔ شاموں میں ہم بیٹھک (لیونگ روم) میں اکٹھے بیٹھتے اور گپ شپ کرتے تھے' اکٹھے رات کا کھانا کھاتے اور اکثر ڈنر کے بعد کی سیر کے لیے سٹریتھم کامن پر اکٹھے نکل پڑتے۔ اگرچہ کالج پہنچنے میں مجھے بس اور ٹرین سے قریباً ایک گھنٹہ لگتا تھا لیکن میں نے اس تبدیلی کو سودمند پایا۔ قریب میں میرا ایک برطانوی ہم جماعت ڈینس وزڈم رہتا تھا۔ اس کا باپ مقامی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ ڈینس اکثر کھانے پر مجھے گھر مدعو کرتا تھا۔ میں وزڈم خاندان کا ایک رکن بن گیا تھا۔ میں نے وزڈم خاندان سے بعد میں رابطہ رکھا تھا اور جب میں انڈیا ہاؤس میں متعین تھا تب میں نے ڈینس کی شادی میں بھی شرکت کی تھی۔ ڈینس وکیل بن گیا تھا۔ وہ آسودہ حال ہو گیا' اس نے رولز رائس خریدی اور ٹیمز کے ساتھ ایک بڑا مکان خریدا۔ اس کی چھوٹی بہن نے

بھی مجھ سے رابطہ رکھا اور اپنے بچوں کو دہلی میں میرے گھر میں قیام کرنے کے لیے بھیجا۔

ملک سے باہر ہندوستانی ایک دوسرے سے چپک جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانی کلبوں کی رکنیت لیتے ہیں، باقاعدگی سے مسجدوں، مندروں اور گوردواروں میں جاتے ہیں اور گھر پر یا ہندوستانی ریستورانوں میں ہندوستانی کھانے کھاتے ہیں۔ وہ برطانویوں سے اس انداز سے نہیں ملتے جس طرح اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس طرح کی جزیرے جیسی محدود موجودگی سٹیریوٹائپس کو ترویج دیتی ہے — برطانوی بہت محدود (ریزروڈ) ہوتے ہیں، وہ اجنبیوں کو اپنے گھروں میں آنے کی دعوت نہیں دیتے ہیں کیونکہ وہ اپنے گھروں کو اپنے قلعے تصور کرتے ہیں، برطانوی عورتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے تو ان میں کسی سٹیریوٹائپ کو سچ نہیں پایا۔ میں نے ان برسوں میں انگریز عورتوں اور مردوں میں اتنے ہی قریبی دوست بنائے جتنا کہ ہندوستانیوں میں۔ میں درجنوں انگریز گھروں میں رہا اور ان کے خاندانی مسئلوں میں شرکت کی۔ اور میں نے پایا کہ اس سے زیادہ بے پر کی اور سچائی سے دور کوئی بات نہیں ہے کہ انگریز عورتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

میں ویلے ہاؤس میں کوئی سال بھر سے زیادہ عرصہ مقیم رہا۔ دونوں نرسیں اپنے کمروں سے خود نکلیں — دو بستر بہنیں جن کے اپنے باورچی خانے تھے۔ للیئن نے محسوس کیا کہ میں میج کی نسبت اس کے لیے زیادہ مائل ہوں۔ اپنے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے کی بات ہے میں نے اسے بتایا کہ ہیمپسٹیڈ کے ایک چھوٹے سنیما میں ایک بہت اچھی کانٹی نینٹل فلم دکھائی جا رہی ہے۔ وہ کہنے لگی: ''تم کیوں نہیں مجھے اپنے ساتھ لے چلتے؟'' ہم متعینہ انداز میں ایک انڈر گراؤنڈ سٹیشن میں ملے اور سنیما چلے گئے۔ جب روشنیاں بجھ گئیں تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فلم ختم ہونے کے بعد ہم ایک جام اور سینڈوچ کے لیے ایک شراب خانے میں گئے اور پھر ہیمپسٹیڈ ہیتھ پر چہل قدمی کرنے چلے گئے۔ جب ہم کیٹس کے کاٹیج کے قریب سے گزرے تو میں نے اسے ''اوڈ ٹو اے نائٹ انگیل'' **(Ode to a Nightingale)** کے ابتدائی اشعار سنائے۔

وہ متاثر ہوئی اور انعام کے طور پر اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے کین وڈ تک ٹہلتے چلے گئے اور وہاں ایک الگ تھلگ جگہ ڈھونڈی تاکہ ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بہتر جان سکیں۔ میرے لیے یہ ایک بے حد مسرت انگیز بات تھی کہ میں خود سے تھوڑی ہی بڑی عمر کی خوب صورت لڑکی کے اتنا قریب بیٹھا تھا اور لیوینڈر اور سٹارچ کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ اگلے ایک یا دو برس میں میں نے للیئن کو خوب دیکھا۔ ہم ہائیڈ پارک، کیو گارڈنز وغیرہ کی سیروں کو جایا کرتے تھے۔ ہم فلمیں دیکھنے اور ریستورانوں میں

جایا کرتے تھے۔ وہ مجھے ''دی سوان لیک'' دکھانے لے گئی۔ یہ پہلا بیلے تھا جو میں نے دیکھا۔ مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آسکی تھی۔ وہ اکثر اپنے کمرے میں مجھ سے پوچھا کرتی تھی ہم اتنی رات گئے کہاں چومیں۔ میں نے جو کچھ رومابسواس سے کیا تھا' اتنا آگے کبھی نہیں گیا! مجھے اب بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی چھاتیوں کو سہلاتا یا مزید آگے بڑھتا تاہم میں پر یقین ہوں کہ وہ میری طرف سے اس کے لیے متوقع تھی اور اسے ادراک نہیں تھا کہ میں ہنوز کنوارا ہوں (گو کہ ٹیکنیکلی نہیں) اور اس کا ممنون رہوں گا اگر وہ جنس کے بارے میں مجھے ایک دو باتیں سکھا دے۔ آہستہ آہستہ ہم دور ہوتے چلے گئے ــــ دل میں کسی کینے کے بغیر بلکہ ایک مایوسی کے احساس کے ساتھ۔ مجھے نہیں معلوم اس کا کیا بنا۔

کسی نے مجھے بتایا کہ ماڈرن سکول کا میرا ہم جماعت سیتندر رسنگھ یہیں کہیں لندن میں میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ میں اس سے ملنے کا مشتاق تھا کیونکہ انگلینڈ میں میرا کوئی اور ہندوستانی دوست نہیں تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ملے گا۔ ایک روز میں انڈر گراؤنڈ سے کالج جا رہا تھا اور جونہی ٹرین کے دروازے کھلے سیتندر اندر داخل ہوا' اور کیا چاہیے تھا' وہ کنگز کالج ہی کی میڈیسن فیکلٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اگلے دو برس ہم نے زیادہ تر وقت اکٹھے ہی گزارا۔ وہ کھیل اچھے کھیلتا تھا اور عورتوں کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کرتا تھا۔ ہم کالج کے کیفے ٹیریا میں اکٹھے دوپہر کا کھانا کھاتے تھے اور کامن روم میں ٹیبل ٹینس کھیلتے تھے۔

ایک واقعہ جس میں ہم ملوث تھے کالج کے کامن روم میں رونما ہوا۔ ایک خوب بنے ٹھنے' درمیانی عمر کے انگریز نے اپنا تعارف برطانوی خارجہ سروس کے ایک رکن کے طور پر کروایا' جس کا تقرر ہندوستان میں ہونا تھا۔ ہم نے دوسرے ہندوستانی طلبہ سے اس کا تعارف کروایا۔ دفعتاً وہاں چوریوں کا طوفان آ گیا ــــ زیادہ تر متاثرین ہندوستانی تھے۔ ایک سہ پہر میں ٹیبل ٹینس کھیل رہا تھا اور میں نے اپنا کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا تھا جہاں سیتندر اور یہ انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں نے کھیل ختم کیا اور اپنا کوٹ پہنا تو مجھے پتہ چلا کہ میرا بٹوہ غائب ہے۔ میں نے سوچا کے سیتندر نے مجھ سے عملی مذاق کیا ہے تاہم اس نے بٹوہ نکالنے سے انکار کر دیا۔ تب میرا شک انگریز کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند روز بعد ہی سکاٹ لینڈ یارڈ سے ایک سراغ رساں ان لوگوں کو ملنے آیا جن کی رقم کھو گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ شخص گرفتار ہو گیا ہے۔ چوریوں اور جیب تراشیوں کا اس کا طویل ریکارڈ تھا۔ اس کے متاثرین میں ایک اٹھارہ سالہ انگریز لڑکی بھی تھی جس کے ہینڈ بیگ سے اسی روز کیش کروائی گئی سالانہ سکالرشپ کی رقم اڑا لی گئی تھی۔ میں ان بہت سے طلبہ میں سے ایک تھا جنہیں بوسٹریٹ مجسٹریٹ کے سامنے اگر ضرورت پڑی تو گواہی

دیناتھی۔ وہ برطانوی انصاف کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ ہم گیلری میں بیٹھے دوسرے مقدموں کی کارروائی سنتے رہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ تمام ملزموں نے اقبال جرم کرلیا اور انہیں جرمانے اور قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ تب ہمارے ''خارجہ سروس'' والے فریبی کی باری آئی۔ اس کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی' خوبصورت لباس پہنے ہوئے' دل کش عورت جو تیس کے پیٹے کی شروعات میں تھی۔ اس شخص نے جرم کا اقبال نہیں کیا۔ مجسٹریٹ کے دریافت کرنے پر کہ کیا وہ کسی مدعی پر جرح کرنا چاہتا ہے اس نے میری طرف اشارہ کردیا۔ مجھے آگے آنے اور سچ بیان کرنے کا حلف لینے کا کہا گیا۔ میں نے کامن روم والا واقعہ سنایا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ مجسٹریٹ نے معاشرے کی لعنت اور غریب طلبہ کو لوٹنے والے کی حیثیت میں اس کو لعن طعن کی۔ اس کے ریکارڈ کے مدنظر اس نے اسے چار سال کے لیے جیل بھیجنے کی سزا سنائی۔ مقدمے کو نمٹائے جانے میں دس منٹ لگے تھے۔

میری نسبت سیتندر عورتوں کے ساتھ کہیں زیادہ دلیر تھا۔ ہر اتوار ٹینس یا ہاکی کھیلنے کے بعد وہ کوئی نہ کوئی لڑکی مکان پر لے آیا کرتا تھا۔ اس کی دلیری نے مجھے حیران کردیا تھا کیونکہ وہ بہت کم گو تھا اور کسی شخص سے کسی بھی موضوع پر مشکل ہی سے گفتگو کرسکتا تھا۔ جب ہم پیرس میں چھٹیاں منا رہے تھے تو میں نے اپنے لیے یہ جانا۔ ہم پینتھیئن کے نزدیک ایک پنشن میں مقیم ہوئے تھے۔ دیگر مکینوں کے درمیان ایک لمبی' چھریری' پرشباب اور چوڑے کولہے والی افریقی وامریکی لڑکی میری سٹوکس بھی تھی۔ وہ اس انسٹی ٹیوٹ میں فرانسیسی ادب میں ایک کورس کررہی تھی۔ جہاں میں ابتدائی فرینچ کی کلاسیں پڑھ رہا تھا۔ مجھے سیتندر سے کہیں زیادہ اس کی رفاقت کے مواقع دستیاب ہوئے تھے۔ اگرچہ یقینی تھا کہ وہ میری پیش رفتوں کو نہیں ٹھکرائے گی میں کوئی بھی پیشرفت کرنے سے قاصر تھا۔ سیتندر نے مجھے خبردار کیا: ''اگر تم میری سے اگلے تین دنوں میں زنا نہیں کرسکے تو میں تمہاری طرف سے اس کے ساتھ زنا کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ جو وہ کہتا ہے وہی کرتا ہے اور مزید مہلت کے لیے التجا کی۔

اسی دوران میں اس نے میری گھبراہٹ دور کرنے کے لیے مجھے فرانسیسی طوائفوں سے متعارف کروایا۔ اس نے ''دی پنک بک'' کے نام سے مشہور رسالے کا ایک شمارہ میرے لیے حاصل کیا' جس میں پیرس کے طوائف خانوں کے پتوں کی فہرست شائع کی گئی تھی۔ ان میں بیشتر گارسینٹ لازرارے کے علاقے میں واقع تھے۔ ہم ایک طوائف خانے گئے۔ ہمارا استقبال ایک میڈم نے کیا اور ہمیں شیشوں سے مزین دیواروں والے وسیع ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اس نے ہمیں اخراجات بتائے' بخشیش اس کے علاوہ تھی۔ اس نے تالی بجائی' درجن بھر لڑکیاں اندر آگئیں' سب کی سب سرتاپا عریاں تھیں۔ جب وہ اپنے ناف کے نیچے کے

بالوں کواس طرح بل دے رہی تھیں گویا وہ مونچھیں ہوں تو ان کے لیے شیمپین کا آرڈر دیا گیا۔ ہم نے شیمپین اور حاصل کردہ خدمات کے لیے معاوضہ ادا کیا۔ جو لڑکیاں ہمیں چاہئیں تھیں ہم نے ان کی نشاندہی کی اور وہ ہمیں اپنے اپنے الگ کمروں میں لے گئیں۔ جس طوائف کو میں نے چنا تھا اس نے اپنے اعضائے مخصوصہ کو دھویا اور مجھے بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے منہ میں دخول کرنا پسند کروں گا۔ میں نے سختی سے جواب دیا ''نہیں'' ـــــ جیسا کہ ماضی میں ہوا تھا' فعل چند سیکنڈوں میں ختم ہوگیا۔ مجھے سیتندر کے لیے کوئی آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا' وہ اپنے وصل کے کمرے میں سے بہت مسرور دکھائی دیتا ہوا نکلا' لڑکی بھی اسی کی طرح خوش تھی اور اسے دوبارہ آنے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے مجھے ''چھوٹیا'' کا خطاب دیا اور دوبارہ دھمکی دی کہ وہ میری کو میرے ہاتھوں سے اڑا لے گا۔

میں نے سیتندر کو یہ ظاہر کرتے ہوئے روکا کہ میں میری کو پھسلانے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ جبکہ میں نے صرف اس کے موٹے موٹے ہونٹوں ہی کو چوما تھا۔ وہ اس کو محبت کے معاملے (لوافیئر) کی شروعات سمجھ رہی تھی جس نے بعد میں تکمیلی درجے پر پہنچ جانا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ امریکہ چلی گئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے خط و کتابت جاری رکھی۔ تیس برس سے زیادہ عرصے کے بعد وہ مجھے ملنے روچیسٹر آئی' جہاں مجھے پڑھانے کے لیے تفویض کیا گیا تھا۔ اس کا وزن بہت ہی زیادہ بڑھ گیا تھا: لمبی' چھریری لڑکی جس سے میں پیرس میں ملا تھا گوشت کا پہاڑ بن چکی تھی۔ میں اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا۔ اس نے روچیسٹر آنے کے لیے رات بھر بس میں سفر کیا تھا۔ جب وہ نہا رہی تھی تو اس نے مجھے اپنی دو شادیوں اور ان محبوبوں کا بتایا جن کی وہ حامل رہی تھی۔ وہ غسل خانے سے اپنے دھڑ اور پشت کو تولیے سے رگڑتی ہوئی نکلی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ میں نے اس کی چھاتیوں کو سہلایا اور اسے چوم لیا۔ 'منی اب تم مجھ سے ہم بستری کرنے کی خواہش نہیں کرنا: تم نے پیرس میں ایسا نہیں کیا جب میں حقیقتاً ہم بستری کے لائق تھی۔'' میں نے کمزور سی کوشش ترک کردی۔ بعد میں اس نے مجھے طعنہ دیا: ''تم نے مجھے زیادہ زور سے نہیں اکسایا وگرنہ میں تو بخوشی جھک جاتی۔'' میں نے میری کو ڈیٹرائٹ میں زیادہ دیکھا جہاں اس نے میرے اور میری بیوی کے لیے ایک بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس کی اندھی ماں نے مجھے اپنی گود میں بیٹھنے کا کہا۔ ''میری نے مجھے تمہارے بارے میں بہت زیادہ بتایا ہے' اب میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنی انگلیاں میری پگڑی' ڈاڑھی اور چہرے پر اس طرح پھیریں گویا بریل پڑھ رہی ہو۔ وہ بولی: ''اب میں ٹھیک ٹھیک جانتی ہوں کہ تم کیسے دکھائی دیتے ہو۔'' میری نے بھی دہلی میں ہمارے گھر کی سیر کی۔ میرے بچے' جنہیں میری بیوی نے بتایا تھا کہ

تمہارے پاپا کی کالج کے دنوں کی گرل فرینڈ ڈنر کے لیے آ رہی ہے' اس کی آمد کے بڑے اشتیاق سے منتظر تھے۔ وہ ان کے لیے تحفے لائی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ سکا تھا کہ میری کے کبھی بوائے فرینڈ بھی رہے ہیں۔ میری میرے ایک افسانے ''سیاہ یاسمین'' کا موضوع بنی تھی۔ وہ حقیقت سے زیادہ فنتاسی تھا۔

میں واپس جنوبی لندن میں ویلیے کے پنشن میں آ چکا تھا۔ ایک شام آرمسٹرانگ اور لانڈری والی لیڈی کے درمیان خوفناک جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا تھا۔ آرمسٹرانگ نے بہت شراب پی ہوئی تھی اور اسے گالیاں دے رہا تھا۔ جھگڑے کے دوران میں ہم سب لیڈی کی طرف داری کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مس ویلیے نے جو آرمسٹرانگ کی داشتہ تھی مجبوراً اسے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اگلی صبح چلا جائے گا۔ لیکن اپنی وصیت سے مس ویلیے کو نکال دے گا۔ اس نے تنبیہ کی: ''میری جائیداد میں سے ایک پینی بھی تمہیں نہیں ملے گی۔''

اگلی صبح آرمسٹرانگ شرمندہ تھا۔ اس نے لانڈری والی لیڈی کے علاوہ سب مکینوں سے معافی مانگی۔ مس ویلیے اسے معاف کرنے اور اسے وہاں قیام کی اجازت دینے کی زیادہ مشتاق تھی۔ ڈنسمیورز نے بھی' جو خصوصاً سستے کرایوں پر رہتے تھے' ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسروں نے جو لانڈری والی عورت کے حامی تھے' کسی اور جگہ رہائش ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔

واحد رہائش گاہ جو میں فوری طور پر پا سکتا تھا وہ ہیمپسٹیڈ اور بیلسائز پارک کے درمیان ورسیلی روڈ پر واقع ایک پنشن تھا جسے ایک ہندوستانی بیوہ اور اس کا بیٹا چلا رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی خستہ حال جگہ تھی جہاں چند مزید ہندوستانی طلبہ رہتے تھے' دو سندھی' ایک بنگالی مسلمان اور کماؤں ہلز کا ایک خوبصورت نوجوان۔ ہم صرف ناشتے اور رات کے کھانے پر ملا کرتے تھے۔ اس جگہ کا واحد فائدہ یہ تھا کہ وہ ہیمپسٹیڈ ہیتھ سے نزدیک تھی' جس کے بارے میں' ان کے کہنے کے مطابق' میں اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا تھا۔

میں مکمل طور پر ہندوستانی کمیونٹی میں رہنے کی وجہ سے خوش نہیں تھا۔ میں اس کے لیے انگلینڈ نہیں آیا تھا۔ ان چند مہینوں میں' جو اس پنشن میں گزرے' دو واقعات رونما ہوئے: ایک کا میرے مستقبل پر فیصلہ کن اثر پڑا' دوسرا ایک المناک واقعہ تھا جسے میں نے بعد میں ایک افسانے میں بھی ڈھالا تھا۔

پہلے المناک واقعہ۔ کماؤں سے آنے والا نوجوان جس کا نام میرا خیال ہے کہ شاہ

تھا، ہم سے میل جول کی پروانہیں کرتا تھا۔ چند ہفتوں کے بعد میرے لیے اس کی سرد مہری جاتی رہی اور وہ کھلنا شروع ہوا۔ اس کی ایک انگریز گرل فرینڈ تھی۔۔۔ ''ایک بہت شائستہ، اعلیٰ طبقے کے خاندان سے تعلق رکھنے والی''۔ اس نے کئی مرتبہ مجھے یقین دہانی کروائی تھی۔ ''ان گھٹیا ویٹرسوں اور نرسوں کی طرح نہیں جن کے ساتھ بیشتر ہندوستانی باہر آیا جایا کرتے ہیں۔ بہت محتاط، بہت باوقار'' اس نے کہا تھا۔ چند دنوں بعد میں نے اس پوچھا کہ وہ اس کے ساتھ کتنا آگے جاچکا ہے۔ اس نے قدرے ناراض ہوکر جواب دیا تھا: ''میں تمھیں بتا تو چکا ہوں، وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے، وہ اس وقت تک کسی کو اپنے ساتھ آزادیاں برتنے کی اجازت نہیں دے گی جب تک وہ اس سے حقیقتاً محبت نہ کرتی ہو۔'' کچھ دنوں بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ اسے چوم چکی ہے، تب جبکہ وہ روانہ ہورہا تھا اور شاید وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اپنی پیش رفت پر بے حد خوش تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ''تم کب وہ کام کرو گے؟'' اس نے میرا اس طرح کی زبان کو استعمال کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ تاہم واضح بات تھی کہ اس کے ذہن میں بھی یہی کچھ سمایا ہوا تھا۔ ایک اتوار اس نے اپنا بہترین گہرے رنگ کا سوٹ زیب تن کیا اور کولون سے اپنے آپ کو شرابور کردیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ لڑکی کے والدین ویک اینڈ پر باہر گئے ہوئے ہیں اور وہ اس کے ساتھ تنہا ہوگا۔ میں نے اس کی خوش قسمتی کی دعا کی۔

وہ گھنٹے بھر کے اندر اندر ہی واپس آ گیا۔ میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور روہانسا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ کیا اس نے اسے وہ کام کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا؟ ''کچھ نہ پوچھو سردار جی! ہمارا تو دل ٹوٹ گیا۔ کہانی جس طرح کہ منکشف ہوئی، نارضامند ہونے سے کہیں بالا تھی، لڑکی تو بلا تاخیر شاہ کو اپنی خواب گاہ (بیڈروم) میں لے گئی تھی اور اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے تھے اور خود کو عریاں کرلیا تھا۔ اس نے شاہ کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ اس نے فرماں برداری کے ساتھ اپنے آپ کو لباس سے محروم کردیا تھا۔ وہ بغل گیر ہوگئے۔ اس نے اس کا بے ختنہ عضوِ تناسل بڑی چاہت سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور تبصرہ کیا: ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم مسلمان نہیں ہو۔'' کماؤں ہلز کے پختہ ہندو برہمن کی تمام تر گرمی بہہ نکلی۔ وہ تو ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے اپنی کہانی ''عظیم فرق'' میں اس واقعے کو استعمال کیا تھا۔

دوسری بات ملک خاندان کا انگلینڈ کا دورہ تھا۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے شُب چِنتن کو، جو اپنی پڑھائی میں بہت سست تھا، کینٹ میں واقع ایک زرعی کالج میں داخلہ دلوانے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کول کے لیے بر ڈھونڈنے کے بھی خواہش مند تھے۔ وہ کٹڑ سکھ تھے، ان کے مستقبل کے داماد کو بھی سکھ ہونا چاہیے تھا۔ ایک سکھ ترلوک سنگھ نے اس برس

آئی سی ایس میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اگر وہ اس کو پالیتے ہیں تو سب سے بہتر ہوگا۔ اسے مسترد کرتے ہوئے انہوں نے برطانوی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے سکھ لڑکوں میں موزوں بر کی تلاش جاری رکھی۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہمارے خاندان تو ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر ملک مجھ سے ذاتی طور پر بہت کم واقف تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں چائے کے لیے مدعو کیا۔ وہ وقت سے ذرا سا پہلے آ گئے اور انہیں میرا کمرہ دکھا دیا گیا۔ مسز ملک نے اردگرد غور سے دیکھا۔ وہ میرے بستر پر بیٹھ گئی اور اس نے تکیہ اٹھایا۔ اس نے وہاں تکیے کے نیچے گٹکا (ایک سکھ کی روزمرہ عبادت کی کتاب) دیکھی۔ اس نے ذہن میں طے کرلیا اگر ترلوگ سنگھ نہیں ہوسکتا تو میں دوسرا بہترین انتخاب تھا۔ سینئر انجینئر کے طور پر ملک عمارتوں کے ایک ٹھیکیدار' جو اکثر اس کی مدد کا طالب رہتا تھا' کے بیٹے کو اپنی بیٹی دیتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ تاہم اس کی رائے سے زیادہ اس کی بیوی کی رائے کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت تک میرا باپ نمایاں ٹھیکیدار بن چکا تھا' جس کے پاس نئی دہلی کے عین قلب میں وسیع وعریض غیر منقولہ جائیداد تھی۔ آخر میں تکیے کے نیچے یہ پرارتھنا پستک (Prayer Book) تھی جو میرا ترپ کا پتا ثابت ہوئی۔

بعد میں اسی موسم گرما میں میرا ان کا ساتھ دوبارہ ہوگیا۔ میں لیک ڈسٹرکٹ میں ونڈرمیئر میں چھٹیاں منا رہا تھا' وہ جھیل کے شمالی سرے پر بونیس میں واقع ایک خوبصورت ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز میں ان کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لیے کشتی کھیتا ہوا بونیس گیا۔ وہ میری قوت سے متاثر ہوئے۔ مسٹر ملک نے اس لیڈی سے کہا جو ہوٹل کو چلا رہی تھی اور اس نے مجھے باقی چھٹیاں وہاں قیام کرنے کے لیے مناسب کرائے کی پیشکش کی۔ اگلے روز میں اپنے پنشن سے ونڈرمیئر کے اس ہوٹل میں منتقل ہو گیا جس میں ایک شراب خانہ (بار)' رقص گاہ (بال روم) اور ایک باغ تھا جہاں سے جھیل کا نظارہ ہوتا تھا۔ میں نے ایک ماہ کے لیے ایک چپو سے کھینے والی کشتی کرائے پر حاصل کر لی اور بیشتر وقت کشتی کھینے' ماہی گیری کرنے میں یا اردگرد کی پہاڑیوں پر واقع جنگلوں میں سیر کرنے میں گزارا۔ وہ ورڈز ورتھ کی کاؤنٹی تھی۔ میں اپنی قانون کی کتابیں پڑھنے سے زیادہ وقت اس کی نظمیں پڑھنے میں صرف کیا کرتا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ میں بھوتوں کے خوف سے نجات پا چکا ہوں۔ لیکن ایک چاندنی رات جب میں جنگل میں سیر کر رہا تھا تو میرا گزر ایک چھوٹی سی یادگار کے قریب سے ہوا جس کے ساتھ سنگ مرمر کی ایک لوح بھی تھی۔ میں اس عبارت کو پڑھ سکتا تھا۔ یہ اس جگہ کی نشان دہی کرتی تھی جہاں بجلی گرنے سے کچھ لوگ مر گئے تھے۔ میں گھبرا گیا اور مجھے اپنے اردگرد مرے ہوؤں کی موجودگی محسوس ہونے لگی۔ میں تو بھاگا اپنے ہوٹل کی طرف' اور پیچھے مڑ مڑ کر

دیکھتا رہا کہ کہیں میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے۔

لندن واپس آ کر میں ہیمپسٹیڈ نہیں گیا۔ ہاکی کھیلتے ہوئے میں نے رچرڈ رائس نامی لمبے تڑنگے' خوبصورت' سنہری بالوں والے لڑکے کو دوست بنا لیا تھا جو انجینئر نگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ویلون گارڈن سٹی (Welwyn Graden City) میں اپنے خاندان کے ساتھ ایک اتوار گزارنے کی دعوت دی۔ مسز رائس وسلر کی بنائی ہوئی اس کی ماں کے پورٹریٹ جیسی تھی — لمبی' خاکستری بالوں والی اور باوقار۔ وہ ایک کوئیکر (Quaker) [1] اور جنگجوئی کے خاتمے کی حامی (Pacifist) تھی۔ وہاں رچرڈ کی بہنیں بھی تھیں' وہ سب دم بخود کر دینے والی خوبصورت' دلکش اور اپنے بھائی کی طرح سنہرے بالوں والی تھیں۔ ان کا گھر ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا جہاں سے گولف کا ایک میدان نظر آتا تھا۔ ایک طرف شاہ بلوط' فرن اور صنوبر کے درختوں کا جنگل تھا اور وہاں جنگلی سدابہار جھاڑیاں تھیں۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ مجھے لندن میں کیوں رہنا پڑا اور اس خوبصورت مسرت انگیز جنگل والی بستی میں کیوں نہیں؟

مسز رائس نے مجھے ایک مثالی (آئیڈیل) رہائش گاہ ڈھونڈ دی۔ پروفیسر ایف۔ ایس ماروِن' جو اس وقت ستر کے پیٹے میں تھے' ایک بڑے باغ والے دو منزلہ خوبصورت مکان میں رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک اینگلو انڈین عورت مسز کریمونا اور ان کی بیس سالہ بیٹی ڈورس رہتی تھیں جو ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں اس کے پاس ایک فالتو کمرہ تھا اور وہ مجھے کرایہ دار بناتے ہوئے خوش تھے۔ اس کے دو بیٹے اسے چھوڑ گئے تھے۔ میں اپنا سامان اٹھا کر ویلون گارڈن سٹی (Welwyn Garden City) چلا گیا۔ انگلینڈ میں پانچ سالہ قیام کے یہ میرے پانچ سب سے زیادہ پرمسرت مہینے تھے۔

میں نے بہت سے انگریز دوست بنا لیے تھے۔ ایک کے لیے میں روزانہ لوگوں کے ساتھ لندن تک کا سفر کرتا اور واپس آیا کرتا تھا۔ میں نے ڈیلکاٹ ٹینس کلب (Delcott Tennis Club) کی رکنیت لے لی تھی اور کھیل مناسب حد تک اچھا ہونے کی وجہ سے اس کلب کی طرف سے دوسرے کلبوں کے خلاف کھیلا کرتا تھا۔ کرسمس کے نزدیک تر میں نے خود کو کرسمس کے گیت گانے والوں کے درمیان پایا جو کنگز کراس (King's Cross) کی طرف سے صبح کے سفر کے دوران میں بانسری کے ساتھ گانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ ان کے درمیان ایک نوجوان' سیاہ بالوں والی لڑکی باربرا پرڈوم تھی' جو بیلے رقاصہ کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔

---

[1] ''سوسائٹی آف فرینڈز'' کہلانے والے عیسائی فرقے کی پیروکار' اس فرقے کی بنیاد جارج فاکس (1691ء-1624ء) نے رکھی تھی۔ (مترجم)

اس کا باپ لکھاری تھا' اس کا بھائی ایک فلمی اداکار تھا۔ وہ رومن کیتھولک تھے۔ میری سمجھ سے ماوراوجوہات کے تحت بار بار مجھے پسند کرنے لگی اور اپنے جوانی کے ولولے میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ وہ اکثر مجھے اپنے گھر اپنے رقص دیکھنے کے لیے مدعو کیا کرتی تھی۔ وہ ٹرین میں میرے ساتھ بیٹھنے کا بندوبست کر لیتی تھی اور میری جیب میں محبت نامے سرکا دیتی تھی۔ مجھے اس کی توجہ سے بہت زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرے لوگوں کے درمیان میں نے جیک پیل اور اس کی ایسٹونیائی بیوی کو بھی دوست بنالیا تھا' جو اس کیفے میں ویٹرس کے طور پر کام کرتی تھی جہاں میں ہر اتوار کی صبح کافی پینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جیک پیدائشی طور پر لسانیات کا ماہر تھا' وہ جرمن اور روسی زبان اتنی ہی روانی کے ساتھ بولتا تھا جتنی روانی کے ساتھ اپنی مادری زبان انگریزی بولتا تھا۔ وہ ایک ماہر پیانو بجانے والا بھی تھا اور بستی کے ہال میں موسیقی کی محفلوں (Concerts) میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ وہ ایک مخالف کلب کی طرف سے ٹینس کھیلتا تھا۔ سکھ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے' کیونکہ اس نے پہلے ایک سکھ گردیال سنگھ کو دوست بنایا تھا جو اس کی گرل فرینڈ کو لے اڑا تھا۔ غیر ملکی زبانوں پر عبور کی وجہ سے جیک لیور برادرز میں اعلیٰ منتظم (ایگزیکٹو) تک ترقی کر گیا اور اس کے مشرقی یورپی شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس نے ونسٹن چرچل کی سٹالن کے ساتھ یالٹا میں ہونے والی ملاقاتوں (میٹنگز) میں ترجمان کا کردار بھی ادا کیا۔ جب جیک کی ایسٹونیائی بیوی مر گئی تو اس نے اتنی ہی خوبصورت ایک جرمن لڑکی ایریکا سے شادی کی' جس نے اس کے لیے ایک بیٹے نکی کو جنم دیا۔ جیک کی وساطت سے میں نے ویلون میں بہت سے دیگر دوست بھی بنائے بشمول اورٹن کے جو ایک چھوٹی سی بستی ویسٹن میں رہتا تھا اور بیہر منز ایک جرمن یہودی' جو ایک مہذب انگریز عیسائی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے رائس خاندان اور پیل خاندانوں سے روابط کبھی نہیں توڑے۔ رچرڈ کی بیٹی کی شادی ہریانہ کے ایک جٹ رندھیر سنگھ سے ہوئی جو امریکہ میں مقیم تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس کے ساتھ ایک داماد کا سا برتاؤ کیا تھا۔ جب میں لندن میں ہندوستانی ہائی کمیشن (سفارت خانے) میں متعین تھا تو جیک اور میں سکواش کھیلا کرتے تھے۔ اس نے اور اس کی بیوی نے دہلی میں ہمارے ساتھ چند روز بسر کیے تھے اور میں جب کبھی لندن جاتا تھا ہم ایک کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے۔

پیرس کے علاوہ میں نے زیادہ تر یورپ نہیں دیکھا۔ جب میں طالب علم تھا تو میں نے گرمیوں کا ایک موسم کوٹ ڈی ایزور میں گزارا تھا۔ برلن اولمپکس کے انعقاد سے تھوڑا ہی پہلے جرمنی کی سیر کا موقعہ ملا۔ جرمن ہندوستانی اولمپک ٹیم سے مقابلے سے پہلے پہلے ہندوستانی طرز کی ہاکی کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ انہوں نے برطانوی یونیورسٹیوں کی مشترکہ ہندوستانی ٹیم

کو وائز بیڈن میں ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ کنگز سے دو طلبا' دونوں ہی سکھوں کو ٹیم کو مصدقہ ہندوستانی انداز عطا کرنے کے لیے شامل کیا گیا تھا' ایک تو کینیا سے آیا ہوا سکھ بسنت سنگھ تھا اور دوسرا میں۔ ہم دونوں اوسط کھلاڑی تھے۔

جرمنی میں مجھے پہلی بار سامی دشمنی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کھیل کے میدان کے گرد تماشائیوں کے لیے بنچیں نصب تھیں۔ چند بنچوں کو پیلا رنگ کر دیا گیا تھا اور ان پر جرمن زبان میں لکھا تھا ''یہودی''۔ میں اس کے معانی سے آگاہ تھا۔ اور ابتدائی ٹرائیلز دیکھتے ہوئے میں نے دوسری بنچوں پر بیٹھنے کی بجائے ان پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ میرے ایک میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ بنچیں یہودیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں تاہم ان پر میں اس لیے بیٹھ رہا ہوں کہ میں ایک کمیونسٹ ہوں (جو کہ سچ نہیں تھا) اور فاشسٹ مخالف ہوں (جو کہ میں تھا)۔ وہ بہت پریشان ہو گئے۔ مجھے واپس انگلینڈ چلے جانے کا حکم دینے کے بجائے' جیسا کہ ہمارا کپتان چاہتا تھا' انہوں نے مجھے رام کرنے کی کوششیں کیں۔ میں ٹیم کا سب سے زیادہ مطلوب رکن بن گیا۔ مجھے فقط آریائیوں (Aryans) کے لیے مخصوص استقبالیوں میں مدعو کیا گیا۔ ایک استقبالئے میں میری ملاقات ایک جسیم' چھ فٹ سے زیادہ لمبی گوری سے ہوئی' ایک پرشباب جرمن لڑکی' ہٹلر کے خوابوں کی ایک آریائی دوشیزہ کی عین مثالِ کامل۔ ایک ترجمان کے ذریعے میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حسین و دلکش عورت نہیں دیکھی۔ مجھے پکا پتہ نہیں تھا کہ میرا تبصرہ جرمن میں اس تک کس طرح ترسیل ہوا ہے تاہم بعد میں اس شام وہ ہوٹل میں میرے کمرے میں آ گئی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگی کہ چونکہ میں نے اسے اتنا زیادہ پسند کیا ہے اس لیے وہ مجھے اچھا وقت دینے کے لیے آئی ہے۔ ہو سکتا ہے میں اس کی پیشکش قبول کر لیتا مگر ایک جملہ جو اس نے استعمال کیا: ''تم یہودیوں کو اتنا زیادہ کیوں پسند کرتے ہو؟'' اس جملے نے مجھے بجھا کر رکھ دیا تھا کیونکہ درحقیقت میں کنگز میں دوسروں سے زیادہ چند ایک ہی یہودی لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ ادھر برونوسکی تھا' جس نے اپنا نام تبدیل کر کے بیرن رکھ لیا تھا۔ وہ انگلینڈ کی طرف سے ٹیبل ٹینس کھیلتا تھا اور آخر میں وہ کسی افریقی ملک میں چیف جسٹس بن گیا تھا۔ ادھر لیون سون تھا' جس نے مجھے امتحانوں کی تیاری کرنے میں مدد دی تھی۔ وہ ایک آسودہ حال وکیل بنا۔ نیز ادھر ایک مس جیف تھی' ہماری جماعت کی ذہین ترین لڑکی۔ جب وہ اپنے آخری امتحان میں شرکت کر رہی تھی تو اسے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اور وہ تمام پرچے دینے سے قاصر رہی تھی۔ بایں ہمہ ممتحن نے اسے فرسٹ کلاس دی تھی۔ میں نے یہودیوں کو اپنے معمول سے ہٹ کر دوست بنایا تھا۔

چار منتخب جرمن ٹیموں نے ہم ہندوستانی لڑکوں کی عجلت میں بنائی گئی ٹیم کو زیادہ دشواری کے بغیر ہرا دیا تھا۔ تاہم انہوں نے ہم سے زیادہ ٹیکنیک نہیں سیکھی۔ جب وہ ہماری اولمپک ٹیم کے خلاف کھیلی ہے تو تاش کے پتوں کی طرح بکھر کے رہ گئی۔

جب میں ویلون واپس آیا تو میں نے چند ایک ایسے مردوں اور عورتوں کو انگلینڈ میں پایا جن سے میں دہلی میں واقف تھا۔ سب سے پہلی اور اہم تو کوَل ملک تھی جو مونٹیسوری تعلیمی نظام کا ایک کورس کرنے آئی تھی۔ وہ ایک من کو لبھا لینے والے حسینہ بن چکی تھی اور اسے اس کا ادراک بھی تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اس کے جسم کی پیمائش مس یونیورس بننے والی لڑکیوں کے عین مطابق تھی۔ پرتاپ لال، جس کے ساتھ میں نے سکول میں برادرانہ دوستی کی علامت کے طور پر پگڑیاں تبدیل کی تھیں، ایک ہی پنشن میں مقیم تھے، جسے بیل (Bell) خاندان چلاتا تھا۔ ای۔این۔منکت رائے جو آئی۔سی۔ایس میں چلا گیا تھا کیبل کالج آکسفورڈ میں اپنی پروبیشن کے لیے آیا ہوا تھا اور امرجیت سنگھ جو کیمبرج کے کسی کالج میں داخل تھا، ٹرائی پوس کرنے کے لیے آیا تھا۔

پرتاپ اور امرجیت دونوں ہی کوَل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ امرجیت کے مواقع، سکھ ہونے کی وجہ سے اور کول کے بڑے بھائی سے اپنی ایک بہن کی شادی کی وجہ سے بہت زیادہ تھے۔ پرتاپ کو اس سے زیادہ ملاقات کرنے کا فائدہ تھا۔ اس وقت منکت رائے غیر جانبدار تھا اور حتیٰ کہ اس سے معاندت سی رکھتا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے تھوڑی ہی ملاقاتیں کیں۔ ایک مرتبہ منکت رائے، رائس اور میں آکسفورڈ اور کوسٹ والڈز میں سائیکلنگ کرنے گئے۔ ایک اور مرتبہ پرتاپ لال اور میں نے ٹنٹرن ایبے اور ویلز تک سائیکل چلائی۔ ٹنٹرن میں میری جھنجھلاہٹ اور پرتاپ کی مسرت کے لیے لاج کیپر نے مجھے اپنے باپ کے طور پر لیا۔ تاہم اس کی سات سالہ بیٹی نے مجھے میری ڈاڑھی کے باوجود ہم عمر قرار دیا۔ ایک مرتبہ امرجیت ویلون میں میرے ساتھ رہنے آیا۔ اس کی پروفیسر مارون سے خوب نبھتی تھی کیونکہ وہ پیانو پر چوپن کی کچھ دھنیں بجا سکتا تھا۔ ایک سہ پہر جنگل میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس کو ایک بوڑھی لیڈی نے راستے میں ٹوکا، اس نے اس سے کچھ سوال پوچھے جن کے وہ جواب نہیں دے پایا۔ اس نے اس کو بتایا: ''میں سنگھ نہیں ہوں۔ میں تو اس کا دوست ہوں اور اس کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' وہ بولی: ''ہاں، تم کچھ مختلف لگتے ہو۔'' ایک گھنٹے بعد جب وہ کیمبرج کو جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا تو وہی لیڈی اس کی طرف آئی اور کہنے لگی: ''مسٹر سنگھ! تم جانتے ہو میں نے غلطی سے تمہارے دوست کو تم سمجھ لیا۔''

کول کو جیتنے کا میرا موقع اگلی کرسمس پر آیا۔ میں نے گزشتہ کرسمس ایک کوئیکر ہاسٹل

میں گزاری تھی جو سیر گرین میں تھا جوکہ بیکن فیلڈز' جہاں ملٹن کا وہ کاٹیج ہے جس میں رہتے ہوئے اس نے ''پیراڈائز لوسٹ'' (Paradise Lost) لکھی تھی اور سٹاک پوجز چرچ یارڈ' جہاں گرے نے اپنی مشہور ''ایلیجی'' (Elegy) لکھی تھی' سے زیادہ دور واقع نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کرسمس کے لیے اس کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اوربیل خاندان نے چھٹی منانے اور اپنے ادارے کو چند دنوں کے لیے بند کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے تجویز دی کہ وہ میرے ساتھ کوئیکر ہاسٹل آ جائے۔ وہ ایک خاموش و پرسکون جگہ تھی جہاں زیادہ تر بیوائیں آیا کرتی تھیں۔ میں نے اس کو فرینڈز میٹنگ ہاؤس' مے فلاور احاطہ' جہاں ہم بیڈمنٹن کھیل سکتے تھے' قبرستان جہاں پین برادران (Penn Brothers) دفن تھے اور درختوں سے گھری ہوئی جگہ کے بارے میں بتایا۔

ہاسٹل کو مسز چتھبرسٹن نامی ایک بیوہ چلاتی تھی۔ میں نے اپنے گزشتہ برس حاصل ہونے والے لطف کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ اسے ہاں کہنے سے پہلے اپنے والدین سے اجازت حاصل کرنا پڑے گی۔ اس نے انہیں خط لکھا۔ میں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ یہ سنا کہ وہ اس کے میرے ساتھ جانے پر رضامند تھے۔ سو ہم نے کرسمس سے چند ایک روز پہلے برنگھم شائز میں سیر گرین ہالٹ کے لیے ایک آہستہ چلنے والی ٹرین لی۔ ایک بوڑھی لیڈی نے' جو سٹیشن سے بستی تک واحد ٹیکسی چلاتی تھی' ہمیں کوئیکر ہاسٹل پہنچایا۔

میں نے کول ملک کے دل کا محاصرہ کر لیا۔ میں نے ہلٹن کے کاٹیج اور سٹاک پوجز چرچ یارڈ کی لمبی سیروں کے دوران میں اس کو اپنی انگریزی شاعری کے علم سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ میں ملٹن کو تو زیادہ نہیں جانتا تھا تاہم میں نے ایلیجی کو اپنے حافظے میں تازہ کیا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں نے پہلا مصرعہ پڑھا' وہ اس سے آگاہ نہیں تھی اور بہت متاثر ہوئی جب میں نے اسے بتایا کہ اسے وہاں لکھا گیا تھا جہاں ہم کھڑے ہیں۔ ''اور اسے سنو'' میں بولتا رہا:

''کئی خالص ترین ہیرے پرسکون
تاریک' سمندر کی گہری غاروں میں پڑے ہیں
غیر مرئی کو شرما دینے والے کئی پھول پیدا ہوئے
اور اپنا حسن بے وفا ہوا میں کھو گئے

میں ادراک نہیں کر پایا کہ میں خود کو منوا چکا ہوں۔ اس کے کسی دوست نے اسے شاعری کے ذریعے نہیں لبھایا تھا۔ گو کہ وہ سکڑ سمٹ جاتی تھی جب میں اسے چھونے کی کوشش کرتا تھا تاہم اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی تھی۔ جب ہم کوئیکر ہاسٹل میں مقیم تھے تو اسے

پرتاپ لال کے بہت سے لمبے لمبے خط موصول ہوئے۔ وہ میرے حوالے سے بہت منفی تبصروں سے بھرے ہوئے تھے اور لکھا گیا تھا کہ ایک بالوں سے بھرے ہوئے سکھ کی صحبت میں رہنا اس کے لیے کتنا ناخوشگوار رہا ہوگا۔ اسے لکھنے اور کارٹون بنانے کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اس کے خط مجھے دکھادئے۔ مجھے مزید یقین ہوگیا کہ وہ کھیل سے باہر ہو چکا ہے۔

لندن کو واپس جاتے ہوئے میں نے اسے شادی کی درخواست پیش کر دی۔ اس نے میری درخواست کو اپنے والدین کی تصدیق سے مشروط کر کے قبول کرلیا۔ میں نے اپنے باپ کو سارا احوال لکھ بھیجا اور اسے ملکوں سے ملاقات کرنے کا کہا۔ اس نے ملکوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ہم نے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا۔ پرتاپ لال نے وقار کے ساتھ اسے قبول کرلیا اور ہم اچھے دوست رہے۔ کئی برس بعد جب وہ ہندوستان ایرونائکس کا جنرل منیجر تھا تو ہم بنگلور میں اس کے ہاں قیام پذیر ہوئے تھے اور جب وہ ائیر چیف مارشل اور ہندوستانی فضائیہ کا سربراہ بنا تو ہم متعدد بار اس سے ملے۔ وہ 1978ء میں لندن میں فوت ہوگیا۔ امرجیت نے' جو کئی مرتبہ میرے راستے میں آیا اور جس نے کبھی مجھے پسند نہیں کیا زہریلا تبصرہ کیا: ''اس کے باپ کا بینک بیلنس جیت گیا۔''

ایک اور نوجوان جس نے کول ملک کو دل دے دیا تھا' بھرت رام تھا جو ہندوستان کے امیر ترین خاندانوں میں سے ایک کا چشم و چراغ تھا۔ اس وقت وہ شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ تھا۔ تاہم اس نے اس کے ساتھ کئی برس رابطہ رکھا یہاں تک اسے ادراک ہوگیا کہ وہ مجھے منظر سے نہیں ہٹا سکتا۔ بھرت کا خاندان' بشمول اس کے باپ سرشری رام کے' یورپ کی سیر کے لیے آیا۔ چند دن بعد کول ان کے ساتھ جرمنی میں ایک معدنی چشمے پر گئی۔ میں خود کو فرانسیسی آلپس پر سکائی انگ کر کے چھٹیاں منانے کے لیے لے گیا تھا۔

اس کو جیت لینے کے بعد مجھے شکوک اور خدشات نے آ گھیرا کہ کیا میں نے یہ درست قدم اٹھایا ہے۔ ایک شخص جو مجھے کہا کرتا تھا کہ میں نے غلطی کی ہے' وہ تھامنکت رائے۔ کول کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں اس کی رائے بھلی نہیں تھی اور وہ تو اسے بہت اعلیٰ دکھائی دینے والی بھی قرار نہیں دیتا تھا۔

ہماری خط و کتابت گھٹنے لگی۔ اس نے سکائی انگ کے لیے میرے جوش و ولولے کو بہت تھکا دینے والا پایا۔ اس نے ایک تصویری پوسٹ کارڈ میں' جو اس نے مجھے نیورمبرگ سے ارسال کیا تھا' لکھا تھا' کہ اس نے ایک عظیم جلوس کا نظارہ کیا ہے جس کی قیادت ''ایک نیا جرمن لیڈر' جسے کوئی شخص ایڈولف ہٹلر کہہ رہا تھا'' کر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں ہر کوئی ہٹلر اور نازی ازم کے خطرے کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کر رہا

تھا۔ حالانکہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اخبارات یا کتابیں نہیں پڑھتی' سوائے ان کے جو اس کے نصاب میں تجویز کی گئی ہیں۔ جب وہ شری رام خاندان کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو گئی تو ایک دوسرے کے لیے ہمارے جذبات کافی حد تک سرد پڑ گئے۔ علاوہ بریں مجھے خود اپنے مستقبل کے حوالے سے خدشات نے آ گھیرا۔

میں نے آئی۔سی۔ایس کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس صرف ایک موقع تھا' میں جانتا تھا کہ میرا تعلیمی ریکارڈ میرے خلاف بھرا پڑا ہے۔ میں جو بہترین کر سکتا تھا میں نے کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بین الاقوامی قانون کے مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کروں گا۔ میں نے ایک پرچہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میری تیاری بہت بری ہے۔ زبانی امتحان آ گیا۔ میں جیسے ہمیشہ برے لباس میں ہوتا تھا ویسے ہی چلا گیا' ڈھیلے ڈھالے گہرے رنگ کے سوٹ' سرخ ٹائی اور نیلی پگڑی میں۔ تین رکنی پینل کا پہلا سوال یہ تھا کہ میں آئی۔سی۔ایس میں ہی کیوں آنا چاہتا ہوں۔ میں نے سیدھا سا جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ اس میں کامیابی کا میرا امکان بہت کم ہے تاہم چونکہ اس کو ذہانت کی آزمائش سمجھا جاتا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ اس میں شرکت کرنی چاہیے۔ وہ ہنس پڑے۔ دوسرے ہندوستانی امیدواروں نے اسی سوال کا جواب یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ وہ لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں' ملک کی خدمت کرنے کے خواہش مند ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگلا سوال انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں کیا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے انگلینڈ کی عدالتوں کا دورہ کیا کہ عدل وانصاف کیسے فراہم کیا جاتا ہے۔ میں نے انہیں بوسٹریٹ (Bow Street) کے مجسٹریٹ کے روبرو بطور گواہ پیشی کے بارے میں انہیں بتایا اور میں نے مقدمے کو تیزی سے نمٹائے جانے' جرم کا اقبال کرنے والے مجرموں کی تعداد اور معمولی چوریوں کی سخت سزاؤں کے حوالے سے اپنی حیرت کے بارے میں انہیں بتایا۔ نیز یہ کہ انگریز بیرسٹروں کے لیے روزی کمانا کتنا دشوار ہوگا وہ دوبارہ دل سے ہنسنے لگے۔

نتائج کا اعلان ایک ماہ بعد ہوا۔ میں ایک درجے سے آئی۔سی۔ایس میں رہ گیا تھا۔ توقعات کے برخلاف ممتحن نے مجھے بین الاقوامی قانون میں کم نمبر دیئے تھے۔ اگر وہ مجھے گیارہ نمبر مزید دے دیتا یا اگر میں اس پرچے میں' جو میں نے نہیں دیا تھا' اتنے ہی نمبر لے لیتا تو میں کامیاب ہو جاتا اور اس لیے بھی میں واحد ہندوستانی یا انگریز امیدوار تھا جس کو زبانی امتحان میں پورے پورے نمبر دیئے گئے تھے: 300 میں سے 300۔ اقلیتی کمیونٹی کا فرد ہونے کی وجہ سے بھی میری سفارش کی گئی تھی۔ وہ ہر تین برسوں میں باری باری ایک مسلمان' ایک عیسائی اور ایک سکھ کو لیا کرتے تھے۔ موہن سنگھ نے' جو اس وقت ہندوستان کے لیے وزیر خارجہ

کی مشاورتی کونسل کا رکن تھا مجھے مبارک باد کا فون کیا اور میرے باپ کو تار بھیجا۔ میں نے قانون کے امتحانوں کا تردد نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اور آکسفورڈ یا کیمبرج میں پروبیشن کے مزید ایک سال کے خواب دیکھتے ہوئے آسمانوں میں اڑتا رہا اور ''پھر یئں خداوند کی اپنی سروس'' کے ایک رکن کی حیثیت میں فتح مندی کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ میری بدقسمتی سے' ایک سکھ کو ایک سال پہلے نامزد کیا گیا تھا اور ایک عیسائی کو اس سے اگلے برس نامزد کیا گیا تھا۔ لٰہذا نامزدگی کسی مسلمان کی ہونا تھی۔ میں تو برباد ہو کے رہ گیا تھا۔ ذرا اس صورتحال کے بارے میں سوچو تو سہی' قانون' صحافت اور کتابیں لکھنے میں جدوجہد کرنے کی بجائے میں نے اپنا کیریئر حکومت کے سیکرٹری کے طور پر لازماً ختم کرنا تھا۔

سکائی انگ تعطیلات مناتے ہوئے میں نے سنا کہ میں نے اپنے ایل۔ایل۔بی کے امتحانات میں کمزور کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں مشکل سے پاس تو ہوگیا ہوں لیکن مجھے ایک پرچہ دوبارہ دینا ہوگا۔ میں بار کے امتحانات نہیں دے سکتا تھا اور میں نے قانون میں ماسٹرز ڈگری لینے کے لیے دوبارہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرے استاد ڈاکٹر پوٹر نے مجھے واضح طور پر بتا دیا کہ میں اس میں چل نہیں سکوں گا۔ چھ ماہ تک ایل۔ایل۔ایم میں سر کھپانے کے بعد میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور گھر واپس چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے بیرسٹر کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے مزید چھ ماہ انتظار کرنا پڑتا مگر کول کے باپ اور ریٹائرڈ چیف جسٹس آف انڈیا اور اس وقت کے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے خطوں نے مجھے غیر حاضری میں لائسنس حاصل کرنے کی مدد دی۔

پروفیسر ماروں کے ساتھ میرے دن مکمل طور پر میری وجہ سے ایک اچانک اختتام کو پہنچ گئے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت گھل مل گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنی کار چلانے کی اجازت دے دی ہوئی تھی۔ میں اس کو باغبانی میں مدد دیتا تھا اور اس کے لان کی صفائی کرتا اور سردیوں کے موسم کے لیے جلانے کے لکڑیاں کاٹ دیتا تھا۔ ایک شام ایک انگریز لڑکی مجھے ملنے آئی۔ وہ اس چیز سے متاثر تھی کہ کہ میں ماروں جیسے ممتاز انسان کے ساتھ رہتا ہوں' جس نے کئی کتابیں لکھ رکھی ہیں۔ ''آ جاؤ اور اس سے ملاقات کرو'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ ہم ماروں کے مطالعے کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ ٹائپ رائٹر سامنے رکھے گہرے خیالوں میں تھا اور ہمارے آنے سے واضح طور پر پریشان ہوا تھا۔ میں نے خوشی کے ساتھ لڑکی کا اس سے تعارف کرایا اور اسے بتانا شروع کیا کہ وہ کون تھی۔ وہ غصے سے سرخ ہوگیا اور پھٹ پڑا: ''کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ میں مصروف ہوں؟ تم دونوں دفع ہو جاؤ!'' مجھے تو اس کے یوں پھٹ پڑنے نے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا--- میں جنگل میں سے لڑکی کو گھر لے گیا۔ میں

مارون کو اس کی درشتی پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اگلے چند روز میں اس سے بولنے سے گریزاں رہا۔ اس مرتبہ وہ پریشان ہو گیا اور اسے وضاحت کرنا پڑی کہ وہ غصے میں کیوں آ گیا تھا۔۔۔ مجھے اس کی وضاحت میں معذرت خواہی نہیں ملی۔ میں ویلون گارڈن میں واقع ایک بورڈنگ ہاؤس میں چلا آیا۔ پھر پیل کے مشورے پر میں اس کے دوستوں مارلیس اور برینڈا اورٹن کے ساتھ رہنے کے لیے لیچورتھ گارڈن سٹی سے چند میل دور واقع بستی ویسٹن میں چلا گیا۔ چونکہ میں کالج جانا تو ختم کر چکا تھا اور بار کے آخری امتحان کے لیے صرف ایک پرچے کی تیاری کر رہا تھا سو میرے پاس بہت سا وقت تھا۔ میں نے اینڈ کاٹیج (End Cottage) کو بہت باسہولت پایا۔ اورٹن جوڑا لندن میں کام کرتا تھا۔ وہ صبح میں چلے جاتے اور شام کو دیر گئے عشائیے کے وقت واپس آیا کرتے تھے۔ ان کا پورا کاٹیج میرے حوالے ہوتا تھا۔

اورٹن جوڑا ایک عجیب وغریب جوڑا تھا' ایسی قسم کا جس سے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ محنت کش گھرانے کا کم تعلیم یافتہ لمبا تڑنگا' مضبوط کاٹھی والا آدمی تھا۔ وہ اعلیٰ طبقے کا لب ولہجہ اپنا کر اپنی تعلیم کی کمی کو چھپانے پر قادر تھا۔ اس کی بیوی ایک چھوٹے قد کی' سیاہ بالوں والی' وضعدار یہودی لڑکی تھی' جو یونیورسٹی میں پڑھتی رہی تھی۔ وہ ایک پارٹی میں ملے تھے جہاں مارلیس نے اپنی کچھ نظمیں سنائی تھیں اور مستقبل کے محنت کش طبقے کے شاعر ہونے کا تاثر قائم کیا تھا۔ اس نے اس کی بہت ذوق وشوق سے تعریف کی۔۔۔ اس نے سیدھا سیدھا اسے بازو سے پکڑا اور میزبان کی خواب گاہ میں لے گیا اور اس کے ساتھ زنا کیا۔ برینڈا کو کبھی ایسی حقیقی ہم بستری کا تجربہ نہیں ہوا تھا جو کسی قسم کے ابتدائی مرحلوں سے عاری تھی۔ چند ہفتوں بعد انہوں نے شادی کر لی۔

برینڈا کو یہ جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ مارلیس ایک اجڈ' مائل بہ تشدد اور ہر چند روز بعد ایک نئی عورت کا خواہش مند شخص ہے۔ وہ زیادہ عرصہ کی ملازمت کو برقرار نہیں رکھ پاتا تھا اور اپنے جینئیس کو نہ پہچاننے پر بورژا معاشرے پر الزام دھرتا تھا۔ جب وہ ملازمت سے باہر ہوتا تو برینڈا ہی گھر چلایا کرتی تھی۔

جب میں ان کے کاٹیج میں منتقل ہوا تو وہ فیونا نامی بستی کی ایک انیس سالہ لڑکی کو تاڑ چکا تھا۔ اس نے برینڈا پر اسے اپنے گھر میں مدعو کرنے کے لیے زور ڈالا۔ جب وہ اسے واپس پہنچانے جا رہا تھا تو اس نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ماں نے انہیں دیکھ لیا اور اس کے بارے میں برینڈا کو بتایا۔ ایک اور مرتبہ اس نے ایک ہندوستانی لڑکی کو چنا اور اس نے اسے ویسٹن میں اپنے ساتھ ویک اینڈ گزارنے کی دعوت دی۔ اس نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ وہ بالکل سہم گئی اور روانہ ہونے تک میرے پہلو سے نہیں اٹھی۔ ایسے دن بھی

آتے تھے کہ وہ ضدی موڈ میں ہوتا اور برینڈا کو اس کے دفتر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ اس کو گالیاں دیتا۔ ''کتیا! طوائف!'' اور دھمکیاں دیتا کہ اس نے کاٹیج سے باہر قدم رکھا تو وہ اسے مارے گا۔ برینڈا رونے لگتی مگر اس کی نافرمانی نہیں کیا کرتی تھی۔ ایک ویک اینڈ وہ میرے ساتھ پیرس آیا اور اصرار کرنے لگا کہ میں اس کے ساتھ سونے کے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں۔ میں نے کہا: ''جاؤ اور اپنے لیے کوئی ڈھونڈ لو۔'' وہ اپنی پینٹ کے اگلے بٹن کھول کر اپنے عضو تناسل کو دکھاتے ہوئے بولا: ''میں کوئی طوائف نہیں چاہتا میں تو تمہاری کوئی گرل فرینڈ چاہتا ہوں۔ اسے پانے کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں بھولیں گی۔'' یہ سب سے بڑا عضو تناسل تھا جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ قریباً کسی گدھے کے جسامت کا۔ ہم ویسٹن واپس آئے تو وہ اپنے وقت اور پیسے کے ضیاع پر بڑبڑا رہا تھا۔ مجھے برینڈا پر بہت ترس آیا مگر اس کی تسلی کے لیے بہت کم ہی کر سکتا تھا۔ میں نے مارلیس کے علاوہ اینڈ کاٹیج (End Cottage) میں دو پرمسرت مہینے گزارے، صبحوں میں لمبی لمبی سیریں اور سہ پہروں میں گھڑ سواری کرتے ہوئے۔ تاہم آخر کار میں اور ٹن جوڑے سے چھٹکارہ پا کر خوش ہوا۔ بعد میں میں نے جیک پیل سے سنا کہ مارلیس نے فضائیہ میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی مہینوں میں ایک فضائی حادثے (ایئر کریش) میں مارا گیا تھا۔ بہت آزاد برینڈا نے دوسری شادی کر لی اور عورتوں کے ایک رسالے کو ایڈیٹ کرنے لگی تھی۔

میں قدرے شرم و ندامت کے ساتھ گھر واپس آیا۔ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ میری منگنی بس ٹوٹنے ہی والی ہے۔ دوسرے جن امتحانوں کو تین سال میں پاس کر لیتے ہیں میں نے ان میں پانچ سال لگا دیئے تھے۔ جب میرے باپ کے دوست اس کے بیٹے کے واپس آنے پر اسے مبارکباد دینے کے لیے آتے اور پوچھتے: ''کاکا کی پاس کر کے آیا ہے؟'' — تو وہ جواب دیا کرتا تھا: ''ہور تے پتا نہیں ٹائم بہت پاس کر کے آیا ہے۔'' جب کول کی دادی کو بتایا گیا کہ اس کی پوتی کی شادی ایک بیرسٹر کے ساتھ ہو رہی ہے تو وہ بولی ''ہائے! ہائے! اٹ پٹو تے بلسٹر نکلدا ہے۔''

واحد میری دادی مجھے گھر واپس پا کر حقیقی طور پر خوش ہوئی تھی۔ اس نے میری گھر واپسی کو اپنی سہیلیوں کو اکٹھا کر کے اور ڈھولک بجاتے ہوئے جنگجوؤں کی واپس کے گیت گا گا کر منایا۔ یہ خوشی اس کے لیے بہت زیادہ ثابت ہوئی۔ اگلی صبح وہ ہلکے سے بخار میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اسے اس کے صبح کے غسل، ''شانتی کی مناجات'' پڑھتے ہوئے سارا دن چرخہ کاتنے اور سہ پہر میں چڑیوں کو دانا ڈالنے سے نہیں روکا۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں باسی روٹی کے ان ٹکڑوں کو چگنے آتی تھیں جو وہ ننھے منے ریزوں کی صورت میں توڑ کر ان کے لیے ڈالتی تھی۔

بخار زوز پکڑ گیا۔ ڈاکٹروں کو بلا لیا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا انجام قریب ہے۔ اس نے خاندان کے اکاؤنٹنٹ کو بلا بھیجا اور اپنی ملکیتی تھوڑی سے رقم اور زیورات سے جو کچھ وہ کرنے کی خواہش مند تھی اسے بتایا۔ ایک گھنٹے بعد' اپنے بستر مرگ کے اردگرد دو بیٹوں اور پوتے پوتیوں کے موجودگی میں اس نے ہمیں الوداع کہا اور مر گئی۔

اس کا جسم اس برآمدے کے فرش پر رکھا ہوا تھا جس میں بیٹھی وہ سارا سارا دن چرخہ کاتتی اور چڑیوں کو دانہ دُنکا کھلاتی تھی۔ وہ ہر سہ پہر کی طرح وہاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ میری ماں نے انہیں روٹی کے ٹکڑے ڈالے یا تو اس وجہ سے کہ ماتم گسار آ جا رہے تھے یا اس کے جسم کے سامنے بین ڈالے جا رہے تھے اور کیرتن کا بندوبست کیا گیا تھا' روٹی کے ٹکڑے یونہی بے چنے ہی پڑے رہے۔ میری دادی ایک خاکے کا موضوع بنی جو میں نے کئی سال بعد اس وقت لکھا تھا جب میں اوٹاوہ میں متعین تھا اور وہ کینیڈین فورم (The Canadian Forum) میں ''پورٹریٹ آف اے لیڈی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ میری سب سے زیادہ مشہور کہانی رہی ہے۔

میری سب سے زیادہ مایوس کن ملاقات کول سے تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کا مطلب ہمارے ماضی کے وعدوں کا ٹوٹنا تھا ـــــ دونوں کا ایک دوسرے کو مسترد کرنا۔ ہم نے ایک گھنٹہ سے زیادہ تک اس حوالے سے گفتگو کی' محسوس کیا کہ اگر ہم منگنی توڑتے ہیں تو اس سے ہمارے خاندانوں کی بدنامی ہوگی اور چونکہ منگنی توڑنے کی کوئی حقیقی وجہ نہیں تھی اس لیے ہم نے شادی کرنے کے منصوبوں کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ میں لاہور میں قانون کی پریکٹس کے ارادے کے تحت وہاں کوئی جگہ حاصل کرنے کا خواہش مند تھا اور اسی لیے شادی میں چند ماہ تاخیر کرنے کا خواہاں تھا۔ میرے باپ نے پیش بندی کرتے ہوئے میرے لیے ہائی کورٹ کے سامنے مال پر نئی تعمیر ہونے والی عمارت میں دو خواب گاہوں والا کونے والا ایک فلیٹ (کارنر فلیٹ) کرائے پر حاصل کیا۔ واپسی کے بعد سے لے کر شادی تک کے تین مہینے میں نے کرپا نارائن کے چیمبرز میں صرف کیے' جو کہ میرے باپ کے قانونی معاملات کو سنبھالتا تھا اور دہلی کا ایک ممتاز وکیل تھا۔ میں نے ان مسلوں میں بہت معمولی دلچسپی لی جنہیں اس نے مجھے تیار کرنے کا کہا تھا۔ میں جائیداد کے تنازعوں کی بجائے قتل کے مقدمات سننے میں زیادہ وقت سیشن کورٹس میں صرف کیا کرتا تھا۔ میں شامیں کول کے ساتھ گزارا کرتا تھا ـــــ دہلی کے چکر لگاتے ہوئے' بھرت رام کے افرادِ خانہ کے ساتھ فلمیں دیکھتے ہوئے یا ان کے تالابوں میں نہاتے ہوئے۔ ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ کول کا باپ سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا پہلا ہندوستانی چیف انجینئر تھا اور یہ اس کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ اس وقت میرا باپ ایک

ممتاز عمارتی ٹھیکیدار تھا اور دارالحکومت میں سب سے بڑی غیر منقولہ جائیداد کا واحد مالک تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کی اولادوں کو کئی برسوں سے تحائف دیتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے کے توسط سے یہ تحفے حاصل کرنے کی اس کی باری تھی۔

وہ ایک روایتی سکھ شادی تھی' فوجی بینڈ بارات کے آگے آگے چل رہا تھا اور میں یاسمین کے پھولوں کا سہرا سجائے' تلوار ہاتھ میں لیے سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ ملک 1 ر تغلق روڈ پر رہتے تھے جو کہ میرے باپ کے گھر 1 ر اے جن' پتھ سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہوگا۔ ہم دلہن کے رشتہ داروں کے استقبال کرنے اور اس کی کزنوں کے میرے ساتھ بہت سے عملی مذاقوں اور چھیڑ چھاڑ کی رسموں سے گزرے۔ اس کے بعد ضیافت ہوئی۔ میں رات ملک ہوم میں گزاری۔ اگلی صبح سویرے ہم گرنتھ صاحب کے سامنے ایک وسیع چھتری کے نیچے بیٹھے' اس نے اپنا چہرہ بناوٹی شرم سے گھونگھٹ کے پیچھے چھپایا ہوا تھا' میں نے موتیا رنگ کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا' تاب دار کرپان میرے ہاتھ میں تھی۔ آنند کرج (دعاؤں کی محفل) ایک سنجیدہ معاملہ تھا جس میں راگی شادی کی مناجاتیں گا رہے تھے۔ میں اپنا ہاتھ اس کے دوپٹے' جس میں وہ ڈھکی ہوئی تھی' کے نیچے سرکانے کی ترغیب سے باز نہیں رہ سکا اور اس کے پاؤں میں چٹکیاں بھرتا رہا۔ ہم نے گرنتھ صاحب کے گرد چار مرتبہ چکر لگائے' میں آگے آگے تھا اور وہ ایک سکارف' جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا' کا ایک سرا تھامے ہوئے میرے پیچھے پیچھے تھی۔ ہم نے اپنی عروسی قسمیں کھائیں ـــــ ایک دوسرے سے وفادار رہنے کی اور دوسروں کو اپنے بھائی اور بہنیں سمجھنے کی۔ یہ 30 ر اکتوبر 1939ء کی صبح تھی۔

اسی شام میرے باپ نے اپنے گھر کے سامنے وسیع وعریض لان میں شرابوں اور رقص کی محفل کا انعقاد کیا۔ ایک ہزار سے زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ سکاچ' شیمپین' وائنز اور برانڈی بہائی گئی' ایک خصوصی طور پر تیار کیے گئے لکڑی کے فرش پر بال روم ڈانسنگ ابتدا ہی سے جاری تھی۔ مہمانوں میں مسٹر ایم۔ اے جناح بھی شامل تھے جو سڑک پار رہتے تھے اور کبھی کبھی میرے باپ کے گلابوں کے باغ کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ہمیں نصف شب کو شب عروسی منانے کے لیے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ مخمور مہمانوں میں سے ایک نے اپنی کار مبارک باد کا تار لانے والے ایک ٹیلیگراف قاصد پر چڑھا دی۔ خبر کو دبا دیا گیا۔

شب عروسی ایک ایسی رات ہوتی ہے جس کا شادی شدہ جوڑے کو انتظار ہوتا ہے۔ میں نے روایت کو نبھانے کی اپنی سی بہترین کوشش کی۔ اس شب مجھ پر منکشف ہوا تھا کہ میری دلہن کنواری ہے۔ اس وقت تک ہم نے کبھی جنس پر گفتگو کی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی میرے

ہاتھوں کو کمر سے نیچے کھوجنے کی اجازت دی تھی۔ وہ مجھے صبر سے کام لینے کا کہتی رہی۔ میں نے دخول کر دیا۔

ہم ہنی مون کے لیے اگلی صبح کوہ ابو روانہ ہو گئے۔ بغیر کسی وجہ کے یہ تب سے میرا انتخاب رہا تھا کہ جب ویلون گارڈن سٹی کے ریلوے سٹیشن کے صدر دروازے پر ایک بڑا پوسٹر چسپاں دیکھا تھا جس میں سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک مندر دکھایا گیا تھا اور درج کیا گیا تھا: ''ہندوستان کی سیر کرو! دیلور مندر بمقام کوہ ابو'' میرے انگریز دوست پوچھا کرتے تھے کہ کیا میں نے اس جگہ کو دیکھا ہوا ہے۔ میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے اسے نہیں دیکھا ہوا تاہم جونہی میں گھر لوٹا میں اس کی سیر کروں گا۔ ہمیں اجمیر میں سفر میں وقفہ کرنا تھا جہاں ہم اتم سنگھ' میرے سسر کے ماتحت کام کرنے والے ایک ایگزیکٹو انجینئر اور اس کی بہت جوان اور خوبصورت ہنگری نژاد یہودی بیوی میڈی کے مہمان تھے۔ کوئی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس نے ایک خاکستری ڈاڑھی والے' اپنے باپ کی عمر سے بڑے سکھ سے شادی کیوں کی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان آئی تھی' عمر میں بیٹی کی بجائے اس کا اتم سنگھ سے جوڑ بنتا تھا۔ میڈی ایک باوفا بیوی ثابت ہوئی تھی۔ فقط اپنے شوہر کی موت کے بعد دون سکول کے ہیڈ ماسٹر جان مارٹن سے رفاقت کی اور اسی سے شادی کر لی۔ مارٹن سے شادی کے دو برس بعد میڈی کو دہرہ دون میں اس کے کاٹیج میں قتل کر دیا گیا۔ ہم نے اتم سنگھ کے ہاں رات بسر کی۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ کوئی پیش رفت نہیں کر سکا تھا۔

اگلی صبح ہم کوہ ابو پہنچ گئے۔ سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ایک وسیع و عریض بنگلہ' جہاں سے نکی جھیل دکھائی دیتی تھی' ہمارے لیے مخصوص تھا۔ باورچی' بیرا' آیا اور مالی ایک ہفتے کے لیے ہمارے ماتحت تھے۔ کلب کی رکنیت بھی تھی اور اس کے شراب خانوں میں دستیاب ہر شے سے لطف اندوز ہونے کی آزادی بھی۔ ہم اس کا انگلش سیڈار کا سارا ذخیرہ پی گئے۔ نکی کی سیر کے لیے چپوؤں والی کشتی بھی وہاں موجود تھی۔ ہم صبح کے وقت اود بلاؤ کے جوڑے کا تعاقب کرتے اور اسے جھیل سے پہاڑیوں میں بھگا دیتے۔ راجپوتانہ ریاستوں کے انگریز ریذیڈنٹ نے ہمارے لیے شراب نوشی کی ایک ضیافت کا اہتمام کیا جس میں مقامی صاحب لوگ اور ان کی بیگمات شریک ہوئے۔ کوہ ابو میں ہمارا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے سکاچ پی اور ہمارے نام کیا گیا شیمپین کا جام صحت نوش کیا گیا۔ ہم مخمور حالت میں اور خود کو دنیا کی چوٹی پر محسوس کرتے ہوئے اپنے بنگلے میں واپس آئے۔

رات محبت کے لیے بنی تھی۔ نکی پر پورا چاند چمک رہا تھا اور ہوادار برآمدے میں بچھے ہوئے بستروں پر چاندنی بکھیر رہا تھا۔ مالی نے ہمارے تکیوں پر موتیے اور گلاب کی

کلیاں بکھیر دی تھیں۔ اس وقت میری شدت کو کوئی نہیں روک سکتا تھا اور وہ بھی تیار تھی۔ ہاں کہنے سے پہلے اس نے تھوڑا سے انکار کیا۔ میں نے اسے تھوڑا سے زخمی کر دیا۔ اس کا تھوڑا سا خون بہا تاہم ہمارا ملاپ تکمیل تک پہنچا۔ ہم ایک دوسرے کے جسموں کے ہنوز بھوکے دہلی لوٹے' جب میرے باپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں میاں چنوں جاؤں جہاں سے اطلاع آئی تھی کہ میرا چچا اجل سنگھ بیمار تھا۔ جو کہا گیا تھا میں نے وہی کیا۔ ایک ہفتہ کرب واذیت کے عالم میں دوررہ کر گزارا۔ اس کو بیماری سے افاقہ ہوگیا اور اس نے مجھے واپس دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ ہنی مون ختم ہو گیا تھا۔ اب مجھے لاہور میں گھر بنانا اور کاروبار قائم کرنا تھا ـــ دونوں ہی میرے باپ کی سخاوت و فیاضی کے کاملاً محتاج تھے۔ اس نے مجھے ایک نئے برانڈ کی فورڈ دی۔ جس میں میں اپنی نئی بیوی کے ساتھ لاہور آیا' رہنے کو فلیٹ دیا اور موکلوں سے معاملہ کرنے کے لیے فین روڈ پر ایک دفتر مہیا کیا۔ میرے سسر نے ہمارے فلیٹ میں فرنیچر مہیا کر دیا۔ میرے باپ کے قریبی دوست بسا کھا سنگھ نے مجھے میری ضرورت کی تمام کتابیں شادی کے تحفے کے طور پر دیں۔ اب یہ مجھ پر تھا کہ میں قانون کے پیشے میں آگے بڑھوں' یا اس میں ناکام رہوں۔

پانچواں باب

لاہور، تقسیم اور آزادی

گورنمنٹ کالج میں بے فکری کے دو برس گزارنے کے بعد لاہور کے لیے میں اجنبی نہیں رہا تھا۔ تاہم وہاں روزی رزق کمانے کے لیے آنا ایک مختلف معاملہ تھا۔ وہاں میرے پاس سب کچھ تھا۔ ایک فرنیچر لگا ہوا فلیٹ اور آفس اور دو اہم کلبوں کی رکنیت ــــ دی کاسمو پولیٹن، جو ہندوستانی اشرافیہ کے لیے تھا اور زیادہ اہم جم خانہ تھا، جو برطانویوں کے لیے مخصوص تھا اور جہاں آکسفورڈ اور کیمبرج سے پڑھے ہوئے درجن بھر سے زیادہ ہندوستانی رکن نہیں تھے۔ میرے باپ اور سسر کے مرتبے نے (دونوں کو برطانویوں نے سر کا خطاب دیا تھا) ججوں اور وزیروں کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ کول کی جوانی اور خوبصورتی کے طفیل ہم لاہور کا مطلوب جوڑا بن گئے، جس کی بہت زیادہ تصاویر اتاری جاتی تھیں۔ صرف قانونی مؤکلین کی کمی تھی۔ میں صبح کے وقت صرف دو گھنٹے کے لیے دفتر میں قانون کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ پھر میں گپ شپ کرنے کے لیے بار روم میں چلا جایا کرتا تھا۔ میں عدالت کے کمرے میں اہم مقدمات کی بحثیں سننے کے لیے جاتا، کافی ہاؤس میں مزید گپ شپ کے لیے ایک گھنٹہ صرف کرتا اور دوپہر کے کھانے کے لیے گھر لوٹ آتا۔ ابتدائی چند ماہ تو کسی ایک مقدمے باز نے بھی میری دہلیز پار نہیں کی۔ کچھ وقت میں نے کرپا نارائن کے جونیئر کے طور پر بھی کام کیا، جو لاہور سے دہلی منتقل ہو گیا۔ ایک روز وہ بحث کے دوران میں ڈھے گیا اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وکیلوں میں اس طرح کی اموات عام نہیں تھیں۔ میں جے گوپال سیٹھی کا جونیئر بن گیا جس کی پنجاب میں سب سے زیادہ فوجداری پریکٹس تھی۔ وہ کبھی کبھی مجھے بھی مؤکل فراہم کر دیا کرتا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ مجھے ایک اچھا منشی حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوستانی قانون کے پیشے میں منشی بالکل ایک ادارہ تھے (اور ہیں) جہاں کہیں وکیل نہیں ہوتے تھے، پنجاب کی طرح، تو وہ وکالت کرتے تھے ــــ مؤکلین سے بات چیت کرتے، ان کے کاغذات کی چھانٹی کرتے، فیس طے کرتے اور اس میں سے دس فیصد منشیانہ منہا کر لیتے۔ میرے زمانے میں لاہور میں منشی زیادہ کام کرتے تھے۔ وہ ریلوے سٹیشنوں اور بس اڈوں پر ہوٹلوں کے ایجنٹوں

کے طور پر جاتے' مقدمہ بازوں کو تاڑتے اور انہیں قائل کرتے کہ وہ ان کے مالک کو اپنا وکیل بنالیں۔ ترغیب کے تمام طریقے استعمال کیے جاتے تھے: ان کے مالک کی بیوی جج کی معشوقہ تھی یا معاملہ اس کے برعکس تھا' وہ ''برطانیہ سے لوٹا ہوا سب سے قابل بیرسٹر'' تھا اور صاحبوں کے ساتھ ٹینس اور برج کھیلتا تھا اور ان کی میموں کے ساتھ شراب پیتا اور رقص کرتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے جس کلرک کو رکھا وہ ہماچل کا ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ اس نے مجھے قائل کیا کہ میں اس کو اپنے مقصد کے لیے پنجاب بھر کے اضلاع میں پروپیگنڈا کرنے کی اجازت دوں۔ وہ مہینہ بھر سفر پر رہا' واپس آ کر اس نے سفر کے بل پیش کیے اور مجھے یقین دلایا کہ ضلعی عدالتوں کے بہت سے اہم وکیلوں نے اپنی اپیلوں والے مقدمات مجھے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ کوئی ایک بھی نہ آیا۔ میرا دوسرا کلرک ایک شیعہ مسلمان تھا۔ اس نے مجھے لکھنؤ کے ایک بڑے وکیل کے جونیئر کے طور پر مقدمہ دلایا جس میں بہرائچ کے دو امیر شیعہ زمینداروں کی دو شاخیں لاہور میں واقع جائیداد کے حوالے سے فریق تھیں۔ میں نے بہت تھوڑی سی فیس تو حاصل کی لیکن لاہور میں میں خاندان کے سربراہ کے ساتھ دوستی گنوا بیٹھا۔ ہم مقدمہ بھی ہار گئے۔ چنانچہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اپنے منشی کو ایک مولوی کی خدمات حاصل کرنے کا کہا جو ہر صبح مجھے ایک گھنٹہ قرآن پڑھائے۔ کچھ عرصے بعد منشی اس بہانے مجھے چھوڑ گیا کہ کسی ایسے غیر مسلم سے جو خدا کے وجود پر سوال کرتا ہو' تنخواہ لینا حرام ہے۔

میں نے سخت مایوسی کے عالم میں لاہور کا سب سے مہنگا منشی رکھ لیا۔ اودھم سنگھ ایک چھ فٹ کا لمبا تڑنگا سکھ جٹ تھا جو ایک معروف ٹاؤٹ تھا۔ میں نے اسے پیشگی دس ہزار روپے دیئے — اتنی رقم کا کسی نے سنا بھی نہیں ہوگا — تاکہ اس کی خدمات محفوظ رہیں۔ وہ ضلع لاہور کی بستیوں سے واقف تھا۔ جب کبھی کسی سکھ بستی میں قتل ہوتا — اور ہر ماہ چار پانچ قتل ہو جایا کرتے تھے — وہ نہ صرف سوگوار خاندان سے تعزیت کرنے جاتا بلکہ ملزمان ٹھہرائے جانے والوں سے بھی ملاقات کرتا۔ وہ کسی ایک طرف سے مقدمہ ملنے کا انتظام کرلیا کرتا تھا۔ دسویں کی بجائے وہ میری فیس میں سے تہائی حصہ بطور منشیانہ لیتا۔ تاہم فوجداری مقدمات مجھے ملنے لگے۔ چند میں نے جیت لیے اور دیگر ہار گیا۔ مجھے پتا چلا کہ کسی فوجداری مقدمے میں اونچی فیس والے وکیل کو لینے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے۔ اگر کوئی مجسٹریٹ یا جج میرا دوست ہوتا تھا تو میں اس سے اپنے موکل کی ضمانت حاصل کر لیتا تھا یا قدرے ہلکی سزا۔ وہاں ایک اینگلو انڈین وکیل تھا جسے قانون کا تو بمشکل ہی کچھ علم ہوگا تاہم وہ اپنے ٹاؤٹوں کے ذریعے مقدمات حاصل کر لیتا تھا کیونکہ وہ ایک صاحب تھا۔ ایک پارسی بھی' جو ایک شیشے والی عینک (مونوکل) پہنا کرتا تھا' اونچے طبقے کے برطانوی جعلی لب و لہجے میں مقدموں کی مسلیں پیش کر

کے اپنی راہ نکال لیتا تھا اور اچھی خاصی روزی کماتا تھا۔ وہاں ایک مسلمان وکیل بھی تھا جو مقدمات کی مسلیں تیار نہ کرنے اور اپنے موکلین کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے حوالے سے بدنام تھا۔ ''یور آنر آپ سے زیادہ بہتر قانون کون جانتا ہے؟ میں کون ہوتا ہوں آپ کو مقدمے کے حقائق سے آگاہ کروانے والا؟ یور آنر تو مجھ سے زیادہ بہتر طور پر انہیں سمجھ لیں گے اور میرے موکل سے انصاف کریں گے!'' وہ ان وکیلوں سے بہتر تھا جو آدھی رات تک مسلوں میں سر کھپاتے تھے اور ججوں سے تکرار کرتے تھے۔

یہ ایک دشوار' کمر توڑ' بے روح پیشہ تھا۔ میں نے سولہ روپے روزانہ کی فیس پر سیشن کورٹس میں بے مدعا علیہ مقدمات لیئے' میں نے کمیونسٹوں کے مقدمے بغیر فیس لیے لڑے۔ میں نے لا کالج میں جز وقتی (پارٹ ٹائم) قانون کی تدریس کی۔ مجھے ہائی کورٹ کے مدعا علیہ وکیلوں کے پینل میں رکھ لیا گیا اور پھر ایڈووکیٹ جنرل کے پینل میں۔ میں نے بمشکل ایک ہزار روپے فی مہینہ ہی کمائے ہوں گے۔ میرا باپ ہماری مدد کرتا رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ایک زیادہ بڑا اپارٹمنٹ جائیداد سمیت دلا دیا جس سے کچھ کرایہ موصول ہو جایا کرتا تھا' پھر لارنس روڈ پر لاہور کے سب سے بڑے پارک لارنس گارڈنز (بعد میں نام رکھا گیا باغِ جناح) کے سامنے وسیع مکان دلوا دیا۔

شاید یہ قانون کے پیشے میں میری ناکامی تھی جس نے میرا جی کھٹا کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا: ''کیا قانون کی پریکٹس کرنے میں کوئی تخلیقیت ہے؟ کیا میں خود کو ملنے والی ایک زندگی میں دوسروں کے جھگڑوں سے پیسے کمانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا؟ ایک عام طوائف کسی وکیل سے زیادہ معاشرے کی خدمت کرتی ہے۔ گو کہ طوائف سے موازنہ غیر منصفانہ ہے۔ وہ کم از کم ایک معاشرتی ضرورت تو پورا کرتی ہے اور اپنے گاہک کو ان کے پیسوں کے عوض لذت و مسرت مہیا کرتی ہے' کوئی وکیل تو اتنا بھی نہیں کرتا ہے۔'' مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا' میں قانون میں چل نہیں پایا تھا' میں بنچ اور حتیٰ کہ سپریم کورٹ تک ایسا ہی رہوں گا۔ جن کی پریکٹس کم تھی اور قانونی فراست کم تر تھی وہ بنچ تک پہنچ گئے تھے' ایک جوڑا تو سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت تک پہنچ گیا۔ میں قانون کو ترک کرنے پر کبھی شرمندہ نہیں ہوا' مجھے تو صرف اس بات کی شرمندگی رہی کہ میں نے اسے پڑھنے میں پانچ برس اور اس سے روزی کمانے کی کوشش میں سات برس ضائع کر دیئے۔

قانون کے پیشے اور اس کے ذریعے جینے والوں کے بارے میں میرے رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ وکیلوں کی کسی پارٹی میں عدالت میں ان کے تجربوں اور ججوں کے برے برتاؤ کے حوالے سے گفتگو کے علاوہ دوسری گفتگو بہت کم ہوتی ہے۔ ان کی دوسری واحد دلچسپی

سیاست ہوتی ہے اور بہت ہی کم اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ اس سے ہندوستانی سیاست کی عدم اخلاقیات اور ہندوستانی منظر سے سیاسی مدبروں کی مکمل غیر موجودگی کی کسی حد تک وضاحت ہوتی ہے۔ میں نے لاہور ہائی کورٹ کے ساتھ برسوں میں صرف ایک کے بارے میں سنا تھا۔ ایک سنیئر وکیل برطانوی جج کو اپنے دلائل قبول کرنے پر قائل کرنے میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ ہر مرتبہ وہ غور کے لیے ایک نئی دلیل پیش کرتا تھا' جج تحقیر سے کہتا'' بکواس!'' شدید غصے میں وکیل نے تبصرہ کیا:'' آج صبح سے سوائے بکواس کے یور لارڈ شپ کے منہ سے کچھ اور برآمد ہوتا دکھائی نہیں دیتا!'' قانون کے پیشے میں جنس (Sex) بہت دلچسپ موضوع رہا ہے اور میری نسل کے وکیلوں کے ذہنوں پر تو بہت ہی زیادہ حاوی تھی۔ ایک وکیل ہر اتوار کی سہ پہر پارٹی دیا کرتا تھا جس میں مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے ٹبی سے طوائفیں بلوائی جاتی تھیں۔ وہ خود کو طوائف بازار میں پہنچنے والے'' نواں مال'' سے خوب آگاہ رکھتا تھا۔ ایک نووارد نے' جو ایک کوئی سے بیاہا ہوا تھا' ہمیں یہ کہانیاں سنا سنا کر موہ لیا کہ انگریز دوشیزہ کس قدر ہیجان کے عالم میں محبت کرتی ہے نیز اس نے اپنے بدن پر وہ داغ دکھائے جہاں اس نے کاٹا تھا یا ناخن گاڑے تھے۔ بدمستوں کی ایک محفل میں ایک مقابلہ ہوا کہ کس کی ایستادگی سب سے زیادہ سخت ہے۔ ایک کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کو ایک رسی میں ایک پھندا بنا کر باندھ دیا گیا کہ کس کا عضو تناسل بغیر خم کھائے اس کو اٹھا سکتا ہے۔ وہ جرائم پیشہ نوجوانوں کی ذہنیتوں والے بالغ بچے تھے۔

شاعر اکبر الٰہ آبادی نے واضح طور پر انہیں یوں پیش کیا ہے:

پیدا ہوا وکیل تو ابلیس نے کہا
اللہ نے مجھے صاحب اولاد کر دیا

عدالتوں میں زیادہ کام کاج نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ادبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا' جن کو مجھے اپنے کالج کے زمانے میں پڑھنا چاہیے تھا: انگریزی شاعری کے انتخاب' شیکسپیئر کے ڈرامے اور سانیٹ' ٹالسٹائی' آسکر وائلڈ' آلڈس ہکسلے' رادھا کرشنن کی لکھی ہوئی ہندو فلاسفی وغیرہ۔ میں نے ''دی ٹریبیون'' میں کتابوں پر تبصرے لکھنے شروع کیے (مجھے اپنے دوستوں کو بتانا پڑا تھا کہ کالم کے آخر پر جو کے۔ایس ہے' وہ میں ہوں) اور ''سوویت یونین کے دوست'' (فرینڈز آف دی سوویت یونین) جس کا میں لاہور میں ایک بانی رکن تھا' کے لیے سٹالن کے حوالے سے ایک تعریفی کتابچہ لکھا۔ میں چھٹیوں میں شملہ ہلز میں صبح کے وقت مطالعے اور سہ پہر کے وقت لمبی سیروں کے علاوہ اور کچھ کم کیا کرتا تھا۔ ہر سہ پہر کو میں بائیسکل پر سوار اپنی بیوی کے ساتھ مشوبرا سے مال تک چھ میل چلتا تھا۔ ہم وینگرز یا

ڈیویکوز میں چائے پیتے' انگریز افسروں کا طمطراق' ہندوستانی وزیروں اوران کی بیویوں کو بھاری بھرکم ملبوسات زیب تن کیے ٹہلتے ہوئے دیکھتے اور پھر واپس چھ میل مشوبرا۔ ایک مرتبہ گوالیار کے مہاراجہ کے وزیر مالیات چارلس کارسن نے دو دن ہمارے ساتھ بسر کیے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شملہ سے پانچ ہزار فٹ نیچے ستلج کے کناروں پر واقع تتا پانی کے گرم پانی کے گندھک کے چشموں تک ایک ہی دن پیدل گیا اور واپس بھی آ گیا تھا' کل فاصلہ چالیس میل بنتا تھا۔ آنے والے ویک اینڈ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں گندھک کے ابلتے ہوئے پانی میں نہایا' ستلج کے تیز رو یخ پانی میں ٹھنڈی کی ہوئی بیئر کی ایک بوتل پی اور دس بجے گھر پہنچ گیا۔

میری بہن کے خاوند جسپال سنگھ نے جو میرے ملنے والے کسی بھی سکھ جٹ جتنا ہی سخت جان تھا' شرط لگائی کہ وہ پیدل چلنے میں مجھے ہرا سکتا ہے۔ ہم پورے چاند کی رات ہندوستان تبت روڈ پر چل پڑے۔ اس کے ساتھ اس کے دو بھتیجے بھی تھے ــــ دونوں ہی بیس کے پیٹے میں تھے ــــ اور ہمارا سامان اٹھانے کے لیے دو کشمیری قلی بھی تھے۔ پندرہ میل کے بعد دونوں لڑکوں اور قلیوں نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے انہیں ایک ڈاک بنگلے میں چھوڑا اور اپنی منزل نرکنڈا کی طرف بڑھتے رہے۔ اس رات کے بعد میں ہم اپنے آپ کو تازہ دم کرنے کے لیے صنوبروں کے جنگل میں ایک ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے۔ جسپال نے گیلن بھر دودھ پیا' میں نے برانڈی ملی ہوئی چائے پی۔ چاندنی رات کی خاموشی اور ٹھہراؤ پراسرار تھا۔ ہم بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے جب بظاہر خالی نظر آنے والے بنگلے سے دھاڑ سنائی دی: ''دفع ہو جاؤ!'' ہم نے ایسا ہی کیا اور صبح سویرے نرکنڈا پہنچ گیے۔ جو کچھ چوکیدار ہمیں دے سکتا تھا' ہم نے کھا لیا: پراٹھے اور بہت زیادہ میٹھی چائے۔ ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ ہم دن بھر چلتے رہے اور شام کو دیر گئے تک۔ میرے پیروں سے خون بہنے لگا۔ مشوبرا سے دس میل ادھر ہم ایک ڈاک بنگلے میں ٹھہرے جہاں چوکیدار کے فراہم کردہ چیتھڑوں سے میں نے ان پر پٹی باندھی۔ جسپال نے جیت کا دعویٰ کرنے کے لیے آگے بڑھتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس سے کوئی سوگز پیچھے تھا۔ وہ لگ بھگ آدھی رات کو مشوبرا پہنچ گیا اور خاندان کو بتایا کہ میں راستے ہی میں دستبردار ہو گیا تھا اور فتح مندی کے ساتھ سونے چلا گیا۔ اس کے فوری بعد مشوبرا پہنچنے پر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ناشتے کی میز پر اپنے پیروں کی شیخیاں بگھار رہا تھا جب میں اس سے جا ملا۔ ٹیکنیکی طور پر وہ جیت گیا تھا۔ ہم نے کم وبیش رکے بغیر 72 میل طے کیے تھے اور ہم دونوں اگلے چند روز اپنے دکھتے ہوئے پیروں کی ٹکور کرتے رہے۔ میرے باپ کا واحد تبصرہ تھا: ''اگر تم 72 میل چلنے کی بجائے 72 گھنٹے اپنی قانون کی کتابیں پڑھتے تو تم زیادہ عقل مند انسان ہوتے۔'' مجھے مزید لمبی سیریں کرنے کی اجازت نہیں

دی گئی۔ تاہم پندرہ روز بعد جب میرا باپ دورِ دہلی میں تھا اور مجھے کسی کام سے لاہور جانا پڑا تھا تو میں نے کالکا تک پیدل جانے کا فیصلہ کیا جو لگ بھگ 65 میل دور تھا۔ ابھی تاریکی ہی تھی کہ میں مشوبرا روانہ ہو گیا' سہ پہر میں سولن (25 میل دور) پہنچا اور ریسٹ ہاؤس میں چائے پی رہا تھا کہ اچانک میرا باپ نمودار ہوا۔ اسے پتا چلا کہ میرے پاس کار نہیں ہے۔ ''تمہاری ٹیکسی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میں سولن تک پیدل چل کر آیا ہوں۔ وہ تو آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اپنے شوفر کو حکم دیا کہ کالکا کے لیے مجھے ٹیکسی کا بندوبست کر کے دے اور مجھے اس میں دفع ہو جانے کا کہا۔ افسوس! کالکا تک میرا تھن پیدل چلنے کے بعد میں تو ریلوے سٹیشن پر نہانے کے بعد پرتکلف کھانا کھانے اور اس کے اوپر ٹھنڈی یخ بیئر کی بوتل چڑھانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

مشوبرا میں اپنے والدین کے گھر ''سندر بن'' میں گزارے ہوئے گرمیوں کے مہینوں کی یادیں بہت مسرت انگیز ہیں۔ وہ مکان ایک پوری پہاڑی پر بنا ہوا تھا اور شمالی سمت میں نہایت دلکش برف پوش پہاڑ دکھائی دیتے تھے اور دوسری طرف سے وادی کا نظارہ ہوتا تھا۔ میری ماں نے سیمنٹ کا چبوترا بنوایا ہوا تھا جہاں سے راجا آف فرید کوٹ کی جائیداد سے نالدرا میں نو سوراخوں والے گولف کے میدان سے ہر کر شملہ سے مشوبرا بازار' کیبل ہوٹل جانے والی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ہم زیادہ تر صبحیں اور سہ پہریں اسی چبوترے پر دھوپ تاپتے ہوئے یا اس کے ساتھ ہی اگے ہوئے شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے گزارا کرتے تھے۔ مشوبرا میں بہت خوبصورت پرندے تھے۔ باربٹ سارا سارا دن چہچہاتے رہتے' سکارلیٹ کے جھنڈ کے جھنڈ چیری کے درختوں میں اڑتے پھرتے' بوقیذار کے درخت پر چڑھی ہوئی بیل میں سیبیائیں گھونسلے بناتیں اور تتلی خور' بشمول چاندی جیسے سفید رنگ کے بہت خوبصورت پیراڈائز تتلی خور جس کی دم کے دوربن اس کے پیچھے پیچھے لہراتے رہتے یہ کوئی معمولی نظارہ نہیں تھا۔ باریش عقاب اور ہمالیائی شاہین ہوا میں تیرتے رہتے۔ صبح سویرے اور سہ پہروں میں کستوریاں ہماری چھت پر جمع ہو جاتی تھیں اور گیت گایا کرتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں تو ساری ساری رات چکوروں کی صدائیں سنائی دیتیں۔ ہماری اولتی میں اڑنے والی گلہریوں نے گھونسلے بنائے ہوئے تھے۔ ہم انہیں ایک درخت سے دوسرے درخت تک اڑتے ہوئے اور ٹینس کے میدان میں پھدکتے ہوئے اکثر دیکھا کرتے تھے۔

اتوار کے دن تو خاص الخاص ہوتے تھے۔ ہم مشوبرا بازار کے داخلی سرے پر واقع سینٹ سوتھنز چرچ کی گھنٹیوں کی جھنکار سنتے ہوئے جاگتے تھے۔ اسے کانپور کے ایک انگریز چمڑے کے تاجر نے تعمیر کروایا تھا اور موچیوں کے سرپرست ولی کے نام سے اس کو موسوم کیا گیا

تھا۔ یہ انگلینڈ کے کسی گرجے کے عین مشابہہ تھا' اونچا پھاٹک' دودھیا شیشوں والی کھڑکیوں اور ایک اونچی قربان گاہ کے ساتھ۔ انگریز گیبل اور پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے وائلڈ فلاور ہال میں قیام کرتے اور صبح کی عبادت (سروس) کے لیے بہترین چرچ میں اتوار کے روز کثیر تعداد میں آیا کرتے تھے۔ عبادت (سروس) کے بعد وہ بازار میں لیونڈر اور فرانسیسی پرفیومز کی خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔

میرا باپ فرنگی پرست تھا اور سفید فام لوگوں کی تواضع کرنے کو بہت پسند کرتا تھا۔ ایک روز اس نے وائلڈ فلاور ہال اور گیبل میں قیام پذیر یورپیوں کی فہرستیں حاصل کیں اور انہیں رات کے کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ درجنوں کی تعداد میں آئے' وہ جنگ کا زمانہ تھا اور ان کے ہوٹلوں میں کوئی ولولہ انگیز تقریب نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہم نے داخلی پھاٹک سے اپنے گھر تک چینی لالٹینیں لٹکائی تھیں۔ ہم نے رقص کی موسیقی بجانے کے لیے گوا کا ایک بینڈ منگوایا تھا۔ صاحبوں نے اپنا اور اپنی میموں کا تعارف کروایا' ہماری سکاچ اور وائنز نوش جاں کیں' ہمارے مصالحہ دار کھانے کھائے' رقص کیا اور رخصت ہو گئے۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ اجنبیوں کی خاطر مدارات پر ہزاروں روپے اڑا دینے سے اسے کیا حاصل ہوا۔ اس نے جواب دیا: ''انگریز ان لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے جو ان کی میزبانی کرتے ہیں۔'' وہ درست کہہ رہا تھا۔ چند روز بعد جب وہ ریل کار کے ذریعے دہلی جا رہا تھا تو ایک انگریز افسر اس کے پاس آیا' اس کی پارٹی میں شرکت کرنے والے ایک مہمان کے طور پر اپنا تعارف کروایا۔ وہ باتیں کرنے لگے۔ میرا باپ فوج کو اشیائے ضرورت فراہم کرنے کے نفع بخش ٹھیکے کو حاصل کر کے اترا۔

فرید کوٹ کا راجا بھی سفید فام لوگوں کی خاطر مدارات کرنے کا بہت شوقین تھا۔ ہر خزاں کے موسم میں وہ ایک کھلے میدان میں بیلوں کی لڑائی کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ دیہاتی دور دراز کی بستیوں سے اپنے چیمپئن بیل لے کر آتے تھے۔ غیر ملکی اور ہندوستانی اہم افراد صوفوں پر بیٹھ کر بیلوں کو سینگ لڑاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ تماشے کے بعد راجا رقص و نغمہ کی ایک تقریب میں مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا جہاں اس کا ذاتی بینڈ دھنیں بکھر رہا ہوتا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر انگریز مہمان قیام کیا کرتے تھے اس لیے ہمیں باقاعدگی سے مدعو کیا جاتا تھا۔ راجا جتنا سخی و فیاض ہو سکتا تھا' اتنا ہی پست اور گھٹیا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ شیمپین تو ہر کسی کو پیش کرتا تھا مگر جب وسکی آتی تھی تو بیرے ہندوستانیوں کو ہندوستانی برانڈ پیش کرتے اور سکاچ صرف سفید لوگوں کو پیش کی جاتی تھی۔ اس کا پتا ہمیں اس شام چلا جب ہم ''دی سٹیٹسمین'' کے ایڈیٹر ایوان چارلٹن اس کی بیوی کو اپنے ساتھ اس کی ایک پارٹی میں لطف اندوز ہونے کے لیے

لے گئے۔ جب میں نے ایوان سے وسکی کے معیار کی شکایت کی تو وہ غرایا: ''تم ایک شکی لوطی ہو! میری وسکی تو ٹھیک ہے۔'' ہم نے گلاسوں کا تبادلہ کیا۔ جب اس نے میری وسکی چکھی تو ناک سکیڑ لی۔ راجا بہت گنوار اور غیر مہذب بھی ہو سکتا تھا۔ جب کبھی میرا باپ اسے مدعو کرتا' وہ بے تحاشا پیتا اور دوسرے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد بھی ٹھہرا رہتا تھا۔ وہ میری بھانجیوں پر تبصرے کرتا جو اس وقت ٹین ایج تھیں اور وہاں موجود دوسری نوجوان عورتوں پر تبصرے کرتا تھا۔ میرے بیچارے ماں باپ جو عمومی طور پر 9 بجے سو جایا کرتے تھے آدھی رات تک جاگتے رہتے تھے۔

مجھے ہر چیز سے زیادہ لمبی لمبی سیروں کا شوق تھا۔ جب شملہ کے علاوہ میں نے دوسری پہاڑی سڑکیں دریافت کر لی تھیں ادھر ایک تنہا' سایہ دار راستہ تھا جو صنوبر اور چیڑ کے جنگل سے گزرتا ہوا ایک اطالوی خانقاہ سان ڈیمیانو تک جاتا تھا۔ ایک اور ڈھلوانی راستہ اوپر مشوبرا سے ڈینس فولی کہلائے جانے والے پھلوں کے باغ سے وائلڈ فلاور ہال کی طرف جاتا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی سے تم دس ہزار فٹ سے زیادہ اونچی شالی کو دیکھ سکتے تھے اور دو پہاڑی سلسلوں کو الگ الگ کرنے والی وسیع ندی کو۔ بارشوں کے موسم میں وادی اکثر دھند میں لپٹی رہتی تھی۔ پراسرار طور پر دھند چھٹ جایا کرتی تھی اور سورج بارش سے دھلی ہوئی زمرد جیسی ہری پہاڑیوں کو روشن کرنے اور ان کے درمیان بہنے والی ندی کو روشنی میں جھلمل جھلمل کرنے کے لیے نکل آیا کرتا تھا۔

لاہور میں کرنے کو کچھ زیادہ تو تھا نہیں' ایک عمدہ گھر اور ایک خوبصورت (گو اب کسی حد تک برخود غلط) بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے ملاقاتیوں کی کمی نہیں تھی۔ ان میں سب سے اہم منگت رائے تھا' جو لاہور میں متعین تھا۔ آئی۔سی۔ایس میں ہونے کی وجہ سے شادی کے قابل بیٹیوں والے عیسائی خاندانوں کو وہ بہت مطلوب تھا۔ وہ اکثر دوستوں کو اپنے گھر مدعو کرتا تھا اور اپنی لکھی ہوئی تحریریں سنایا کرتا تھا۔ ایک تحریر جس کو بہت داد ملی وہ ایک مرغی کے بارے میں تھی جس نے ایک نالی میں انڈے دیئے تھے۔ اس کو تعریف کرنے والی عورتوں کے ایک وسعت پذیر حلقے میں ہمیشہ بہت زیادہ داد و تحسین کے ساتھ سنا جاتا تھا۔ چند ایک ماہ بعد اس نے دفتر سے واپسی میں ہمارے ہاں رکنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی کو سیڑھیوں سے اوپر لے آتا اور شراب کے جاموں اور رات کے کھانے کے لیے ٹھہرتا۔ میری بیوی کے بارے میں کبھی اس کے جو تحفظات ہوتے تھے وہ غائب ہو چکے تھے' یہ امر مجھ پر بالکل واضح تھا کہ وہ اس کا والہ وشیدا ہو چکا ہے۔ مجھے کسی شک میں نہ رہنے دینے کے لیے اس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے ایک خط لکھا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہے اور ہم سے میل ملاقات جاری رکھنے کے لیے میری

اجازت کا خواہش مند ہے۔ میں نے اس کا خط اپنی بیوی کے آگے رکھ دیا۔ وہ تو بے خد خوش ہو گئی۔ میں نے اس کو ایک لطیفے کے طور پر لیا اور اسے جوابی خط لکھا کہ اس کو پہلے کی طرح خوش آمدید کہا جاتا رہے گا۔ میرے پاس اپنی فراخ دلی کے اظہار کی وجہ تھی۔ منگت کے پاس لوگوں کو اپنے خیالات سے متفق بنا لینے کی بے پناہ قائل کر لینے والی قوتیں تھیں۔

ان دنوں میری بیوی اپنی صبحیں بھابیش سنیال کے تحت چلنے والے سٹوڈیو میں مصوری کر کے گزارا کرتی تھی۔ منگت رائے نے اس کے سٹوڈیو میں جانا شروع کر دیا اور اسے قائل کرنے لگا کہ مصوری ایک بے کار مشغلہ ہے۔ اس نے مصوری چھوڑ دی۔ وہ ٹینس کی اچھی کھلاڑی تھی اور کاسمو پولیٹن کلب میں ہر شام ٹینس کھیلا کرتی تھی' اس نے اسے قائل کر لیا کہ سائیکل چلانا (سائیکلنگ) زیادہ پر لطف ہوتا ہے لہٰذا اس نے ٹینس کھیلنا چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ سائیکلنگ کے لیے جانے لگی۔ وہ مذہبی رسوم کی بہت پابند تھی' ہر صبح گرنتھ صاحب کو کھولتی اور ایک یا دو مناجاتیں پڑھتی تھی۔ شام میں وہ پوتر پستک (Holy Book) کو رات کے لیے پڑھا کرتی تھی۔ اس نے اسے ایسی رسوم کے فضول ہونے کا قائل کر لیا۔ اس نے اپنی پرارتھنا کے روزانہ معمول میں وقفہ شروع کر دیا۔ وہ شدید مے نوش بن چکا تھا' میری بیوی بھی زیادہ شراب پینے لگی۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اس کے بارے میں بہت کھلا ڈلا تھا۔ اس نے میری بیوی کو بتایا کہ ایک شام جب وہ اپنی بہن کو ریلوے سٹیشن پر الوداع کرنے گیا تھا تو وہاں اسے ایک عیسائی لڑکی' جو ہماری واقف تھی' اچانک مل گئی۔ اس کے پاس کوئی وسیلۂ سفر (ٹرانسپورٹ) نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنی سائیکل پر پیچھے بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ اگلے ڈنڈے پر بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان جسمانی ربط نے انہیں انگیخت کر دیا۔ اس نے اسے اپنے اپارٹمنٹ چلنے کی دعوت دی۔ اس نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ انہوں نے رات ایک ہی بستر میں بسر کی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اسے کسی قدر احساس جرم محسوس ہوا کیونکہ وہ میری بیوی سے محبت کرتا ہے اس لڑکی سے نہیں جس نے اس کے ساتھ ہم بستری کی تھی۔ مذمت کی بجائے میری بیوی نے اس کی صاف گوئی کی تعریف کی اور اس کی طرف مزید کھنچ گئی۔ لازمی بات ہے ان کے تعلق کے بارے میں بہت باتیں بنائی گئیں۔

میرے باقاعدہ ملاقاتی بن جانے والوں کے درمیان جسٹس گوپال داس کھوسلہ' آئی۔ سی۔ ایس بھی' اپنی بیوی شکنتلا کے ساتھ تھا۔ وہ میری بیوی میں دلچسپی لینے لگا اور میں اس کی بیوی میں۔ سو ہمارا حساب برابر ہو گیا۔ ادھر ایک کینیڈین جوڑا تھا — ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ' جو ہندوستانی اسلام پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہا تھا اور اس کی بیوی میوریئل' جو لاہور میں میڈیکل کالج میں میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ادھر پی۔ این کرپال تھا' دیال سنگھ کالج میں تاریخ

کا پروفیسر۔ وہ منکٹ رائے کی بڑی بہن پری اوبالا کے عشق میں مبتلا تھا اور اس سے شادی کا امیدوار تھا۔ ہماری زندگیوں میں اس کا ہمارے باقی سارے ایام میں رہنا تقدیر میں لکھا تھا۔ ادھر دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً نوبزادہ محمود علی خان اور اس کی سکھ بیوی ستنام' ولبرن اور اوشالال' جو منکت رائے کے دور کے رشتہ دار تھے' اندر موہن ورما' گورنمنٹ کالج کا انگریزی کا ایک پروفیسر۔ بشن نارائن اور ان کی بیوی شانتی' دونوں کھوسلہ کے دوست تھے۔ دوسرے آئے اور چلے گئے۔ کبھی کبھی جب لاہور میں ہوتا تو آرتھر لال کا چھوٹا بھائی جان' جو آئی۔سی۔ایس تھا' ملنے آیا کرتا تھا۔۔۔ جان ناقابل یقین برطانوی لب ولہجے میں انگریزی بولنے والا ایک قدرے رنگین مزاج نوجوان (پلے بوائے) تھا۔ وہ میرے اوپر فقرے کستا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے میری بیوی سے کہا: ''کول اگر تمہاری کوئی چھوٹی بہن ہے تو اس کی شادی اپنے ڈاڑھی والے شوہر سے کروا دو اور تم خود مجھ سے بیاہ رچالو۔'' میں دونوں لال برادران کے مذاق کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ جان سے تو میری مذاق کی برابری ہوگئی جب اس نے اپنی منگیتر ہوپ سے ہمیں ملوایا' وہ ایک کالی' خوشگوار فربہی کی حامل لڑکی تھی۔ اگلے روز وہ آیا اور مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا: ''وہ عقیدے اور خیرات میں ہمیشہ استعمال ہوگی۔'' اس کے بعد اس نے کبھی مجھ پر فقرہ نہیں کسا۔ آرتھر کو منہ توڑ جواب دینے کا میرا دن آنے میں ابھی چند سال دیر تھی۔

اس زمانے میں مجھ سے ملنے والے دو لوگ بیان کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ایک تو مصور امرتا شیرگل تھی۔ اس کی شہرت ہماری سڑک سے پار فلیٹوں کے بلاک میں اس کے قیام پذیر ہونے سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ اس کی شادی حال ہی میں اس کے ہنگری نژاد کزن وکٹر ایگن' ایک ڈاکٹر آف میڈیسن' سے ہوئی تھی جو لاہور میں پریکٹس کرنے کا خواہش مند تھا۔ امرتا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بے حد خوبصورت اور آزادانہ جنسی اختلاط کی حامی ہے۔ پنڈت نہرو کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی اداؤں سے گھائل ہوگیا تھا' اس کی جنسی بھوک کی کہانیاں منہ سے رال ٹپکا ٹپکا کر سنائی جاتی تھیں۔ وہ پہلے لاہور آئی تھی اور فلیٹیز (Falettis) ہوٹل میں قیام کر کے کوئی موزوں اپارٹمنٹ ڈھونڈتی رہی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ روزانہ دن بھر میں اپنے تین یا چار عاشقوں سے ملاقات کرتی تھی' دو گھنٹے کے وقفے سے۔ وہ آتے' اپنا کام کرتے اور جونہی کام ختم ہوتا وہ روانہ کر دیئے جاتے۔ گورنمنٹ کالج کے زمانے کا میرا دوست ننھا اقبال سنگھ' جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں پروڈیوسر تھا' اس کا شام کے وقت آخری ملاقاتی بیان کیا جاتا تھا۔ اس کو اس کے سونے کے دوران میں اس کی ضروریات پوری کرنے کا محدود سا استحقاق حاصل تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے شہوت پرست ہونے کی افواہوں میں کس قدر صداقت تھی تاہم میں اس سے واقفیت کا شائق تھا۔ مجھے

بہت زیادہ لمبا عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ میری بیوی ہمارے چھ سالہ بیٹے کے ساتھ اپنے والدین کے ہاں قیام کرنے کے لیے کسولی گئی ہوئی تھی۔ ایک سہ پہر جب میں لنچ کے لیے گھر واپس آیا تو میں نے اپنی نشست گاہ میں ایک میز پر بیئر کا جام اور ایک نسوانی ہینڈ بیگ رکھا ہوا دیکھا اور ہر طرف فرانسیسی پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں پنجوں کے بل اپنے باورچی سے پوچھنے کے لیے کہ وہ کون تھی' باورچی خانے گیا۔ اس نے جواب دیا: ''میں نہیں جانتا' ساری پہنے ہوئے ایک میم صاحب ہیں۔ اس نے آپ کا پوچھا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ لنچ کے لیے واپس آئیں گے۔ اس نے سارے فلیٹ کو گھوم پھر کر دیکھا اور فریج سے بیئر خود ہی نکالی' وہ باتھ روم میں ہے۔''

مجھے شبہ تھا کہ وہ فقط امرتا شیر گل ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہی تھا۔ وہ نشست گاہ میں آئی اور اپنا تعارف کروایا۔ اس نے بتایا کہ اس نے سڑک پار فلیٹ کرائے پر لیا ہے اور وہ بڑھئی' پلمبر' درزی اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کے بارے میں مشورہ لینے کے لیے آئی ہے۔ میں اس طرح کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا اسے بتایا۔ میں نے اسے جامے میں رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف زیادہ دیر تک نہیں دیکھا کیونکہ وہ اتنی دلیر' گستاخانہ نظر کی حامل تھی کہ میرے جیسے بزدل آدمی اپنی نگاہیں جھکا لیتے تھے۔ وہ چھوٹے قد والی اور زرد جلد والی تھی (آدھی سکھ اور آدھی ہنگری نژاد ہونے کی وجہ سے) اس نے بالوں کے بیچ میں مانگ نکال کر پیچھے مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ اس کی ناک گنبد نما تھی جس کے سیاہ سرے نمایاں تھے۔ اس کے ہونٹ موٹے موٹے تھے جن پر مونچھوں کا ہلکا سا نشان تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی تصویروں کے بارے بہت کچھ سنا ہوا ہے اور دیواروں پر لگی ہوئی اپنی بیوی کی بنائی ہوئی آئل پینٹنگز دکھائیں۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''وہ ابھی مصوری کرنا سیکھ رہی ہے۔'' اس نے نتھنے پھلا کر کہا: ''یہ تو واضح ہے۔'' نرم خوئی اس کی خوبیوں میں سے نہیں تھی' وہ جو کچھ اپنے ذہن میں ہوتا بول دینے میں یقین رکھتی تھی' خواہ وہ کتنا ہی درشت اور نامہربان ہی کیوں نہ ہو۔

چند ایک ہفتے بعد مجھے اس کے اکھڑپن کا ایک نمونہ دیکھنے کو ملا۔ میں نے اپنی بیوی اور بیٹے کو کسولی سے لیا اور انہیں مشوبرا لے آیا۔ امرتا اپنے دوست چمن لال کے خاندان کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی جنہوں نے میرے باپ کے گھر سے ذرا ہی دور ایک مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ میں نے انہیں لنچ پر مدعو کیا۔ ہم شاہ بلوط کے درخت کے سائے میں کھلے چبوترے پر بیئر اور جن پی رہے تھے۔ میرا بیٹا ایک پلے پین (Playpen) میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ رہا

تھا۔ ہر کوئی اسے ہلہ شیری اور شاباش دے رہا تھا: وہ گھنگھریالے بالوں‘ بڑی بڑی سوالیہ آنکھوں اور ڈمپلوں والے گالوں والا پیارا سا ننھا بچہ تھا۔ ’’کتنا بدصورت ننھا بچہ ہے!‘‘ امرتا نے تبصرہ کیا۔ دوسروں نے شرمندگی کا اظہار کیا اور احتجاج کیا۔ میری بیوی تو دم بخود رہ گئی تھی۔ امرتا بغیر کوئی پروا کیے بیئر پیتی رہی۔ بعد میں جب اس نے سنا کہ میری بیوی کو اس کے ادب آداب کے حوالے سے کیا کہنا پڑا تھا اور یہ کہ اس نے اسے خونی کتیا کے طور پر بیان کیا ہے تو امرتا نے اطلاع دینے والے کو کہا: ’’میں اس عورت کو سبق سکھاؤں گی۔ میں اس کے شوہر کو ورغلالوں گی۔‘‘

ورغلائے جانے کا دن کبھی نہیں آیا۔ جب ہم لاہور واپس آئے تو میری بیوی نے اعلان کر دیا کہ امرتا کو ہمارے گھر میں پاؤں رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ چند ماہ بعد مشترکہ دوستوں نے ہمیں بتایا کہ امرتا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک رات اس کا ایک مہمان ہمارے ہاں ٹھہرنے کے لیے آیا کیونکہ وہ اتنی بیمار تھی کہ مہمان داری سے قاصر تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ پاگل ہوگئی ہے اور برج (تاش کے کھیل) کے دوران بڑبڑاتی رہتی ہے۔ وہ برج کھیلنے کی بے حد دلدادہ تھی۔ اگلی صبح ہم نے سنا کہ وہ مرگئی ہے۔ وہ بمشکل اکتیس برس کی ہوگی۔

میں ایگن کے اپارٹمنٹ گیا۔ امرتا کا بوڑھا‘ ڈاڑھی والا باپ امراؤ سنگھ حواس باختہ تھا اور اس کی ماں پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ شملہ میں واقع سمر ہل سے ابھی ابھی آئے تھے اور انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی نوجوان‘ باصلاحیت (ٹیلنٹڈ) بیٹی ہمیشہ کے لیے جا چکی ہے۔ اس سہ پہر درجن بھر مرد و خواتین اس کے جنازے کو مرگھٹ لے گئے جہاں اس کے شوہر نے اس کی چتا کو آگ لگائی۔ جب ہم ایگن کے اپارٹمنٹ واپس پہنچے ہیں تو پولیس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ برطانیہ نے ہنگری کے خلاف نازی جرمنی کا ایک اتحادی ہونے کی وجہ سے جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ ایگن ایک دشمن قوم کا فرد بن چکا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کو پولیس نے تحویل میں لے لیا تھا۔

امرتا کی ماں کو اپنی بیٹی کی بیماری اور موت کی تفصیلات جاننے میں کچھ وقت لگا۔ اس نے اپنے بھانجے اور داماد کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے اس پر قتل کا الزام لگاتے ہوئے وزیروں‘ افسروں اور دوستوں پر (بشمول میرے) خطوں کی بمباری کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قتل نہیں تھا۔ ے بالکل یقین ہے کہ وہ بے احتیاطی تھی۔ اس کی موت کے حوالے سے میرا خیال ہی ڈاکٹر رگھو بیر سنگھ نے‘ جو اس وقت لاہور کا ایک نمایاں فزیشن تھا‘ بیان کیا۔ اسے اس وقت امرتا کے لیے بلایا گیا تھا جب وہ صحت یابی کی امید سے بالاتر ہو چکی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ وہ حاملہ ہوگئی تھی اور اس نے اپنے شوہر سے حمل ساقط کروایا تھا۔ آپریشن غلط ہوا۔ اس کا خون بہت

زیادہ بہہ گیا اور اس میں خون کی کمی ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رگھو بیرا سے خون دے اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنا خون دینے کی پیشکش کی تھی۔ ڈاکٹر رگھو بیر سنگھ نے ان کے خون کے گروپ ٹیسٹ کیے بغیر اس کی پیشکش کو رد کر دیا تھا۔ جب دونوں ڈاکٹر بحث کر رہے تھے تب امرتا زندگی سے محروم ہو گئی۔

بہت سے لوگ مثلاً فنی نقاد کارل کھنڈلا والہ' اقبال سنگھ اور اس کا بھتیجا' مصور ویوین سندرم نے امرتا پر کتابیں لکھیں۔ بدرالدین طیب جی نے تفصیلی بیان دیا کہ کس طرح اس نے اسے ورغلایا تھا (اس نے بس کپڑے اتار دیئے تھے اور آتش دان کے قریب قالین پر ننگی لیٹ گئی تھی۔) ویوین اعتراف کرتا ہے کہ وہ بہت سے محبوب رکھتی تھی۔ اس کے مطابق زندگی میں اس کا حقیقی جنون ایک اور عورت تھی۔

ان مہمانوں کے درمیان' جو میری بیوی اور بیٹی کے گرمیوں کے لیے جانے کے دوران میں میرے اپارٹمنٹ میں رہے' کمیونسٹ دانیال لطیفی بھی تھا۔ وہ جیل میں آتا جاتا رہا تھا اور جو خوراک وہ اسے پارٹی ہیڈ کوارٹر میں دیا کرتے تھے اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔ اس وقت پارٹی کے قریب ہونے کی وجہ سے میں نے اسے صحت کی بحالی کے لیے کچھ ہفتے اپنے ساتھ گزارنے کے لیے بلا لیا۔ دانیال ایک زبردست مقرر تھا۔ اس کی ہموار' یک آہنگ آواز خواب آور کیفیت کی حامل تھی۔ ایک شام میرے دو دوست آئے۔ دونوں پئے ہوئے تھے۔ دانیال نے ان کے بس یونہی پوچھے گئے سوالات کے جواب میں جدلیاتی مادیت اور طبقاتی کشمکش کے حوالے سے ایک طویل خود کلامی کی۔ میں تازہ ہوا لینے باہر چلا گیا جب میں کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آیا تو دانیال اس وقت بھی بولے چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں دوست گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

دانیال کے توسط سے مجھے دو مزید ملاقاتی حاصل ہوئے۔ پہلا سری پدڈ نگے تھا جو اس وقت پولیس سے بھاگا ہوا تھا۔ اسے خود کو میرا نوکر ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس نے زیادہ تر وقت میری کتابیں پڑھنے میں گزارا۔ جب کوئی مجھے ملنے آتا تو وہ باورچی خانے میں چھپ جاتا تھا۔ ایک اور اجوائے گھوش تھا' اس وقت وہ بھی زیر زمین تھا۔ وہ ایک کرخت اور گفتگو نہ کرنے والا شخص تھا۔ اس کی محبوبہ اور بعد ازاں اس کی بیوی' لِٹو ہر روز اس وقت آتی تھی جب میں ہائی کورٹ میں ہوتا تھا اور اس کے ساتھ کئی کئی گھنٹے گزارا کرتی تھی۔ کئی برس بعد میں نے انگلینڈ میں سی آئی ڈی کے اپنے دوست ایوریٹ سے پوچھا تھا کہ کیا اسے پتا تھا کہ وہ دونوں آدمی میرے ہاں رہتے تھے۔ اس نے کہا ہاں وہ جانتا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ انہیں گرفتار نہیں کیا جائے بلکہ صرف میرے اپارٹمنٹ کی نگرانی کی جائے اور میرے کمیونسٹ مہمانوں سے ملنے

والے لوگوں کے نام نوٹ کر لیے جائیں۔

ایک شخص جو لاہور کے زمانے میں میری زندگی پر حاوی رہا وہ تھا منظور قادر۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا' اس نے انگلینڈ سے بار کیا تھا اور لائل پور (اب فیصل آباد) میں ضلعی عدالتوں میں پریکٹس کرتا تھا۔ اس نے قابل لحاظ موکل حاصل کر لیے تھے اور غیر معمولی قابلیت کے حامل ایک دیانت دار انسان کی شہرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا باپ سر عبدالقادر لاہور ہائی کورٹ کا جج اور ایک ادبی شخصیت رہا تھا: مخزن کے مدیر کے طور پر اس نے علامہ اقبال کی نظمیں پہلی بار شائع کی تھیں' جن کا وہ دوست تھا۔ منظور کی شادی اصغری سے ہوئی تھی جو میاں سر فضل حسین کی بیٹی تھی۔ وہ بہت حسین و جمیل تھی۔ روسی مصور سوٹیو سلاف روئریچ نے میڈونا کے پورٹریس کے لیے اسے ماڈل کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس وقت اصغری منظور کو اپنی حیثیت سے کم تصور کرنے لگی اور محسوس کیا کہ اس نے اس پر عظیم احسان کیا ہے۔ وہ ایک چھوٹے قد' گرتے بالوں' چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا آدمی تھا جو موٹے شیشوں والی عینک لگاتا تھا۔ واضح طور پر وہ اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور صبر کے ساتھ اس کے طعنوں کو سہہ رہا تھا۔ منظور اور میری شناسائی اور دوست بننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ قسمت سے ہم دونوں کی بیویاں ایک دوسرے سے ملتے جلتے خاردار اور تنگ کرنے والے کردار کی حامل تھیں' دونوں کی خوب نبھتی بھی تھی۔ ہم نے ہر دوسری صبح ایک دوسرے کے گھروں میں کھانا شروع کر دیا۔ میری بیوی اور منظور کا سینما جانے کا شوق مشترک تھا: وہ ہر ہفتے کم از کم ایک فلم دیکھا کرتے تھے۔ اس کو آموں کا بھی جنون تھا۔ دونوں کے سامنے ہوتے تو وہ درجن بھر آم ایک ہی نشست میں بڑے شوق سے کھا جاتے تھے۔

منظور ہر اعتبار سے مجھے ملنے والے کرداروں میں غیر معمولی تھا۔ بلاشبہ وہ پنجاب کا قابل ترین ابھرتا ہوا وکیل تھا۔ وہ اور اس کا چچا محمد سلیم' ٹینس کا مشہور کھلاڑی جس نے ڈیوس کپ میں پندرہ سال ہندوستان کی نمائندگی کی تھی' ہائی کورٹ میں روزانہ کا کام نمٹانے کے بعد گھنٹوں قانونی نکات پر بحث کرنے میں گزار دیتے تھے۔ دونوں آدمیوں نے دیانت کے اعلیٰ ترین معیاروں کو اپنایا تھا' یہ خصوصیت وکیلوں میں تو مقابلتاً شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی فیس چیک کے ذریعے وصول کیا کرتے تھے یا جب نقد لیتے تو اپنے موکلوں کو پوری رقم کی رسید دیا کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے ذمہ واجب الادا انکم ٹیکس سے زیادہ ادا کر دیتے تھے اور اس کا کچھ حصہ واپس مل جاتا تھا۔ منظور مجھے اپنی زندگی میں ملنے والا واحد ایسا شخص تھا جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور لوگوں کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کرنے میں بہت تکلیفیں سہیں۔ وہ ایک طرح کا لٹمس پیپر بن گیا تھا جس کے ذریعے اس کے دوست خود اپنی پختگی کو جانچتے تھے۔ جب

کسی کام کے بارے میں شبہ ہوتا تو ہم اپنے آپ سے سوال کرتے تھے: ''کیا منظور اس کو منظور کرے گا؟'' میری طرح وہ بھی ایک دہریہ تھا۔

منظور اور میری ادب کی محبت مشترک تھی۔ اسے مکمل طور پر اردو شاعری سے محبت تھی، جس سے اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس کو بہت سے شاعروں کی شاعری حفظ تھی۔ وہ شعر کہنے کی بھی کوشش کرتا تھا لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ فحش شاعری کرنے میں ماہر تھا جو وہ اپنے مرد دوستوں کے حلقے میں زبردست جوش کے ساتھ سنایا کرتا تھا۔ عورتیں اردگرد ہوتیں تو بہت متوازن ہو جاتا تھا۔ ہم نے کئی چھٹیاں اکٹھے گزاریں — بعض اوقات پٹیالہ میں، جہاں میرا سسر تیجا سنگھ ملک ایک وزیر تھا، بعض اوقات مشوبرا میں میرے والدین کے ساتھ۔ ہماری دوستی سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شاذ گہری دوستی کی مثال کے طور پر مشہور ہوگئی تھی۔

جو چیز میرے کریئر میں نقطۂ انقلاب ثابت ہوئی وہ تھی منگت رائے کی ہمارے حلقے میں دوسروں پر ادیب کی حیثیت سے حاوی ہونے کی خواہش۔ اس نے تجویز دی کہ تنہا اس کے تعریف کرنے والے سامعین کو اپنی تحریریں سنانے کی بجائے ہر کسی کو اپنی لکھی ہوئی تحریریں سنانا چاہئیں۔ اس کے بعد ہماری پہلی میٹنگ اس کے گھر میں ہوئی تھی — اس نے وارث روڈ پر ایک گھر کا ایک حصہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ جو موضوع اس نے تجویز کیا تھا وہ تھا ''میں یقین کرتا ہوں'' ہمیں زندگی کی اقدار کے حوالے سے اپنے خیالات کو تحریر کرنا تھا۔ قریباً دس مختصر مقالے پڑھے گئے تھے۔ میں نے خدا، مذہب، حب الوطنی، دوستی، محبت، شادی، موت اور موت کے بعد کی زندگی کے نظریات کے حوالے سے اپنے عدم یقین کی وجوہات تحریر کی تھیں۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا تھا اس میں طبعزاد (اوریجنل) تو کچھ بھی نہیں تھا، اور جیسا وہ مجھ تک آیا تھا میں نے ویسا ہی لکھ ڈالا تھا۔ میری اہم کامیابی یہ تھی کہ میں بلا مقابلہ چلے آ رہے منگت رائے کا مقابل بن کر سامنے آیا تھا۔ خود کو انصاف پسند ثابت کرنے کے لیے اس نے زبردست تعریف کی۔ اگلے روز مجھے ولفریڈ اور میوریئل کینٹ ویل سمتھ کی طرف سے تعریفی رقعہ ملا۔ یہ میری پہلی چاہنے والوں کی ڈاک (فین میل) تھی اور جس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ادبی حلقہ ایک ہفتہ وار خصوصی سرگرمی کا روپ اختیار کر گیا۔ ہم مختلف گھروں میں ترتیب وار باری باری اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جب نظمیں، افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تو کھل کر شراب (عموماً ہندوستان ساختہ) پی جاتی اور کھل کر داد دی جاتی تھی۔ دو لوگ جو زیادہ بے قرار و بیتاب ہوتے تھے وہ جسٹس جی۔ ڈی۔ کھوسلہ اور میں تھے۔ کھوسلہ اپنے آپ کو ایک منصف کی بجائے ادیب کے طور پر مقام دلوانے کے لیے بیتاب و بے قرار تھا۔ میرے پاس

دوسروں کے مقابلے میں کرنے کو بہت کم کام تھے۔ میں نے اپنے سکھ بستیوں کے دوروں کو استعمال کیا جہاں سے آنے والے موکلین میرے افسانوں کا پس منظر بنے۔ میں ان اجلاسوں میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے ادراک ہوا کہ امتحانوں میں سب سے اونچے نمبر حاصل کرنے (منکت رائے نے آئی۔سی۔ایس میں لکھے ہوئے اپنے مضمون میں سب سے اونچے نمبر حاصل کیے تھے) کا دارومدار ایک توجہ مبذول کروا لینے ولی کہانی لکھنے کی اہلیت پر ہے۔ یہ ایک پیدائشی وصف تھا___ کچھ اس کے حامل تھے' کچھ نہیں تھے۔منکت رائے نے لکھنا اور ہمارے اجلاسوں میں شرکت کرنا کم کر دیا۔

منکت رائے نے بیوی کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں۔ پہلی لڑکی جس نے اس کی توجہ حاصل کی ہے لاجونتی رالیہ رام تھی' جو ایک قوم پرست (نیشنلسٹ) عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کسی بڑی بڑی آنکھوں' لمبے قد اور خوبصورت بدن والی کشمیری برہمن لڑکی جیسی دلکش تھی۔ اس نے اپنے ایم۔اے انگریزی کے امتحان میں سب سے اونچا درجہ (ٹاپ پوزیشن) حاصل کیا تھا (اس کا باپ یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا) مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ کس طرح ملے تھے تاہم چونکہ منکت رائے عیسائی کمیونٹی میں سب سے زیادہ مطلوب کنوارا تھا اس لیے رالیہ رام خاندان نے اسے دریافت کرنے اور اپنی بیٹی کو اس سے شناسا کروانے میں زیادہ دشواری محسوس نہیں کی ہوگی۔ جب ہم کلب میں ہوتے تو وہ دونوں ہمارے اپارٹمنٹ میں ملا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا اور ان کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ شادی کارڈ چھپ گئے اور تقسیم کر دیئے گئے۔ لاجونتی نے اپنی گھریلو چادروں پر ایل۔ایم۔آر کے ابتدائی حروف کاڑھ لیے۔ مقامی چرچ میں شادی سے چند روز پہلے منکت رائے نے اسے منسوخ کر دیا۔ لاجونتی کا دل ٹوٹ گیا۔ قریباً ردعمل میں اس نے ایک خوبصورت پٹھان محمد یونس سے شادی کر لی' جو آزادی کی تحریک میں سرگرم تھا (اور بعد میں وزیراعظم اندرا گاندھی کے قریب ترین سیاسی ساتھیوں میں شامل ہوا) شادی دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

منکت رائے نے دوبارہ قریباً ہر روز ہم سے ملنے کے لیے آنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی آمد کا کبھی برا نہیں مانا کیونکہ میری بیوی انتہائی ملکیت پسند' حاسد اور توجہ کی طالب بن گئی تھی۔ میں اس کے عدم تحفظ کے احساس کے حوالے سے اسے الزام نہیں دے سکتا کیونکہ میں کھلم کھلا فلرٹ کرنے اور عورتوں سے میل جول رکھنے لگا تھا۔ منکت رائے کے ساتھ اس کی دلچسپی نے مجھے سکون دے دیا۔

کم وبیش ایک برس بعد منکت رائے ایک اور نوجوان عیسائی لڑکی چمپا سے ملا۔ اس نے بھی ایم۔اے انگریزی کے امتحان میں اس وقت اونچے درجے میں کامیابی حاصل کی تھی

جب اس کا باپ ایس۔ پی۔ سنگھا یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا۔ چمپا ایک سیاہی مائل' پر جوش اور مزاحمت نہ کرنے والی لڑکی تھی۔ منگت رائے اس کی طرف اس کی زندہ دلی کی وجہ سے مائل ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہوگئی۔ چمپا نے زیادہ لمبی مدت منگنی برقرار رکھے رہنے کا موقع نہیں دیا اور دونوں کی ایک چرچ میں شادی ہوگئی۔ مدعو ہونے کے باوجود ہم نے شادی میں شرکت نہیں کی۔ چمپا نے ہمارے ساتھ دوستی کی چند ایک نیم دلانہ کوششیں کیں لیکن جب اسے جواب نہیں ملا تو اس نے ہمیں ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

جیسا کہ میں نے پیش بینی کی تھی شادی ناکام ثابت ہوئی۔ منگت رائے نے ہم سے ملاقاتیں دوبارہ شروع کر دیں اور جب ہم دور ہوتے تو میری بیوی کو لمبے لمبے خط لکھتا تھا۔ تاہم اس کی شادی ہر کسی کی توقع سے زیادہ عجیب طریقے سے انجام کو پہنچی۔ ایک گرمیوں میں ہم بیک وقت شملہ میں موجود تھے۔ منگت رائے خاندان اپنی بہن شیلا اور اس کے شوہر آرتھر لال کے گھر میں لکڑ بازار کے نزدیک قیام پذیر تھا۔ ہم معمول کے مطابق مشوبرا میں میرے باپ کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم سائیکلوں پر نیچے شملہ آتے اور ان کے ساتھ مال پر چہل قدمی کرتے تھے۔ یہ واضح تھا کہ چمپا اور آرتھر لال کی خوب نبھ رہی تھی۔ ہفتہ بھر کے لیے اندرون میں کوہ گردی (ٹریکنگ) کے منصوبے بنائے گئے۔ پارٹی تشکیل دے دی گئی اور قلی (پورٹر) کرائے پر حاصل کر لیے گئے۔ آخری دن منگت رائے واپس ہوگیا۔ اس کی بہن نے بھی ایسا ہی کیا۔ آرتھر اور چمپا نے ہمالیائی ویرانوں میں الگ تھلگ ڈاک بنگلوں میں راتیں بسر کر کے ایک ہفتہ اکٹھے گزارا۔ وہ کوہ گردی سے اس یقین کے ساتھ لوٹے کہ انہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا گیا ہے۔ منگت رائے تو پہلے ہی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تلا بیٹھا تھا' شیلا نے اپنے شوہر کی اس سے آزادی پانے کی خواہش پر قدرے جھجک ظاہر کی۔ انجام اس طرح سے نہیں ہوا تھا۔ جب سنگھا اور اس بیوی نے اس بارے میں سنا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو خوب لتاڑا۔ چمپا نے اپنے شوہر سے معافی مانگی۔ اس نے اسی طرح اس کو آمادگی کے ساتھ معافی دے دی جیسے وہ اسے طلاق دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ تاہم تمام عملی مقاصد کے حوالے سے شادی ختم ہوگئی تھی۔

میرا لاہور کا زمانہ قریب الاختتام تھا۔ میرے یہاں قیام کے لیے آنے کے قریباً پہلے ہی دن سے یورپ اور مشرق بعید میں جنگ زوروں پر تھی۔ میں مضبوط فاشسٹ مخالف خیالات رکھتا تھا اور اس امر کا قائل تھا کہ ہندوستان کو حقیقی آزادی حاصل ہونے سے پہلے ہٹلر' مسولینی' ان کے یورپی اتحادیوں اور جاپان کو شکست ہونی چاہیے۔ اکثر ہندوستانی محوری طاقتوں کی فتوحات پر' نازیوں اور فاشسٹوں کی محبت سے زیادہ انگریز حکمرانوں سے نفرت کی

وجہ سے' خوش ہوا کرتے تھے۔ میں سبھاش چندر بوس کے ہندوستانی قومی فوج (انڈین نیشنل آرمی) کی کمان سنبھالے جانے کے بعد جاپانیوں کے ارادوں کے بارے میں پر یقین نہیں تھا۔ وہ اتنا مضبوط انسان تھا کہ کسی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بن سکتا تھا لیکن اس کے اور اس کی آئی۔این۔اے کے بارے میں مجھے سنگین خدشات لاحق تھے۔ جب سٹالن نے ہٹلر سے معاہدہ کیا تو میرے کمیونسٹ تصورات آسمانوں میں پرواز کرنے لگے تھے اور اس وقت صرف کسی حد تک مجروح ہوئے جب وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما ہو گئے۔ میں نے گاندھی کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کو بالکل پسند نہیں کیا۔ میں نے اس یقین کے ساتھ کہ ہندوستان اپنے دونوں سروں پر دو خود مختار مسلمان اکثریتی ریاستوں کے ساتھ ایک ملک کے طور پر چلتا رہے گا' مسلمانوں کے ان علاقوں میں الگ ریاست کے مطالبے کی حمایت کی' جہاں وہ اکثریت میں تھے۔

زیادہ تر ہندوستانیوں کو یقین نہیں تھا کہ انگریز ہندوستان میں اپنی شہنشاہی کو راضی خوشی چھوڑ دیں گے۔ وہ کرپس اور کابینہ مشنوں کو دھوکا دہی سمجھتے تھے۔ وہ انگریزوں کو جانتے نہیں تھے۔ وہ برطانوی افسر جنہوں نے ہندوستان میں جنگ کے دوران ملازمت کی وہ نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر سفید فام کلبوں کی رکنیت اختیار کرنے کو رد کر دیا' ہندوستانیوں کو دوست بنایا' کچھ انگریز حکمرانوں کے ہندوستان میں کیے گئے اقدامات پر شرمندگی ظاہر کی اور کانگرس کی قیادت میں آزادی کی تحریک سے ہمدردی ظاہر کی۔ تاہم ان سے تعلق نہ رکھنے والے ایک واقعے نے مجھے پھر یقین دلا دیا کہ آزادی نزدیک تر ہے۔ یہ واقعہ 1946ء کی گرمیوں میں رونما ہوا۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ مشوبرا میں تھا۔ مجھے لاہور آنا پڑا اور میں نے کالکا سے شام کی ریل کار لی۔ وہاں میرے علاوہ صرف ایک ہندوستانی اور تھا باقی سب کے سب یا تو برطانوی افسروں کی وردیوں میں تھے یا انگریز سویلیئن تھے۔ بیروگ میں ڈنر کے لیے مختصر قیام کے بعد ہمارا پہاڑی سے نیچے کی طرف سفر جاری رہا۔ یہ پورے چاند کی خوبصورت رات تھی۔ دھرم پورہ کے نزدیک ایک موڑ پر ریل کار کا ایک پہیہ نکل گرا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک وہ اگلے سٹیشن سے کالکا سے امدادی کار بھیجے جانے کے لیے نہیں کہتا۔ ہم چاندنی میں نہائی ہوئی پہاڑیوں میں چیڑ کے درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ انگریز قابل فہم انداز میں پریشان تھے کیونکہ چند ماہ پہلے ایک ریل کار پر ڈاکوؤں کا حملہ ہوا تھا جنہوں نے چھ انگریز مسافروں کو قتل کر دیا تھا اور پھر بغیر کچھ لوٹے فرار ہو گئے تھے۔

کسی نے رکی ہوئی کار کا ریڈیو چلا دیا تھا اور بی بی سی کی خارجہ (اوورسیز) سروس لگا دی تھی۔ انتخابات کے نتائج نشر کیے جا رہے تھے۔ لیبر پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کر لی

تھی اور کلیمنٹ ایٹلی کو انگلینڈ کا وزیراعظم نامزد کیا گیا تھا۔ انگریز مسافروں نے خبر کو بت بنے ہوئے خاموشی کے ساتھ سنا۔ دوسرا ہندوستانی جس میں نہیں جانتا تھا اور میں چھلانگ مار کر اٹھے اور ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ ہم جانتے تھے کہ انگلینڈ میں سوشلسٹوں کے اقتدار میں ہوتے ہوئے ہندوستان کے لیے آزادی نزدیک تر ہے۔

منظور قادر خاندان سے اپنی دوستی کے باوجود مجھے عمومی مسلم، ہندو، سکھ تقسیم کے بارے میں کوئی وہم نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اور لائبریری میں بھی وسیع لاؤنج اور لائبریری میں مسلمان وکیل ہندوؤں اور سکھوں سے الگ گوشوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ شادیوں اور جنازوں پر ایک خاص حد تک سطحی سا اختلاط ہوتا تھا تاہم یہ محض ظاہرداری کو برقرار رکھنے کے لیے ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کی پاکستان کے مطالبے کی قرارداد کے بعد تقسیم وسیع ہوگئی تھی اور وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ بہت تیزی سے قوت پکڑتا جا رہا تھا۔ ہر دوسری سہ پہر مسلمانوں کے بڑے بڑے جلوس مال پر نکلتے تھے جو یک آواز ہو کر نعرے لگاتے تھے:

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا الہ الا اللہ

ایک مقدمہ جس میں مَیں منظور قادر کے جونیئر کے طور پر پیش ہوا تھا اس امر کی ایک مثال تھا کہ زہر کتنا پھیل چکا تھا۔ اس مقدمے کا تعلق ایک امیر اور خوبصورت سکھ بیوہ سے تھا، جس کا نام سردارنی پریم پرکاش کور تھا۔ اس کی شادی لدھیانہ کے ایک امیر ٹھیکیدار کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی تھی۔ اس کا خاوند عیاش تھا اور شادی میں اختلاط کیے بغیر ہی آتشک کے ہاتھوں مر گیا۔ اس کی ساری جائیداد نوجوان بیوہ کو مل گئی۔

ایک مرتبہ شملہ میں چھٹیاں مناتے ہوئے وہ ڈیویکوز میں چائے پی رہی تھی۔ مال پر چہل قدمی کرنے والے ایک نوجوان مسلمان نے اسے کھڑکی کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کی نظریں ملیں اور اس کی مسکراہٹ نے اسے یقین دلا دیا کہ اسے خوش آمدید کہا جائے گا۔ وہ اس کی چائے میں شریک ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ نوجوان خوبصورت تو تھا مگر ایک نائی کا بے کار بیٹا تھا۔ اس نے پریم پرکاش کور کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ ان کے دو بیٹے ہو گئے۔ تب پریم پرکاش کور اپنے گنوار محبوب سے اکتا گئی۔ اس کے کزن گرنام سنگھ نے، جو اتنا ہی خوبصورت تھا جتنا کہ مہذب اور لائل پور میں پریکٹس کرنے والا بیرسٹر تھا (وہ منظور قادر کا قریب دوست تھا) پریم پرکاش کور کو نائی کے بیٹے کے شکنجے سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ پریم پرکاش گرنام کا ساتھ رہنے لگی۔ اس کے مسلمان محبوب دو بیٹوں کی تحویل کے معاملے پر اسے عدالت میں لے گیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی، اس نے اسلامی شعائر کے

مطابق اس سے شادی کی تھی' اس کے بیٹوں کا ختنہ ہو چکا تھا اور ان کے مسلمانوں والے نام رکھے گئے تھے۔ شادی اور ان کے بچوں کی تحویل کے علاوہ جائیداد میں زبردستی دخل اور قبضے کے فوجداری مقدمات بھی تھے۔ جیسے ہی مقدمے نچلی عدالتوں سے اپیلٹ عدالتوں میں پہنچے پیٹرن واضح ہو گیا' اگر پریذائیڈنگ افسر مسلمان ہوتا تو مقدمے نائی کے بیٹے کے حق میں چلے جاتے' اگر ہندو یا سکھ ہوتا تو وہ سکھ بیوہ کے حق میں چلے جاتے۔ میں اس وقت منظر میں شامل ہوا جب شادی اور تحویل کا مقدمہ ڈونلڈ فالشا آئی۔سی۔ایس' تب لاہور میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج' کے حضور سماعت کے لیے آیا۔ میں مقدمے کو ایک غیر فرقہ وارانہ رنگ دینے میں محو تھا اور ڈونلڈ اور اس کی بیوی جو آن کے ایک دوست کے طور پر معروف تھا۔

ہم مذہب کی تبدیلی اور شادی کا مقدمہ پیش کر رہے تھے: ایک مولوی جس نے دونوں معاملات کی سربراہی کی تھی کا ایک حلفی بیان مع اصل نکاح نامہ کے بطور شہادت داخل کیے گئے تھے۔ تب منظور نے (یا یہ کوئی اور مسلمانوں وکیلوں کا بینل ہو سکتا تھا) ایک تیسری شہادت پیش کی ـــــ ربن میں بندھا ہوا ایک پیکٹ' اور اسے فالشا کی میز پر رکھ دیا۔ ''اور یور آنر یہ ہے پریم پرکاش پنڈت کے سکھ مت کو ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کن ثبوت۔''

''یہ کیا ہے؟'' فالشا نے پوچھا۔

''یور لارڈ شپ اسے کھول سکتے ہیں اور اس کے مشمولات کا معائنہ کر سکتے ہیں۔''

فالشا نے بہت احتیاط کے ساتھ پیکٹ کو کھولا' پھر اپنے ہاتھ یوں پیچھے کر لیے گویا اسے کرنٹ لگا ہو۔ اس نے ٹماٹر کی طرح سرخ چہرے کے ساتھ دھاڑ کر پوچھا: ''یہ کس قسم کا ثبوت ہے؟''

''یور آنر یہ خاتون کے ناف کے نیچے کے بال ہیں ـــــ انہیں اس نے اس روز شیو کیا تھا جب اس نے میرے موکل سے شادی کی تھی اور اسے تحفہ کے طور پر پیش کیے تھے۔ سکھ' جیسا کہ آپ ضرور جانتے ہوں گے' اپنے بال کبھی نہیں کاٹتے۔''

''اٹھا لو اسے۔'' فالشا دھاڑا ''اسے کوڑے کے ڈبے میں پھینک دو۔ میں اس قسم کے کچرے کو تسلیم نہیں کر رہا ہوں۔''

تاہم اگست 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم تک مقدمہ ہنوز جاری تھا۔ پریم پرکاش کور اور اس کی ساری جائیداد مشرقی پنجاب میں تھی جو ہندوستان میں آ گیا تھا۔ نائی کا بیٹا پاکستان میں رہ گیا تھا۔ گرنام سنگھ نے مشرقی پنجاب میں نقل مکانی کر لی' وہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا اور اس نے پریم پرکاش کے ساتھ اپنا ربط بحال کیا۔ پنجاب اسمبلی میں اپنی اکثریت کھونے کے بعد وہ آسٹریلیا میں ہندوستانی ہائی کمشنر متعین کر دیا گیا۔ کینبرا میں اپنے کاغذات پیش

کرنے کے ایک ہفتے بعد وہ اپنی محبوبہ اور اپنے متعلقین کو آسٹریلیا لے جانے کے لیے آیا۔ اس کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا اور کوئی باقی نہیں بچا۔

پنجاب کی فضا نفرت سے اتنی زیادہ بھر گئی تھی کہ اس کے شعلوں میں تبدیل ہونے کے لیے صرف ایک چنگاری کی کسر تھی۔ کلکتہ میں طویل ہندو مسلم فسادات بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کا سبب بنے جس کے بعد مشرقی بنگال میں نواکھالی میں ہندوؤں کا قتل عام ہوا۔ پھر شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمانوں نے ادھر ادھر بکھری سکھ اور ہندو بستیوں پر حملے شروع کر دیئے اور جو کوئی ان کے ہتھے چڑھا اسے قتل کر دیا۔ باقی اپنی جان بچانے کے لیے گھروں کو چھوڑ کر لاہور' امرتسر اور مشرقی پنجاب کو فرار ہو گئے۔

جب شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل جاری تھا تو مجھے ایک ہندو خاندان کی دو شاخوں کے قتل کے مقدمے میں صفائی کے وکیل کے طور پر ایبٹ آباد جانے کا موقعہ ملا۔ مقدمہ ایک ہی دن میں ختم ہو گیا۔ اگلی صبح اپنی ٹرین پکڑنے کے لیے ٹیکسلا بجائے گاڑی سے آنے کے' میں نے دس میل کا فاصلہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ موسم فرحت بخش تھا۔ سڑک مکمل طور پر ویران تھی۔ میں جن جن بستیوں سے گزرا' ان میں مجھے زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا۔ عورتیں اور مرد مجھے اکیلے ڈگ بھرتے دیکھنے کے لیے دروازوں میں نکل آئے تھے۔ یہ انوکھی بات تھی۔ ٹیکسلا سے دو میل ادھر سکھ سپاہیوں سے بھری ہوئی ایک لاری میرے پاس آن رکی۔ ایک نوجوان کیپٹن نے درشتی سے مجھے کہا: ''سردار جی! کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں؟ انہوں نے بستیوں میں ایک ایک سکھ کو قتل کر دیا ہے اور آپ اس طرح باہر نکلے ہوئے ہیں گویا شام کی چہل قدمی پر نکلے ہوں۔ اندر آ جائیں۔'' میں نے تعمیل کی اور مجھے ٹیکسلا سٹیشن پر اتار دیا گیا۔

سوائے سٹیشن ماسٹر اور دو ٹکٹ کلکٹروں کے ٹیکسلا کا ریلوے سٹیشن سارے کا سارا سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں نے جس ٹرین پر سوار ہونا تھا' اسے آتے ہوئے اور ایک بیرونی سگنل پر ٹھہرتے ہوئے دیکھا' میں نے کچھ چیخ و پکار تو سنی مگر اس کے بارے میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر آ کے رکی تو میں ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ میں واحد مسافر تھا اور میں نے اندر سے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ ٹرین جن جن سٹیشنوں سے گزری کسی میں زندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جب میں لاہور پہنچا تو پلیٹ فارم پر منظور قادر کے سوا کوئی بھی نہیں تھا' جو مجھے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات چھڑ گئے ہیں۔ اگلی صبح میں نے اخبارات میں اس ٹرین کے بارے میں پڑھا جس کے ذریعے میں نے سفر کیا تھا کہ اسے ٹیکسلا سٹیشن کے قریب ایک سگنل پر روک کر سارے سکھ

مسافروں کو باہر گھسیٹ لیا اور قتل کر دیا گیا تھا۔

چند روز بعد منظور قادر کو لے کر آنے کی میری باری تھی۔ وہ ایک مقدمے کے لیے گوجرانوالہ گیا تھا۔ جب وہ واپس آ رہا تھا تو بادامی باغ کے قریب اس کی ٹرین پر مسلمان ہجوم نے حملہ کر دیا اور اس کے سکھ مسافروں کو باہر گھسیٹ لیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے قتل عام ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ زرد دکھائی دے رہا تھا اور ہنوز اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے لاہور کو چھوڑ دینے پر مجبور کیے جانے سے کچھ دن پہلے میں گوجرانوالہ کے سیشن جج کی عدالت میں تین آدمیوں کے مقدمہ میں صفائی کے وکیل کے طور پر گیا جن پر قتل اور ڈکیتی کا الزام تھا۔ ملزموں میں سے دو آئی۔این۔اے کے رکن تھے اور ان کے دفاع کے لیے قائم کی گئی ایک تنظیم نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ سیاسی جرم نہیں بلکہ قتل کا مقدمہ تھا۔ وہ آدمی لاہور سے راولپنڈی جانے والی رات کی ٹرین میں سوار ہوئے اور وہ دو نوجوان انگریز فوجی نرسوں کے زیر قبضہ فرسٹ کلاس کوپے میں زبردستی چلے گئے۔ لڑکیوں نے مزاحمت کی' اس نے خود کو اوپر والی برتھ سے نیچے کھینچنے والے آدمی کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ دوسری ہاتھوں کے ذریعے لڑتی رہی۔ آدمیوں نے اسے تیزی سے چلتی ہوئی ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ جب ٹرین گوجرانوالہ رکی تو تاریکی میں تینوں ڈاکو غائب ہو گئے۔ بچ جانے والی لڑکی ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی پلیٹ فارم پر دوڑتی چلی گئی۔ ریلوے پولیس منظر پر نمودار ہوئی اور دوسری انگریز لڑکی کا جسم پٹڑی پر پڑا ہوا مل گیا۔ بچ جانے والی کو گوجرانوالہ ہسپتال لے جایا گیا اور انگلینڈ واپس لے جانے سے قبل' صدمہ پہنچنے کی وجہ سے اس کا علاج کیا گیا۔ اگلے روز ہی تینوں ملزم گرفتار کر لیے گئے۔ وہ سکھ تھے۔ ڈکیتی کے بعد انہوں نے رات کو ایک سوئے ہوئے نائی کو بیدار کیا تھا اور گرفتاری سے بچنے کے لیے اس نے اپنے لمبے لمبے بال اور ڈاڑھیاں کٹوالی تھیں۔

چند ماہ بعد جب استغاثہ نے اپنے مقدمے کو پیش کرنے کی تیاری کر لی تو بچ جانے والی انگریز لڑکی ہندوستان سے پرواز کر گئی۔ ایک شناخت پریڈ میں لڑکی سے حملہ آوروں کی شناخت کروائی گئی تھی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اس نے انہیں بالکل درست طور پر شناخت کر لیا تھا اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ نائی کی شہادت' ملزموں سے حاصل ہونے والی لوٹی ہوئی باقی ماندہ چیزوں بشمول نشانہ بننے والی کے ہینڈ بیگ مع ایک کمپیکٹ' اس کی لپ سٹک' کنگھی اور خواتین کے میک اپ کی دیگر اشیا کی بنیاد پر ایک بہت مضبوط مقدمہ تیار ہو گیا ہے۔ جب میں سیشن کورٹ میں پہنچا تو یہ واضح تھا کہ سیشن جج' جو ایک مسلمان تھا' تینوں آدمیوں کو پھانسی دینے کا سوچ چکا ہے۔ مجھے انگریز لڑکی کی دیانت داری سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ میں نے نائی

سے جرح کرنے کا تردد بالکل نہیں کیا' نہ ہی ملزموں سے برآمد ہونے والے سامان کے حوالے سے پولیس سے کوئی جرح کی۔ بستی کے نائیوں سے تو پولیس جو بھی چاہے کہلوا سکتی تھی اور معصوم لوگوں پر پولیس عموماً اپنی طرف سے چیزیں ڈال دیا کرتی تھی۔ میں نے انگریز لڑکی پر ساری توجہ مرکوز رکھی۔ وہ ہنوز صدمے کی کیفیت میں تھی اور ٹرین کے المناک سفر کے دوران میں رونما ہونے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے کئی مرتبہ رو پڑی۔ جونہی میں اس سے جرح کرنے کے لیے کھڑا ہوا جج نے مجھ سے بڑی درشتی کے ساتھ کہا: ''اختصار سے کام لینا! اس نے بہت مصیبت سہی ہے۔ میں تمہیں اس کو ہراساں کرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے احتجاج کیا کہ مجھے یا تو اپنا فرض ادا کرنے دیا جائے یا پھر مجھے مقدمے سے ہاتھ اٹھا لینے دیا جائے۔ وہ نرم پڑ گیا اور کارروائی جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ کیا وہ ایک ہی عمر کے دو سکھوں میں فرق کر سکتی ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کے لیے ایسا کرنا بہت دشوار ہو گا۔ پھر وہ کس طرح یقین سے کہہ سکتی ہے کہ یہ وہی تین آدمی تھے جنہوں نے انہیں لوٹا تھا' جس کو اس نے دانت کاٹے تھے اور جس نے اس کی ساتھی کو ٹرین سے باہر پھینکا تھا؟ اس نے اعتراف کیا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی ہے تاہم ان لوگوں کو پولیس نے گرفتار کیا ہے اور اسے انہیں شناخت کرنے کا کہا گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ ملزموں کو' جنہوں نے اپنی شیو کروا لی تھی' پولیس نے اس سے شناخت کروانے سے پہلے جبراً اپنی ڈاڑھیاں دوبارہ بڑھانے کو کہا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ نہیں' وہ اس امر سے آگاہ نہیں تھی۔

شناخت پریڈ ایک بہت گھٹیا اور مصنوعی معاملہ رہا تھا۔ انگریز لڑکی کے سامنے کھڑے بارہ آدمیوں میں صرف تین ڈاڑھی والے سکھ تھے' اس نے ان ہی کی نشان دہی کر دی تھی۔ اس نے بلا توقف اعتراف کیا کہ اگر وہ سب ڈاڑھی اور پگڑیوں والے ہوتے تو اس کے لیے خطا کار کی نشاندہی کرنا ناممکن ہوتا۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ ایک پولیس افسر نے اسے ملزموں کو شناخت کرنے میں مدد کرنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے اس کی پیشکش کو رد کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کٹہرے میں ہتھکڑیوں میں بندھے کھڑے تینوں ملزموں کو دیکھے اور اس کی نشان دہی کرے جس کو اس نے دانت کاٹے تھے اور ان دو کی نشان دہی کرے جنہوں نے اس کی ساتھی کو کمپارٹمنٹ سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس نے ملزموں کی طرف دیکھنے سے انکار کر دیا۔ استغاثہ کے وکیل اور جج نے مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور اصرار کیا کہ جج میرے سوال کو مسترد کیے جانے سے پہلے ریکارڈ کا حصہ بنائے۔ سوال کو ریکارڈ کر لیا گیا۔ جج نے مسترد کرنے سے پہلے اس پر دوبارہ سوچا اور عینی شاہد سے بہت نرمی سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس سوال کا جواب دینا چاہتی ہے۔ لڑکی رونے چلانے لگی: ''نہیں'

نہیں، نہیں۔ میں ان خونیوں کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی۔ پلیز مجھے جانے دیجئے!'' میرے اصرار پر اس کا جواب ریکارڈ کر لیا گیا اور لڑکی کو دو برطانوی سپاہیوں کی مدد سے عدالت سے باہر لے جایا گیا۔

میں نے ایک بہت خفا جج کے روبرو اپنے صفائی کے دلائل پیش کیے۔ اس نے یوں دیکھا گویا وہ مجھے بھی تینوں ملزموں کے ساتھ ہی پھانسی دینا چاہتا ہو۔ میں لاہور چلا گیا اور چند دنوں بعد کسولی روانہ ہو گیا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ سیشن جج نے تینوں ملزموں کو ناکافی شواہد کی وجہ سے بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ میرے ذہن میں تھوڑا سا شک تھا کہ جن تین آدمیوں کو میں نے آزادی دلوائی تھی کہیں وہ ڈاکے اور قتل کے مجرم ہی نہ ہوں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مجھے قانون کے پیشے سے گھن دلا دی تھی: اس کا انصاف سے بہت کم سروکار ہوتا ہے۔

لاہور میں اچانک فسادات پھوٹ پڑے۔ سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے پنجاب قانون ساز اسمبلی کی عمارت کے باہر ایک میلوڈرامائی اشارہ کرنے کی وجہ سے یہ فسادات بھڑکے تھے۔ چیمبر کے اندر وزیراعظم سر خضر حیات ٹوانہ کو مسلم لیگ کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ پنجابی مسلمان بھی پاکستان کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ جونہی اجلاس ختم ہوا ماسٹر تارا سنگھ نے نیام سے کرپان کھینچی اور نعرہ لگایا: ''پاکستان مردہ باد۔'' یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی آگ پکڑنے والی گیس سے بھرے ہوئے کمرے میں ماچس جلا دی جائے۔ سارے صوبے میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ قتل عام میں مسلمانوں کو بالادستی حاصل تھی۔ وہ اکثریت میں تھے، بہتر طور پر منظم تھے اور ہندوؤں یا سکھوں سے زیادہ متحرک تھے۔ پنجاب پولیس زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل اور شرم ناک حد تک جانب دار تھی۔ مسلمان گروہوں کی مزاحمت کرنے والا واحد منظم گروپ آر۔ ایس۔ ایس تھا تاہم وہ جو کچھ کر سکا یہی تھا کہ چند بم دھماکے کر دیئے جن میں ہو سکتا ہے ایک دو افراد مارے گئے ہوں۔ پھر وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ شہری سکھ بہت قابل رحم تھے: انہوں نے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جنگجویانہ شجاعت کو ابھارا اور ان لمبی لمبی کرپانوں کو لہرایا جنہیں انہوں نے کبھی نیام سے نہیں نکالا تھا۔

ایک روز دو مسلمان لڑکوں بعمر گیارہ اور بارہ سال نے ایک گیس سٹیشن پر کام کرنے والے بہاری کو چاقو مار کر دن دہاڑے قتل کر دیا، میں وہاں سے پٹرول خریدا کرتا تھا۔ خدشے سے بے نیاز سائیکل سوار سکھوں کو سڑکوں کے آر پار بندھی رسیوں کے ذریعے پھانس لیا جاتا اور دفعتاً دونوں طرف اوپر کھینچ لیا جاتا۔ اور خنجر مار دیئے جاتے۔ ہماری راتیں ایک طرف ''اللہ اکبر'' اور دوسری طرف ''ست سری اکال'' یا دوسری طرف سے ''ہر ہر مہادیو'' کے ایک دم پھٹ

پڑنے والے نعروں سے پریشان ہو جاتیں۔ مسلمان زیادہ پراعتماد تھے ــــ وہ ہندو اور سکھ علاقوں کے قریب چلے جاتے اور چلاتے ''ہوشیار! شکار کا ہے انتظار!''

مسلمان غنڈوں کی جو تھوڑی بہت مزاحمت ہندو اور سکھ کر رہے تھے وہ جون 1947ء کی ایک گرم سہ پہر منہدم ہو کر رہ گئی۔ ادھر سوائے بندوقوں کے فائروں یا نعروں کے شور کے اور کوئی آواز نہیں تھی: شہر سے صرف دھوئیں کے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔ شاہ عالمی کا سارا ہندو علاقہ آگ کی نذر کر دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے' جو کچھ اٹھا لے جا سکتے تھے اس کے سمیت لاہور سے نکلنا شروع کر دیا۔ چند دنوں بعد انہیں زبردستی نکالا گیا اور کچھ بھی ساتھ نہیں لے جانے دیا گیا۔ ان کے گھر اور ساز و سامان پر ان کے مسلمان پڑوسیوں نے قبضہ کر لیا۔ [1]

میں نہیں جانتا تھا کہ ہم لاہور میں کتنا عرصہ رہنے کے قابل ہوں گے۔ ہم نے اپنے دونوں بچوں کو ان کی نانی کے پاس کسولی بھیج دیا تھا۔ میرے دونوں طرف کے ہمسایوں نے اپنی اپنی دیواروں پر اپنی اپنی مذہبی شناختیں واضح طور پر عیاں کر دی تھیں: ایک طرف ایک بہت بڑی صلیب تھی' یہ واضح کرنے کے لیے کہ وہ عیسائی تھے' دوسری طرف بڑے بڑے اردو حروف میں لکھا تھا: پارسی کا مکان۔ نزدیک ہی جسٹس تیجا سنگھ رہتا تھا۔ وہ اکثر مجھے اور دوسرے سکھوں کو نصیحت کرتا کہ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ ایک صبح اگست کے اوائل میں جب میں اس کے گھر گیا تو وہ مقفل پڑا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ اس کا مالک تو دہلی چلا گیا ہے۔ وہ میرا لندن کے زمانے کا کالج کا دوست تھا' سی۔ ایچ۔ ایوریٹ' جو اس وقت سی۔ آئی۔ ڈی کا سربراہ تھا' جس نے مجھے صورت حال نارمل ہو جانے تک چند دنوں کے لیے لاہور سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے مشورہ دیا: ''اپنے گھر اور اشیا کو کچھ مسلمان دوستوں کی حفاظت میں چھوڑ کر چلے جاؤ۔'' منظور اس وقت شملہ میں کچھ مقدمات پر کام کر رہا تھا۔ میں نے اسے فون کیا اور جہاں سڑک کی شاخ کسولی کو نکلتی تھی وہاں کالکا شملہ روڈ پر دھرم پورہ میں ملاقات طے کی۔ اگلی رات میری بیوی' میں اور ہمارا ہندو باورچی ایوریٹ کے فراہم کیے ہوئے بلوچ سپاہیوں کے دستے کی حفاظت میں ریلوے سٹیشن گئے۔ ہم اپنے نوجوان سکھ ملازم دلیپ سنگھ کو منظور قادر کو آ کر ہمارا گھر سنبھالنے تک گھر کا نگران بنا آئے تھے۔

ہم بغیر کسی بدقسمتی والے حادثے کے اگلی صبح کالکا پہنچ گئے۔ میں نے ملاقات کے لیے کار آگے بھیج دی۔ ہم دھرم پور چلے گئے۔ چند منٹ بعد منظور شملہ سے ٹیکسی کے ذریعے پہنچ

---

[1] خوش ونت سنگھ کے الفاظ اور مفہوم سے مترجم اور پبلشر کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ دیانتداری کے تقاضوں کے تحت متن جوں کا توں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ فقط مصنف خوشونت سنگھ کی ذاتی آراء ہیں۔ (مترجم و پبلشر)

گیا۔ اس نے بتایا کہ شملہ میں چند کشمیری مزدوروں کو خنجر گھونپ دیئے گئے ہیں اور مسلمان ہماچل کی پہاڑی تفریح گاہوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کی چابیاں اس کے حوالے کیں۔ ہم گلے ملے اور ہم نے جونہی معاملات دوبارہ سنبھلے ملنے کا وعدہ کیا۔

ہم نے کسولی میں چند روز بسر کیے۔ اس وقت تک ہندوؤں اور سکھوں کا پاکستان سے اور مسلمانوں کا مشرقی پنجاب سے خروج شروع ہو چکا تھا۔ ٹرینوں اور پیدل قافلوں پر حملوں کی اندوہ ناک کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں جن میں ہزاروں افراد کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ سکھ' جنہیں مغربی پنجاب میں ہول ناک مار پڑی تھی' مشرقی پنجاب میں معصوم مسلمانوں سے خونیں انتقام لینے نکلے ہوئے تھے اور ایک کے بعد دوسری بستی کا صفایا کر رہے تھے۔ میں نے چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور دہلی چلا گیا۔ مجھے سوچنا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو کسولی چھوڑا اور ایک موٹر مکینک کو ساتھ لیا تاکہ کار میں ہو جانے والی کسی خرابی کو درست کیا جا سکے۔ کالکا سے کچھ میل آگے میں نے پایا کہ سڑک کے ساتھ ساتھ قائم سارے گیس سٹیشن بند پڑے ہیں۔ راستے میں مَیں نے اپنے لاہور کے ملازم دلیپ سنگھ کو سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مسلمان ہجوم لاہور میں ہمارے گھر میں آیا تھا۔ قادر اور اس کے نوکروں نے اسے کئی دن تک چھت پر چھپائے رکھا اور منظور نے صدر دروازے سے میرے نام کی تختی (نیم پلیٹ) ہٹا دی تھی اور اس کی جگہ اپنی نیم پلیٹ لگا دی تھی۔ تاہم خبر نکل گئی کہ ایک سکھ کو پناہ دی جا رہی ہے اور غنڈے گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ منظور ان کے اندر گھس آنے سے پہلے ہی پولیس کو بلانے میں کامیاب رہا۔ اسی رات کو اس نے دلیپ سنگھ کو اپنی کار میں چھپا کر اس جگہ پہنچایا جو نئی پاک و ہند سرحد بننے والی تھی۔ اس نے اسے پیسے دیئے اور امرتسر سے کالکا جانے والی ٹرین میں سفر کرنے کی ہدایت کی۔ اس طرح وہ وہاں آیا تھا۔ کسولی کے بارے میں اس نے کچھ نہیں سنا تھا' وہ دہلی کو جانے والی سڑک پر چل پڑا تھا' اس امید میں کہ راستے میں کہیں تو کوئی بس مل جائے گی۔

میں نے دلیپ سنگھ کو کار میں بٹھایا' دہلی پہنچنے کے لیے کافی پٹرول رکھا اور اپنے راستے پر چل پڑا۔ سڑک پر کوئی ایک شخص بھی نہیں تھا۔ گرانڈ ٹرنک روڈ کے ساتھ ساتھ واقع بستیوں یا قصبوں میں سے کسی میں زندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جب میں کرنال سے' جو کہ دہلی سے کوئی ساٹھ میل ادھر ہے' گزرا تو صرف تبھی میں نے ایک جیپ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں رک گیا جیپ بھی مجھ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر رک گئی۔ میں نے اپنا پستول نکالا اور انتظار کرنے لگا۔ جیپ کو تکتے رہنے کے پانچ اذیت ناک منٹوں کے بعد میں نے جانا کہ اس میں سوار لوگ تو سکھ تھے۔ دو آدمی ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے باہر نکل آئے۔ مجھے یقین

ہو گیا اور میں کار کو جیپ کے قریب لے گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا دہلی تک جانا محفوظ رہے گا یا نہیں۔ ''بالکل محفوظ'' انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ ''ہم نے سڑک کیساتھ واقع بستیوں سے تمام سوروں کو صاف کر دیا ہے۔'' انہوں نے مسلمانوں کے لیے لفظ ''سوروں''[1] استعمال کیا تھا۔ اس سے میرے معدے میں اینٹھن ہونے لگی۔ یہ جگہ ان سے بحث کرنے کی نہیں تھی۔ میں ہندوستان کے آزاد قرار دیئے جانے سے چند روز پہلے دہلی پہنچ گیا۔

میرے پاس جانے کو اپنے باپ کا گھر تھا۔ دوسرے سینکڑوں ہزاروں لوگ' جو میری طرح پاکستان بننے والے علاقے سے فرار ہو کر آئے تھے' کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ کچھ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں رہ رہے تھے' دوسروں نے قدیم یادگاروں' ریلوے پلیٹ فارموں' دکانوں اور دفتروں کے بیرونی برآمدوں پر قبضہ کر لیا تھا یا فٹ پاتھوں پر اپنے گھر بنا لیے تھے۔ رونما ہونے والے المیئے کی اہمیت آنے والی آزادی کے غلغلے میں عارضی طور پر دب گئی تھی۔ یہ اس آدمی جیسا معاملہ تھا جس کو اس وقت زخم کا احساس نہیں ہوتا جب اس کا بازو یا ٹانگ اچانک کٹ جاتی ہے: درد کچھ وقت بعد ہوتا ہے۔

14 راگست کی رات میں انسانوں کے اس بہاؤ میں شامل ہو گیا جو پارلیمنٹ ہاؤس کی طرف رواں تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی کا کزن ہر جی ملک تھا۔ ہم گیارہ بجے پارلیمنٹ پہنچ گئے تھے۔ ہجوم بہت بڑا' منضبط اور جوش و ولولے سے لبریز تھا۔ وقفے وقفے سے وہ ''مہاتما گاندھی کی جے'' اور ''انقلاب زندہ باد'' کے زوردار نعرے لگانے لگتا تھا۔ آدھی رات سے ایک منٹ پہلے ہجوم پر خاموشی طاری ہو گئی۔ سچیتا کرپلانی کی آواز لاؤڈ سپیکر سے آئی جو ''وندے ماترم'' گا رہی تھی۔ اس کے بعد پنڈت نہرو نے اپنی یادگار تقریر کی: ''کئی برس پہلے ہم نے منزل پر پہنچنے کا عہد کیا تھا...... اب اس عہد کو نبھانے کا وقت آ گیا ہے......'' جونہی تقریر ختم ہوئی' ہجوم تالیاں بجانے اور نعرے لگانے لگا۔ ہم اجنبیوں سے گلے ملے اور آزادی حاصل کرنے پر ایک دوسرے کو مبارک دی ہم دو بجے کے بعد تک گھر نہیں پہنچے۔

میں جلدی اٹھ گیا تا کہ لال قلعے جا کر یونین جیک کو اترتا اور ہندوستانی ترنگا چڑھتا دیکھوں۔ ایک مرتبہ پھر سارا راستہ پیدل چلنے والے لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن اپنی چھ گھوڑوں والی وائسرائے کی بگھی میں سوار ہو کر جا رہے تھے۔ بہت سے برطانوی افسروں کو ہجوم نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ لگ بھگ ایک رات پہلے تک کے سب سے زیادہ نفرت کے قابل انگریز ہندوؤں کے لیے سب سے زیادہ محبت کے قابل غیر ملکی بن گئے تھے۔

1۔ مصنف کے الفاظ اور مفہوم سے مترجم اور پبلشر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (مترجم و پبلشر)

میں لال قلعے کے پشتے سے قریباً پچاس گز دور کھڑا تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے یونین جیک اتارتے وقت بگل سن رہا تھا۔ جب پنڈت نہرو نے ہندوستانی ترنگا لہرایا تو بینڈ قومی ترانے کی دھن بجا رہا تھا۔ جمہوریہ کے نئے صدر کو سلامی دینے کے لیے توپیں گرج رہی تھیں۔ میں نے سنا سب مگر دیکھا بہت کم کیونکہ خوشی کے آنسوؤں نے میری بینائی کو دھندلا دیا تھا۔ اور میرا دل فخر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب بہت اچھا تھا لیکن اب مجھے اپنی روزی کمانے کے لیے کیا کرنا تھا؟ ہم آزادی اور تقسیم کے ساتھ پیدا ہونے والی نفرت میں لاہور تو واپس نہیں جا سکتے تھے۔

چھٹا باب

مینن کے ساتھ لندن میں' ملک کے ساتھ کینیڈا میں

ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ جو سب سے اہم بات میرے ساتھ واقع ہوئی وہ تھی قانون کے پیشے سے میرا نکل آنا۔ میں نے دوبارہ کبھی اس کی طرف نہ جانے کی سوگند کھالی۔ کچھ ترغیبات مجھے میرے راستے سے ہٹانے کے لیے جاری تھیں۔ مسٹر جناح نے میرے باپ سے کہا کہ اسے مجھے لاہور ہی میں رہنے کے لیے قائل کرنا چاہیے۔ اشارہ واضح تھا' وہ مجھے ہائی کورٹ کا جج بنانا چاہتے تھے۔ واضح تھا کہ نہ تو وہ چاہتے تھے اور نہ ہی انہوں نے پیش بینی کی تھی کہ پاکستان میں' جسے وہ وجود میں لائے تھے' غیر مسلموں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ ایسی ہی یقین دہانی مجھے میرے دوست جسٹس کھوسلہ نے کروائی تھی جو شملہ میں دوبارہ تشکیل پانے والی پنجاب ہائیکورٹ میں سنیارٹی میں دوسرے نمبر پر تھا۔ میں اوپر آنے والے کسی ہندو یا سکھ وکیل سے زیادہ برا نہیں تھا اور وہ میرے نام کو قبول کرلے گا۔ تاہم قانون سے متعلق ہر شے کے خلاف میری ذہنی برگشتگی ایسی تھی کہ میں نے ان ترغیبات کو رد کردیا۔

مجھے کیا کرنا تھا؟ ادھر بے شمار ملازمتیں مہیا تھیں۔ ہندوستان نے کئی سفارت خانے کھولے تھے اور ان کے لیے افراد کی ضرورت تھی۔ اصغری قادر کا بھائی عظیم حسین' جس نے ہندوستان میں رہنے ہی کو پسند کیا تھا' اس وقت نائب وزیراعظم سردار ولبھ بھائی پٹیل کے تحت وزارتِ اطلاعات ونشریات کا ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے لندن میں انڈیا ہاؤس کے تعلقاتِ عامہ کے شعبے میں افسر اطلاعات (انفارمیشن آفیسر) متعین کروا سکتا ہے۔ یہ ملازمت مجھے انگلینڈ واپس لے جانے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔ مجھے سردار پٹیل سے مختصر سی ہدایات لینا تھیں' پھر تقرر کی یونین پبلک سروس کمیشن سے توثیق ہونا تھی۔

میری بریفنگ ایک واقعہ تھی۔ مجھے سردار پٹیل کے گھر (بعد میں موتی لال نہرو مارگ پر اطالوی سفیر کی رہائش گاہ) پر حاضر ہونا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے داخلی دروازے کے ساتھ ہی واقع پرائیویٹ سیکرٹری کا دفتر دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ مجھے کچھ وقت انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ وزیر کو ایک اہم ملاقاتی کی آمد متوقع ہے۔

چند منٹ بعد مہاراجہ اندور کی رولز رائس جھنڈا لہراتے ہوئے آ کر رکی۔ ایک افسر نے' جو بحریہ کی سفید وردی پہنے ہوئے تھا ہز ہائی نیس کے باہر آنے کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ ان کا استقبال وزیر کے سیکرٹری نے کیا اور ڈرائنگ روم تک لایا۔ جہاں میں بیٹھا ہوا تھا وہاں سے دیکھ سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ سردار پٹیل اپنے چہرے کے عمومی کڑے تیوروں کے ساتھ آیا اور مہاراجہ کو' جو کھڑا ہو گیا تھا' بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ملاقاتی کے ساتھ ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ مہاراجہ نے اپنی آکسبرج انگریزی میں تیز تیز بولنا شروع کیا۔ سردار پٹیل اپنی چپلوں کو دیکھتا رہا۔ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ مہاراجہ دوسرے راجاؤں کو نواب آف بھوپال کا ساتھ دینے کے لیے قائل کر رہا تھا اور ہندوستان کی حکومت کے اپنی ریاستوں کو قبضے میں لینے اور انہیں سرکاری خزانے سے پنشن دیئے جانے کے منصوبے کی مزاحمت کر رہا تھا۔ داخلی امور کے وزیر کے طور پر سردار پٹیل کو ان سے الحاق کی دستاویز پر دستخط لینے کا کام سونپا گیا تھا۔ میں سن نہیں سکتا تھا کہ مہاراجہ اندور کیا کہہ رہا تھا تاہم یہ واضح تھا کہ وہ خفیہ سرگرمیوں کے حوالے سے لگائے گئے الزامات سے انکار کر رہا تھا۔ سردار پٹیل نے ایک مرتبہ بھی اوپر دیکھے یا مداخلت کیے بغیر اسے بولتے رہنے دیا۔ جب مہاراجہ رکا تو پٹیل کھڑا ہو گیا تو اتنی آواز اور اونچی آواز میں کہ جو میرے کانوں تک بھی پہنچی' کہا تم جھوٹے ہو۔'' اور چلا گیا۔ ایک بہت دل شکستہ مہاراجہ' جس کے پیچھے پیچھے اس کا خوب صورت اے ڈی سی تھا' عجلت میں آ کر رولز رائس میں بیٹھ گیا۔ سردار پٹیل کا سیکرٹری مجھے بتانے آیا کہ وزیر اتنا اپ سیٹ ہے کہ مجھ سے مل نہیں سکتا۔ مجھے لندن جانا تھا اور سدھیر گھوش افسر تعلقات عامہ سے بریفنگ لینا تھی' جو میرا باس ہوگا۔

چند روز بعد میں کے ایل ایم کی پرواز سے لندن چلا گیا۔ ان دونوں ہوائی سفر ایک تفریحی معاملہ ہوتا تھا۔ ہمارے پاس سونے کے لیے برتھیں تھیں اور ہمیں قاہرہ میں اترنے سے ایک گھنٹہ پہلے جگا کر گرم گرم کافی یا چائے کے کپ پیش کیے گئے۔ ہمیں ایک چھوٹے ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا اور آرام کرنے' نہانے اور ناشتے کے لیے کمرے دیئے گئے۔ ہمیں جہاز پر لندن جانے کے لیے دوبارہ سوار ہونے سے قبل باغ میں چہل قدمی کے لیے ایک گھنٹہ دیا گیا۔

مجھے اپنے خاندان کے پہنچنے تک آرتھر اور شیلا لال کے ساتھ ان کے نائٹس برج میں واقع تین منزلہ اپارٹمنٹ میں رہنا تھا اور ہم اپنی جگہ ڈھونڈتے۔ یہ انتظام میرے لیے قابل تعریف حد تک موزوں تک تھا۔ ہائیڈ پارک سے تیزی سے گزرتے ہوئے میں آلڈوچ میں واقع انڈیا ہاؤس کے لیے بس یا انڈر گراؤنڈ لے سکتا تھا۔ مجھے گھرداری کے لیے فکر نہیں کرنا پڑتی تھی کیونکہ لال اپنا باورچی لائے ہوئے تھے (جسے وہ مالی کہا کرتے تھے) لال کے گھر میں ڈیوٹی فری شرابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔

آرتھر کا کرشنا مینن سے بہت ملنا جلنا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ کرشنا مینن اسے ملنے والا سب سے زیادہ عمدہ ذہن کا انسان تھا اور سٹالن سے تشبیہہ دی (جو عمدہ ذہن رکھنے کے حوالے سے نہیں جانا جاتا تھا) میری کالج کے زمانے میں کرشنا مینن سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اس میں جینئیس کے کوئی نشانات نہیں پائے تھے۔ وہ ایک مقدموں سے محروم تلخ مزاج بیرسٹر تھا اور اپنی توانائیاں اپنی انڈیا لیگ کو استوار کرنے میں اور جب کبھی پنڈت نہرو انگلینڈ میں موجود ہوتا اس کی تعظیم و تکریم میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اس کے ہائی کمشنر مقرر کیے جانے کا ہندوستان میں خیر مقدم نہیں کیا گیا تھا اور انگلینڈ میں موجود ہندوستانی کمیونٹی نے اس کو اقربا پروری کے طور پر لیا تھا۔ آرتھر کی باتیں سننے کے بعد میں نے سوچا کہ ممکن ہے مینن کے بارے میں میرے اندازے غلط رہے ہوں یا وہ ارتقا پا کر ایک بہتر انسان بن چکا ہو۔

اگلے روز میں نے انڈیا ہاؤس میں کام پر حاضری دی۔ میں نے سدھیر گھوش سے اپنا تعارف کروایا۔ ایسا لگا کہ وہ مجھ سے مل کر زیادہ خوش نہیں ہوا تھا۔ اس کی کام والی میز کی شیشے والی سطح کے نیچے تصاویر اور گاندھی اور سر سٹیفورڈ کرپس' گاندھی اور وزیر اعظم ایٹلی کے ایک دوسرے کو لکھے گئے خطوط رکھے تھے' سب میں سدھیر گھوش کی تعارف کی گئی تھی۔ یہ بھی واضح تھا کہ سدھیر اور کرشنا مینن کے درمیان گڑ بڑ ہے اور اس کے تعلقات ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ اچھے نہیں ہیں۔ اس نے مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ دکھایا جہاں مجھے بیٹھنا تھا اور ایک انگریز پامیلا گلین سے متعارف کروایا' جس نے میری اسسٹنٹ بننا تھا۔ اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ مجھے کیا کرنا تھا۔ اس نے کہا: ''تم جب مینن سے ملو تو اس سے پوچھ سکتے ہو۔'' وہ اس کو ہائی کمشنر کہنے یا حتیٰ کہ اس کے نام کے ساتھ مسٹر کا اضافہ کرنے تک سے گریزاں تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ تعلقاتِ عامہ کا کیا مطلب ہوتا ہے نہ ہی یہ کہ مجھے ان کی ترویج کے لیے کیا کرنا ہے۔ کسی مخصوص کام کے بارے میں بریف یا مطلع نہ کیے جانے کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ شاید میں جو بہترین کام کر سکتا تھا وہ ہندوستان کے بارے میں کتابچے تیار کرنا تھا۔۔۔ اس کے لوگ' وسائل' نباتات' حیوانات وغیرہ وغیرہ۔ سیاست میرے ذہن سے دور تھی۔ لاہور سے زبردستی نکالے جانے کے باوجود میں جذباتی طور پر پاکستانی سے منسلک رہا۔ تنازعے کی جڑ کشمیر جس پر دونوں ملکوں میں جنگ ہوئی تھی' کے حوالے سے سمجھتا تھا کہ پاکستان کا مقدمہ ہندوستان سے زیادہ مضبوط ہے۔

لندن میں اپنی آمد کے پہلے چار روز میں نے ہر صبح کام پر انڈیا ہاؤس میں حاضر دی۔ میں نے ملاقاتیوں کی کتاب میں دستخط کیے اور سدھیر گھوش کو یاد دہانی کروائی کہ مجھے ہائی کمشنر سے متعارف کروائے۔ اس نے اس کو فوری تصور نہیں کیا۔ میں نے لال سے کہا۔ اس

نے کہا یہ اس کا نہیں سدھیر کا کام ہے۔ پانچویں دن سدھیر مجھے مینن کے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے کرشنا مینن کو سلام کیا تو میرے چہرے پر کشادہ مسکراہٹ تھی اور میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنی پنجہ نما انگلیوں سے اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ خوش آمدید کی مسکراہٹ کی بجائے اس کے چہرے پر غصے کی تیوری تھی۔ میں نے خوشی خوشی اسے یاد دلایا کہ میں نے ایک مرتبہ اس کے اور رجنی پٹیل کے ساتھ پیرس تک سفر کیا تھا۔ اس نے میرا اپنا تعارف کروانا نظرانداز کر دیا اور بھونکا: ''سردار! کیا انہوں نے ہندوستان میں تمہیں آداب نہیں سکھائے؟ تم یہاں چار دن سے آئے ہوئے ہو اور تم نے مجھ سے ملنے کی زحمت تک نہیں کی۔ میں ہائی کمشنر ہوں۔ جانتے ہو تم!'' میری مسکراہٹ منجمد ہو کر رہ گئی۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی طرف سے بہترین کام کیا ہے۔۔۔ ملاقاتیوں کی کتاب میں دستخط کیے اور سدھیر اور آرتھر لال دونوں سے کہا کہ وہ آپ سے میری ملاقات طے کروا دیں۔ سدھیر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری غلطی تھی۔ مینن نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا: ''میں تمہیں بعد میں بلاؤں گا۔ میں مسٹر گھوش سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں بہت صدمہ زدہ حالت میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ مینن کے سے انداز میں کبھی کسی نے مجھ سے بات نہیں کی تھی اور وہ بھی بغیر کسی وجہ کے۔ میں نے تہیہ کیا کہ اسے برداشت نہیں کروں گا۔ میں نے قسم کھالی کہ اگر اگلی مرتبہ مینن نے مجھ سے درشتی سے کوئی بات کی تو میں منہ توڑ جواب دوں گا' استعفیٰ دے دوں گا اور اسے کہوں گا کہ وہ اسے اپنے گندے مقعد میں ڈال لے۔ میں تمام سہ پہر غصے میں رہا۔ کوئی کام کرنے کی بجائے ٹیمز کے کنارے کنارے لمبی چہل قدمی کی یہاں تک کہ میرا غصہ قدرے کم ہو گیا۔ شام کے وقت مرکزی استقبالیہ کمرے میں چائے پارٹی تھی۔ میں اس میں گیا' چائے کا کپ لیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مینن اندر آیا تو میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے دیکھا نہیں ہو۔ وہ میرے پاس آ گیا اور اپنا بازو میرے گلے میں ڈالتے ہوئے بولا: ''آج صبح تمہیں برا بھلا کہنے پر معذرت' مجھے امید ہے کہ تم نے ادراک کر لیا ہو گا کہ وہ تمہارے لیے نہیں تھا۔'' میں لہجے کی تبدیلی پر کسی حد تک حیرت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے جواب دیا: ''میں تھوڑا سے مشتعل ہو گیا تھا۔''

وہ بولا: ''اگر تم اتنی بھی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے ہو تو تم کبھی انفارمیشن افسر کے طور پر کام نہیں کر سکو گے۔'' اس نے میری کمر تھپتھپائی اور دوسروں سے ہاتھ ملانے چلا گیا۔ میرا غصہ بالکل اتر گیا تھا۔ اس کا رویہ واضح طور پر دوستانہ تھا' صبح کے وقت تو سدھیر گھوش نشانہ تھا۔ مینن ایک پیچیدہ ذہن کا حامل انسان تھا۔

مجھے انڈیا ہاؤس کی سیاست کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کرشنا مینن کے وفاداروں

کا ایک ٹولہ تھا۔ فہرست میں سب سے اوپر اس کا ٹریڈ کمشنر آرتھر لال تھا۔ وہ ڈپٹی ہائی کمشنر آر۔ ایس۔ مانی‘ یہ بھی آئی۔ ایس تھا وراس کا نمبر دو آدمی تھا‘ کی بہت معمولی عزت کرتا تھا۔ مانی ایک پلپلا سا آدمی تھا جس کی اس سے زیادہ پلپلی بلجئین بیوی تھی۔ وہ مینن کے دل میں گھر کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا اور ایسے ذلت آمیز سلوک سے دوچار ہوتا گویا وہ پائیدان ہو۔ وہ ایک پائیدان ہی رہا۔ مینن وردی پوش لوگوں سے بھی چڑتا (الرجک) تھا اور اپنے فوجی‘ بحری اور فضائی اتاشیوں کے ساتھ تحقیر آمیز برتاؤ کرتا تھا۔ سدھیر گھوش نے شعبہ ٔ تعلقات عامہ کو اپنے ذاتی ادارے کے طور پر چلانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نیک نیت انگریزوں کے لیے گاندھی کا قاصد سمجھتا تھا جنہوں نے آزادی کی تحریک کی حمایت کی تھی۔ ان میں بیشتر کوئیکرز تھے۔ اس نے مینن سے مشورہ کیے بغیر انہیں سرکاری ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔ وہ اپنی میز پر سجے خطوط اور تصاویر کو فخر کے ساتھ دیکھتے ہوئے مجھے کہا کرتا تھا: ''مینن کو اپنا کام کرنے دو اور اسے مجھے میرا کام خود کرنے دو۔ میں نے گاندھی جی کے ساتھ کئی برس گزارے ہیں۔ میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی نفرت نہیں ہے۔'' وہ مجھے بار بار یقین دہانی کروایا کرتا تھا۔ پھر وہ مینن کے خلاف اپنی پرجوش ملامتی تقریر دوبارہ شروع کر دیتا تھا۔ آرتھر لال کے علاوہ مینن کے سب سے زیادہ منظور نظر اس کے سٹاف کے جونیئر ارکان تھے۔ کچھ کے ساتھ اس نے اس وقت تک سختی برتی جب تک انہوں نے اس کے ساتھ اپنی وفاداریاں ثابت نہیں کر دیں ایسے لوگوں میں اس کا ذاتی سیکرٹری (پرسنل سیکرٹری) ہندوستانی بحریہ کا کیپٹن سری نواسن شامل تھا۔ مینن خوبصورت عورتوں کو پسند کیا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت عورتوں کے خاوندوں کے ساتھ دوستوں جیسا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ اگر وہ جوڑے کے درمیان تناؤ کو محسوس کر لیتا تو وہ ان میں خصوصی طور پر ثالث کا کردار ادا کرنے لگتا: مینن کو ناراض عورتوں کو منانے میں مہارت حاصل تھی۔ شیلا لال اور میری بیوی (خاندان کے مجھ سے آملنے کے بعد) اسی درجے میں شمار ہونے لگی تھیں۔ آرتھر اور میں اس کے نمبر ایک اور نمبر دو منظور نظر بن گئے تھے۔ ہم میں سب سے بالا کملا جسپال تھی جو اس کے کلرکوں کے عملے میں شامل تھی۔ وہ سکھ تھی‘ اس کی جلد نرم‘ سیاہ گھنگریالے بال اور ایک آنکھ میں دلکش بھینگا پن تھا۔ وہ دفتر میں ایسا لباس پہن کر آتی تھی جیسے کسی کاک ٹیل پارٹی میں جا رہی ہو۔ وہ شیفون کی شوخ رنگوں والی ساریاں‘ درمیان سے بہت زیادہ کھلے ہوئے بلاوز پہنتی‘ اس کی ناف دکھائی دیتی رہتی تھی۔ وہ چاندی‘ سونے اور کانچ کے کڑے پہنا کرتی تھی جو اس کی کلائی کو زیادہ ڈھانپے رکھتے تھے اور اپنے چہرے پر بکھر جانے والی لٹوں کو سلجھاتی تو کھنکنا اٹھتے تھے۔ ناکافی لباس پہنے رہنے کی وجہ سے اسے اکثر نزلہ زکام رہتا اور اس کی ناک بہتی رہتی تھی۔ وہ انگریز شاعروں کے ناموں سے واقف تھی اور بھارت

ناٹیم کے کچھ بھاؤ جانتی تھی' وہ بری نثر اور نظم بھی لکھتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو منوانے میں بلند آواز اور جارح تھی۔ تاہم وہ کرشنا مینن کی اس طرح پوجا کرتی تھی گویا وہ بھگوان وشنو کا اوتار ہو۔ ایک اچھی ہندو بیوی کے مانند وہ کبھی اس کے نام سے یا ہائی کمشنر کہہ کر نہیں پکارتی تھی بلکہ ایچ۔ای۔۔۔ ہزایکسی لینسی کہا کرتی تھی۔ کرشنا مینن کے لیے' جو کئی عشروں سے ہندوستان سے دور تھا' کملا جسپال جدید ہندوستانی نسائیت کی ترجمانی کرتی تھی۔ وہ اس کی پرستش کا جواب پھولوں اور مفادات' بشمول اس کو گھر سے لانے کے لیے اپنی رولز رائس کے استعمال ذریعے دیا کرتا تھا۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر والی انگریز معشوقہ برجیٹ سے تھک چکا تھا' جو انڈیا لیگ کے معاملات کو دیکھتی تھی اور اسے تبدیل کیے جانے کا معاملہ زیرغور تھا۔ کبھی کبھی کملا برجیٹ کی خوشامد درآمد کرتی تھی اور جلد ہی اس نے جان لیا کہ وہ اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ انڈیا ہاؤس میں ہر شخص جانتا تھا کہ کرشنا مینن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کملا جسپال کی خوشنودی حاصل کرنا ہوگی۔ لندن میں اپنے پہلے تقرر کے دوران میں میں نے برجیٹ اور کملا دونوں سے دوستی کر لی۔

مینن سدھیر گھوش سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کرتا تھا اور اس نے اس سے چھٹکارہ پانے کے لیے مجھے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایسا کرنے کا موقع حاصل کرنے کے لیے زیادہ لمبے عرصے تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔

مجھے تب پتا چلا کہ معاملات کتنے بدتر ہو چکے تھے جب مجھے مینن کا پنڈت نہرو کو لکھا ہوا ایک خفیہ (کانفیڈینشل) خط دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے گھوش کا ذکر ایک ''کام چور'' کے طور پر کیا تھا۔ واضح طور پر نہرو کے تعلقات اپنے نائب وزیراعظم سردار پٹیل کے ساتھ کھنچاؤ کا شکار تھے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ خارجہ پبلسٹی کو وزیر خارجہ (نہرو) کے تحت ہونا اور وزیر داخلہ و اطلاعات (پٹیل) کے تحت نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ پنڈت جی جواب دے پاتے کھوئی ہوئی پرچی کا واقعہ رونما ہو گیا جس نے سدھیر گھوش کے زوال کو ثابت کر دیا۔

ایک صبح مینن نے اپنے ہاتھ سے سدھیر گھوش کو کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نوٹ لکھ کر بھیجا کہ جونہی میں دفتر پہنچوں وہ مجھے اس سے ملنے کے لیے بھیج دے۔ سدھیر نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی یہاں تک کہ دو گھنٹے بعد کملا جسپال یہ دیکھنے نیچے آئی کہ میں آ چکا ہوں یا نہیں۔ میں گھوش کے دفتر یہ جاننے کے لیے پہنچا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے پرچی کو پڑھتے ہوئے مجھے کہا: ''مینن میرے بغیر تم سے ملاقات کرنے کا خواہش مند ہے۔'' اس نے اسے مروڑا اور اپنی ردی کاغذوں کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ جب میں مینن سے ملنے گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ اوپر آنے میں مجھے دو گھنٹے کیوں لگے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس وقت تک اس بارے

میں کچھ پتا نہیں تھا جب تک کملا نے مجھے نہیں بتایا اور میں سدھیر کے کمرے میں گیا۔ سدھیر کو بلا لیا گیا۔ اس نے اس کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہونے سے انکار کر دیا۔ میں انہیں ایک دوسرے سے الجھتا چھوڑا' گھوش کے کمرے میں واپس آیا اور مڑی تڑی پرچی کو ردی کاغذوں کی ٹوکری سے نکال لیا۔ کملا جسپال کی وساطت سے میں نے وہ پرچی مینن کے حوالے کروا دی۔ مجھے نہیں معلوم کہ گاندھی پرست سدھیر اپنے بولے گئے سفید جھوٹ کو کس طرح نبھا پایا۔ اگلے روز وہ ہندوستان چلا گیا' اس کے جانے کے چند روز بعد مینن بھی ہندوستان چلا گیا۔

جب وہ گئے ہوئے تھے تو مجھے کینیڈا تبدیلی (ٹرانسفر) کے احکامات موصول ہوئے۔ پی۔ ایل بھنڈاری کو' جسے میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور کے جونیئر رپورٹر کی حیثیت سے جانتا تھا اور جو اپنے آپ کو تعلقاتِ عامہ کا ایک ماہر تصور کرتا تھا' سدھیر کا جانشین نامزد کیا گیا تھا۔

چند روز بعد مینن اور گھوش لندن واپس آ گئے۔ گھوش صرف ایک مرتبہ ہی' اپنی میز سے اپنی تصویریں اور اسناد لینے کے لیے انڈیا ہاؤس آیا۔ اس نے جو الوداعی ہنگامہ برپا کیا وہ تھا اپنے انگریز دوستوں کو سیوائے ہوٹل (Savoy Hotel) میں بڑی لنچ پارٹی دینا۔ اس نے مجھے یا کسی اور رفیق کار (Colleague) کو بلانے کا تردد نہیں کیا تھا۔ اس ایک پارٹی میں اس نے شعبہ تعلقات عامہ کا سال بھر کا تفریحی الاؤنس اڑا دیا تھا۔

میں ابھی لندن ہی میں تھا جب 30 رجنوری 1948ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ میں نے کینیڈا جانے کے لیے اپنا سامان سمیٹنے کے لیے چھٹی لے لی تھی۔ ہمیں سر میلکم ڈارلنگ ریٹائرڈ کمشنر آف انکم ٹیکس نے' جو وکٹوریا سٹیشن کے نزدیک ایک تہہ خانے میں بنے ہوئے فلیٹ میں رہتا تھا' لنچ پر مدعو کیا۔ جونہی ہم لنچ کے بعد سرد ہواؤں اور دھوپ والے دن میں باہر نکلے تو میں نے ایک اخبارات کے کھوکھے (نیوز پیپر سٹال) پر ہاتھ کا لکھا ہوا یہ پیغام ایک پلے کارڈ پر دیکھا: ''گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔'' مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ ہمارا باپو ہو سکتا ہے۔ کس نے ایک ایسے روحانی انسان کو قتل کیا ہو گا' جس نے کبھی کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا ہو گا؟ میں نے کھوکھے والے سے دریافت کیا۔ جب اس نے مجھے ''ایوننگ سٹینڈرڈ'' کا شمارہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا: ''ہاں کسی خونی نے ایسا کیا ہے'' آنسو میری آنکھوں سے بھی رواں ہو گئے' میں صرف سرخیاں ہی پڑھ سکا۔ میں شپنگ آفس جا کر اپنے سفر کی تفصیلات طے کرنے کے بجائے اپنے لوگوں کی رفاقت کے لیے انڈیا ہاؤس چلا گیا۔ گاندھی کی تصویر (پورٹریٹ) کے نیچے تیل والے لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ بخورات کی مہک اس جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ مرد اور عورتیں فرش پر بیٹھے گاندھی کی پسندیدہ مناجاتیں پڑھ رہے تھے: وشنو

جان تو تتنے کہیئے جو پید پرائی جانے رے اور رام دھن: ایشور اللہ تیرے نام سب کو سمتی دے بھگوان۔ ہم کوئی گھنٹہ بھر وہاں بیٹھے رہے۔ میری جیب میں ایک ماہ پہلے خریدے گئے تھیٹر کے ٹکٹ تھے جو ڈائمنڈ لل (Diamond Lil) میں مے ویسٹ (Mae West) کو دیکھنے کے لیے خریدے گئے تھے۔ میرا ذہین کشمکش کا شکار ہو کر بٹ گیا تھا۔ کیا باپو کے دہلی میں فوت ہونے پر دنیا کی سب سے بڑی جنس کی علامت (سیکس سمبل) کا نظارہ کرنا درست تھا؟ بالآخر ہم نے تھیٹر جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس وقت کوئی شرم یا احساس جرم نہیں ہو رہا تھا جب میں نے پر شباب عورت کا اس کے ٹیپ کے مصرعے ''آؤ اور کبھی مجھے دیکھو'' کے ساتھ نظارہ کیا۔ میں نے خوشی کے ساتھ اس کے بلاوے کو قبول کر لیا تھا۔ بروشر سے مجھے پتا چلا تھا کہ مے ویسٹ میری ماں کی ہم عمر تھی۔

جس وقت میرے کینیڈا ٹرانسفر کے احکام آئے اس وقت میرا بیٹا شیرڈز پارک سکول میں داخل ہو چکا تھا اور ہم نے ٹرم کی فیس بھی ادا کر دی تھی۔ آخر کار وہ انگریزی سیکھنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں سب سے ابتدائی الفاظ میں اخبار کا انگریزی لفظ شامل تھا۔ اس نے شوق سے مجھے بتایا تھا ''اسے پپر (Piper) کہتے ہیں۔'' میں نے اس کی اصلاح کی: ''پپر (Piper) نہیں پیپر (Paper) 'پپر تو کوکنی (Cockney) ہے۔'' وہ اڑا رہا تھا: ''لیکن میں نے ایک انگریز لڑکے کو ریلوے سٹیشن کے باہر 'پپر' پپر!'' آواز لگاتے سنا ہے۔'' ایک اور موقع پر جب وہ بروکٹ پارک میں شام کی چہل قدمی میں میرے ساتھ تھا' اس نے مجھ سے پوچھا کہ بڑے محل میں کون رہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا: ''یہ لارڈ بروکٹ کا گھر ہے۔'' وہ پریشان ہو گیا' پوچھنے لگا: ''کیا وہ ان کا گرو ہے؟'' ''نہیں' تم نے کیسے سوچا کہ وہ ایک انگریز گرو ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''وہ اپنے گرو کو لارڈ کہتے ہیں۔ سکول میں انہوں نے ہمیں لارڈ عیسیٰ کے بارے میں پڑھایا ہے۔''

لارڈ بروکٹ ایک شراب ساز تھا۔

مجموعی طور پر میں ٹرانسفر سے ناخوش نہیں تھا۔ تاہم میری بیوی اس کے حوالے سے مضبوط تحفظات کی حامل تھی۔ مجھے ایچ۔ ایس۔ ملک کے ماتحت کام کرنا تھا جو اس کا دو حوالوں سے انکل تھا' اس کے باپ کا چھوٹا بھائی اور اس کی ماں کی چھوٹی بہن کا شوہر۔ ایچ۔ ایس۔ ملک اور اس کی بیوی خود پسند تھے۔ وہ آئی۔ سی۔ ایس میں ہونے اور پٹیالہ کا وزیراعظم رہنے پر مغرور تھا۔ اس کی بیوی بھی اتنی ہی مغرور تھی اور خاندان میں ''ملکہ'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک تہذیب کا مطلب تھا اچھا لباس پہنے ہونا' یورپی نشست و برخاست کے آداب

سے واقفیت اور غیر ملکی شرابوں مثلاً اولڈ فیشنڈ (Old Fashioned) 'منٹ جولیپ (Mint Julep) اور مین ہٹن (Manhattan) سے آ گہی رکھنا۔ شاموں میں جب وہ رات کے کھانے سے پہلے کی شراب نوشی کے لیے اکٹھے ہوتے تو رشتہ داروں اور دوستوں کے نام لیتے اور ان کی دوری پر آنسو بہاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے ان پر بہتان طرازی کرتے تھے۔ وہ ایک بہت متحد پرمسرت خاندان تھا۔ ملک اور اس کی ''ملکہ'' دونوں اکثر میری بیوی کو لاپروایانہ لباس پہننے پر لعن طعن کرتے تھے۔ وہ مجھے ایک نو دولتیئے ٹھیکیدار کا گنوار بیٹا تصور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہی میں نے شملہ میں ان کے ہاں قیام کیا تھا جب وہ پٹیالہ کا وزیراعظم تھا' میں خود کو سلیوٹ کرنے کے لیے سنتریوں سے گریز کرنے کی خاطر ان کے گھر کے عقب سے کھسک لیا کرتا تھا۔ خاندان کا ماحول تکلفات سے اس قدر بھاری تھا کہ مجھے اکثر ہوا کو صاف کرنے کے لیے پاد مارنا پڑتا تھا۔

ہم نیویارک جانے کے لیے ''کوئین الزبتھ'' پر سوار ہوئے۔ کیا عیاشی تھی! میں دن کا زیادہ وقت سکواش کھیلتے ہوئے گزارتا۔ میں پرسکون ہو گیا اور مسافروں سے ملنے جلنے لگا۔۔۔ بعض اوقات ایک دن میں درجن بھر۔ میں کینیڈا کے بارے میں پڑھتے ہوئے اپنا وقت زیادہ سودمندانہ طور پر گزارنا چاہتا تھا۔ جو کچھ میں اس ملک کے بارے میں جانتا تھا اس کی بنیاد ہائیواتھا (Haiwatah) پر تھی۔ میں بے شمار ریڈ انڈینوں کو سروں پر شاہینوں کے پر باندھے ہوئے ملنے کی توقع کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا اوٹاوہ دارالحکومت ہے اور یہ کہ مغربی ساحل پر کچھ سکھ آباد ہیں۔ یہاں تک کہ میں تو اس کے سب سے بڑے شہر مانٹریال تک کے وجود سے بے خبر تھا۔

ہم نے نیویارک میں ایک دن گزارا اور اوٹاوہ کے لیے رات کی ٹرین لی۔ نیویارک میں ہم نے والڈروف ایسٹوریا (Waldrof Astoria) میں بکنگ کروائی تھی۔ اس ہوٹل میں چند گھنٹے گزارنے پر (چار افراد خانہ اور دو ملازمین) میری مہینے بھر کی تنخواہ صرف ہو گئی تھی۔

ہرجی ملک ہمارے استقبال کے لیے سٹیشن پر موجود تھا۔ ہم نے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل شاتولارئیر (Chateau Laurier) میں بکنگ کروا رکھی تھی۔ میں نے جانا کہ اس ہوٹل میں ہفتہ بھر کے قیام سے میری دو مہینے کی تنخواہ صرف ہو جائے گی۔ کسی کو میری قابل رحم حالت پر کوئی فکر نہیں تھی۔ میں ایک امیر باپ کا حامل جانا جاتا تھا۔

ہمیں ملک میاں بیوی کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ ہمارا بہت سرد استقبال کیا گیا۔ وہ مجھ سے ملتے ہوئے یوں جھجک رہا تھا گویا میں اس کا ماتحت ہوں' جیسے میری بیوی اپنے شوہر کو اپنے انکل کا تابع فرمان بنا کر لائی ہو۔ ''ملکہ'' ہمیشہ جتنی ہی منکسر تھی۔ صرف دو افراد جو حالات

کی تبدیلی پر خوش تھے وہ ہر جی اور میں خود تھے۔ وہ اس لیے کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی' میں اس لیے کہ یہ ایک نیا کام تھا۔ میں جانتا تھا کہ ملک کو دفتر کی چاکری کی نسبت گولف سے (وہ ایک بہت اچھا کھلاڑی تھا) اور خطاب یافتہ اشراف سے میل جول میں زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھ سے نئے کھولے جانے والے سفارت خانے کو چلانے کی توقع تھی۔

پہلا بحران ہمارے پہنچنے کے چند روز بعد نمودار ہوا۔ ہم نے شاتو لارئیر میں گاندھی جی کے لیے یادگاری اجلاس کا اہتمام کیا تھا۔ بینڈ یا ریکارڈ شدہ میوزک کی عدم موجودگی میں میں نے پیانو پر قومی ترانہ بجایا۔ ملک نے معمول کے مطابق ٹیگور کی نظم ''جہاں ذہن کو کوئی خوف نہیں ہوتا'' سے مزین تقریر کی۔ وزیراعظم میکنزی کنگ نے' جو عظیم مقرر نہیں تھا' جوابی تقریر کی۔ باپو کو دو یادگار خراج عقیدت پیش کیے گئے: ایک برطانوی ہائی کمشنر سر الیگزینڈر کلٹر یک کی طرف سے اور دوسرا کینیڈا کے ممتاز مصنف لیونارڈ برونکنگٹن کی طرف سے۔ مجھے مزید جذباتی خطاب ہنوز سننا تھے۔

ہندوستانی سفارت خانہ (ہائی کمیشن) سڑک پار ہوٹل کے سامنے تھا۔ ایک صبح جب زوردار برف باری ہو رہی تھی' میں ٹریفک سگنل کے قریب کھڑا ہوا روشنیوں کے تبدیل ہونے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ سڑک پار کر سکوں' میری پگڑی اور ڈاڑھی پر برف پڑی ہوئی تھی۔ میں ضرور قابل دید ہو رہا ہوں گا۔ ایک طویل القامت امریکی' واضح طور پر ایک سیاح' آیا اور میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوال کرنے سے پہلے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ اس نے پوچھا: ''تم انگریز بولتے ہو؟'' میں نے سر ہلا دیا۔ اس نے بات جاری رکھی: ''سر اپنی وضع قطع سے آپ کوئی غیر ملکی دکھائی دیتے ہیں۔''

میں نے اعتراف کیا کہ میں غیر ملکی ہوں۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں سے آئے ہوئے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''میں ہندوستانی ہوں۔''

وہ مایوس سا دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا: ''کیا آپ کسی ریزرویشن سے ہیں؟'' مجھے نہیں پتا تھا کہ ریزرویشن کیا ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا: ''نہیں میں شاتو لارئیر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

جب ہم نے اپنی رہائش گاہ ڈھونڈ لی تو اس کے چند روز بعد ایک اور دلچسپ ٹکراؤ ہوا۔ یہ ٹکراؤ ایک سکھ جنٹل مین سے ہوا تھا۔ میں نے اسے ٹریفک لائٹس کے ساتھ کھڑے ہوا دیکھا۔ اس نے گرونانک کے بیدی نسل کے لوگوں کے مخصوص انداز میں سنہری بروکیڈ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی اور بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اس نے سیاہ شیروانی' سفید چوڑی دار پاجامہ اور

سنہرے کام دار پنجابی سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ سردیوں کی گہری برف کے بیچ وہ شاندار انداز کی وجہ سے غیر موزوں لگ رہا تھا۔ میں نے پار جا کر اس کو سلام کیا: ''ست سری اکال'' اس نے خوش اخلاقی کے ساتھ جواب دیا اور پوچھا کہ میں اوٹاوہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ادھر کس لیے آیا تھا اور کیا وہ اس لباس میں سردی نہیں محسوس کر رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ کاروبار کے لیے وہاں آیا ہوا ہے اور چند دنوں میں ہی اپنی بیوی اور بچوں کے پاس لوٹ جائے گا جنہیں وہ بہت یاد کر رہا ہے۔ جہاں تک اس کے لباس کا تعلق تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ جب ہندوستانی غیر ملک میں ہوں تو انہیں اپنا قومی لباس پہننا چاہیے ''وگرنہ غیر ملکی ہماری منفرد ثقافت اور طرز زندگی کو کس طرح جانیں گے۔'' میرا اندازہ درست تھا کہ وہ ایک بیدی تھا۔ میں نے اسے ڈنر پر بلایا شام کو میں اسے اس کے ہوٹل جا کر لے آیا' وہ اسی لباس میں تھا۔

وہ میری بیوی کو میرے ساتھ شراب پیتا ہوا دیکھ کر تھوڑا سا بجھ گیا تھا۔ اس نے اسے کہا: ''عورتوں کا شراب پینا ہماری روایت نہیں ہے۔'' اس کو پتا چلا کہ ہم تو رقص کے لیے بھی جاتے ہیں۔ اس نے یورپی اطوار اپنانے کے خلاف ایک اور وعظ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ مغرب سے مسحور نہیں ہے اور اپنے خاندان کی طرف واپس جانا چاہتا ہے۔

کچھ ماہ بعد مجھے ٹورنٹو میں مقامی اخبارات کے مدیروں سے ملنا تھا۔ میں نے انہیں ایک چھوٹے' منتخب ریستوراں میں دعوت دی اور رات کو دیر گئے نشے میں چور اپنے ہوٹل واپس آیا۔ لگ بھگ درجن بھر لفٹیں فرشی منزل (گراؤنڈ فلور) پر نصب تھیں جنہیں چلانے کے لیے لڑکوں کی وردی میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے دوستانہ مسکراہٹ سے نوازا اور ''ست سری اکال'' کہہ کر سلام کیا۔ میں بلا تاخیر اس کے ایلیویٹر میں سوار ہو گیا۔۔۔ جونہی دروازے بند ہوئے میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم میرے ملک میں رہی ہو؟'' ''نہیں' لیکن میں آپ کے ہم وطنوں سے واقف ہوں۔ کون سی منزل؟'' میں نے اپنے کمرے کی چابی پر نمبر دیکھا اور جواب دیا: ''گیارہویں'' اس نے تبصرہ کیا: ''کیسا اتفاق ہے میرا دوست بھی گیارہویں منزل پر ہے۔ کتنا دلکش آدمی ہے وہ! اس کی پگڑی تمہاری پگڑی سے زیادہ اچھی ہے۔ ساری کی ساری سونے چاندی کی۔ اس نے مجھے مسکوکا میں ویک اینڈ گزارنے کے دعوت دی تھی۔ ہم نے زبردست وقت گزارا!'' اس نے اس ویک اینڈ کو یاد کرتے ہوئے خوشی کے ساتھ آہ سی بھری۔ وہ کوئی بھی رہا ہو مگر مسٹر بیدی تو اپنی بیوی اور بچوں میں لوٹ جانے کا شدید آرزومند تھا' میں نے اس واقعے کو افسانے میں ڈھالا تھا۔

ہائیواتھا نے جیسا تصور میرے ذہن میں پیدا کر دیا تھا کینیڈا میں کچھ بھی ویسا نہیں

تھا۔ میں نے کبھی ابھرے ہوئے رخساروں والے سیاہ فاموں کو پروں کے تاج پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی ریڈ انڈین بہادر سے مشابہہ واحد آدمی ایک سفید فام تھا جو ایک ٹریول ایجنسی کے باہر کینیڈین شہروں کے دوروں (ٹورز) کی مشہوری کر رہا تھا۔ مانٹریال میں مَیں ایک ریڈ انڈین سے ملاقات کے قریب ترین تھا۔ ہوٹل رٹز کارلٹن سے باہر آتے ہوئے میں نے ایک گندمی رنگت اور ابھرے ہوئے رخساروں والے ایک آدمی کو سڑک کے دوسری طرف ادھر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اس سے ملنے کے لیے سڑک پار کی۔ جب ہم نے ہاتھ ملائے تو میں نے کہا: ''میں دیکھ سکتا ہوں کہ آپ ایک انڈین ہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔ میں نے اس سے پوچھا: ''تم کہاں سے آئے ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''میں مدراس سے آیا ہوں۔''

اگر میرے جیسے ہندوستانی کینیڈا کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں تو بیشتر کینیڈین بھی ہندوستان کے بارے میں بہت ہی تھوڑی معلومات رکھتے ہیں۔ اس وقت حیدرآباد کی صورتحال خبریں بنا رہی تھی۔ ایک صبح مجھے ایک کینیڈین اسلحہ ڈیلر کی کال موصول ہوئی۔ چونکہ ہائی کمشنر ہوانا میں گولف کھیلنے گیا ہوا تھا اس لیے میں نے اس کی جگہ سنبھالی ہوئی تھی۔ ''کیا یہ نیا ہندوستانی ہائی کمیشن ہے؟'' لائن کے دوسرے سرے پر موجود آواز نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا: ''یہی ہے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اس نے وضاحت کی: ''ایسا ہے کہ ماضی میں جب کبھی ہمیں ہندوستان کی کسی ریاست کی طرف اسلحہ کا آرڈر ملتا تھا تو ہم اوٹاوہ میں برطانوی نمائندے کو آرڈر پر تعمیل سے پہلے اطلاع دیا کرتے تھے۔ ہمیں نظام آف حیدرآباد کی طرف سے ایک لاکھ کی تعداد میں 303 بندوقیں فوری طور پر فراہم کرنے کا آرڈر ملا ہے۔ نقد رقم پیشگی ادا کر دی گئی ہے۔ ہم آپ کو بتا رہے ہیں کہ آپ کو ہمارا ایسا کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔'' میں نے اپنی حکومت کو تار بھیج کر اطلاع دی اور فوری طور پر اپنے باس کو اوٹاوہ واپس آنے کے لیے فون کیا۔ وہ اپنے کھیل میں میری دخل اندازی پر نالاں تھا اور اس نے کہا کہ اس معاملے میں کسی عجلت کی ضرورت نہیں۔ اگلے ہی روز ہندوستانی فوجی دستے حیدرآباد میں داخل ہو گئے۔

ہندوستان کا پریس بہت برا تھا۔ کینیڈین اخبارات اپنی ہندوستانی خبریں وائر سروسز یا دہلی میں متعین امریکی مراسلہ نگاروں سے لیتے تھے۔ میں نے ہائی کمشنر کو قائل کیا کہ وہ کینیڈین میڈیا کو ہمارے نکتہ نگاہ سے آگاہ کرنے کے لیے پریس کانفرنس کرے۔

دو درجن سے زائد اخبارات اور ریڈیو کے مرد و خواتین آئے۔ ہائی کمشنر نے نئے جمہوری نظام میں آزاد ہندوستان کی ریاستوں کے الحاق کی پالیسی کا مختصر پس منظر بیان کیا۔ اس نے کہا حیدرآباد ہندوستانی علاقے کے اندر ایک جزیرہ ہے اور اسے کسی بھی حوالے سے خود

کو آزاد سلطنت قرار دینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کوئی سوال؟

ایک نے پوچھا: ''حیدر آباد کہاں ہے؟''

میں نے ایک بورڈ پر ہندوستان کا ایک نقشہ پھیلا دیا اور اس کی سرحدوں پر اپنی پہلی انگلی پھیری۔ ایک دمکتی ہوئی نوجوان خاتون رپورٹر نے کہا: ''لیکن تمہارے ہائی کمشنر نے تو کہا ہے کہ وہ ایک جزیرہ ہے۔'' ہم نے فیصلہ کیا کہ انہیں بریف کرنا زیادہ قابل قدر نہیں ہے اور سکاچ اور کیناپیوں کے لیے پریس کانفرنس برخاست کر دی گئی۔ اگلی صبح کے اخبارات میں ہائی کمشنر کی پریس کانفرنس کے بارے میں مشکل ہی سے کچھ تھا۔ ان کے پاس دوسری اہم خبریں تھیں۔ باربراین سکاٹ ورلڈ آئس سکیٹنگ ٹائٹل جیت کر اپنے گھر اوٹاوہ واپس آ رہی تھی۔ اس کی تصویریں طفولیت سے سکیٹنگ کی ملکہ بننے تک خبروں میں چھائی ہوئی تھیں۔

کینیڈا میں گزرنے والا سال میرے کرئیر میں نقطہ انقلاب ثابت ہوا۔ میں نے بہت سے کینیڈین ادیبوں اور شاعروں کو دوست بنا لیا تھا۔ ان کی تخلیقات پڑھنے کے بعد میں نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا۔ ان میں شعرا آئرین پیج اور ایب کلائن' ''کینیڈین فورم'' اور ''سیچر ڈے نائٹ'' کے مدیران شامل تھے۔ میری کہانیاں ان جرائد میں شائع ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنے سکول کے زمانے کے حوالے سے مانٹریال میں ایک کہانی لکھی تھی جو نیویارک کے ''ہارپرز'' میں شائع کی گئی تھی۔ چونکہ ملکوں کے ساتھ میرے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے اس لیے میں نے سروس چھوڑنے اور ادب کو کل وقتی کرئیر کے طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے آپ کو یاد دلاتا رہتا: ''بغیر خطرہ مول لیے فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔'' میں تیس کے پیٹے کے وسط میں تھا' اگر میں اب قدم نہیں اٹھاتا تو کبھی نہیں اٹھا سکوں گا۔''

کینیڈا نے نہ صرف مجھے ادیب بنانے کا تصور دیا بلکہ فطرت میں میری دلچسپی کو بڑھایا۔ جب میں اوٹاوہ پہنچا تو وہ سردیوں کا وسط تھا اور ہر شے برف کی چادر تلے ڈھکی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اوٹاوہ کے تیز رفتاری سے بہنے والے دریا کے حصے بھی منجمد ہو گئے تھے اور لوگ ان کے اوپر سکیٹنگ کر رہے تھے۔ مارچ تک سردیاں ختم ہونے کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ پارلیمنٹ ہاؤس بلڈنگ سے مین روڈز تک کا تین فٹ چوڑا قطعہ ٹیولپ کے پھولوں سے دہکنے لگا۔ مجھے پتا چلا کہ اس کے نیچے سے گرم پانی کا ایک پائپ گزرتا ہے۔ جونہی برف پگھلی' ٹیولپ کے پھول ہر طرف کھل گئے۔ میں نے گیٹی نیوہلز میں کئی ویک اینڈ سکی انگ کرتے ہوئے گزارے اور عریاں درختوں کی شاخوں کو ڈھانپنے والی برف کی مخروطی ٹیوبوں کو ہوا چلنے پر شمع دانوں کی طرح بقعۂ نور بنتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ ہوا تھا۔ اب وہ ننھے ننھے پتوں سے بھر گئے تھے۔ میں ہائی کمشنر اور اس کے خاندان کے ساتھ ویسٹ کوسٹ گیا تھا۔

وینکوور میں تین دن اور تین راتیں بغیر رکے بارش ہوتی رہی تھی۔ چوتھے دن میں نے سٹینلے پارک میں چہل قدمی کی۔ گیلے راستے سانپوں سے بھرے پڑے تھے۔ اگلے روز ہم کشتی کے ذریعے وکٹوریا گئے تھے وہاں میں نے فطرت کو اس کے مکمل شکوہ کے ساتھ دیکھا۔ ہوٹل کے ساتھ ایمپریس پارک تو پھولوں سے دہک رہا تھا۔ دھوپ میں چمکتے ہوئے سرسبز لان شبنم سے دھلے ہوئے تھے' ان میں مور اور کوئلیں چہک رہی تھیں۔ میں پارک سے گزر کر ایک پہاڑی کے سرے پر پہنچا جہاں سے سنسان ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں منعکس ہو رہی تھیں۔ میں اپنے اردگرد کے منظر سے سحر زدہ سا ہوا کھڑا تھا۔ گویا اس روحانی تجربے کو مکمل کرنے کے لیے میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان جوڑا ساحل پر ادھر ادھر دیکھتا ہوا آ رہا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو اور اپنے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ وہ ریت پر اچھلتے کودتے رہے' سمندر میں دوڑتے ہوئے اترے' اسے بہت سرد پایا اور خود کو گرم کرنے کے لیے باہر دھوپ میں آئے' وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور محبت کرنے لگے۔ میں انہیں باری باری اوپر آتے' ان کی حرکت کو تیز ہوتے اور انہیں مسرور ڈھیر کی صورت میں گرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہ ایک مکمل صبح کا مکمل انجام تھا۔

ہم نے واپسی کا سفر ٹرین سے کیا۔ ہم وینکوور سے صبح کے وقت روانہ ہوئے' راکیز سے گزرے' چیڑ اور صنوبر کے گھنے جنگلوں سے گزرے' چمکتی ہوئی ندیوں اور جھیلوں کے پاس سے گزرے جن کے کناروں پر بارہ سنگھے چر رہے تھے۔ ہم سفر کے دوران میں بینف اور لیک لوئیس ٹھہرے پھر کیلگرے' کنگسٹن اور البرٹا میں اس موسم گرما میں اپنے خاندان کو الگونکوئین پارک لے گیا۔ ہم نے اپنا وقت جھیل میں کشتی رانی کرتے ہوئے' مرغابیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اور مچھلیاں پکڑتے ہوئے گزارا۔ میں اپنے خاندان کو نیاگرا آبشار دکھانے بھی لے گیا۔ جب میں پانی کی عظیم چادر کو دیکھ کر حیران اور مرعوب ہو گیا تھا تو میری بیوی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا: ''اس میں عظمت کی کونسی بات ہے؟ ہمارے ہاں اوکھلا میں ایسی ہی آبشار تو ہے۔'' میں نے اگلا دورہ ٹورنٹو کا کیا اور تھاؤزینڈ آئی لینڈز اور مسکوکا کے گرد ڈرائیونگ کر کے دن گزارے میں نے کبھی کینیڈا جیسا خوبصورت ملک نہیں دیکھا۔

گرمیوں میں لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن ٹورنٹو میں کینیڈین تجارتی میلے کا افتتاح کرنے کے لیے آئے۔ اس نے پیغام بھجوایا کہ عزت مآب پسند کریں گے کہ ہندوستانی ہائی کمشن کا سٹاف ان کے ہمراہ ہو۔ ہم خوش ہو گئے اور ہمیں صرف تقریب میں ہی حجہ کا علم ہوا۔ ادھر لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن شارک سکن کی چاندی جیسی سفید بحریہ کی وردی پہنے ہوئے بیٹھا تھا' جو تمغوں اور سونے کے نیول افسر والے نشانات سے دمک رہی تھی' اس کے پہلو میں لیڈی

شاہانہ انداز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کے پیچھے پگڑیوں اور ڈاڑھیوں والے سکھ' سیاہ شیروانیوں اور سفید چوڑی دار پاجامے میں۔ اس کی عظمت وشوکت کی ترجمانی کرنے والا ایک مکمل ٹیبلو تھا۔ اگر ہزاروں سامعین کو اس کی صداقت میں کوئی شک تھا تو لارڈ لوئیس نے انہیں اپنی تقریر میں مطمئن کر دیا' جس میں اس نے متعدد مرتبہ ''میری کزن ملکہ' میرا بھانجا فلاں فلاں'' کا ذکر کیا۔ اور ہندوستان کے وزیراعظم اور عوام کی جانب سے اس نے ملک کے آخری وائسرے اور گورنر جنرل کی حیثیت میں زبردست محبت مؤصول کی تھی۔

اوٹاوہ کو واپسی ایک طرح سے انٹی کلائمیکس تھا۔ اگرچہ میں اب بھی ری ڈیو کلب میں ٹینس کھیلتے ہوئے' دریائے اوٹاوہ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے' بہاؤ کے ساتھ لکڑی کے لٹھوں کے جزیروں کو بہتے ہوئے' کینیڈین دوستوں کی خاطر مدارات کرتے اور ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوب مزے میں تھا تاہم ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ ہم مشکل ہی سے آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ ہماری قسمت سے ہندوستان کے واقعات نے ہمیں ایک دوسرے سے نجات پانے میں مدد دی۔ خارجہ پبلسٹی کے محکمے کو وزارت خارجہ نے لے لیا تھا۔ مینن اب اپنے انداز سے کام کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ اس نے پی۔ ایل۔ بھنڈاری جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا' کی جگہ میرے لندن ٹرانسفر کے لیے کہا۔ مجھے اپنے آرڈرز اکتوبر میں ملے' جب میپل کے درخت سرخ انگارہ ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے راہول کے راک کلف پبلک سکول میں اس کی ٹرم پوری ہونے تک اپنے خاندان کو اوٹاوہ ہی میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے ''کوئین الزبتھ'' لیا اور جہاز پر اپنے دن سکوائش کھیلتے ہوئے گزارے۔ ملک بھی اسی جہاز پر سفر کر رہا تھا' ہمیں ایک ہی میز پر بیٹھنا پڑتا تھا۔۔۔ اس کا الوداعی تحفہ مجھے پوکر کے کھیل میں ملوث کرنا تھا جسے میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ کھیل کے اختتام پر اس نے بتایا کہ میں سو پونڈ کا مقروض ہوں۔

مینن میری واپسی پر خوش تھا۔ میں تو محض ایک افسر اطلاعات (انفارمیشن آفیسر) تھا۔ بھنڈاری سے اختیارات لینے کے چند دنوں کے اندر اندر ہی اس نے مجھے ترقی دے کر پریس اتاشی اور فرسٹ سیکرٹری کے عہدے کے ساتھ پی آر او بنا دیا۔ اس نے کملا جسپال کی بہن کے شوہر جمال قدوائی کو میرا نمبر دو بنا دیا۔ کینیڈا سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈیوٹی فری سکاچ کے کریٹ اپنی نئی پونٹیاک کے ساتھ مجھے بھجوانے کے آرڈر جاری کیے تھے۔ دونوں ہی جنگ کے بعد کے انگلینڈ میں قابل قدر اثاثے ثابت ہوئے تھے۔

میں ایک مرتبہ پھر نائٹس برج میں ہیرڈز کے پیچھے لال کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ ان کے پاس ایک پرکشش انگریز لڑکی سیڈرا اوسبورن ہاؤس کیپر کے طور پر رہ

رہی تھی۔ وہ ہاؤس کیپنگ ہی نہیں بلکہ مے نوشی کے درمیان اچھی رفاقت مہیا کرتی تھی۔ آرتھر اور شیلا کے تعلقات ٹوٹنے ہی کو تھے۔ آرتھر جو دوسری عورتوں سے تعلقات برقرار رکھے ہوئے تھا' اپنی بیوی کا کسی دوسرے کے ساتھ ملنا جلنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لال کے اپارٹمنٹ میں اکثر آنے والے ملاقاتیوں میں تین شادی شدہ لوگ شادی سے بالاتر تعلقات کے اہل تھے۔ ادھر طویل القامت خوبصورت بی۔ کے۔ نہرو تھا' جو وزیراعظم کا کزن تھا اور چند اہم سفارتی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے لندن کا دورہ کر رہا تھا' اشوک چندا' جس نے انڈیا ہاؤس میں ڈپٹی ہائی کمشنر کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالی تھیں اور بیجو پٹنائک (بعد میں یونین کا کابینہ وزیر اور اڑیسہ کا وزیراعلیٰ)' ایک چھ فٹ کا لمبا تڑنگا آدمی جو اپنے جہاز پر ہندوستان سے لندن آیا تھا۔ جب میرا خاندان مجھے آملا تو ہم لال سے اس کا بالائی منزل والا فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں چند ایک ہفتے قیام پذیر رہے۔ وہاں بہت سے ڈرامائی منظر رونما ہوئے۔ ہمارے حلقے میں شامل ہونے والی ان کی ہمسائی ایلسا وڈمین تھی' جو امریکی سفارت خانے کے ایک نیول اتاشی کی بیوی تھی۔ اس کا خاوند دور ہوتا تو وہ ایک فیاض میزبان اور کھلنڈری ہوتی تھی۔

ان منظروں میں سے پہلا اس وقت رونما ہوا جب آرتھر لال دہلی میں تھا۔ بیجو پٹنائک نے' جو کہ باقاعدگی سے آنے والا ملاقاتی تھا' آرتھر اور شیلا اور میری بیوی کے مابین تناؤ کو بھانپ لیا تھا۔ ایک شام جب مجھے دفتر میں دیر ہو گئی تھی تو اس نے شیلا یا میری بیوی کو اپنے ساتھ ویک اینڈ کے لیے پیرس جہاز سے جانے کی سرسری سے انداز میں پیشکش کی۔ میری بیوی اس کی پیشکش قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی' شیلا نے آمادگی ظاہر کی۔ وہ بہت خوش خوش واپس آئی۔ شیلا رازداری میں یقین نہیں رکھتی تھی۔ چند روز بعد آرتھر ہندوستان سے واپس آ گیا۔ ہم اسے ائیرپورٹ سے لانے کے لیے گئے۔ واپسی میں شیلا نے اسے بیجو کے ساتھ اپنے ویک اینڈ کے بارے میں بتا دیا۔ وہ دل شکستہ ہو گیا اور اس شام اس نے بہت زیادہ شراب پی۔۔۔ آدھی رات کے بعد شیلا اوپر آئی اور اس نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ اس نے ہموار آواز میں پوچھا: ''کے سنگھ کیا تمہارے پاس ریوالور ہے؟ آرتھر اپنے آپ کو گولی مارنا چاہتا ہے۔'' وہ اس طرح پرسکون انداز میں بولی تھی گویا وہ نیند کی گولی مانگ رہی ہو۔

آرتھر رات دن اسے جھاڑتا رہتا یہاں تک شیلا تھک کر ہموار ہو گئی۔ ٹھیک اس وقت سوم ناتھ مائرا' جو لا کالج لاہور میں میرا طالب علم رہا تھا اور اس وقت آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا' نمودار ہوا۔ وہ ایک طویل قامت' خوبصورت' دل میں گھر کرنے لینے والے اطوار کا حامل شخص تھا۔ ہم چائے پی رہے تھے' فضا ماتمی سی تھی۔ اس نے ہمیں خوش کرنے کی کوشش کی اس نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟ ہر شخص بہت غصے غصے نظر آ رہا ہے۔'' وہ شیلا کے قریب گیا' اس کی ٹھوڑی

کو چھوکر لجاجت سے بولا: ''شیلا جی! پلیز مسکرا دیجئے!'' اس بات نے آرتھر کے جنونی غصے کو بھڑکا دیا وہ مشتعل چیتے کی طرح مائرا پرا کود پڑا: ''حرام زادہ! بھین چود! تمہیں میری بیوی سے اس طرح بولنے کی جرأت کیسے ہوئی!'' اگرچہ قد میں چھوٹا تھا تاہم آرتھر قوت سے بھرا ہوا تھا۔ سوم مائرا لگ بھگ ایک فٹ زیادہ لمبا' بیس۔ ال چھوٹا اور زیادہ مضبوط تھا۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ آرتھر اس کے ۔ ۔ دوستانہ زور آزمائی کر رہا ہے۔ جونہی اسے ادراک ہوا کہ آرتھر تو اسے پیٹنا چاہتا ہے اس نے آرتھر کو زمین پر گرا لیا۔ ہم انہیں الگ الگ کرنے کی کوشش کیے بغیر لڑتے ہوئے دیکھتے رہے۔ شیلا اپنی نرم آواز میں منمناتی رہی: ''آرتھر' خود پر قابو رکھو!'' آرتھر کو ادراک ہو گیا کہ وہ سوم پر حاوی نہیں ہو سکتا اور پھنکارتا' گالیاں بکتا اور اسے اپنی حد سے کبھی آگے نہ بڑھنے کی تنبیہہ کرتا ہوا ۔ ے سے چلا گیا۔

لندن واپس آنے کے بعد ابتدائی چند ہفتوں کے لیے مجھے پہلی منزل پر ایک کمرہ دیا گیا جس پر پیتل کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی ''بیگم ماؤنٹ بیٹن آف برما'' نہرو کے بعد مین ماؤنٹ بیٹنوں پر بھروسہ کیا کرتا تھا۔ اس نے لیڈی ایڈوینا سے ظاہرہ طور پر اس کے ہندوستانی معاملات میں دلچسپی لینے کی ضرورت کا ذکر کیا تھا۔ ایک کمرہ' جب وہ استعمال کرنا چاہے' اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہ اس میں ایک مرتبہ بھی داخل تک نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے انتباہ کیا گیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو مختصر نوٹس پر مجھے یہ کمرہ خالی کر دینا ہوگا۔ چند روز تو یہ بڑا پر لطف رہا: مجھے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دیتی' جونہی میں چلاتا: ''اندر آ جاؤ'' کوئی شخص اس امید میں خاموشی سے دروازہ کھولتا کہ اسے کرسی پر بیگم وائسرائے بیٹھی ہوئی نظر آئیں گی۔ اس کے بجائے انہیں ایک سکھ کھیسیں نکالے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ میرے دوست پھٹ پڑتے تھے: ''تم لوطی! تم لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے کمرے میں کیا...... رہے ہو؟''

لیڈی ایڈوینا تو اپنے لیے مختص کیے گئے کمرے میں کبھی نہیں آئی لیکن لارڈ لوئیس نے ایک غیر طے شدہ دورہ کیا۔ اس نے انڈیا ہاؤس میں ایک استقبالیے کی دعوت قبول کی تھی۔ اس کے سیکرٹری نے اس کو غلط وقت بتایا اور وہ اپنی آمد کے متوقع وقت سے آدھا گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کبھی کسی پارٹی میں پہلے آنے کا عادی نہیں تھا' وہ دوسرے مہمانوں کی آمد کے بعد پہنچنے کو ترجیح دیتا تھا۔ لہٰذا اس موقع پر وہ بھلا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کی بیوی کے لیے مخصوص کمرے میں چند منٹ انتظار کرنے کا کہا اور خود ہی آدھے گھنٹے تک گریٹ لارڈ کو محو رکھا۔ وہ حکومت کے ایک غیر اہم سے اہلکار کے ساتھ باتیں کر کے اپنا بیش قیمت وقت ضائع کرنے کا شائق نہیں تھا۔ میں نے اس سے اس کے ہندوستان میں گزرے ہوئے دنوں کے حوالے سے پوچھتے ہوئے گفتگو جاری رکھنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی۔ میں

نے اس سے پوچھا: ''کیا بعد میں غور کرنے پر آپ یہ نہیں سوچتے کہ ہندوستان کی تقسیم ایک غلطی تھی؟'' ''جس عجلت سے اسے عمل میں لایا گیا اس کی وجہ سے ہزاروں معصوم جانیں ضائع گئیں۔'' لارڈ ماؤنٹ بیٹن جانتا تھا کہ میرا منشا کیا ہے اور اس نے جواب دیا: ''مجھے کوئی پروا نہیں ہے کہ لوگ آج میرے بارے میں کیا کہتے ہیں' تاریخ کی عدالت میرا فیصلہ کرے گی۔''

انڈیا ہاؤس میں میری زندگی میں دل گداز لمحے بھی آئے۔ ایک لمحہ وہ تھا جب رانی آف منڈی کینسر کی وجہ سے فوت ہوئی۔ وہ اپنے وقتوں کی عظیم حسینہ تھی اور اپنے شوہر سے الگ ہو جانے کے بعد لندن میں قیام پذیر تھی۔ شام کے اخباروں نے اس کی جوانی کی تصویروں کے ساتھ اس کی موت کا اعلان کیا۔ اگلی صبح جب میں اپنے دفتر میں تھا تو میرے سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ کوئی انگریز مجھ سے کسی فوری کام کے سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اندر بھیجنے کا کہا۔ وہ سیاہ ہیٹ' سیاہ کوٹ اور پٹی والا ٹراؤزر پہنے ایک لمبا آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا: ''میں مسٹر کینین ہوں۔ کینین اینڈ کینین تکفین و تجہیز کرنے والے ادارے کی طرف سے آیا ہوں۔ بلاشبہ آپ نے ہمارے بارے میں سنا ہو گا!'' میں اکثر شہر کے مختلف حصوں میں ان کی جنازہ گاہوں کے قریب سے گزرا کرتا تھا' میں نے جواب دیا کہ میں اس ادارے سے آگاہ ہوں۔

اس نے پوچھا: ''بلاشبہ آپ نے ہر ہائی نیس رانی آف منڈی کے بارے میں سنا ہو گا؟'' میں نے جواب دیا کہ میں نے شام کے اخباروں میں پڑھا ہے۔

اس نے آہ بھر کر کہا: ''بہت دکھ ہوا۔''

میں نے کہا: ''واقعی' وہ بہت حسین تھی۔''

اس نے گفتگو جاری رکھی: ''سر ہر ہائی نیس نے وصیت کی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین کے لیے ان کے جسم کو ان کی ساری میں لپیٹا جائے۔'' اس نے پارسل کھولا اور چوڑے سنہرے حاشئے والی ایک شاندار ساری کی تہیں کھولیں۔ ''ہمیں بے شمار مرحومین مرد و خواتین کے ملبوسات کا تجربہ ہے' مگر ہمیں کبھی کسی ہندوستانی خاتون کی تجہیز و تکفین کا موقع نہیں ملا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ساری کو بدن پر کس طرح لپیٹا جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ میں ذاتی طور پر آپ کے سفارت خانے جا کر اس کو سیکھوں۔''

مجھے بھگوان کی طرف سے ایک ننگی مہارانی کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا — خواہ مردہ ہی سہی' تاہم میں نے اس سنہرے موقع کو اس لیے نظر انداز کر دیا کیونکہ کوئی مزاحیہ بات کہنے کی خواہش مجھے مجبور کیے دے رہی تھی۔ میں نے جواب دیا: ''مسٹر کینین میں معذرت چاہتا ہوں' مجھے ساریاں اتارنے کا تو کچھ کچھ تجربہ ہے لیکن میں نے کبھی کسی ایک عورت کو بھی

ساری باندھی نہیں ہے۔"

مسٹر کینین اپنے پارسل سمیت تیزی سے رخصت ہو گئے اور کرشنا مینن سے ملاقات کرنے چلے گئے۔ اس نے اپنی درخواست کو ہلکے پھلکے انداز میں لینے پر میری شکایت کر دی۔ کملا جسپال سے اس کو تربیت دلوانے کے بعد مینن نے مجھے بلا بھیجا۔ "سردار! چالاک بننے کی تمہاری عادت کا کوئی علاج بھی ہے؟" اس نے پوچھا۔ بعدازاں اس نے ہر کسی کو گورکن کے ساتھ میری گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔

تب پنڈت نہرو نے بطور وزیراعظم انگلینڈ کا پہلا دورہ' دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے' کیا۔ ہم نے اس موقع پر ایک ہفت روزہ "انڈین نیوز" کے اجرا کا فیصلہ کیا۔ جمال قدوائی اور میں لے آؤٹ' کتابت کے انداز کے انتخاب پہلے' شمارے میں چھپنے والی خبریں فراہم کرنے کے لیے متعدد مرتبہ پریس گئے۔ صفحہ اول (فرنٹ پیج) کو پنڈت جی کے دورے اور دولتِ مشترکہ کی کانفرنس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مخصوص کیا جانا تھا— ہم نے اس کی آمد سے دو دن پہلے مواد طابع (پرنٹر) کو بھیج دیا۔ شہ سرخی (بینر ہیڈلائن) تھی "پنڈت نہرو لندن میں" (Pandit Nehru In London) ۔ جب پروف اصلاح کے لیے آئے تو حرف P کی جگہ B لگا دیا گیا تھا— "بینڈٹ (ڈاکو Bandit) نہرو لندن میں۔" کیا یہ کسی قسم کا مذاق تھا؟ میں نے پریس کے مینجر کو فون کیا اور اس کو سخت لعن طعن کی۔ اس نے بہت زیادہ معذرت چاہی۔ اس کے کاتب نے کبھی لفظ پنڈت (Pandit) نہیں سنا تھا' اس نے سوچا ہمارا مطلب ہو گا بنیڈٹ (Bandit)۔ دوسرے پروف میں لفظ درست تھا۔ عظیم آدمی کی آمد والی شام دوسرا کاتب ڈیوٹی پر موجود تھا اور وہ بھی لفظ "پنڈت" (Pandit) کے وجود سے ناآشنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر "پنڈت" (Pandit) کو "بینڈٹ" (Bandit) میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہمیں وہ سارے شمارے ردی والے کو دینا پڑے اور عملے کے ایک رکن کو بھیجا گیا کہ وہ دیکھے کہ درست لفظ کتابت ہوا ہے۔

عملے کے سنیئر ارکان کو حکم دیا گیا کہ وہ وزیراعظم کے استقبال کے لیے ہیتھرو ائیرپورٹ پر موجود ہوں۔ یہ سرما کی ایک یخ بستہ رات تھی جب ہوائی جہاز نے زمین کو چھوا۔ "تم سب لوگ ناوقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا' واضح تھا کہ اسے ہمارے موجود ہونے کی توقع تھی اور یہ وہ دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ ہم اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ مینن نے مجھے خود کو پی۔ ایم (وزیراعظم) سے متعارف کرانے کا کہا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھ سے کوئی کام لینے کا خواہاں ہے۔ میں نے صرف فخر کرنے کے لیے ایسا کیا۔ "اس وقت میں تم

سے کیا چاہ سکتا ہوں؟ گھر جاؤ اور سو جاؤ۔''

اگلی صبح جب میں دفتر پہنچا تو میں نے اپنی میز پر مینن کی طرف سے نوٹ پڑا ہوا پایا کہ میں فوری طور پر اسے ملوں۔ میں نے اخبارات کی سرخیوں پر ایک نگاہ ڈالی تا کہ جان لوں کہ کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ہے۔ ''ڈیلی ہیرالڈ'' نے نہرو کی بڑی سی تصویر شائع کی تھی جس میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں اس کے لیے دروازہ کھول رہی تھی۔ اس کا وضاحتی جملہ (کیپشن) تھا: ''لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا آدھی رات کا ملاقاتی۔'' قارئین کو یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن میں موجود نہیں تھا۔ ہمارے وزیر اعظم کے لیڈی ایڈوینا سے تعلقات سکینڈل بن چکے تھے۔ ہیرالڈ کے فوٹو گرافر کو ان کی تصویر اتارنے کا موقع مل گیا تھا ''حالت غیر'' میں نہ سہی کم از کم اس کی تیاری میں سہی۔ اس نے اپنا سکوپ (Scoop) حاصل کر لیا تھا۔ جب میں مینن سے ملنے اوپر گیا تو وہ مجھ پر دھاڑنے لگا:

''کیا تم نے ہیرالڈ دیکھا ہے؟ وزیر اعظم تم سے ناراض ہیں؟''

میں نے صفائی پیش کی: ''اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا علم کس طرح ہوتا کہ پنڈت جی اپنے ہوٹل جانے کی بجائے ماؤنٹ بیٹن کے گھر جائیں گے؟''

''کچھ بھی ہو، وہ بہت ناراض ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم ایک آدھ دن کے ان کے سامنے نہیں آؤ۔''

مجھے زیادہ چھپنا نہیں پڑا تھا کیونکہ نہرو کانفرنس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے لیے جس واحد تقریب کا ہم نے انتظام کیا وہ تھی بین الاقوامی پریس کے ساتھ اس کی میٹنگ اور اس کے ہوٹل کے سوئٹ (Suite) میں چوٹی کے انگریز اخبارات کے مدیران کے ساتھ لنچ۔ دونوں کی تفصیلات اس کے سیکرٹری ایم۔ او۔ متھئی کو دے دی گئی تھیں۔ پریس کانفرنس میں بہت ہجوم ہو گیا' بشمول پاکستانی صحافیوں کے۔ ان کی بنیادی دلچسپی تھی کشمیر: مغربی پریس عمومی طور پر پاکستانی نکتۂ نظر کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ لوگ یہ سننے کے شائق تھے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم اپنے دفاع میں کیا کہتا ہے۔

کانفرنس کا وقت 10:30 بجے دن تھا۔ 10:45 تک وہاں پنڈت جی کا کوئی نام نشان تک نہیں تھا۔ میں نے متھئی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ پریس والے بے چین ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وزیر اعظم بہت ناراض دکھائی دیتے ہوئے آ پہنچا۔ مینن اور میں اسے ڈائس تک لے کر آئے۔ ''یہ سب کیا ہے؟ مجھے کسی نے کیوں نہیں بتایا کہ مجھے پریس سے ملنا ہے؟'' اسنے اتنی بلند سرگوشی کی کہ مائیکروفونز نے اس کی آواز کو کمرے کے ہر کونے میں پہنچا دیا۔ پھر اس نے کیمرہ مینوں کے لیے چہرے پر مسکراہٹ سجا لی اور پوچھا: ''یس جنٹل مین! میں

آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

پاکستانی صحافی اٹھے اور اس سے کشمیر کے حوالے ہندوستان کی پوزیشن کی وضاحت کرنے کے لیے کہا۔ اس نے بہت آسانی سے وضاحت کر دی۔ واضح تھا کہ وہ پیشگی تیاری کر کے آیا تھا' تاہم وہ یہ تاثر تخلیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ فی البدیہہ بات کر رہا ہے۔ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ بعد میں جب میں نے اس کو وہ پروگرام شیڈول دکھایا جس میں کانفرنس کا ذکر تھا تو اس نے اسے پرے کر دیا۔ اس نے میری قیمت پر اپنے نمبر بنا لیے تھے۔

متھئی نے بھی مجھے انتباہ کیا کہ وزیراعظم کی کوئی تصویر وزیراعظم سے منظوری لیے بغیر پریس کو جاری نہیں کی جائے۔ وہ ایک خود بین آدمی تھا جو ناک میں انگلیاں پھیرتے یا جمائیاں لیتے ہوئے پکڑے جانے کا خواہاں نہیں تھا۔

مدیروں کے لیے لنچ ایک مطلق بربادی تھا۔ مینیو کملا جسپال نے تیار کیا تھا جس میں سبزیوں کے سوپ کے بعد چائے پیش کی جانی تھی۔ ٹائمز' ٹیلیگراف' مانچسٹر گارڈین' آبزرور اور نیو سٹیٹسمین اور نیشن کے مدیر موجود تھے۔ ہم نے میزوں پر بیٹھنے سے پہلے شیری سے شروعات کی۔ پھر سوپ اور ٹھنڈی وائٹ وائن پیش کی گئی' پنڈت جی شیری اور وائن سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اس نے اس امر کی غمازی کے لیے سگریٹ جلایا کہ غیر رسمی مکالمہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ روایت پسند (کنزرویٹو) پریس ہندوستان کے لیے معاندانہ کیوں ہے۔ مدیروں نے جواباً احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ تو ہندوستان سے اپنے نامہ نگاروں کی بھیجی گئی خبریں شائع کرتے ہیں جن کے غیر جانبدار ہونے پر انہیں اعتماد ہے۔ اگر کوئی واقعاتی غلطی ہو تو وہ انڈیا ہاؤس کو بھیجی گئی اصلاحات کو برضا عمل میں لائیں گے۔ ہر کسی نے مینن کا رخ کر لیا۔ اس کا سر اس کے سینے پر جھکا ہوا تھا اور وہ اونگھ رہا تھا۔ پنڈت جی نے غصے سے میرے ساتھ سرگوشی کی: ''کیا تم نہیں دیکھ سکتے تمہارا ہائی کمشنر بھلا نہیں ہے؟ تمہیں اسے دوسروں کے سامنے اس طرح تو عیاں نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر پنڈت جی خود دلچسپی کھو بیٹھے۔ جب ایک مدیر نے اس سے کوئی سوال پوچھا تو اس نے خلا میں دیکھنا شروع کر دیا۔ سوال کوئی جواب پائے بغیر لٹکا رہ گیا۔ میں نے خاموشی کے وقفوں کو پر کرنے کے لیے اپنی سی بہترین کوشش کی۔ میٹھا پیش کیے جانے سے پہلے پنڈت جی خود اونگھ رہے تھے اور ان کا سر ان کے سینے پر جھک گیا تھا۔ مدیر کافی پیش کیے جانے سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے۔

ادھر میرے لیے ذخیرے میں کافی کچھ تھا۔ دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے ختم ہو جانے کے بعد پنڈت جی کے پاس اپنے ذاتی مشاغل کتابوں کی خریداری اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن میں محو ہونے کے لیے دو دن تھے۔ کتابوں کی خریداری کے لیے ایک سہ

پہر مخصوص تھی۔ مینن نے مجھے وزیراعظم کے ساتھ جانے اور خریدی گئی کتابوں کی ادائیگی کے لیے تفویض کیا۔ اس نے مجھے یہ بھی ہدایت کی کہ میں وزیراعظم کو بتاؤں کہ ہائی کمشنر کتنی اعلیٰ خدمات انجام دے رہا ہے اور ہندوستانی صحافی اپنے اپنے اخبارات کو جو مخالفانہ خبریں بھیج رہے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ میں نے نہرو کو اس کے ہوٹل سے لیا اور پوچھا: ''سر! آپ کس قسم کی کتابیں دیکھنا پسند کریں گے؟'' اس نے ترت جواب دیا: ''کتابیں پڑھنے کے لیے ہوں؟ کوئی سی ہوں!'' میں نے واضح کرنے کی کوشش کی کہ مختلف موضوعات پر بہت سی مخصوص کتابوں کی دکانیں ہیں — نایاب کتابیں' مشرقی' مذہبی' فلسفیانہ' سفر وغیرہ کے حوالے سے۔ اس نے میری تفتیش کو نظرانداز کر دیا اور شوفر کو آکسفورڈ سٹریٹ پر واقع کتابوں کی ایک مشہور دکان پر چلنے کا حکم دیا۔ ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ اسے پہچان لیا گیا اور سیلز اسسٹنٹس اس کی طرف لپکے۔ اس نے چند کتابوں کو دیکھا۔ جب ایک سیلز اسسٹنٹ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کوئی خاص شے ڈھونڈ رہا ہے تو اس نے جواب دیا: ''برنارڈ شا۔'' شا چند ہفتے پہلے ہی فوت ہوا تھا اور اس کی کتابوں میں دلچسپی دوبارہ ابھر آئی تھی۔ شا کی کتابیں مہیا کر دی گئیں اور میں نے انڈیا ہاؤس کی طرف سے ان کے لیے دستخط کر دیئے۔ کچھ لوگ نہرو کے آٹوگراف لینے کے لیے آئے' اس نے خوشی خوشی انہیں اپنے دستخط کر دیئے۔ میں نے نظموں کی ایک کتاب خریدی اور اس سے اپنے لیے اس پر لکھوایا۔ خریداری مہم ختم ہو گئی۔ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے میں نے نہرو سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس کتابیں پڑھنے کے لیے کافی وقت ہوتا ہے۔ ''بالکل نہیں'' اس نے صاف جواب دیا۔

نہرو کے جانے سے دو شامیں پہلے اسے لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے سوہو میں دو آدمیوں کے پرسکون ڈنر پر ایک یونانی ریستوران میں مدعو کیا۔ ریستوران کے مالک نے انہیں پہچان لیا اور ان کے ساتھ اپنی مشہوری کی غرض سے پریس کو فون کر دیئے۔ اگلی صبح کے اخبارات میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے دونوں کی تصویریں شائع ہو گئیں۔ میں جانتا تھا کہ میں دوبارہ مشکل میں ہوں۔ میں دفتر پہنچا تو میز پر مینن کا یہ نوٹ پایا کہ وزیراعظم مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ میں تیزی سے کلیرجز ہوٹل پہنچا اور متھئی کو اپنے پہنچنے کی اطلاع۔ ''اندر چلے جاؤ'' اس نے میکانکی سے انداز میں کہا۔ میں نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں کہا: ''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

''نہیں' وہی تمہیں بتائے گا۔''

میں نے وزیراعظم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلا گیا۔ وہ چند فائلیں دیکھنے میں مصروف تھا۔ ''ہاں؟''

اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

''سر! آپ نے مجھے بلایا تھا۔''

''میں نے تمہیں بلایا تھا؟ کون ہو تم؟''

''سر! میں لندن میں آپ کا پی۔آر۔او ہوں۔''

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا: ''پبلسٹی کے تمہارے تصورات عجیب سے ہیں!''

نہرو کے رخصت ہونے کے فوری بعد مجھے نئی دہلی سے بلایا گیا' یو۔پی۔ایس۔سی (U.P.S.C) سے اپنے تقرر کی توثیق کے لیے۔ اسی طرح ان سب کو بلایا گیا تھا جنہیں میری طرح منتخب کیا اور مختلف ملکوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ ایک یونہی سا انٹرویو ہوگا: ہم لگ بھگ دو برس سے ملازمت میں تھے اور اس وقت تک مسترد نہیں کیے جا سکتے تھے جب تک میزان عمل پر پورا نہ اتریں۔ میں غلطی پر تھا۔ درجن بھر یا اس سے زیادہ کے انٹرویو لیے گئے' اکثریت کو مسترد کر دیا گیا۔ میں خوش قسمتوں میں سے ایک تھا اور مجھے اپنے عہدے پر لوٹ جانے کا کہا گیا۔ اس دورے کو گھریلو چھٹی (ہوم لیو) شمار کیا گیا۔

میٹکاف ہاؤس میں ہونے والے انٹرویو سے واپسی پر میرا گزر سبزی منڈی سے ہوا۔ سڑک بظاہر کسی آگے برپا ہونے والے جھگڑے کی وجہ سے بند تھی۔ میں نے ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا اور یہ جاننے کے لیے باہر نکلا کہ کیا ہوا ہے۔ ''ہم نے دو مسلمان سؤروں کو ایک گائے ذبح کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے پکڑا ہے۔'' ہجوم میں موجود لوگوں میں سے ایک نے مجھے اطلاع دی۔ میں لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا منظر کے مرکز میں پہنچا۔ وہاں ایک گائے اور تین آدمی موجود تھے ___ دو مسلمان اور ایک سکھ ___ جن کو لوہے کی سلاخوں اور لمبے لمبے چاقوؤں سے مسلح لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس میری آمد نے انہیں باز رکھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے غصے سے پوچھا: ''یہ دو آدمی قصائی ہیں' اس سکھ نے انہیں گائے فروخت کی تھی۔'' ___ مجھے آگاہ کیا گیا۔ وہ تینوں آدمی خوف سے لرز رہے تھے۔ مسلمانوں کو الف ننگا کر دیا گیا تھا اور ان کے ختنے کیے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ انہیں مار مار کر خنجروں سے ہلاک کیا جانے والا تھا۔ سکھ کو مارا پیٹا جانا تھا اور اسے سبق سکھایا جانا تھا۔ میں نے اپنے بازو قصائیوں کے سامنے پھیلا دیے اور چیخ کر کہا: ''ان آدمیوں کو کوئی شخص ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا! میں نے تقسیم کے دوران ایسا بہت دیکھا ہے۔ اسے ختم کرنا ہوگا۔''

ہجوم کے اشتعال کا رخ میری طرف ہو گیا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ آدمی گائے کو ذبح کرنے لے جا رہے تھے؟ تم کس قسم کے سکھ ہو؟'' میں اپنے مؤقف پر قائم رہا: ''میں تمہیں

ان کو چھونے بھی نہیں دوں گا۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو میں اسے گرفتار کروا دوں گا۔ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔'' وہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ مگر کوئی بھی پہلا قدم اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔ مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ ''آؤ ہم انہیں پولیس سٹیشن لے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' ہجوم نے جو میں چاہتا تھا مجھے وہی کرنے دیا۔ میں نے گائے کو ہانکا' دونوں قصائیوں کو اپنے بازوؤں میں لیا' خون کا پیاسا ہجوم ہمارا راستہ صاف کرنے کے ہمارے پیچھے پیچھے ٹراموں میں تلواریں جھنجھناتا ہوا آ رہا تھا۔ ہم سبزی منڈی پولیس سٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے انسپکٹر انچارج سے' جو ایک پنجابی ہندو تھا' اپنا تعارف کرایا' اور ان قصائیوں کو تحویل میں لینے کا کہا۔ اس اثنا میں سکھ ہجوم میں کھسک لیا تھا۔ ''انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے' میں انہیں کیسے حراست میں لے سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا: ''ان کی جانیں بچانے کے لیے۔'' میں نے اس کو قائل کیا۔ وہ نہیں مانا۔ میں نے سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنے عہدے سے اسے دھمکی دی تھی۔ اس نے ذرا بھی پروانہیں کی: ''مجھے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ کیا ہیں یا ہجوم ان لوگوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ جو کچھ ان کے ساتھ ہوگا وہ اس کے سزاوار ہیں۔''

میں نے معہ گائے اور قصائیوں کے پر ہجوم بازاروں میں سے اپنا مارچ تیس ہزاری تک جاری رکھا جہاں مویشیوں کا ہسپتال تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ہجوم گھٹ چکا تھا۔ مویشیوں کا ڈاکٹر ایک سفید ڈاڑھی والا سکھ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گائے کو اپنی تحویل میں لے لے اور حیوانوں پر بے رحمی کے الزام میں دونوں کو گرفتار کر لے۔ وہ بھی نارضامند تھا۔ ''مجھے گائے پر کوئی زخم دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اور اگر وہ ان سانپوں کو مار دینا چاہتے ہیں تو میں انہیں نہیں روکوں گا۔'' اس نے پرے جاتے ہوئے کہا۔ میں باقی بچ جانے والے ممکنہ قاتلوں سے مخاطب ہوا: ''دیکھو! میں گائے کو یہیں چھوڑ رہا ہوں اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ کسی ایسی جگہ لے جا رہا ہوں جہاں انہیں وہ سبق سکھایا جائے جس کے یہ مستحق ہیں۔'' وہ راضی ہو گئے' بہت ہو چکی تھی' ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے گائے کو چھوڑ دیا۔ وہ انسانی گرفت سے آزاد ہونے کی خوشی میں دم اٹھائے' پچھلی ٹانگوں سے پچھاڑیاں مارتی ہوئی پار بھاگ گئی۔ میں نے دونوں قصائیوں کو اپنی کار میں بیٹھنے کا کہا: ''تم کہاں رہتے ہو؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''دریا گنج''

''کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ ان دنوں گائے کو ذبح کرنا کتنا خطرناک ہے؟''

''جناب! ہمارے پاس دو دن سے کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم نے اس گائے کو خریدنے کے لیے چندہ اکٹھا کیا تھا۔ اب ہم تو برباد ہو گئے ہیں۔''

میں نے انہیں دریا گنج اتار دیا۔ وہ اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ میں نے انہیں اپنی

خریدی ہوئی گائے ڈھونڈنے کے لیے واپس جاتے ہوئے دیکھا۔

میں کوئی بہادر آدمی نہیں ہوں۔ میں نے خطرے کا سامنا کرنے میں جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اس پر حیران تھا۔ میں نے شوفر کو کہا کہ وہ مجھے چاندنی چوک میں گردوارہ سیس گنج لے چلے۔ میں پوجا کے مقامات کو جانا چھوڑ چکا تھا۔ سیس گنج نویں گرو تیغ بہادر کو دی جانے والی سزا کے مقام پر بنایا گیا تھا۔ روایت کے مطابق اس نے ہندوؤں کو سزا سے بچانے کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ یہ اس شخص کے جانے کے لیے بہترین جگہ تھی جس نے دو مسلمانوں کی جانیں اپنے انداز میں بچائی ہوں۔ سیس گنج میں مَیں نے گرو کے مزار پر حاضری دی جہاں اس برگد کے درخت کا تنا محفوظ کیا گیا ہے جس کے نیچے اس کا سر قلم کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے جیسے بزدل کو اس فرض کو نبھانے کی جرأت عطا کرنے پر، جو میرے خیال کے مطابق کسی سکھ پر عائد ہوتا ہے، گرو کا شکریہ ادا کیا۔ میں رونے لگا، ممنونیت کے آنسو میری آنکھوں سے تیزی سے رواں ہو گئے۔ جب میں روانہ ہوا تو میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ میں قتل ہونے کے قریب جو پہنچ چکا تھا۔

گھر پر میں نے بڑے فخر کے ساتھ واقعہ بیان کیا۔ میرے والد کے دوست سوہن سنگھ آف راولپنڈی نے جو ہمارے ساتھ قیام پذیر تھا، مجھے داد و ستائش دینے کے بجائے مجھے بے وقوف اور گدھا قرار دیا۔ میری ماں ناراض تھی کہ میں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ میرا باپ خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ایک شخص کی منظوری حاصل تھی جو میرے لیے کسی بھی شخص سے زیادہ اہم تھا۔

دہلی میں چند دن گزارنے کے بعد میں دوبارہ کام پر لندن لوٹ گیا۔ میرا کینیڈا سے لایا ہوا ڈیوٹی فری سکاچ کا ذخیرہ جنگ کے بعد کے سکاچ سے محروم پیاسے انگلینڈ کے لیے ایک تحفہ تھا۔ میں ہر بدھ کو لال کے اپارٹمنٹ میں ایک اوپن ہاؤس کا بندوبست کرتا تھا۔ چند کو تو میں مدعو کیا کرتا تھا ــــ دوسروں کو خوش آمدید کہے جانے کی ضمانت تھی۔ مینن وہاں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا کیونکہ میرے بیشتر مہمان صحافی ہوا کرتے تھے۔

ایسی ہی ایک پارٹی میں مہمان خصوصی پروفیسر سی۔ ایم۔ جوڈ تھا، جس نے اپنی کتابوں، ریڈیو پر اپنی آمد اور اپنی عورت پرستی کی کہانیوں کی وجہ سے شہرت اور بدنامی کمائی تھی۔ ایک سیریز ''کوئی سوال؟'' میں اپنی آمد کے موقع پر اس نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہاؤس کو گھٹا دیا: ''جب ایک خاتون وائسرائن کے ہاں نر بچہ جنم لیتا ہے تو کتنی توپوں کی سلامی دی جاتی ہے؟'' پینل میں واحد شخص جس نے سوال کا جواب دینے کے لیے ہاتھ بلند کیا، جوڈ تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ کتنی توپیں داغی جاتی ہیں۔'' اس نے اپنی باریک آواز میں جواب دیتے

ہوئے کہا ''لیکن میں جانتا ہوں کہ اے۔ڈی۔سی کو گولی ماردی جائے گی۔'' جوڈ ایک میلا کچیلا' لاپروائی سے ملبوس' پست قد' بکرا ڈاڑھی والا آدمی تھا۔اس کے بارے میں مشہور تھا کہ عورتوں کو وصل کی دعوت دینے کا اس کا فارمولا سادہ سا ہے: ''کیا تم ایک نامور آدمی کے ساتھ ہم بستری کرنا پسند کرو گی؟'' یہ فارمولا بہت کارگر رہتا۔تاہم حال ہی میں وہ ٹکٹ کے بغیر ٹرین میں سفر کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور اس پر جرمانہ عائد کر دیا گیا تھا۔یہ خبر تمام اخبارات کے صفحات اول پر شائع ہوئی۔جوڈ نے ہماری دعوت قبول کر لی' اس نے سنا تھا کہ میں نے مشہور ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا ہوا تھا۔مجھے پتا نہیں تھا کہ مینن جوڈ کو پسند نہیں کرتا۔اور میری بدقسمتی سے مینن اور جوڈ ایک ہی وقت پہنچے۔مینن تیزی سے اتنی اونچی آواز میں بولتا ہوا کہ جوڈ کو سنائی دے سیڑھیوں پر چڑھا (وہ ہمیشہ سیڑھیوں پر دوڑ کر چڑھتا تھا) ''اگر میں نے سنا ہوتا کہ تم نے اس شخص کو مدعو کیا ہوا ہے تو میں کبھی تمہاری پارٹی میں نہیں آتا۔'' وہ لینڈنگ پر رک گیا تاکہ میں آگے آ کر مہمانوں سے اس کا تعارف کراؤں۔اس کی بجائے میں جوڈ کو اس کا اوورکوٹ اتارنے میں مدد دینے کے لیے نیچے چلا گیا۔جونہی ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے جوڈ نے اپنی بلند ترین آواز میں مجھ سے پوچھا:

''کیا وہ آدمی مینن تو نہیں ہے؟''

''ہاں' سر'' میں نے جواب دیا۔

''وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ میرا خیال تھا تمہاری پارٹی ادیبوں شاعروں اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہے۔'' دونوں نے ایک دوسرے سے گریز برتا۔جوڈ اپنی سکاچ پینے بیٹھ گیا اور جلد ہی خاتون تعریف کرنے والیوں میں گھر گیا۔مینن صرف آرتھر لال کو اپنے سامع کے طور پر لیے چائے کا کپ پیتا رہا۔

مینن ایک پیچیدہ کردار تھا' مجھے ملنے والا سب سے زیادہ ناقابل پیش گوئی اور چڑچڑا آدمی۔میں اسے سب سے پہلے لندن سے پیرس جانے والی ٹرین میں ملا تھا جس میں وہ رجنی پٹیل کے ساتھ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے سفر کر رہا تھا۔ڈوور میں وہ اور رجنی امیگریشن کلیئرنس کے لیے منتظر مسافروں کی قطار پھلانگ گئے۔جب امیگریشن افسر نے انہیں قطار میں واپس جانے کو کہا تو مینن نے اس پر نسلی تعصب کا الزام لگا دیا۔اس شخص نے انہیں جانے دیا تھا۔مینن کالے ہونے کے حوالے سے تخیلاتی نسلی تذلیل پر جھگڑے کھڑے کر دیا کرتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بار کی اپنی فیسیں ادا کرنے کے لیے شفیع اور راما سوامی ریستورانوں میں بیرا گیری کرتا تھا۔اس نے کبھی پریکٹس نہیں کی لیکن سیاست دانوں کے مقدمے لڑنے کے لیے جانا جاتا تھا اور پیلیکن کی کتابوں کی سیریز کے مدیروں کے پینل میں شامل تھا۔ہائی کمشنر بننے

تک وہ کڑے حالات سے دوچار تھا اور کسی کا بھی مہمان بننے کو تیار رہتا تھا۔ وہ دبلا پتلا' درمیانی جسامت والا اور سیاہ رنگ کا آدمی تھا جس کے نقش و نگار تیکھے اور آنکھیں روشن' چمکدار تھیں۔ اس کی پیشانی چوڑی تھی' اس کے سیاہ گھنگھریالے بال کنپٹیوں پر سے خاکستری ہو رہے تھے' لمبی ناک اور رخساروں کی ہڈی ابھری ہوئی تھی۔ عورتوں کو وہ خوبصورت محسوس ہوتا تھا۔ وہ بہت کشیدہ (Tense) تھا' اس کا چہرہ کبھی پرسکون نہیں ہوتا تھا اور جذبات کی وجہ سے کھنچا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتا تھا جو درزیوں کی ایک معروف فرم کے سلے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ دوسروں کی بدلباسی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی صبح کی ملاقاتیں منسوخ کیں' مجھے اپنے درزی کے پاس لے گیا' کپڑا منتخب کیا اور میرے دو سوٹوں کے لیے میرا ماپ دلوایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے وہ سوٹ تحفتاً دینا چاہتا ہے اور اس کا بہت ممنون تھا۔ وہ تحائف نہیں تھے' مجھے کئی سو پونڈ ادا کرنا پڑے تھے لیکن وہ میرے پاس موجود سب سے بہترین سوٹ تھے اور بیس برس سے زیادہ عرصہ تک کام آئے۔ مینن اپنے پیسے کے معاملے میں فیاض نہیں تھا سوائے اپنی عورت دوستوں اور بچوں کے۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ بھی وہ عورتوں کے لیے گلابوں کے گل دستے اور بچوں کے لیے سستے پلاسٹک کے کھلونوں سے زیادہ شاذ و نادر ہی خرچ کرتا تھا۔

مینن اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں کفایت شعاری کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ بہت کم کھاتا تھا مگر چینی والی چائے کے کپوں اور بسکٹوں سے خود کو بھرے رکھتا تھا۔ تاہم وہ ہائی کمشنر کے لیے (اپنے لیے) رولز رائس اور ہندوستان سے دورہ کرنے کے لیے آنے والوں اور انڈیا ہاؤس کے ملازموں کے لیے آسٹن پرنس کے بیڑے کی خریدار کے لیے پیسہ اڑا دینے کو برا نہیں سمجھتا تھا۔ اپنی محدود ضروریات کے ساتھ اسے دولت جمع کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ایسا کرتا تھا۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا بلکہ اپنی انڈیا لیگ کی کئی ذیلی تنظیمیں قائم کرتا اور امیر ہندوستانیوں اور اپنے انگریز دوستوں سے عطیات کے طور پر پیسہ حاصل کرتا تھا' اس کے بدلے میں وہ مؤخر الذکر کو ہندوستان کے لیے اسلحہ فراہم کرنے کے ٹھیکے دے دیتا تھا۔ کاروباری معاملات میں اسے کوئی ضمیر کی خلش نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک پیدائشی جھوٹا تھا اور سچ کو صرف سادہ لوحوں کے لیے بہتر سمجھتا تھا اور جھوٹ بولنے کو ذہین لوگوں کے لیے بہترین عمل سمجھتا تھا۔

مینن کا اپنے سامنے پیش کی گئی کسی تجویز پر پہلا ردعمل اس کو رد کرنا ہوتا تھا۔ جو لوگ اسے بہتر طور پر جان گئے تھے اپنی تجاویز کو منفی طور پر پیش کرتے تھے اور اس کے انہیں مسترد کرنے سے ان کی منظوری پالیتے تھے۔ اس نے کام کے نشئی کی ساکھ استوار کی تھی۔ وہ گھنٹوں

تک کام کرتا جنہیں وہ دوسروں کو دق کرنے میں ضائع کرتا تھا مثلاً کینٹینوں کے مینیو اور دفتر کی کاروں میں استعمال کیے گئے پٹرول کا جائزہ لینا۔ اس نے کئی راتیں مجھے دفتر ہی میں سونے پر مجبور کیا۔ اس تکلیف کو مجھ پر مسلط کرنے کے لیے اتنا کافی کام ہوتا نہیں تھا جو اس طرح رات کو روکنے کا جواز ٹھہرتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کھیلوں کا بہت شائق ہوں اور ٹینس یا ہاکی کھیلنے کے لیے اتوار کی سہ پہروں کا منتظر رہتا ہوں۔ وہ لازماً اتواروں کو لنچ سے پہلے مجھے فون کرتا اور سہ پہر کو اپنی منعقد کردہ میٹنگ میں شرکت کا کہتا۔ وہ شدید سادیت پسند تھا۔

مینن کے برے مزاج اور عدم شائستگی کا یقین اس کا تجربہ ہونے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ بہت سے لوگوں کا معاملہ ہے وہ صبحوں میں اپنی بدترین حالت میں ہوتا۔ اپنے گیسٹرک عرقیات کے بہنا شروع ہونے سے پہلے۔ میں نے اسے جگن ناتھ کھوسلہ کے منہ پر فائل مارتے اور چلاتے ہوئے دیکھا تھا: ''کیا تمہاری کھوپڑی میں مغز بھی ہے؟ دفع ہو جاؤ!'' پھر اس نے ٹھنڈا ہونے کے لیے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور مجھ سے بولا: ''مجھے اس سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی؟ کیا کرنی چاہیے تھی؟'' میں نے کہا کہ وہ ایک سنیئر افسر کے ساتھ ذرا درشت ہو گیا تھا۔ اس نے کھوسلہ کو واپس بلایا اور معذرت چاہی۔ کھوسلہ نے کہا: ''سر! آپ سے ڈانٹ کھانا تو اعزاز کی بات ہے۔'' ایک صبح جب مینن ایک طویل فاصلے کی کال ملانے میں ناکام رہا تو وہ آپریٹر پر چلانے لگا۔ جرأت مند انگریز لڑکی جواباً چلائی: ''تم مجھ سے اس طرح بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کرو! میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ تم اپنی گندی ملازمت اپنے پاس رکھو۔'' ایک مرتبہ میں ''آبزرور'' کے مالک ڈیوڈ ایسٹر اور اس کے اے ڈی ولیم کلارک کو اس سے ملانے کے لیے لایا۔ اس نے انگریزوں کو لٹیروں کی نسل قرار دیا۔ ایلیویٹر میں نیچے اترتے ہوئے ڈیوڈ نے مجھے کہا: ''تمہیں مینن کے لیے تعلقات عامہ کی ملازمت ضرور کرنی چاہیے!'' اس کا ڈپٹی اشوک چندا مینن کی اس عادت سے واقف تھا کہ اگر وہ اپنے کہے کو بعدازاں باعثِ شرمندگی پاتا تو اس سے انکار کر دیا کرتا تھا' وہ اس سے تمام آرڈرز تحریراً لیا کرتا تھا۔ وہ اکثر میرے دفتر میں داخل ہوتا اور فتح مندی کے ساتھ کہتا: ''ہم شالا کو پھائل میں ایسا مارا! بھولے گا نہیں۔'' سر دھیرن مترا' ہمارا قانونی مشیر' کبھی گرم نہیں ہوتا تھا۔ وہ سکون کے ساتھ اپنے پائپ کے کش لیتا رہتا اور مینن کو ''پاگل ہے'' کہتے ہوئے نظرانداز کر دیتا تھا۔

جو لوگ خاموشی سے مینن کی لعن طعن جھیل لیا کرتے تھے انہیں خوب نوازا جاتا تھا۔ اس میں سب سے ڈرامائی مثال بریگیڈیئر ہرنارائن سنگھ اور اس کی بیوی رانی کی ہے۔ مینن نے بریگیڈیئر کو فوری طور پر ناپسند کیا تھا۔ مؤخرالذکر نے خود کو موورون (Moron) کا سردار بیان کیا تھا' جو کہ پنجاب میں پھلور کے نزدیک ایک چھوٹی سی زمینداری تھی۔ مینن ہمیشہ اسے موورون

(کم عقلوں) کے سردار کے طور پر مخاطب کیا کرتا تھا۔ بریگیڈیئر نہیں جانتا تھا کہ انگریزی میں اس لفظ کے کیا معانی ہیں اور اپنی غنغناتی ہوئی آواز میں احتجاج کرتا: ''سر! ان دنوں کون ایسے خطابات کی پروا کرتا ہے!'' اس کی بیوی بھی اشرافیہ جیسا برتاؤ پسند کرتی تھی۔ وہ راولپنڈی کے ایک امیر زمیندار سردار سوہن سنگھ کی بیٹی تھی۔ اس کا نام رانی اس کے اشرافی تصورات کی تصدیق کرتا تھا۔ مینن کو پتا چلا کہ وہ کملا جسپال کے ساتھ اس کے معاملے کے حوالے سے سکینڈل پھیلا رہی ہے۔ اس نے اسے دفتر میں بلایا' اسے لعن طعن کی اور کتیا کہا۔ روہانسی رانی نے معافی کی التجا کی۔ اس کے بعد وہ جوڑا کملا جسپال کی بے حد عزت کرنے لگا اور مینن کا منظور نظر بن گیا۔ دو اور سنیئر افسروں کے ساتھ اس نے حقیروں جیسا سلوک کیا مگر انہوں نے بغیر احتجاج کے قبول کر لیا' وہ تھے کیپٹن سری نواسن اور فرسٹ سیکرٹری ڈی۔ این چیٹر جی۔ سری نواسن' ایک بیوی بچوں والے آدمی نے اپنی خوبصورت انگریز سٹینوگرافر کو حاملہ کر دیا۔ مینن نے کیپٹن کا کئی پونڈ وزن کم کروانے کے بعد اسے اپنی ہندوستانی بیوی کو طلاق دینے اور حاملہ انگریز لڑکی سے شادی کرنے اور نوکری پہ برقرار رہنے کی اجازت دے دی۔ چیٹر جی نے اپنی بنگالی بیوی (بھگوان سنہا کی ایک داسی) کو طلاق دے دی اور ایک بیلجیئن لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوا۔ فارن سروس کے قوانین کے مطابق اس کی درخواست پر غور کیے جانے سے پہلے اس کا استعفیٰ دیا جانا مطلوب تھا چیٹر جی نے اپنی درخواست کو اس منظوری کے ساتھ بھیجے جانے سے پہلے کہ اسے قبول کر لیا جائے مینن کے ہاتھوں بہت بے عزتی برداشت کی۔ چیٹر جی ایک سفیر کے طور پر ریٹائر ہوا۔

مینن میرٹ کی پروا نہیں کیا کرتا تھا' غیر مشروط وفاداری کو وہ اہمیت دیتا تھا۔ اس نے وزیراعظم کو انگلینڈ میں رہنے والے سے فارن سروس کے لیے درخواست دہندگان انٹرویو کے واسطے ایک پینل تشکیل دینے پر قائل کیا۔ اس نے اپنے ساتھ ہیرالڈ لاسکی کو چیئرمین اور اس کی تشکیل کے لیے ایک مزید فرد کو حاصل کیا۔ پینل نے پی۔ این۔ ہکسر (میرٹ پر منتخب ہونے والا واحد شخص)' جگن ناتھ کھوسلہ' کملا جسپال اور رکمنی مینن (ایک کلرک اور ملٹری اتاشی کے ڈیپارٹمنٹ میں متعین ایک جونیئر افسر کی بہن) کو منتخب کیا۔ بعد میں اس نے کیکی دارا شاہ اور پرتھی سنگھ کو حاصل کرنے کا انتظام کیا' جس کی انگریز بیوی ماتحت فارن سروس میں ملازم تھی۔ اس نے میرے ساتھ بھی ایسے ہی وعدے کیے کہ وہ مجھے پارلیمنٹ میں منتخب کروا دے گا اور ہو سکتا ہے حکومت میں وزیر بنوا دے۔ مگر مینن کے منظور نظر کے طور پر میرے دن تیزی سے قریب الاختتام تھے۔

مینن کبھی میرے ساتھ غیر مہذب نہیں رہا تھا۔ میں کئی مہینے اس کی خصوصی توجہ سے

لطف اندوز ہوا اور میرے رفقائے کار جو اس سے کچھ کروانا چاہتے مجھے بطور وسیلہ استعمال کرتے تھے۔ میں اس کے ساتھ انگلینڈ کے دور دراز قصبوں میں جاتا جہاں اسے تقریر کرنے کے مدعو کیا گیا ہوتا تھا۔ کملا جسپال مجھے اس کی ذاتی ضروریات سے آگاہ کرتی تھی۔ جو اشیا مجھے لے جانا ہوتی تھیں ان میں لیمونیڈ کی بوتلیں ہوا کرتی تھیں: وہ رات کو سونے سے پہلے اس کا ایک گلاس پیا کرتا تھا۔

اگرچہ اس کی انگریزی بہت زیادہ ملیالی لہجے میں ہوتی تھی تاہم وہ ایک شگفتہ بیان مقرر تھا۔ وہ انگریزوں اور جواب نہیں دے سکنے والے لوگوں کے خلاف تند و تیز طنز سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے انگلینڈ میں تربیت لینے والے فوجی' بحریہ اور فضائیہ کے افسروں سے پہلی ملاقات پر ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''میکالے کے فرزندو!'' وہ دوسرے مقرروں کے اپنے اوپر سبقت پانے سے لطف اندوز نہیں ہوتا تھا ان سے بہتر ہونے کے لیے بچگانہ طریقے اپنا لیتا تھا۔ ایک مرتبہ لیڈز میں ماسٹر کٹلرز کے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے' وہ اپنے طنز کے عروج پر تھا اور سامعین بہت ہنس رہے تھے: انگریز اپنے اوپر ہنس کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مینن کی بدقسمتی سے جس نے تشکر کے ووٹوں کی تجویز دی تھی مینن سے زیادہ بہتر خطیب ثابت ہوا۔ اس کے لطیفوں اور حکایتوں نے زیادہ داد و ستائش حاصل کی تھی۔ میں نے مینن کو ایک بیرے کو پکارتے اور اسے ایک کپ چائے کے لیے کہتے دیکھا۔ جونہی مقرر کلائمیکس پر پہنچا' مینن نے کپکپاتے ہاتھ کے ساتھ کپ بلند کیا۔ جونہی مقرر اپنا ٹیپ کا جملہ ادا کرنے والا تھا مینن نے کپ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور چائے میز پر پھیل گئی۔ ٹیپ کا جملہ ان کہا رہ گیا اور تقریب کا اختتام افراتفری پر ہوا۔

مینن کے ساتھ میری سب سے زیادہ یادگار مہم ڈبلن کا دورہ تھا' جہاں ہم نے ایک سفارت خانہ کھولنا تھا—— آئرلینڈ کا پہلا مکمل سفارتی مشن۔ مینن نے اپنے دفاعی اتاشیوں کو ان کی بیویوں سمیت ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس پارٹی میں شامل تھا اور مجھے اپنی بیوی کو ساتھ لے جانے کا کہا گیا تھا۔ ہماری پارٹی کا استقبال ڈبلن ایئرپورٹ پر گارڈ آف آنر کے ساتھ کیا گیا۔ ہمیں ڈبلن کے سب سے زیادہ پرتکلف ہوٹل میں رکھا گیا۔ اگلی صبح مینن نے اپنے کاغذات آئرش صدر کو پیش کرنا تھے۔ میرے فون کی گھنٹی صبح سویرے بج اٹھی۔ مینن کی بیمار سی آواز سنائی دی کہ میں فوراً اس کے کمرے میں پہنچوں۔ میں نے اسے بستر پر کراہتا ہوا پایا۔

''میں بہت بیمار ہوں'' اس نے کراہ کر کہا ''دن بھر کی مصروفیات ملتوی کر دو۔'' میں گھبرا گیا: ''سر! انہوں نے لازماً بہت سی تیاریاں کی ہوں گی۔ مجھے ہوٹل کے ڈاکٹر کو لانے دیجئے اور دیکھتے ہیں وہ کیا کہتا ہے۔''

''کیا دیکھ نہیں سکتے' میں بیمار ہوں؟'' وہ غرایا میں ہوٹل کے ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے تھکن کے علاوہ مینن میں کسی بیماری کی تشخیص نہیں کی۔ مینن بہت مضطرب تھا۔ ''چیف آف پروٹوکول سے فون پر بات کراؤ۔'' جب میں درست نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا' ہم نے مارچ کرتے ہوئے قدموں کی دھمک اور انہیں اپنی کھڑکی کے نیچے رکتے ہوئے سنا۔ ''یہ کیا ہے؟'' مینن نے پوچھا۔ میں نے باہر دیکھا۔ ''سپاہی کھڑے ہیں میرا خیال ہے وہ آپ کو صدارتی محل تک لے جانے کے لیے آئے ہیں۔'' مینن نے بہتر محسوس کرنا شروع کر دیا وہ شیو اور دانت صاف کرنے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ جب وہ باہر آیا تو ہم نے سڑک سے آتے ہوئے کسی ملٹری بینڈ کی آوازیں سنیں جو ہوٹل کے باہر رک گیا۔ مینن نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اس نے سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنا اور مجھے کہا: ''سردار جی! جائیں اور لباس پہن آئیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

اب مینن زبردست فارم میں تھا۔ ہمیں بینڈ کی رہنمائی اور سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ قافلے کی صورت میں لے جایا گیا۔ متجسس ڈبلن والے سڑکوں کے کنارے کھڑے تھے اور مینن ان کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ کاغذات پیش اور قبول کیے گئے۔ صدر ڈگلس نے مینن کو سہ پہر میں اپنے گھر چائے پینے کے لیے مدعو کیا اور مینن نے میری بیوی اور مجھے ساتھ چلنے کا کہا۔ ہمیں کتابوں سے بھری ہوئی ایک مطالعہ گاہ میں لے جایا گیا جہاں ایک آتش دان میں دلدلی کوئلے کی آگ دہک رہی تھی۔ صدر نے ہندوستان کے بارے میں مہذب انداز میں سوالات دریافت کیے۔ مینن نے ہندوستان کے معدنی اور آبی برقیاتی وسائل' اس کی صنعتوں اور زراعتی امکانات کے بارے میں ایک لمبی تقریر شروع کر دی۔ صدر نے خاموشی سے اسے سنا۔ اپنی طویل خود کلامی کے اختتام پر مینن نے صدر سے پوچھا آئرلینڈ کا حال سنایئے۔ ''کوئی زیادہ قابل ذکر بات نہیں ہے۔'' صدر نے چبا چبا کر کہا ''ہمارے پاس برآمد کرنے کو کچھ نہیں ہے سوائے غیر مرئی اشیا کے مثلاً شاعر' ناول نگار اور ڈرامہ نگار۔''

اس شام ہم نے آئرش صدر' وزیر اعظم اور حزب اختلاف کے لیڈر کے لیے استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ ایمون ڈی والیرا موجود تھا۔ استقبالیے کے بعد ہم یورپی کلاسیکی موسیقی کی محفل (کنسرٹ) میں مہمان تھے۔ جونہی ہمیں ہمارا باکس دکھایا گیا لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ آئرلینڈ کا پہلا غیر ملکی سفیر پہنچ چکا ہے۔ سامعین اسے تعظیم دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ روشنی کا ایک دھارا مینن کو ڈھونڈنے کے لیے پرہجوم ہال میں لہرا رہا تھا— اس کی بجائے وہ مجھ پر مرتکز ہو گیا— مع میری پگڑی اور ڈاڑھی کے' میں اپنی پارٹی کے کسی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ ہندوستانی لگتا تھا۔ میں نے قطار کے پیچھے ہو کر روشنی سے بچنے کی کوشش مگر روشنی میرے تعاقب

میں رہی۔ مینن میری پریشانی سے لطف اندوز ہوا اور اس نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ سامعین کی داد و ستائش کو قبول کرنے کا کوئی بھی اہل نہیں تھا۔

انڈیا ہاؤس میرے اعصاب پر سوار رہتا تھا تاہم میں کچھ وقفے حاصل کر لیتا تھا۔ میرے تقرر کے دوران دو مرتبہ میرے والدین ہمارے ساتھ گرمیاں گزارنے کے لیے آئے۔ میں انہیں اپنے خاندان (فیملی) کے ساتھ آئل آف وائٹ (Isle of Wight) لے گیا۔ ہم نے سارا ہوٹل قریباً اپنے ہی لیے پایا کیونکہ کسی وبا کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم جو چاہتے بینڈ وہی موسیقی بجاتا' میرا بیٹا راہول اور بیٹی مالا سٹیج پر چلے گئے اور بینڈ کے ساتھ گاتے رہے۔ میری ماں کے سب سے مسرور لمحے تفریحی آرکیڈ میں گزرے جہاں اس نے ''لافنگ سیلر'' کے سوراخ میں چھ پینی کے کئی سکے ڈالے۔ جب وہ زبردست قہقہے لگاتا تو وہ ہنس ہنس کر دہری ہو جاتی اور آنسو اس کے چہرے پر بہنے لگتے۔ لندن واپس آ کر میڈم تساد ز تو لازمی تھا نا۔ میں نے ان کے لیے بکنگھم پیلس میں چائے کی دعوت کا بندوبست کر لیا تھا۔ میرے باپ کے لیے ہمیشہ انگلینڈ کے دورے کا یہ سب سے زیادہ اچھا پہلو ہوتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ وائسرایوں' گورنروں اور کمشنروں سے ملتا' جنہیں وہ جانتا تھا۔ میرے باپ نے انگریزی تھیٹر کی بہت تعریف سن رکھی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں انہیں وہاں لے جاؤں۔ تب تک وہ اونچا سننے لگا تھا اور میری ماں انگریزی نہیں جانتی تھی۔ میں انہیں ونڈمل تھیٹر میں لے گیا جو عریاں لڑکیوں کے رقص اور فحش لطیفوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

میری ماں نے تماشوں کے دوران میں کھانے کے لیے انگوروں کا بیگ بھر لیا تھا۔ وہ اپنے کاغذ کے بیگ کو کڑکڑاتی رہی اور ہمارے اردگرد بیٹھے لوگوں کو مشتعل کرتی رہی۔ اور کہانی کہنے والے کی کہانی کو کلائمیکس پر لے جانے کی کوشش سے غافل' اس نے انگوروں کے بیج ایک لمبی ''تھو'' کے ساتھ بیگ میں تھوک دیئے۔ آدھا شو دیکھنے کے بعد میں نے انہیں گھر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ''تم ہر ہفتے ان ''بے شرم'' ننگی لڑکیوں کو دیکھنے جاتے ہو؟'' اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان الفاظ سے نوازا۔

اگلے دورے میں میں انہیں بورن ماؤتھ میں برینکسم ٹاور ہوٹل میں لے گیا۔ یہ میرے باپ کے ذوق کے لیے بہت زیادہ تھا' جو اونچے طبقے کے ہوٹلوں کو پسند کرتا تھا جہاں لوگ ڈنر کے لیے ملبوس ہوتے اور کھانوں کے ہمراہ فرانسیسی شرابیں منگواتے تھے۔

☆☆☆

مینن سے میرے تعلقات بگاڑنے والی کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ جن عورتوں کے قریب تھا' ہمارے ان میں سے برجیٹ کے ساتھ زیادہ دوستانہ مراسم ہو گئے' جو

مینن کی کملا جسپال کے لیے تشنگی کے سیر نہ ہونے پر مغموم تھی۔ وہ کملا کو سازشی ورغلانے والی اور مینن کو بدنام کر دینے والی تصور کرتی تھی۔ میں مینن کو یہ بات بتانے کی غلطی کر بیٹھا۔ اس نے مجھے پھٹکار دیا اور کہا کہ اپنے کام سے کام رکھوں۔ پھر کشمیر کے بارے میں ''مانچسٹر گارڈین'' میں کچھ تبصرے شائع ہوئے۔ ہکسر نے جواب تیار کیے' وہ پریس اٹاشی کے حیثیت میں دستخط کے لیے مجھے بھیجے گئے۔ میں ویسا ہی جواب تیار کر سکتا تھا— اور ممکن ہے اس سے بہتر الفاظ میں— تاہم مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا گیا۔ اخبارات میں مراسلت جاری رہی۔ مجموعی طور پر میں نے ایسے تین خطوں پر دستخط کیے' جو میں نے نہیں لکھے تھے۔ مجھے تحقیر محسوس ہوئی اور دفتر میں سب کو معلوم ہو جانے پر دکھ سا ہوا۔ پھر براہ راست مجھ سے بات کرنے کی بجائے مینن کملا جسپال کے ذریعے احکامات جاری کرنے لگا۔ میں نے اسے پیغامات لانے سے روک دیا کہ میں تو ہائی کمشنر کو ہر وقت فون پر دستیاب ہوں۔ مینن نے مجھ پر کملا سے بدتہذیبی برتنے کا الزام لگایا۔ اس وقت اس کی تشنگی اپنے عروج پر تھی۔

اپنی بیوی کے ساتھ بھی میرے تعلقات خراب تر ہو چکے تھے۔ قریباً ہر شام ہمارا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ مجھ سے ناخوش تھی تو میں بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ فرار کا واحد راستہ یہ تھا کہ خاندان کو ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔

اسی زمانے میں میرے افسانوں کا مجموعہ ''وشنو کا نشان اور دوسرے افسانے'' جو کہ زیادہ تر وکیل کے طور پر میرے لاہور کے دنوں پر استوار تھے' سٹیزن پریس کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کی فروخت تو بہت اچھی نہیں رہی تاہم ادبی جرائد میں اس پر عمدہ تبصرے کیے گئے۔ اگرچہ دو سو جلدوں کا بوجھ مجھ پر آ پڑا تھا تاہم میں نے محسوس کیا کہ مہم کامیاب ہو گئی ہے کیونکہ چند افسانوں کو ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں اس کے آئرش مدیر سین مینڈی نے منتخب کر کے شائع (ری پروڈیوس) کیا۔ میرے اندر دوسری کتابیں تخلیق کا جامہ پہننے کو مچل رہی تھیں— سکھ صحائف کے کچھ تراجم' سکھوں کی ایک مختصر تاریخ اور ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے ایک ناول۔ میں نے اتنی رقم الگ رکھ چھوڑی تھی جو انگلینڈ میں چھ ماہ رہنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر ادب کو کریئر کے طور پر اپنانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں— انگلینڈ میں اکیلا رہ کر۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میں نے اپنے خاندان کو پی اینڈ او کے ایک جہاز میں بمبئی روانہ کر دیا۔ گووندا ڈیسائی نے ہیمپسٹیڈ ہیتھ کے نزدیک ہائی گیٹ میں تہ خانے میں ایک فلیٹ دلوا دیا۔ میں نے اپنا ذاتی سامان اور کتابیں اس اپارٹمنٹ میں منتقل کر دیں۔ مجھے استعفےٰ کے لیے حکومت کو تین ماہ کا

نوٹس دینا تھا' میری تین ماہ کی چھٹی واجب تھی لہٰذا اگلی صبح میں نے چھٹی کی درخواست دی اور یہ انتظار کیے بغیر کہ وہ منظور ہوئی ہے یا نہیں' دفتر سے نکل آیا۔ میں ایک لمبے ویک اینڈ کے لیے برینکسم ٹاورز ہوٹل چلا گیا جہاں میں ایک چھٹی کے لیے اپنے ماں باپ اور اپنے خاندان کو لے گیا تھا۔ یہ ایک بے حد تکلیف دہ قیام تھا ـــ میں اپنے بچوں کو یاد کرتے ہوئے لابی اور باغ میں ٹہلتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی ہے' یہ جانے بغیر کہ میرے پاؤں کہاں ٹکیں گے۔ میں نے بہت اچھی ملازمت چھوڑ دی تھی جس نے آخر میں مجھے کسی نہ کسی ملک میں سفیر بنوا دینا تھا۔ میرے پاس یہ سوچنے کے لیے کوئی بنیاد نہیں تھی کہ میں ادب کے ذریعے روزی کما سکتا ہوں۔ جب میرا پیسہ ختم ہو جائے گا تو میں دوبارہ اپنے باپ کی خیرات پر گزارا کروں گا۔ میں خود کو یہ بھی یاد دلاتا رہتا تھا کہ میرے پاس جینے کے لیے صرف ایک زندگی ہے' میں دفتر میں وہی کر رہا تھا جو مجھ سے پہلے والے لوگ کر گئے تھے۔ انہیں بھی سال میں ایک مرتبہ بکنگھم پیلس میں مدعو کیا جاتا تھا' ''یوَر ایکسیلنسی'' کہا جاتا تھا' ڈیوٹی فری شراب پیتے تھے اور گمنامی میں ریٹائر ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے میں ادیب کی حیثیت میں ناکام ہو جاؤں لیکن جوا کھیلنے کے لائق تو تھا۔ اب پیچھے دیکھنے میں دیر ہو چکی تھی۔

میں اپنے ہائی گیٹ والے فلیٹ میں رہنے لگا اور کام شروع کر دیا۔ مجھے ادراک ہوا کہ ادب کی انتہائی مقابلے والی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے چند موضوعات کو خصوصیت سے اپنانا ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرے لیے سب سے بہتر سکھ مذہب اور تاریخ رہے گی۔ کسی سکھ نے اس موضوع پر انگلینڈ یا امریکہ میں کوئی چیز شائع نہیں کی تھی' سارے نام نہاد سکھ سپیشلسٹس انگریز تھے۔ میں ایک سکھ گھرانے میں پروان چڑھا تھا اور بہت سی سکھ دعاؤں کو ان کے معانی سے آشنا ہوئے بغیر یاد کر رکھا تھا۔ ''سنت بھاشا'' جس میں بیشتر گرنتھ لکھی گئی ہے' کا میرا ذخیرۂ الفاظ ناکافی تھا۔ میں نے ایک پنجابی انگریزی ڈکشنری حاصل کی' پہلے والے ترجمے ٹرمپ اور میکالف نے کیے تھے اور گرونانک کی صبح کی دعا ''جاپ جی'' کو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے ترجمہ مکمل کرنے کے بعد اپنے دوست گے ونٹ کو دکھایا' جو ''آبزرور'' اور ''مانچسٹر گارڈین'' دونوں کے لیے آزادانہ طور پر کام کرتا تھا اور سینٹ انتھونی کالج آکسفورڈ میں پڑھاتا تھا۔ اس کو بہتر بنانے کے لیے اس نے نہ صرف کچھ تجاویز دیں بلکہ پروبستھیئن کو اسے شائع کرنے کے قائل بھی کیا۔

میں نے سکھوں کی ایک مختصر تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا' ساری کی ساری شائع شدہ کاموں پر مبنی مگر جدید۔ میں نے اپنی پیش گوئی کا اضافہ کیا کہ اگر یہ رجحان جاری رہا جس میں نوجوان سکھ خالصہ عقیدے کے امتیازات (ڈاڑھی اور بالوں کو نہ کٹوانا) کو ترک کرنا شروع ہو

گئے ہیں' تو اگلی صدی کے آنے تک سکھ بھی' جینوں اور بدھوں کی طرح ہندومت کے مرکزی دھارے میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کو میسرز ایلن اینڈ انون نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ کوئی گہری کتاب نہیں تھی اور اس میں کچھ تاریخی اور طباعتی غلطیاں تھیں۔ تاہم کئی عشروں بعد اس موضوع پر پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے برطانوی پریس میں اس کا وسیع خیر مقدم ہوا۔ اس نے ہندوستان کے روایتی سکھ حلقوں میں بالکل ایک طوفان بھی برپا کر دیا۔ کون ہوتا تھا میں یہ کہنے والا کہ سکھ معدوم ہو جائیں گے جبکہ آخری سکھ گرو نے پیش گوئی کی تھی کہ جلد ہی زیادہ تر دنیا سکھ مت کو قبول کر لے گی؟

اب میں ادیب کے طور پر اپنے بارے میں کچھ مزید پر اعتماد محسوس کرنے لگا۔ میں نے نئے دوست بنائے جو میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کے درمیان ایک امریکی سٹیلا الیگزینڈر تھی' جو ایک برطانوی سفارت کار کی مطلقہ تھی' وہ متعلقہ لوگوں کی دوست تھی اور اس نے اپنے جاننے والے لوگوں سے مجھے متعارف کروایا۔ ان لوگوں میں ایڈمنڈ لیچ (بعد ازاں کیمبرج کنگز کالج کا ریکٹر اور سر کا خطاب یافتہ) اور اس کی بیوی سیلیا' ایک مصور اور ناول نویس شامل تھے۔ انہوں نے مجھے ہرٹفورڈ شائر میں اپنے کاٹیج میں رہنے کی دعوت دی۔ میں نے ویک اینڈ ان ساتھ گزارنا شروع کر دیئے اور ان کے دو بچوں لوئیسا اور الیگزینڈر کی سب سے بڑی پسند بن گیا۔ میں ان کے گھر میں ایلزبتھ بوٹ سے بھی ملا' وہ نوجوان کینیڈین لڑکی لندن سکول آف اکنامکس میں سوشیالوجی (عمرانیات) پڑھ رہی تھی۔ گو کہ وہ دانش ور خاتون ہونے کے ناطے موٹی سی عینک پہنے رہتی تھی اور اس کے بال الجھے ہوئے رہتے تھے' تاہم میں اس میں کافی دلچسپی لینے لگا۔ وہ بہت ذہین تھی اور اس نے میری کہانیاں اور سکھ تاریخ پر میرا مسودہ پڑھا۔ میں اس کے عمدہ کھانوں' شرابوں اور کلاسیکل یورپی موسیقی کا شیدا ہو گیا۔ اس نے مجھے نفسیات دانی سے روشناس کرایا۔ میں فرائڈ اور ژونگ کو پڑھ چکا تھا اور اس نے مجھے میلانی کلائین کی کتابیں دیں۔ انہوں نے میرے لیے نئے آفاق کشادہ کر دیئے۔ لیچ میاں بیوی اور ایلزبتھ بوٹ نے مجھے ناامیدی اور غیر یقینیت کے مہینوں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

انڈیا ہاوس سے الوداع ہونے کا وقت آ گیا۔ جمال قدوائی میری جگہ لے چکا تھا۔ جب میں اسے خدا حافظ کہنے گیا تو اس نے بتایا کہ مینن مجھے الوداعی دعوت دینے کا خواہش مند ہے۔ میں نے اسے سیدھا سیدھا کہہ دیا کہ میں کسی دعوت کا خواہش مند نہیں اور مینن سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس نے مجھے قائل کیا کہ دعوت وہ دے گا اور مینن صرف چند لمحوں کے لیے ہی آئے گا۔ میں جانتا تھا مینن ایسا کچھ نہیں کرے گا تاہم میں قدوائی کی پارٹی میں آنے کو آمادہ ہو گیا۔ رکتے رکتے میں مینن سے ملنے چلا گیا۔ وہ مودب تھا اور اس نے کہا کہ غلط فہمی کے باوجود وہ

مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے۔ ''تمہارا کوئی دوست نہیں'' ــــ جب میں رخصت ہوا تب میں نے صاف صاف کہہ ڈالا ــــ جیسا کہ مجھے توقع تھی مینن الوداعی تقریب میں نہیں آیا۔ قدوائی نے اس کی طرف سے معذرت کی اور بتایا کہ وہ ٹھیک نہیں اور بستر تک ہی محدود تھا۔ تاہم میں نے اسے میزبِ سے سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتے اور اپنی رولز رائس میں بیٹھتے ہوئے دیکھا: جھوٹ بولنا مینن کی فطرت تھا اور غیر مہذبانہ پن اختیار کرنے کی طرح وہ جھوٹ بھی آسانی سے بولتا تھا۔

مینن کو پنڈت نہرو کی سرپرستی کیوں حاصل تھی' یہ بات راز ہے اور امکان ہے کہ راز ہی رہے گی۔ پنڈت جی نے اسے پارلیمنٹ کے لیے منتخب کروایا اور اقوام متحدہ کے لیے ہندوستانی وفد میں اسے بھیجا۔ کشمیر پر اس کی میراتھن تیرہ گھنٹے طویل تقریر نے متفقہ طور پر ہندوستان کے خلاف ووٹ حاصل کروائے۔ پھر اسے کابینہ کے قریباً سارے ہی ارکان کی خواہشات کے برخلاف وزیر دفاع بنا دیا گیا۔ اس نے سنیئر افسروں کے مقابلے میں اپنے منظور نظر افسروں کو ترقی دے کر فوجی نظم وضبط کو تباہ کیا۔ وہ ان لوگوں کا شدید مخالف ہو جاتا تھا جو اس کے خلاف کھڑے ہوتے تھے۔ 1962ء میں چین کے ہاتھوں ہماری فوج کی ذلت آمیز شکست کا ذمہ دار سب سے زیادہ وہی تھا۔ پنڈت نہرو اس کے ساتھ آخر تک چپکے رہے۔

آخری مرتبہ مینن سے میری بات ٹیلی فون پر ہوئی تھی۔ میں لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں کام کر رہا تھا۔ میں شیلا لال کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ ہمارا ٹیلی فون مشترک تھا۔ وہ ہر رات اپنے بہت سے محبوبوں میں سے کسی ایک کے ساتھ باہر ہوا کرتی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی لیکن جب میں نے اسے اٹھایا اور بولا ''ہیلو'' تو وہ بند ہو گیا۔ میں نے شیلا سے شکایت کی۔ ''وہ ضرور کرشنا ہو گیا۔'' اس نے مجھے بتایا۔ ''وہ مجھے اپنی معشوقہ بنائے رکھنا چاہتا ہے ــــ بغیر رسی کے بندھی ہوئی۔'' اگلی مرتبہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو روایتی ''ہیلو'' کہنے کی بجائے میں نے زہر اگلا ''تم خونی حرامی' میں جانتا ہوں تم کون ہو۔ اس وقت فون کرنا بند کر دو ورنہ اس سے بھی گندی باتیں سنو گے۔'' اس کے بعد کوئی کال نہیں آئی تھی۔

مینن دو سوانح عمریوں کا موضوع بنا اور ایک سڑک اس کے نام پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے اس کے سوانح نگاروں یا ان بائیں بازو والوں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں جو اسے ہندوستان کا فرزند قرار دیتے ہیں۔ جنرل شورما نے اس کے بارے میں جامع تبصرہ کیا تھا: ''مینن ایک کنوارہ تھا' ویسا ہی اس کا باپ تھا۔''

❁ ❁ ❁

ساتواں باب

ماضی کی تطہیر اور ہندوستان واپسی

تناؤ اور کثرتِ شراب نوشی نے میرے بدن سے خراج وصول کیا۔ دفتر اور گھر میں تناؤ ہوا کرتا تھا۔ جیسے کوئی شخص سردرد میں سکون کے لیے اسپرین کھاتا ہے میں شراب کے ذریعے سکون ڈھونڈتا تھا: کھانے سے پہلے شیری، لنچ کے ساتھ وائن، کافی کے ساتھ شراب۔ ہر دوسری شام کاک ٹیل پارٹی ہوا کرتی تھی۔ ہر ڈنر سے پہلے سکاچ ہوتی، دوران میں وائنز ہوتیں اور اختتام پر کوگینک یا ڈریمبی ہوتی۔ میں بری طرح سوتا اور تین سے پانچ بجے کے درمیان جاگ اٹھتا، خمار کو ختم کرنے اور اپنی خستگی پر قابو پانے کے لیے شراب پیا کرتا تھا۔ جس وقت میں نے انڈیا ہاؤس چھوڑا اور اپنے خاندان کو گھر بھیج دیا تو میں پیٹ درد سے نڈھال تھا۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ اس نے فیصلہ سنانے سے پہلے مکمل معائنہ کیا: ''کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ روزانہ کام کرنے اور شراب پینے کے معمول میں وقفہ ڈالو اور دیہاتی علاقوں میں چلے جاؤ۔ تمہیں دوا کی نہیں نیچروپیتھی (Naturopathy) کی ضرورت ہے۔'' اس نے مجھے چیمپینز (ہرٹسفورڈ شائر) کے ایک فطری علاج کے کلینک کا نام تجویز کیا جسے ڈاکٹر لیف نامی آسٹرین چلاتا تھا۔

میں نے ڈاکٹر لیف کو خط لکھا کہ کیا میں اس کے ادارے میں چند روز گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیٹلاگ موصول ہوا جس میں معائنے، علاج، رہائش کے مصارف لکھے ہوئے تھے۔ یہ مہنگا دکھائی دیتا تھا تاہم میں نے تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چیمپینز چلا گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہر شے سرسبز اور دھوپ میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔ چیمپینز ایک پرانا محل تھا جو اس وقت سرسبز و شاداب شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں والے وسیع لانوں سے گھرا ہوا تھا۔ لازماً جو اصطبل اور ملازموں کے کوارٹر رہے ہوں گے انہیں مریضوں کے لیے چھوٹے کمروں کی قطاروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

مجھے ایک چھوٹا کمرہ دکھایا گیا جس میں ایک بستر، ایک میز اور ایک کرسی کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ وہاں بارہ رہائشیوں کے لیے ایک ہی پاخانہ تھا۔ غسل خانہ کوئی نہیں تھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں ایک دن لگا کہ دونوں کیوں غیر ضروری تھے۔

ڈاکٹر لیف مجھے اپنے دفتر میں ملا۔ جو میں نے کہنا تھا وہ سننے کے بعد اس نے مجھے تفصیل سے بتانے کو کہا کہ میں ہر روز کیا کھاتا پیتا ہوں۔ وہ میرے ناشتے' دوپہر کے کھانے سے پہلے کے کھانے' دوپہر کے کھانے' سہ پہر کی چائے' کاک ٹیل سنیکس اور رات کے کھانے کی تمام اشیاء کو لکھتا چلا گیا۔ اس نے مجھے اگلے روز ملاقات کا کہا۔ رات کے کھانے کے وقت میں کیفے ٹیریا میں دوسروں رہائشیوں میں جا ملا۔ وہ مختلف لوگوں کا اکٹھ تھا۔ فلمی ستارے' کورس کی لڑکیاں' کاروباری' دکان دار' سول ملازمین اور وکلاء۔ ان میں لیڈز کا ایک درزی بھی تھا جو سب کے سامنے اپنے ٹراؤزر کو اتارتا رہتا اور دکھاتا کہ کس طرح اس کی توند غائب ہوگئی اور اس نے کتنا وزن کم کرلیا ہے۔ میں حیران نہیں ہوا کیونکہ وہاں کھانے کے لیے سلاد اور دہی کے علاوہ کوئی شے نہیں تھی۔ میری میز پر موجود مرد اور عورتوں نے ایک ایک سنگترہ پیٹوؤں کی طرح کھایا اور گرم پانی کے گلاس پیے۔ وہ علاج اور اپنے اوپر عائد کیے گئے سخت ڈسپلن سے خوش دکھائی دیتے تھے۔ علاج ختم ہونے تک کسی کو چیمپیئز چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ مقامی لوگ جو انہیں لانوں پر آدھا ننگا چہل قدمی کرتے یا دھوپ تاپتے ہوئے دیکھتے تھے انہیں مشکوک سمجھتے یا وہ اپنی انگشت شہادت کو اپنے سروں کے ایک پہلو میں رکھتے۔ جو ذہنی اختلال کی نشاندہی کرتی تھی۔ وہ ہمیں چیمپیئز کے لنگور یا لیف کے سودائی کہتے تھے۔

اگلے روز جب میں ڈاکٹر لیف کے کلینک میں حاضر ہوا تو اس نے اپنی میز پر ایک شیشے کا برتن رکھا ہوا تھا جو کسی ایسی چیز سے بھرا ہوا تھا جو کسی کی قے دکھائی دیتی تھی۔ "یہ ہے مسٹر سنگھ وہ جو تم ہر روز اپنے پیٹ میں ڈالتے ہو — انڈے' ٹوسٹ' کافی' کیک' بسکٹس' سٹیک' سبزیاں' سکاچ' وائن اور دیگر شرابیں۔ میں نے انہیں پچھلی شام اس برتن میں ڈالا تھا جب تم نے مجھے اپنی روزانہ خوراک کا بتایا تھا۔ اب ذرا اس پر نظر ڈالو۔" میں نے دیکھا کہ ملغوبے میں سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ "ذرا اسے سونگھو" اس نے حکم دیا۔ میں برتن پر جھکا اور بری طرح پیچھے ہٹا۔ "ٹھیک!" وہ بولتا رہا۔ "تمہیں کیا توقع ہے اگر تم ہر روز اتنا کچرا اپنے پیٹ میں ٹھونستے رہو گے؟ ہم سب سے پہلے جو کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اندر سے تمہیں صاف کرتے ہیں۔ پھر میں تمہاری خوراک اور مالش تجویز کروں گا۔" اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھا اور مجھے ایک سفید میڈیکل کوٹ پہنے ہوئے آدمی کے حوالے کر دیا۔

مجھے ٹریٹمنٹ روم میں لے جایا گیا۔ "مجھے تمہاری آنتوں میں آب پاشی کرنی ہے۔" — اس آدمی نے ہاتھ میں کوئی بڑے عضوِ تناسل جیسی شے' جس کے ساتھ ایک تار لگی ہوئی تھی' پکڑے ہوئے کہا۔ اس نے اسے ویزلین سے لتھیڑ دیا۔ اس نے مجھے کپڑے اتار کر

پیٹ کے بل ایک میز پر، جس پر ربر شیٹ بچھی ہوئی تھی، لیٹنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے عضوِ تناسل میرے مقعد میں داخل کر دیا۔ درد بہت شدید تھا، مجھے حیرت تھی کہ مفعول ہم جنس پرستوں کو لواطت سے کیا ملتا ہے۔ اس نے وہ شے پوری میری بڑی آنت کے آخری حصے (ریکٹم) تک پہنچا دی اور میری آنتوں میں گرم پانی کا سیلاب سا چھوڑ دیا۔ ایک چوسنے والے پمپ نے مواد کھینچ لیا۔ مزید گرم پانی اندر ڈالا اور چوس لیا گیا۔ یہ آب پاشی پون گھنٹہ بھر جاری رہی یہاں تک کہ میری اندر کوئی شے باقی نہیں رہی۔

میں گرم پانی سے نہایا۔ مجھے بڑی بڑی بالٹیوں میں حل کیے گئے نمک سے اپنے آپ کو ملنے کا حکم دیا گیا۔ وہ کیچڑ کی طرح گاڑھا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اپنے آپ کو ریت مل رہا ہوں۔ نمک کی مالش کے بعد تیل کی مالش کی گئی اور پھر تیل کو اتارنے کے لیے گرم پانی سے غسل۔ مجھے میرے لیے تجویز کردہ لنچ کیفے ٹیریا سے کھانے اور سہ پہر دھوپ میں گزارنے کا کہا گیا۔ لنچ صرف ایک مالٹے پر مشتمل تھا، پینے کو گرم پانی کا ایک گلاس تھا جس میں شہد ملی ہوئی تھی۔ میں خود کو صاف اور فاقہ زدہ محسوس کرتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ آنتوں کی آب پاشی کے بعد مجھے سمجھ آئی کہ کسی کو کھیل کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ میں نے پڑھنا چاہا مگر بھوک نے ارتکاز کو مشکل بنا دیا۔ میں باہر باغ میں چلا گیا۔ یہ تابوتوں سے بھرا پڑا تھا جس میں مرد اور عورتیں الف ننگے لیٹے ہوئے تھے اور اوپر کوئی ڈھکنا نہیں تھا۔ وہ دھوپ تاپ رہے تھے۔ میں کچھا پہنے ہوئے ایک تابوت میں لیٹ گیا۔ میں خود کو ننگی عورتوں کے سامنے شرمندہ نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے چار دن مشکل تھے۔

لنچ پر صرف ایک سنگترہ، ڈنر پر ایک اور گیلنوں کے حساب سے نیم گرم پانی۔ مجھے اپنے کان سنسناتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھے یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ ایسا نارمل ہی تھا۔ کھانے کی طلب، اور سنسناہٹ جلد غائب ہو جائیں گی۔ میں کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا تھا۔ کھانے کے کمرے میں گفتگو کا موضوع فقط اچھے ریستوراں، گائے کے گوشت کے قتلے، چاکلیٹ میں ڈبوئی ہوئیں آئس کریمیں ہوتی تھیں۔ ادھر عورتوں پر کوئی بات نہیں کی جاتی تھی۔ ادھر بہت سے لڑکیاں نظر آتی تھیں مگر ہر شخص کو جس چیز کی تمنا تھی وہ جنس نہیں، کھانا تھا۔ پانچویں دن میں نے ان لوگوں کے ساتھ ٹینس کھیلی جو پندرہ دنوں کے لیے دو سنگترے روزانہ کی خوراک پر تھے۔ لیڈز سے آیا ہوا درزی تو بالکل دوست بن گیا تھا۔ وہ وہاں تین ہفتوں سے موجود تھا۔ اس نے وہاں آنے سے پہلے کی اپنی تصویر دکھائی، وہ ایک بڑی توند والے موٹے آدمی کی تصویر تھی۔ ''اب دیکھو!'' وہ ہزارویں مرتبہ اپنے ٹراؤزر کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے بولا: ''کچھ بھی نہیں بچا!'' وہ خوشی سے دمکتے ہوئے بولا۔ اس نے چیمپینز میں بنائی گئی اپنی

دوست سے ملوایا۔ وہ بھی وہاں تین ہفتوں ہی سے موجود تھی۔ اس کے سنہرے بال مزید سنہرے دکھائی دیتے تھے' اس کی کمر اور کولہے گویا ریت گھڑی کی طرح ڈھلے ہوئے تھے۔ ''یہ بات حیران کن ہے کہ حقیقی بھوک تمہارے ساتھ کیا کر سکتی ہے۔ انہیں نظام میں سے زہروں کو نکالنے دو اور نتائج دیکھو!'' اس نے ایک شادماں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ انہوں نے مجھے جوڑوں کے درد میں مبتلا لوگوں کے بارے میں بتایا جن کے ٹانگیں بازو کھل گئے تھے' کان' ناک اور گلے کے مسائل کا شکار لوگوں کے بارے میں بتایا جواب بہتر سن سکتے تھے' بہتر دیکھ سکتے تھے اور ان کے ناک صاف ہو گئے تھے۔

پابندی درزی اور اس کی دوست کے وہاں سے رخصت ہونے سے ایک دن پہلے ٹوٹی۔ انہوں نے اس موقع پر ایک پینے پلانے کی محفل برپا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہنس مکھ ہونے کی وجہ سے درزی سٹاف کا بڑا منظورِ نظر بن چکا تھا۔ کلینک کے قوانین کے خلاف انہوں نے اسے اور اس کی دوست کو کلینک کے احاطے سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ جوڑا مے خانہ گردی کرتا رہا۔ خالی معدوں کی وجہ سے شراب نے تو ان پر زبردست اثر جمایا۔ جب دکانیں بند ہونے کا وقت ہوا تو اس نے ایک بغیر لائسنس والے سٹور سے سکاچ کی ایک بوتل خرید لی اور چیمپینز واپس آ گیا۔ دونوں نشے میں چور تھے۔ انہوں نے رات اکٹھے گزاری۔ اگلی صبح بھی انہیں چڑھی ہوئی تھی' وہ بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے ہوئے دنیا کو ننگی سنا رہے تھے۔ سٹاف نے ان کے نظام میں سے شراب کو پمپ کے ذریعے نکالنے کی اپنی سی بہترین کوششیں کیں۔ نہ تو آنتوں کی آبپاشی' نہ ہی نمک کی مالش' نہ تو ٹھنڈے پانی کے غسل' نہ ہی گرم سیاہ کافی (بلیک کافی) نے کوئی اثر ڈالا۔ جب ڈاکٹر لیف کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت غصے ہوا۔ اس نے درزی اور اس کی دوست کو فوراً وہاں سے نکال دیئے جانے اور انہیں باہر جانے کی اجازت دینے والے سٹاف کو جرمانے کا حکم سنایا۔ جوڑے کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ''یہ تو بے حد زبردست تھا۔'' درزی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت خوش مزاجی کے ساتھ کہا۔ ''جو کچھ ہم نے پچھلی رات اپنے ساتھ کیا تھا وہ تین ہفتوں کے علاج معالجے میں سب سے زیادہ بہتر تھا۔ کیا ایسا نہیں تھا پیاری؟'' وہ اپنی دوست کی طرف رُخ کرتے ہوئے بولا: ''بالکل ایسا ہی تھا۔'' اس نے خمار آلودہ لہجے میں جواب دیا: ''میں زندگی بھر کبھی اتنا لطف اندوز نہیں ہوا۔'' مجھے بعد میں پتہ چلا کہ درزی کی دوست تو لندن کی ایک طوائف تھی۔

دو سنگتروں اور شہد ملے ہوئے گرم پانی کے گیلنوں پر تین ہفتے گزارا کرنے کے بعد مجھے اپنا آپ صاف اور ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ مجھے اپنا روزہ دہی کے ایک بڑے کٹورے سے کھولنا پڑا۔ مجھے اس کے چند ایک چمچ بغیر سانس لیے کھانے میں تھوڑا وقت لگا۔ ڈاکٹر لیف نے

ہدایت کردی تھی کہ مجھے اپنی خوراک میں کن کن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے۔ تلے ہوئے کھانے بند اور شراب بہت ہی کم۔ میں چیمپینز سے اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا ہوا رخصت ہوا سوائے اس کے کہ لگتا تھا کہ اس مشقت نے میری بینائی کو نقصان پہنچایا ہے۔ لندن پہنچتے ہی میں نے جو پہلا کام کیا وہ تھا آنکھوں کے ماہر کے پاس جانا۔ اس نے میری آنکھوں اور جو چشمہ میں لگاتا تھا اس کا معائنہ کیا۔ ''تمہیں اپنا چشمہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے مجھے کہا۔ ''کسی معجزے کی وجہ سے تمہاری بینائی بہتر ہوگئی ہے۔'' میں تو خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ اپنے آپ کو چمپینزی یا سودائی کہا جانا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔

☆☆☆

لندن پہنچنے کے بعد میں سنجیدہ کاموں میں منہمک ہوگیا۔ میں نے ''سکھوں کی مختصر تاریخ'' مکمل کی اور پھر ایک ناول پر کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے ذہن میں جو موضوع تھا وہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ساتھ واقع ہونے والا دہشت انگیز قتل عام تھا۔ میں پر یقین نہیں تھا کہ مجھے کس طرح اس کو لکھنا چاہیے۔ میں نے کئی پلاٹوں اور بہت سے کرداروں کے بارے میں غور کیا۔ مجھے اس تصور (آئیڈیا) کا خبط ہوگیا تھا کہ ہر انسان کے اندر ہندو دیوتاؤں کی تثلیث موجود ہوتی ہے: برہما (تخلیق کرنے والا)' وشنو (تحفظ دینے والا) اور شِو (تباہ کرنے والا)۔ لیکن ہر شخص میں کوئی ایک یا دوسرا پہلو غالب ہوتا ہے۔ غالباً برہما پہلو کی تصویرکشی ایک کسان کے ذریعے ہوسکتی ہے' وشنو کی کسی قانون قائم کرنے والے مثلاً ایک مجسٹریٹ کے ذریعے اور شِو کی ایک کمیونسٹ کے ذریعے جو شر کو تباہ و برباد کر کے ایک بہتر دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہو۔ میں نے اپنی نوٹ بک ساتھ لی اور اطالوی جھیلوں کے سکون میں خاکے پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں پہلے بیلجیو گیا مگر اسے سیاحوں کے شور سے بہت زیادہ بھرا ہوا پایا۔ اتفاق سے میں نے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر پہاڑوں میں ایک کافی چھوٹی جھیل دریافت کرلی جو لاگو ایلیو کہلاتی تھی۔ یہاں دو کمروں والا صرف ایک پنشن موجود تھا۔ میں ایلیو منتقل ہوگیا اور ایک مہینے کے لیے ایک کشتی کرائے پر لے لی' اِدھر اُدھر سیر کے مواقع کم تھے اس لیے میں نے کشتی چلانے اور تیراکی کی مشق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں دن کا بیشتر وقت ناول پر کام کرنے میں گزارتا تھا۔ رات کا کھانا جلدی کھانے کے بعد میں جھیل کے دوسرے کنارے تک کشتی کھیتا جاتا' وہاں کوئی آبادی نہیں تھی' میں کپڑے اتار دیتا اور جھیل میں اتر جاتا۔ گرمیوں کی شامیں طویل اور گرم ہوتی تھیں' رات دس بجے کے بعد ہی ہوتی تھی۔ میں اپنی کھڑکی سے سوئس علاقے کی بستیوں کی روشنیاں دیکھ سکتا تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں کئی دنوں کے لیے واحد سرگرمی ٹور ڈی فرانس سائیکل ریس تھی۔ بستی کے کچھ لوگ ہر شام پینے اور ریڈیو پر ریس کی

پیش رفت کا حال سننے کے لیے آتے تھے۔ ایک شام میں نے سوئس علاقے کا سارے کا سارا شمالی آسمان آتش بازیوں سے بھرا ہوا دیکھا: ایک سوئس ریس جیت گیا تھا۔

ایک رات بہت خاموشی اور گرمی تھی۔ کچھ دیر کشتی کھینے کے بعد میں نے ایلیو کے پانیوں میں اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنی کشتی جھیل کے درمیان لے گیا' اپنے سارے کپڑے اتار دیئے (میرے پاس تیراکی کا لباس نہیں تھا) اور چھلانگ لگا دی۔ کشتی شمال کی طرف بہنا شروع ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے تیرتا رہا۔ اچانک میں نے اپنی طرف آتی ہوئی ایک موٹر بوٹ کی زوردار آواز سنی۔ اس کی طاقت ور ہیڈ لائٹس مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے اپنی کشتی پر واپس چڑھنے کی کوشش کی۔ مگر جتنا میں اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا' اتنا ہی وہ جھک جاتی اور میری گرفت سے پھسل جاتی تھی۔ مجھ پر گشتی کشتی (پٹرول بوٹ) کی ہیڈ لائٹس مسلسل پڑ رہی تھیں۔ ظاہری طور پر میں سوئس سرحد کے بہت قریب بہہ آیا تھا اور اطالوی کسٹم والے جاننا چاہتے تھے کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا اس پر انہیں یقین نہیں آ سکتا تھا ـــــ ایک سیاہ آدمی جس کے لمبے لمبے بال اس کے کاندھوں پر پڑے ہوئے تھے اور ڈاڑھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایلیو نے کس قسم کا انسان نما عفریت باہر اگل دیا تھا؟ مجھے بے یقینی کے کچھ جملے سنائی دیئے۔ ڈیوس میوس (میرے خدا)' کارامی! (میری پیاری)۔ خیر گزری کہ گشت کرنے والوں میں سے ایک نے اپنی چھوٹی بیٹی سے میرے بارے میں سن رکھا تھا۔ وہ میری کشتی کو' جس کے پچھلے حصے سے میں لٹکا ہوا تھا' میرے پنشن تک باندھ کر لے آئے۔ میں پانی سے باہر آیا' سر پر پگڑی باندھی اور لباس زیب تن کیا۔ میں نے اپنی سی بہترین اطالوی میں ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں شب بخیر کہہ کر رخصت کیا۔

لاگو ایلیو میں ایک مناسب حد تک بارآور مہینہ گزارنے کے بعد میں بمبئی اور گھر واپس جانے کے لیے جہاز پر سوار ہونے کے واسطے لندن واپس آ گیا۔ میں 1950ء میں ہندوستان واپس آیا۔ اس حقیقت سے کوئی متاثر نہیں تھا کہ انگلینڈ میں میری دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ خاندان کا کوئی فرد وہ تبصرے پڑھنا نہیں چاہتا تھا جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سب یہ جاننے کے خواہش مند تھے کہ میں نے ان کے حق تصنیف کے معاوضے (رائلٹی) کے طور پر کتنا کچھ کمایا تھا۔ یہ بہت کم تھا۔ میری پیٹھ پیچھے میرے دوست اور رشتے دار میرا مذاق اڑاتے تھے۔ "یہ اپنا امتحان تو پاس نہیں کر سکا مگر کتابیں لکھنے لگا ہے۔" ـــــ وہ کہتے تھے۔ مجھے "نکھٹو" کہا جانے لگا۔ ایک روز سر شری رام نے' جن کے گھر میں اس لیے اکثر جایا کرتا تھا کہ اس کا بیٹا بھرت اور بھرت کی بیوی شیلا میری بیوی کے سکول کے زمانے کے دوست تھے' کہا: "تم کوئی کام وام بھی کرتے ہو یا اپنے باپ کی کمائی پر گزر کر رہے ہو ـــــ باپ کی کمائی کا

کھاتا ہے؟'' ان جملوں نے مجھے ڈنک سا مارا کیونکہ وہ سچ تھے۔ میری بیوی اور بچے میرے والدین کے ساتھ رہتے تھے' میری واحد آمدنی ان مضامین سے' جو میں مقامی اخباروں میں لکھتا تھا' یا آل انڈیا ریڈیو پر کی جانے والی تقریروں سے آتی تھی۔ یہ کبھی کبھی 1000 روپے فی ماہ ہو جاتی تھی۔ میرے بیٹے کی دون سکول کی فیسیں میری بیوی اس رقم سے ادا کرتی تھی جو اس کا باپ اسے بھیجا کرتا تھا۔ وہ میری بجائے منگت رائے اور بھرت رام سے مشورہ کیا کرتی تھی' میری ہمت بہت ہی پست ہو چکی تھی۔

میں نے دہلی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ بھوپال میں میرے باپ کا برف خانہ تھا اور اس نے جھیل کے کنارے منیجر کے لیے ایک مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ مجھے راستے میں ابھی ایک اور مصیبت سے گزرنا تھا۔ میرے کمپارٹمنٹ میں تین سندھی بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ کاروباری گفتگو میں محو رہتے اور میری طرف کوئی توجہ نہیں دیا کرتے تھے۔ راستے میں ایک سٹیشن پر ہم نے چائے کا آرڈر دیا۔ ان میں سے ایک نے بسکٹوں کا بہت خوب صورت سا ڈبہ کھولا اور ایک بسکٹ مجھے پیش کیا۔ میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ تب ان میں سے ایک نے مجھے ملامت کی: ''سیٹھ خود تمہیں اپنی پروڈکٹ پیش کر رہا ہے اور تم انکار کر رہے ہو۔ بھلا تم کس قسم کے آدمی ہو؟''

میں سمجھا کہ وہ آدمی سیٹھ منگھا رام تھا' ہندوستان کا ممتاز بسکٹ ساز۔ ہم گفتگو کرنے لگے۔ اس نے اپنے حقیر سے آغاز کے بارے میں مجھے بتایا کہ وہ سکھر میں گلیوں میں گھوم پھر کر چیزیں بیچتا تھا اور اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے بسکٹ کا کاروبار استوار کیا۔ اس نے کہا بھگوان اس پر مہربان رہا ہے۔ اب وہ لکھ پتی تھا۔ میں نے اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے اپنے بیٹوں کے بارے میں بتایا۔ وہ خوش تھا کہ انہوں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر لیا تھا اور کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

''تم نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار کیوں نہیں بھیجا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کس لیے؟'' اس نے دندان شکن جواب دیا: ''وہ جانتے ہیں کہ بسکٹ کس طرح بنتے ہیں۔ انہیں سمندر پار جا کر کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں اُسے اپنی اولاد کے لیے نئے آفاق کشادہ کرنے کے حوالے سے اصرار کر کر کے دق کرتا رہا۔ وہ تپ گیا اور مجھ پر الٹ پڑا۔

''تم باہر پڑھتے رہے ہو؟''

میں نے تسلیم کیا کہ ہاں۔

''تم نے ''ولایت'' میں کتنا عرصہ گزارا؟'' اس نے پوچھا۔

''لگ بھگ پانچ سال۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم کتنی تنخواہ لے رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اپنی آخری تنخواہ بتا دی۔ سیٹھ منگھا رام نے تیزی سے حساب لگایا اور نتھنے پھلا کر بولا: تمہارے باپ کا تو سود بھی نہیں نکلا۔''

وہ مکان ''آشیانہ'' کم فرنیچر والا دو منزلہ عمارت تھی۔ میں نے بالائی منزل پر ایک کمرہ لیا۔ بالکونی سے جھیل اور کم گہرے پانی میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے سارسوں کے جھنڈوں کا شاندار نظارہ ہوتا تھا۔ میں اپنے ناول پر کام کرنے کے دوران میں ان کے رقصِ وصال کو دیکھتا رہتا تھا۔ دوسری واحد تفریح نواب کے محل کی ملازمائیں تھیں جو صبح سویرے نہانے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ وہ عموماً پانچ یا چھ ہوتی تھیں جو سر سے پاؤں تک برقعوں میں لپٹی ہوتی تھیں۔ قرب و جوار میں اور اس سڑک پر جو محل کی طرف جاتی تھی' اس جگہ کوئی مکان نہیں تھا' جہاں وہ اپنے سارے کپڑے اتار دیا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ ''آشیانہ'' بھی انسانی بصارت کی حد سے باہر واقع تھا۔ میری طاقتور دوربین انہیں قریباً بازو بھر فاصلے پر لے آتی تھی۔ وہ ایک دلفریب نظارہ ہوتا تھا۔ کپڑوں سے آزاد ہونے کے بعد وہ عورتیں پانی کو ہاتھوں سے اچھالتیں' ایک دوسرے کے اوپر پھینکتیں' صابن ملتیں' پانی میں غوطے لگاتیں اور پھر دھوپ میں خود کو سکھاتی تھیں۔

میں سہ پہروں میں جنگلوں میں دور نکل جاتا یا ریلوے سٹیشن جا کر یہ جان کاری حاصل کرتا کہ گاڑیوں کو مختلف پلیٹ فارموں پر کیسے بھیجا جاتا ہے اور سٹاف کی ڈیوٹیاں کیا کیا ہوتی ہیں۔ ایک ریلوے سٹیشن میرے ناول کا مرکزی حصہ تھا۔

جب میں بھوپال میں تھا تو لندن آبزرور کا ریول ناکس اور اس کی بیوی ہفتہ بھر میرے ساتھ رہنے کے لیے آئے۔ اس نے نواب سے انٹرویو لیا۔ اخبار کو انٹرویو بھیجنے کے بعد میں انہیں بدھ سٹوپے دکھانے کے لیے سانچی لے گیا۔ ایک رات ہم شکاریوں کی ایک ٹولی کے ساتھ چیتا دیکھنے کے لیے جنگل گئے۔ ہم ایک تالاب کے کنارے بنے ہوئے فائرنگ کے لیے تعمیر کیے گئے مینار پر بیٹھ گئے اور صبح تک پیتے رہے۔ ہمیں تو کوئی چیتا نظر نہیں آیا۔ شکاری ہم سے ناراض تھے کیونکہ ہماری نہ ختم ہونے والی باتوں کی وجہ سے جانور تالاب سے دور رہے تھے۔ انہوں نے اپنے غصے کو اپنی کار کی ہیڈلائٹس سے چندھیا جانے والے دو سانبھروں پر اتارا۔

مہینہ ختم ہونے تک میں نے اپنے ناول کا خاکہ تیار کرلیا۔ میں نے اس کا نام اس

بستی کے نام پر ''مانو ماجرا'' رکھا جس میں اس کی کہانی کو وقوع پذیر ہوتا دکھایا گیا تھا۔ دہلی واپس پہنچا' برطانوی ہائی کمیشن کے والٹر بیل کی امریکی بیوی ٹیٹی بیل نے میری خاطر اسے ٹائپ کرنے کی پیشکش کی۔ جب اس نے اپنا کام مکمل کرلیا تو اس نے واضح طور پر مجھے کہا: ''یہ اچھا نہیں ہے! کوئی اسے شائع نہیں کرے گا۔'' میں مایوس ہوگیا اور اسے پھاڑنا چاہتا تھا۔ میں خوش ہوں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں نے اسے ہندوستان سے فکشن کے بہترین کام کے طور پر گرووپریس کو بھیج دیا۔ میں نے اسے اپنے دوست آئی۔ایم۔ ورما کے نام سے بھیجا تھا کیونکہ ججوں میں سے ایک کرشنا مینن تھا۔ اس نے ایک ہزار ڈالر اور اسے شائع کرنے کے معاہدہ پر مشتمل اول انعام جیت لیا۔ برطانیہ میں یہ ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ پہلا شخص جسے میں نے یہ خبر سنائی وہ تھی ٹیٹی بیل۔ اس نے مجھے انعام میں ایک بوسے اور کاک ٹیل پارٹی (محفل مے نوشی) سے نوازا۔ وہ بہت چومنے کے قابل اور ایک فیاض میزبان تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے ملازمت کرلینی چاہیے۔ آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی سروس کے لیے پروگرام پروڈیوسروں کی اسامیوں کا اشتہار آیا۔ میں نے انگریزی کے لیے درخواست دے دی۔ پرکاش شاستری نے' جسے میں اپنے لاہور کے زمانے سے بطور الائیڈ فرانسیز کے طور پر جانتا تھا اور جس کی بہت خوب صورت فرانسیسی بیوی تھی' فرانسیسی کے لیے درخواست دی۔ ہم دونوں منتخب کرلیے گئے۔ میرا باس پروفیسر دارو والا تھا' جس نے مجھے گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھائی تھی۔ شعبے کی سربراہ (ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ) مس مہرا مسانی تھی ـــــ زندگی میں مجھے ملنے والی سب سے زیادہ خوب صورت اور محنتی عورت۔ میرے رفقائے کار میں سے ایک نرادسی چودھری تھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے پتہ چلا کہ میرے لیے تو کرنے کو بہت تھوڑا کام ہے۔ میرا پروگرام' جو آدھی رات کو نشر کیا جاتا تھا' مشتمل تھا خبروں پر (جو نیوز ریڈر سناتا تھا) کلاسیکی موسیقی کے کنسرٹس پر (جن کا انتخاب موسیقی کا ایک ماہر کرتا تھا) اور دس منٹ کی طوالت کے مختصر فیچر پر ـــــ انہیں بھی کوئی باہر کا شخص لکھتا اور ریکارڈ کرتا تھا۔ جو کچھ مجھ سے توقع کی جاتی تھی وہ میں پندرہ منٹوں میں ختم کرلیتا تھا۔ دن کا باقی سارا وقت دفتر میں دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکتے ہوئے گزرتا تھا ـــــ نراد بابو اپنا شاہکار لکھنے کے بعد یا کرشن شنگلو کے ساتھ جس کے پاس اتنا ہی کام کرنے کے لیے ہوتا تھا جتنا کہ میرے پاس مگر وہ خود پر بہت زیادہ کام کا بوجھ ہونے کی بناوٹ کیا کرتا تھا۔ ادھر خوب صورت لڑکیوں کا جھرمٹ بھی تھا ـــــ کانتا گپتا' فرانسیسی کے شعبے کی ایک مسلمان سٹینو ٹائپسٹ اور دوسری لڑکیاں۔ میں وقت گزارنے کے لیے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا کرتا تھا۔ جو چیز زیادہ بے حوصلہ کردینے والی تھی وہ یہ تھی کہ ہماری

نشریات اتنی کمزور ہوتی تھیں کہ بہت ہی کم لوگ انہیں سن پاتے تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ ایک رات پرکاش شاستری نے، جو پروڈیوسر بھی تھا اور نیوز ریڈر بھی' اپنے پروگرام کے شروع ہوجانے کے آدھے گھنٹے کے بعد بھی اپنا کام شروع نہیں کیا۔ نشریات کا انچارج انجینئر غصے کی انتہا پر تھا۔ شدید مایوسی کے عالم میں اس نے ٹرانسمیٹر وں کو چلا دیا اور اعلان کیا: ''یہ آل انڈیا ریڈیو کی فرانسیسی سروس ہے۔ معذرت چاہتا ہوں' ہمارا پروڈیوسر ابھی تک نہیں پہنچا اور مجھے فرانسیسی نہیں آتی ہے۔ لہٰذا موسیقی سماعت فرمائیے۔'' ہمارے فرانسیسی سامعین کی طرف سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ شاستری کو ملازمت سے فارغ کردیا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو میں دو برس گزارنے اور اس کے لیے بہت تھوڑا کام کرنے کے بعد مایوس ہوکر میں کچھ مزید قابل قدر کام کرنے کے لیے بے تاب و بے قرار ہوگیا۔ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل لوتھر ایوانز کے بھارت کے دورے سے مجھے موقع ملا۔ مجھے ملکی سروسز کے لیے اس کا انٹرویو لینے کا کہا گیا تھا۔ انٹرویو اچھا ہوا اور ایوانز متاثر ہوا۔ میں نے اسے ڈنر کے لیے گھر پر مدعو کیا۔ وہ میرے باپ کے طرز زندگی (اس کا سر کا خطاب زیادہ مددگار ثابت ہوا) اور اس کی مہمان نوازی سے مزید متاثر ہوا۔ میں نے اپنے دوست پریم کرپال کو' جو اس وقت یونیسکو میں کلچرل افیئر ز ڈیپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا' اپنے اس کے ساتھ جا ملنے کے امکانات کو مضبوط کرنے کا لکھا۔ ایک ماہ بعد مجھے شعبۂ ابلاغ میں پریس' فلم اور ریڈیو کے معاملات دیکھنے کے لیے ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ میں نے فوراً اسے قبول کرلیا۔ آل انڈیا ریڈیو کو استعفیٰ کے نوٹ میں مَیں نے لکھا کہ میرے لیے کرنے کو بہت تھوڑا کام تھا اور تجویز دی کہ اس آسامی کو ختم کردیا جائے۔ میرا دوست کرشن شنگلو جو میری جگہ لینے کا خواہشمند تھا' کی بدقسمتی کہ آسامی ختم کردی گئی۔

آٹھواں باب

پیرس میں گزرا ہوا زمانہ

میں پیرس میں اجنبی نہیں تھا اور یونیسکو نے جو کام کیا تھا اس سے تھوڑا بہت واقف تھا۔ لندن میں طالب علمی کے زمانے میں میں نے کئی مرتبہ پیرس کی سیر کی تھی اور لکسمبرگ گارڈنز کے نزدیک واقع انسٹی ٹیوٹ ڈیو پینتھیئن میں بول چال والی فرانسیسی کا تین مہینے کا ایک کورس کیا تھا۔ جب پریم کرپال لندن میں پی آر او تھا تو ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سربراہی میں آنے والے ہندوستانی وفد کے سیکرٹری کے طور پر اس نے فلورینس میں یونیسکو کے پریس افسر کے طور پر میرا نام شامل کروایا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا۔ ہم فرانس اور الپس میں سے گزرتے ہوئے ٹسکانی پہنچے۔ عملی طور پر میرے لیے کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ سوائے ''ثقافت کسی سرحد کو نہیں جانتی'' اور ''انسانوں کے ذہنوں میں امن کے بیج بونے کی ضرورت'' کے موضوع پر لمبی تقریریں سننے کے۔ میں نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کا خوب اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے خطابت کے جوہر دکھائے اور زبردست داد و تحسین حاصل کی۔ بہت سے مندوبین ان سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے ان کا استقبال کرتے تھے' جہاں وہ اپنا بیشتر وقت مطالعہ کرنے اور لکھنے میں گزارا کرتے تھے۔ دوسرے ملاقاتیوں میں ایک فلمی اداکارہ میرنا لوئے بھی شامل تھی۔ جب انہوں نے اپنے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کو اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا تو وہ شرما گئی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو دلاسا دیا تھا اور اس سے پوچھا تھا کہ اس کے کتنے شوہر رہے ہیں۔ یہ مشہور تھا کہ وہ امریکی وفد کے سربراہ ڈاکٹر سارجنٹ سے شادی کرنے کی خواہاں ہے۔ دوسروں کے ساتھ میں کیرول لائیس کا بھی دوست بن گیا تھا جو امریکی وفد میں شامل تھی۔ بعد میں اس کا تقرر ہندوستان میں ہوا' سفیر بکنر سے شادی ہوئی اور وہ خود اپنی اہلیت کے بل بوتے پر نیپال میں سفیر بنی۔

فلورینس میں گزرے ہوئے تین ہفتوں نے مجھے آرٹ گیلریوں کی سیر کرنے' پیسا کے جھکے ہوئے مینار' سینا میں پیلیو اور چند اطالوی جھیلوں کو دیکھنے کا موقع دیا۔ گارڈا کی پیرنو

اب بھی میرے خوابوں کا حصہ ہے۔ ساری سہ پہر ہم شدید ترین گرمی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے کسی ایسے ہوٹل کو ڈھونڈتے رہے جہاں ہم کھانا کھا سکیں اور رات بسر کر سکیں۔ ہمیں گارڈا نظر آ گیا ۔۔۔ دہکتے سورج تلے لہریں لیتا ہوا پانی میلوں پھیلا ہوا تھا۔ ہم ایک تنگ سے راستے پر پہنچے جو جھیل کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ سائن بورڈ پر لکھا تھا سان سیمیون ۔ ہم نے وہاں کوئی جگہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ یہ چٹانی جزیرے پر واقع ملاحوں کی ایک بستی تھی جہاں چند ایک ہی ہوٹل تھے۔ ہم نے ایک ہوٹل میں کمرے لیے۔ غسل کرنے کے بعد میں نے جزیرے پر نگاہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

میں ایک گرد آلود سڑک پر چل پڑا جو ایک قبرستان تک پہنچ کر ختم ہوگئی' جو چیڑ کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں چیڑ کے پتوں کے بستر پر لیٹ گیا اور نیلے آسمان کو دھیرے دھیرے سیاہ ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ میں نے گھروں کو لوٹتے ہوئے مچھیروں کے ہوا کے جھونکوں پر تیر کر آنے والے گیتوں کی آوازیں سنیں۔ مجھے اونگھ آ گئی۔ مجھے خبر نہیں کہ میں مُردوں کے درمیان کتنی دیر تک سویا رہا۔ میری آنکھ تو اس وقت کھلی جب ایک بلبل عین میرے سر کے اوپر والی شاخ پر بیٹھی پوری آواز میں گانے لگی۔ پورا چاند طلوع ہو چکا تھا' جھیل کے آر پار سیماب کی سی ایک پٹی کو جنم دے رہا تھا۔ میں چاندنی رات میں پرندے کے گیت سے مسحور لیٹا رہا ۔۔۔ کیٹس نے لازماً اسی جیسا کوئی گیت سنا ہوگا جب وہ مستی میں ڈوب گیا تھا۔ اس سحر کے ٹوٹ جانے سے نفور میں جہاں تھا وہیں پڑا رہا۔ میں رات کے صاف آسمان پر چاند کو بلند سے بلند تر ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ بلبل میری موجودگی سے آگاہ ہوگئی اور اڑ گئی۔ سحر ٹوٹ گیا تھا۔

دو برس بعد کرپال نے مولانا آزاد کی سربراہی میں پیرس میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے والے وفد میں میرا نام شامل کروا دیا۔ مولانا آزاد نے تصور کیا کہ میں پیرس میں اچھا وقت ہی گزارنے آیا ہوں اور کوئی کام میرے ذمے نہیں لگایا۔ ہر مرتبہ جب میں ان سے پوچھتا کہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے تو وہ جواب دیتے "سردار صاحب! مزا کریئے۔" ایک بار مجھے ایک سینئر مندوب نے ان سے ایک خاص تجویز کی توثیق کروانے کا کہا' مجھے شام کے وقت انہیں ان کے ہوٹل میں پریشان کرنا پڑا۔ وہ بہت روکھے تھے۔ شام کے وقت وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ کیونکہ وہ اکیلے ہی سکاچ سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنا امام الہند' تاثر برقرار رکھنے کے لیے چاہتے تھے کہ ان کی مے نوشی کی عادت غیر معروف ہی رہے۔ وفد میں پروفیسر حبیب' ایک دل کش عالم' بھی موجود تھے جو ہندوستان کے کمیونسٹ چین کو تسلیم کر لینے کے رجحان پر الجھے ہوئے سے تھے۔ جب ووٹنگ ہوئی تو انہوں نے ہندوستان کا ووٹ ہندوستانی تجویز کی مخالفت میں ڈالا۔ اس کی توثیق کرنا پڑی تھی۔

کوئی یونیسکو کو کس طرح سنجیدگی سے لے سکتا ہے؟ میں ہمیشہ ان لوگوں سے چڑتا رہا ہوں جو ثقافت بگھارتے پھرتے ہیں۔ ''تمہیں نئے تصورات دینا ہوں گے۔'' کرپال نے مجھے کہا تھا۔ اس نے کبھی واضح نہیں کیا کہ کون سے تصورات انہیں مطلوب ہیں۔ تاہم پیرس بہت خوب صورت شہر تھا' اس میں کچھ مدت گزاری جا سکتی تھی۔ میں پیرس کی مسرور یادوں کا حامل ہوں اور افسوس یہ ہے کہ میں کسی فرانسیسی مرد یا عورت کو دوست نہیں بنا پایا۔ میرے بڑھائے ہوئے دوستی کے ہاتھ کو قبول کرنے میں راضی ہونے والوں میں صرف تارکینِ وطن ہی شامل تھے — سفید فام روسی یا امریکی جو وہاں آباد ہو چکے تھے یا یہودی جو اکثر نمایاں ہو جانے والی سامیت مخالف فضا میں عدم تحفظ محسوس کرتے تھے۔ ثقافت پر بلند بانگ گفتگو اور شاعری کے باوجود فرانسیسی قوم میرے تجربے کے مطابق دنیا کی سب سے زیادہ پیسہ پرست قوم ہے۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ — کسی ریستوراں میں' سینما میں یا چپو سے چلانے والی کشتی کرائے پر لینے کے لیے کسی پارک میں — مطلوبہ رقم ادا کرنے کے بعد بخشیش کے لیے ایک ہاتھ لازماً پھیلا پاؤ گے۔ اور باوجود تمام تر جھکنے' ہاتھ چومنے اور تعظیمی تقریر کے وہ ناقابل یقین حد تک بدتمیز ہو سکتے تھے۔ فرانس کتنی عمدہ جگہ ہوتا اگر وہاں کوئی فرانسیسی نہ رہتا ہوتا!

تاہم میں 1954ء میں پانچ سال کا معاہدہ جیب میں لیے دوبارہ پیرس میں موجود تھا۔ سٹیشن پر ہمارا استقبال سفیر کے سیکرٹری نے کیا۔ سفیر کوئی اور نہیں میری بیوی کا چچا ایچ۔ ایس م۔ ملک تھا جس کا تبادلہ کینیڈا سے فرانس ہو گیا تھا۔ میرے لیے یونیسکو کے دفتر کے نزدیک ہی عارضی رہائش گاہ تلاش کی گئی' جو اس وقت دوسری عالمی جنگ کے دوران میں جرمن خفیہ پولیس (گسٹاپو) کا ہیڈکوارٹر رہنے والے ہوٹل میجسٹک میں قائم تھا۔ پہلی شام ہم نے ملک میاں بیوی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہمارے ساتھ ان کا رویہ سرد مہری والا تھا' اسی طرح ہم نے بھی سرد رویہ اپنایا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فرانس کے قیام کے دوران میں جتنا ہو سکے ان سے تھوڑا رابطہ رکھنا ہے۔

اگلی صبح میں نے یونیسکو میں حاضری دی اور اپنے باس شنائیڈر کہلانے والے ایک امریکی اور اس کے نمبر دو ایک فرانسیسی یہودی سے ملا جس نے اپنا نام اس وقت فلپ ولف سے تبدیل کر کے فلپ ڈیسجارڈین رکھ لیا تھا جب فرانسیسی زیرزمین میں شامل ہوا تھا۔ وہ دونوں افراد انگریزی اور فرانسیسی ایک سی روانی کے ساتھ بول سکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شنائیڈر کے لوتھر ایوانز کے ساتھ تعلقات بہتر نہیں ہیں' جو اس کی جگہ لینے کا خواہش مند تھا۔ شنائیڈر میری تقرری کے حوالے سے تحفظات رکھتا تھا۔ ڈیسجارڈینز محکمے کا ایک ڈپٹی ڈائریکٹر بننے کا مشتاق تھا اور سمجھتا تھا کہ ایوانز نے مجھے ادارے میں اس لیے شامل کروایا ہے تاکہ وہ مجھے دوسرا

ڈپٹی ڈائریکٹر بنوائے۔ اس نے مستعدی سے مجھے دوست بنالیا اور ایک خوش گوار' خلوت آمیز ایک بیڈ روم والا فلیٹ ایفل ٹاور کی نزدیکی مصروف سڑک سے نکلنے والی ایک ذیلی سڑک سائٹ نیگریئر میں چھ ماہ کے لیے عارضی طور پر رہنے کے لیے دلوانے میں مدد کی۔ اس کی مالکہ ایک فرانسیسی سفارت کار کی چینی بیوی تھی۔

ہمارے رہائش پذیر ہونے اور میرے بیٹے کے امریکن انٹرنیشنل سکول میں داخلے کے بعد ایوانز نے مجھے کہا کہ میں لندن کے برطانوی اخبارات کے مدیروں کے ساتھ اس کی میٹنگ کا بندوبست کروں۔ میں لندن گیا اور یونیسکو کے انگلستان والے کمیشن کے رچرڈ پاؤل کی مدد سے اپنے کچھ دوست مدیروں کو یونیسکو کے منصوبوں کے حوالے سے ایوانز کو سماعت کرنے کے لیے لنچ پر آنے کی دعوت دی۔ انگریز یونیسکو کے بارے میں تشکیک کا شکار تھے اور برطانیہ کی شرکت کو پیسے کا ضیاع تصور کرتے تھے۔ ہمارے مہمان اتنے مہذب و شائستہ تھے کہ وہ جو کچھ ایوانز کو کہنا تھا اس میں دلچسپی کا ثبوت دے سکتے تھے۔ بدقسمتی سے ایوانز دوسرے امریکیوں کی طرح بہت اونچی اور گرج دار آواز کا مالک تھا۔ اس کی آواز وسیع ہال کے آخر تک جارہی تھی جو لنچ کے وقت غیر معمولی طور پر بھرا ہوا تھا۔ جب ایوانز اپنی بلند ترین آواز میں یونیسکو کے مستقبل کے حوالے سے اپنے تصور کو بیان کررہا تھا تو ایک امریکی خاتون اس کے پیچھے آئی اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ایوانز نے اپنا خطاب روک دیا اور اس کی طرف مڑا۔ ''میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم ایک بہت اونچی آواز کے مالک ہو۔'' اس عورت نے بہت روکھے پن سے کہا۔ ''میں ہال کے دوسرے سرے پر جو کچھ تم کہہ رہے تھے سن سکتی تھی اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو میں اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔'' ایوانز تو برباد ہوکے رہ گیا تھا۔ پیرس واپس آنے پر ایوانز نے مجھے اطلاع دی کہ میں مونٹ ویڈیو' یوراگوئے میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے والے سٹاف میں شامل تھا اور مجھے شعبۂ ابلاغ عامہ کی بجٹ تجاویز سے آگاہ ہونا چاہیے تاکہ میں مندوبین کی طرف سے کیے گئے سوالات کے جواب دینے کا اہل ہوسکوں۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا لوہا منواؤں اور دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا میں محکمے کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی ملازمت سے عہدہ برآ ہونے کا اہل ہوں۔ میں بجٹ سازی سے بالکل ناواقف و نابلد تھا اور حساب کتاب (اکاؤنٹنگ) سے میری بے زاری نے میرے لیے تجاویز کی تفہیم کو دشوار بنا دیا تھا۔ تاہم مین نے بحراوقیانوس کے پار برازیل میں رلیف کے لیے جہاز کرائے پر لیا۔ پروپیلر ہوائی جہاز پر یہ رات بھر کا ایک لمبا سفر تھا۔ ریوڈی جنیرو میں ایندھن بھروانے کے لیے ایک مختصر وقفے کے بعد ہم ہلکی گرمیوں کی ایک سہ پہر مونٹ ویڈیو پہنچ گئے۔

مونٹ ویڈیو کے لوگوں نے پہلے کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا ہوا تھا۔ وہ بے یقینی کے

ساتھ میری طرف تکتے تھے۔ ہمارے میزبانوں نے ہمارے لیے یوراگوئے کی دو بڑی فٹ بال کی ٹیموں کا میچ دیکھنے کے لیے دو نشستوں کا بندوبست کیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ہر کوئی مڑ مڑ کر منہ پھاڑے مجھے دیکھنے لگا۔ کھیل چند لمحوں کے لیے روک دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ قائل ہو گئے کہ میں فقط ایک اور انسان تھا۔ اگلی صبح کے اخبارات میں میری تصویریں صفحاتِ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ تاہم اگر یوراگوئے والے ہندوستان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تو ادھر ایسے اہم ہندوستانی بھی تھے جنہیں یوراگوئے کی موجودگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس کا ایک ثبوت وہ خط ہے جو سر جیت سنگھ مجیٹھیا نے مجھے لکھا تھا' جو اس وقت دفاع کا نائب وزیر تھا۔ میں نے اسے لکھا تھا کہ وہ وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری ہمایوں کبیر کو کہے کہ مختلف قوموں کی مشہوری کرنے والی تحریروں کے پروگرام میں شامل کرنے کے لیے سکھوں کی مناجاتوں کا بھی ترجمہ کروائے۔ مجیٹھیا کا جواب ایک ایسے لفافے میں ملفوف موصول ہوا جس پر میرا پتہ یوں لکھا گیا تھا ''یونیسکو' پیلیڈ نیسیونل' مونٹ ویڈیو' یوراگوئے' فرانس۔''

جب میری ہسپانوی سیکرٹری نے یہ دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔ ''تمہارے لوگوں کو اتنا بھی پتہ نہیں ہے کہ ایک ملک ایسا بھی ہے جسے یوراگوئے کہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا: ''تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ''یہ خط وزارتِ دفاع کی طرف سے آیا ہے۔ اگر وہ نہیں جانتے کہ تم وجود نہیں رکھتے ہو تو وہ تمہارے خلاف جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔''

شہر میں میرے قیام کے تیسرے دن ایک دلچسپ ترین تجربہ ہوا۔ میں اپنے ہوٹل کے ہال میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک پست قامت' سوکھا اور جھریوں والا' یک چشم بوڑھا آدمی میرے پاس آیا اور مجھے ''ست سری اکال' سینور!'' کہہ کر سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پنجابی میں پوچھا کیا وہ سکھ ہے۔ ''ہاں' سینور'' اس نے ہسپانوی میں جواب دیا۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک پرانا' تڑا مڑا برطانوی پاسپورٹ نکالا اور اس میں لگی ہوئی تصویر مجھے دکھائی: وہ ایک یک چشم سکھ تھا جو عمر کے اعتبار سے بیس کے پیٹے میں رہا ہوگا۔ اس نے اس کے سینے کی طرف اشارہ کیا اور گنواروں والی پنجابی میں بولا: ناؤں (نام) چنچل سیونھ (سنگھ)۔ پئے (پیو) سوہن سیون' ماؤ (ماں) گردیپ کور' پنڈ: لاہور کا کوئی گاؤں۔ اس کے بعد اس نے گنتی شروع کر دی' اک' دو' تن اور دس تک سناتا چلا گیا۔ ان الفاظ کے علاوہ جو کچھ بھی میں پنجابی یا انگریزی میں بولتا تھا وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی ہسپانوی سیکرٹری کو مدد کرنے کا کہا۔ وہ ایک ناقابل یقین کہانی تھی۔ چنچل سنگھ نے نوجوانی میں کینیڈا میں آباد ہونے کے لیے پنجاب چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت وہ پنجابی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بول سکتا تھا۔ کینیڈین حکام نے اسے قیام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ امریکہ کی طرف نکل گیا۔

وہاں بھی اسے اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا اور چند دنوں کے اندر اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ وہ میکسیکو اور برازیل سے جنوب کی طرف لفٹ لے لے کر سفر کرتا رہا۔ کسی ملک نے اسے رہنے کی اجازت نہیں دی یہاں تک کہ وہ یوراگوئے پہنچ گیا اور اس نے ایک فارم پر مزدور کے طور پر ملازمت حاصل کرلی۔ اس نے ایک ہسپانوی مزدور کی بیٹی سے شادی کی اور اس سے اس کے کافی بچے پیدا ہوئے۔ ان کے سکھ اور ہسپانوی نام رکھے گئے: دل باغ ڈان پیڈروسنگھ' سانتی کارمیلیا سنگھ وغیرہ وغیرہ۔ چنچل سنگھ' جو بیس کے پیٹے تک صرف پنجابی بول سکتا تھا' اب اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا — پچاس برسوں نے اسے اس کی یادداشت سے مکمل طور پر صاف کر دیا تھا۔

مجھے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص کسی زبان کو بولے یا پڑھے لکھے نہیں تو وہ پچاس برس سے بہت کم مدت میں اس کی یادداشت سے محو ہوسکتی ہے۔ ایک پنجابی مسلمان کاروباری نے (میرا خیال ہے اس کا نام انور تھا) مجھے اپنے اور اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے مدعو کیا۔ وہ دونوں ہی روانی کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ جب وہ باورچی خانے میں مصروف تھی تو میں نے اپنے میزبان سے پنجابی میں بات کی۔ اسے میری بات سمجھنے میں دشواری ہوئی: ''لفظ تو جانے پہچانے لگتے ہیں مگر مجھے ان کا مفہوم یاد نہیں آرہا ہے'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا: ''میں بارہ سال سے یوراگوئے میں رہ رہا ہوں' میرا کام سارے کا سارا یا تو انگریزی میں ہوتا ہے یا ہسپانوی میں۔ ان تمام برسوں میں میں نے کسی شخص کے ساتھ نہ تو ہندوستانی میں بات کی ہے نہ پنجابی میں نہ ہی میں کتابوں اور رسالوں کے ذریعے ان زبانوں سے منسلک رہا ہوں۔ اب تم جو کچھ بول رہے ہو میں نہ تو میں اس کا ایک لفظ بھی بول سکتا ہوں اور نہ ہی سمجھ سکتا ہوں۔'' بارہ برسوں میں اس کی یادداشت کی تختی سے اس کی مادری زبان مٹ گئی تھی۔

مونٹ ویڈیو کانفرنس کو بین الاقوامی پریس میں بہت تھوڑی مشہوری حاصل ہوئی۔ یوراگوئے دنیا کے نقشے پر نہیں تھا اور یونیسکو کو ایک بڑی کوفت (بور) تصور کیا جاتا تھا۔ پاکستانی وفد کے سیکرٹری ایم شریف نے یونیسکو میں میری شمولیت کی مخالفت نہ کرکے میری خصوصی توجہ حاصل کرلی تھی۔ اس کے بدلے میں وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے عورت مہیا کروں جس کے ساتھ وہ ہم بستری کرے اور جب میں ایسا کرنے سے قاصر رہا تو وہ مجھ سے بہت مایوس ہوا۔ میں نے مقامی اخبارات میں اس بات کو چھپوا دیا اور تمام مندوبین میں پھیلا دیا۔ کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں نے یہ خبر پاکستان روانہ کردی جہاں سب اخبارات نے اسے شائع کیا۔

پاکستانی وفد کا سربراہ وزیر تعلیم اشتیاق حسین قریشی تھا جو میرے دو برس کے دوران

سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں استاد تھا۔ ایک پرلطف واقعہ اس چھوٹے سے رسمی لنچ میں رونما ہوا جس میں تمام وفود کے سربراہ موجود تھے۔ مسٹر قریشی میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے' ہمارے سامنے آسٹریلوی وفد کا سربراہ بیٹھا ہوا تھا۔ قریشی کچھ کچھ افسردہ دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اس کو اطلاع ملی تھی کہ اسے ہٹایا جا رہا ہے۔ (شریف نے مجھے اس بارے میں بتا دیا تھا) ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے آسٹریلوی نے قریشی کا کارڈ پڑھا اور اپنا تعارف کرایا۔ ''مسٹر منسٹر! میرا نام فلاں فلاں ہے' میں آسٹریلوی وزارت تعلیم میں کام کرتا ہوں۔'' انہوں نے مصافحہ کیا۔ گفتگو کو جاری رکھنے کے لیے آسٹریلوی خوشی خوشی بولا: ''مسٹر منسٹر آپ میں اور میرے جیسے ایک سول ملازم میں ایک فرق ہوتا ہے' وہ یہ کہ میں جانتا ہوں جب میں کینبرا واپس پہنچوں گا تو اپنی ملازمت کو اپنا انتظار کرتا ہوا پاؤں گا۔ کوئی وزیر بھی پر یقین نہیں ہوسکتا کہ وہ کب تک برقرار رہے گا۔'' اسے روکنے کے لیے مجھے میز کے نیچے سے اس آسٹریلین کو ٹھوکر مارنا پڑی۔ وہ میری طرف مڑا اور غصے سے بولا: ''تم مجھے کیوں ٹھوکریں مار رہے ہو؟'' جو میں جانتا تھا مجھے اس کا اظہار کرنا تھا اور میں نے جواب دیا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اس وزیر سے بات کر رہے ہو جو آج صبح اپنا عہدہ کھو چکا ہے۔''

میں لوتھر ایوانز کی توقعات پر پورا نہیں اترا اور بجٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کو مسترد کر دیا۔ اب وہ مجھے شعبے کا ڈپٹی ڈائریکٹر نہیں بنا سکتا تھا۔ اس نے میلکم ادیسیشیاہ' ایک تامل نژاد عیسائی پادری کو ترقی دے کر فرانسیسی رینے میہیو کی جگہ' جس کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا' اپنا سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل بنانے کا اعلان کیا۔ مونٹ ویڈیو میں میری واحد کامیابی تھی سکھ صحائف کے منتخب حصوں کے تراجم کو شامل کرنے کی تجویز کی قبولیت۔

میں یوراگوئے کو زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ میری ہسپانوی سیکرٹری مجھے اپنے والد کے زرعی فارم پر لے گئی جہاں میں نے گاچوؤں کو ننگی پشت والے گھوڑوں پر سواری کرتے اور ایک بچھیا کو پکڑتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اس کا گلا کاٹ دیا' پھر اس کا پیٹ چیر دیا تاکہ اس کی اوجھڑی نکال دی جائے۔ پھر جانور کی لاش کو سر اور کھال سمیت سٹیل کی سلاخوں سے بنی ہوئی ایک تپائی پر رکھ دیا گیا جس کے نیچے آگ دہک رہی تھی۔ پھر لڑکے اور لڑکیاں رقص کرنے اور گانے لگے یہاں تک کہ بچھیا بھونی گئی۔ اپنے کاؤبوائے والے چاقوؤں سے انہوں نے اس کے جسم سے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹے اور کاغذی پلیٹوں میں رکھ کر کھانے لگے۔ شراب کے مرتبانوں میں سے گھر کی بنی ہوئی وینو روسو کو گلاسوں میں انڈیل دیا گیا۔ گوشت اپنے تمام تر عرقوں سمیت بہت لذیذ تھا۔ اسی طرح شراب بھی بہت مزیدار تھی۔ میں بس پر ریونیگرو بھی گیا اور مونٹ ویڈیو میں پرندوں کو دیکھتا رہا۔ جو دو جنوبی امریکی پرندے مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ اور

نیرو تھے' جو ہمارے جولاہے پرندے بیا کی طرح دو کمروں والا گھونسلا بناتا ہے۔ نیز ٹیجریٹا' قینچی پرندہ' جس کی دو لمبی لمبی دمیں تھیں جو قینچی کی طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک ماہ بعد میں پیرس آ گیا تھا اور مونٹ ویڈیو میں ناکام ثابت ہونے پر بہت افسردہ تھا۔ شنائیڈر ریٹائر ہو گیا تھا۔ ایوانز کو اس کی جگہ کام کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے تعلقاتِ عامہ کے شعبے سے نارویجئین ٹورجیسڈیل ملا۔ جیسڈیل نیویارک سے اپنے ذاتی نائبین لے کر آیا۔ میرے پاس سوائے میری وفادار سیکرٹری یوون لی روفیتیل کے اور کوئی عملہ نہیں رہا۔ جیسڈیل میری زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اور جب کبھی سٹاف میٹنگ ہوتی تو سنگھ پر زور دے کر کہتا: ''مسٹر سنگھ میں حقیقتاً نہیں جانتا کہ آپ کا کیا کیا جائے! شاید تم یونیسکو پر ایک کتاب لکھ سکتے ہو؟'' ادھر ایسا زمانہ بھی آیا جب میں اپنی مایوسی کو شراب میں ڈبویا کرتا تھا۔ میں شاموں میں اپنے ساتھ لائے ہوئے ہندوستانی ریکارڈ چلا دیتا۔ لتا منگیشکر گاتی: ''جوگی مت جا' پاؤں پڑوں میں تیرے'' ــــ یہ گانا بہت ثابت ہوتا اور میں باہر باغ میں کچھ اشک بہانے کے لیے چلا جایا کرتا تھا۔ میری مایوسی اس وقت قدرے کم ہوئی جب مجھے گروو پریس کے بارنی روزے کا تار ملا کہ میرا ناول ''مانو ماجرا'' (جو ''ٹرین ٹو پاکستان'' کے عنوان سے زیادہ جانا جاتا ہے) سال (1954ء) کی سب سے اچھی فکشن تخلیق قرار پایا ہے۔ میں نے پریم کرپال سے زبردستی ایک پارٹی دلوائی اور لوتھر ایوانز نے مجھے ان دنوں پیرس کے دورے پر آئے ہوئے سر راما سوامی مڈالیار کی موجودگی میں چیک پیش کیا۔ انعام نے مجھے اتنی رقم دی جو مرسیڈیز بینز خریدنے کے لیے کافی تھی۔

سکھ صحائف سے منتخب حصوں کے تراجم کے یونیسکو منصوبے پر میں نے نیشنل کمیشن اور یونیسکو کے ذریعے قریباً تنہا ہی کام کیا۔ مجھے اجزاء کا انتخاب کرنے اور مترجموں کا ایک پینل بنانے کے لیے دہلی بھیجا گیا۔ اس سے مجھے تجربہ حاصل ہوا کہ سکھ علماء کیا پسند کرتے ہیں۔ میں حکم سنگھ سے ملا جو اس وقت لوک سبھا کا سپیکر تھا۔ اس نے لدھیانہ کے ڈاکٹر ترلوچن سنگھ کو کنوینر اور کوآرڈی نیٹر کے طور پر حاصل کرنے کی تجویز دی۔ مجھے شبہ سا تھا کہ حکم سنگھ اس آدمی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ ڈاکٹر آف ڈیوائنٹی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ (کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہاں سے) اور بہت نادار تھا۔ حکم سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو فون کیا۔ وہ اگلے روز دہلی پہنچ گیا۔ وہ لمبی ڈاڑھی والا گرنتھی ٹائپ شخص تھا جو اس شعبے کے دوسرے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ خصوصاً ڈاکٹر گوپال سنگھ ڈارڈی کو۔ ہم نے چار مترجمین کا ایک پینل بنانے کا فیصلہ کیا: اس نے سختی سے ڈارڈی کا نام مسترد کر دیا تھا۔ علماء کے ایک اور پینل سے انتخاب کرنے کے لیے کہا گیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن دیباچہ لکھنے کے لیے راضی ہو گیا۔ جب ڈارڈی

نے سنا کہ وہ پینل میں شامل نہیں ہے تو اس نے احتجاج کرتے ہوئے مجھے خط لکھا اور مجھ سے التجا کی کہ میں اس کے نام کو یونیسکو کے نامزد کردہ مترجم کے طور پر شامل کرلوں۔ میں نے اسے جوابی خط لکھا کہ انتخاب سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے تاہم اتنا جان چکا ہوں کہ ترلوچن سنگھ اور کپور سنگھ' جو کبھی ڈارڈی کا ایک قریبی دوست رہا تھا' دونوں اس کے خلاف مضبوط تحفظات رکھتے تھے۔ ڈارڈی غضبناک ہوگیا۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ اس معاملے کو وزیراعظم نہرو کے پاس لے جائے گا۔ میں نے اسے برابر کی درشتی کے ساتھ جواب دیا کہ وہ جو چاہے کرے۔ اس کی زندگی کے آخری برس تک ہمارے درمیان معاملات کبھی ہموار نہیں رہے۔

کپور سنگھ ایک اور عجیب کردار تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ہوئی ہے۔ وہ سکھ ہونے کی حیثیت میں آئی ۔سی۔ایس میں نامزد ہوا تھا۔ سروس میں چند برس رہنے کے بعد اسے کرپشن کی بنا پر نکال دیا گیا تھا۔ اس نے اس بے عزتی پر ہندوستانی حکومت کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اس نے اکالی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی' لوک سبھا کے لیے منتخب ہوا اور سکھوں کو دوسرے ہندوستانیوں سے الگ ایک قوم بیان کرنے اور ان کے لیے ''خود مختار درجے'' کے مطالبے پر مبنی آنند پور صاحب قرار داد کا بنیادی مصنف تھا۔ اسے اپنے علم کا بہت تکبر تھا اور وہ دوسرے اکالیوں کو دماغ سے عاری گنوار سمجھتا تھا۔ وہ بے حد غصیلے مزاج کا بھی حامل تھا۔

منتخب اجزاء کا ترجمہ کیا گیا اور وہ مجھے بھیجے گئے۔ ان کا کام پست معیار کا تھا۔ انہیں پرکشش معاوضہ پانے والے مترجمین کو واپس بھیجنے کی بجائے میں نے یونیسکو کو قائل کیا کہ انہیں درست کرنے کے لیے مجھے ایک انگریز شاعر کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اپنے دوست گے ونٹ کے تجویز کردہ ایک چھوٹے شاعر گورڈن فریزر کی خدمات حاصل کیں اور اس کے ساتھ یہ یقین کرنے کے لیے پندرہ دن لندن میں گزارے کہ وہ اصل متن سے بہت زیادہ آزادیاں نہ برتتے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے عالمانہ تعارف کے ساتھ میسرز ایلن اینڈ انون نے ''سکھوں کی منتخب مقدس تحریریں'' کے عنوان کے تحت شائع کیا۔

کتاب شائع ہونے کے بعد ترلوچن سنگھ مجھ سے سخت ناراض ہوگیا۔ میسرز ایلن اینڈ انون نے کتاب کی پبلسٹی میں مترجموں کے پینل میں میرا نام سرفہرست دے دیا تھا کیونکہ وہ مجھے پہلے شائع کرچکے تھے اور میں دوسروں کی نسبت انگلینڈ میں زیادہ جانا جاتا تھا۔ ترلوچن سنگھ ساہتیہ اکیڈمی کے سیکرٹری کرشنا کرپلانی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے پاس مجھ پر الزام لگانے گیا کہ میں نے فہرست میں سازش کے تحت اپنا نام سب سے اوپر طبع کروایا ہے۔ میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ انہوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔ میں نے ایلن اور

انون سے کہا کہ وہ انہیں لکھیں کہ میرا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے اور یہ کہ میری درخواست پر میرا نام مترجموں میں سب سے نیچے لکھا جائے۔ صرف کرپلانی نے مجھ سے معذرت کی۔ میں نے رادھا کرشنن اور ترلوچن سنگھ سے مزید کوئی سروکار نہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

جب سائٹ نیگریئر والے اپارٹمنٹ کے لیے میری لیز ختم ہوگئی تو یوون لی روفیٹیل نے پارک ڈی سیوکس کے قریب بورگ لا رائن کہلانے والے علاقے میں ہمیں ایک چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ دلوا دیا۔ ہم اپنی نئی قیام گاہ میں منتقل ہوگئے۔ ہم نے کھانے پکانے اور گھر چلانے کے لیے ایک خوب صورت انگریز لڑکی میری کو حاصل کیا۔ میرے بیٹے کو زیادہ تر اس کی ناپسندیدگی کی وجہ سے امریکن انٹرنیشنل سکول سے لائیسی لاکینال میں تبدیل کروانا پڑا اور میری بیٹی کو دن کے رہائشی کے طور پر ایک فرانسیسی کانوینٹ میں داخل کروا دیا گیا۔ اس وقت دونوں مجھ سے ناخوش تھے۔ دونوں ہی فرانسیسی نہیں بول سکتے تھے اور اپنے اساتذہ کو سمجھنے میں دشواری پاتے تھے۔ مالا خود کو نیگر (کالی) کہے جانے پر آزردہ تھی اور میرے سمجھانے کے باوجود کہ نیگر اچھے لوگ ہوتے ہیں آزردہ ہی رہی۔ زندگی میں بعد میں دونوں نے تلخی سے تسلیم کیا کہ میرے انہیں فرانسیسی سکولوں میں داخل کروانے کے باوجود بھی وہ اس زبان کو بولنا کبھی نہیں سیکھ پائے۔

ہمارا گھر ایک ریلوے ٹریک کے ساتھ واقع سڑک پر تھا جس کا نام ریوڈوکرنل کینڈیلو تھا۔ میری آنکھ پہلی ٹرین کے بورگ لا رائن (میرے دوستوں کے لیے ''بگردی کوئن''—— ملکہ سے لواطت کرو) سٹیشن پر ایک ہالٹ پر آنے کے لیے ہائیڈرالک بریکیں لگانے کے شور سے کھل جایا کرتی تھی۔ میرے صبح سویرے کے خواب عموماً آبشار میں ڈوبنے کے ہوتے تھے۔ میں 9 بجے والی ٹرین پکڑتا تھا جو مجھے ایٹوئل پہنچا دیتی تھی۔ سب سے پہلے میں کیفے ٹیریا جاتا جہاں میں دھواں اڑاتی گرم گرم کافی کے کپ کے ساتھ مکھن لگا توس کھاتا۔ پھر میں یونیسکو پر مسودہ تحریر کرنے کے لیے اپنے کمرے میں جاتا' یوون کو کچھ خطوط لکھواتا اور اپنی بیوی کا انتظار کرتا جو لنچ میں میرا ساتھ دیا کرتی تھی۔ پھر ہم کرپال کے ساتھ باہر جا کر ایسے ریستوران ڈھونڈتے جو مناسب دام میں اچھا کھانا دیں۔ ایک بات ہے پیرس میں قریباً ہر ریستوران لذیذ کھانا پیش کرتا ہے۔ اگر موسم خراب ہوتا تو ہم یونیسکو کے کیفے ٹیریا یا ریستوران ہی میں لنچ کرتے تھے۔ جب میں اپنے کمرے میں واپس آتا تو شراب پینے کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا ہوتا تھا۔ ایک انگریز سٹینوگرافر جو مکمل طور پر نابینا تھی ہمارے لیے سہ پہر کی چائے بنایا کرتی تھی۔ پھر ٹریفک کے ہجوم والا وقت شروع ہونے سے پہلے پہلے گھر جانے کا وقت ہوتا۔ مجھ پر یہ امر واضح ہونے لگا کہ پیرس میں رہنا کافی خوش گوار تو ہے مگر میں اپنی موجودگی کے جواز

کے لیے بہت کم کام کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے خاندان کو پارک ڈی سیوکس میں سیر کرانے اور بطخوں کو کھلانے سے باز نہیں رکھا۔ ہم ویک اینڈز پر پیرس سے باہر چلے جایا کرتے تھے۔ کرپال ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ وہ میری بیوی اور بچوں کو مجھ سے زیادہ دیکھتا تھا۔ پاس پڑوس میں رہنے والے یونیسکن مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں کرپال فیملی کے ساتھ ویک اینڈز کیوں گزارتا ہوں۔

کبھی کبھی ہندوستان سے ہمارے ملنے والے بھی آ جایا کرتے تھے۔ پہلا ملاقاتی میرا سب سے چھوٹا بھائی دلجیت تھا۔ اس نے خوبصورت میری پر ایک نظر ہی ڈالی اور اسے پھانسنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس کی پیشرفتوں سے گھبرا گئی اور اس نے میری بیوی کا تحفظ مانگا۔ میری بیوی اس وقت تک میری کے بیڈروم میں رہی جب تک میرا بھائی تھک کر سو نہیں گیا۔ پھر بھرت رام اور اس کی بیوی آئے۔ شیلا ماسکو سے آئی جہاں وہ ہندوستانی عورتوں کے ایک وفد کے ساتھ گئی تھی۔ اسے اجازت دی گئی تھی کہ وہ نمائش کے لیے اپنے زیورات ساتھ لے جائے ___ مجھے یقین ہے کہ وہ بارہ لاکھ سے زیادہ مالیت کے تھے۔ ہندوستانی رقاصوں اور گلوکاروں سے زیادہ اس کے زیورات نے روسی عورتوں کی توجہ حاصل کی تھی۔

ہمارے گھر میں بہت تھوڑی جگہ تھی مگر اس نے ہوٹل میں رہنے سے انکار کر دیا۔ اس کے خاوند نے' جو انگلینڈ میں تھا' اسے پیرس میں آ ملنا تھا۔ شیلا ہندوستان چلی گئی اور بھرت نے مزید چند دن قیام کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے میری بیوی کو لنچ پر لے جانے کی اجازت مانگی اور کسی اچھے ریستوران کا نام پوچھا۔ کاغذ کی ایک پرچی پر میں نے لکھ دیا ٹور ڈی ارجنٹ' پیرس کا سب سے زیادہ مہنگا ریستوران اور اسے یقین دلایا کہ ہر ٹیکسی ڈرائیور اسے جانتا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو بتا دیا: ''وہاں کھانا کھانے کا یہ تمہارے لیے واحد موقع ہے۔'' وہ ریستوران گئے' بھرت نے مینیو اور قیمتوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ''اس میں سبزی خوروں کے لیے تو کچھ نہیں ہے'' وہ بولا۔ اس نے ایک سستی جگہ ڈھونڈی جہاں وہ اپنا ''دال بھات'' کھا سکے۔ ارب پتی بننے کے لیے کاروباری فراست سے کچھ زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں یہ جاننا پڑتا ہے کہ جو کچھ تم نے ورثے میں حاصل کیا ہے اسے کس طرح بچانا ہے۔

اپنی کمائی کو بچانے کی بات کرتے ہوئے میں اس کی بہترین زندہ مثال بلدون ڈھینگرا سے ملا۔ میں اسے لاہور سے جانتا تھا جب وہ لیکچرر کے طور پر گورنمنٹ کالج میں آیا تھا۔ وہ ایک خوش وضع' پست قامت' جوش و ولولے اور ادبی امنگوں سے بھرپور شخص تھا۔ لاہور میں اس نے ایک مضمون شائع کروایا جو اس نے کسی یونیورسٹی مقابلے میں بھیجا تھا۔ طبع شدہ ایڈیشن نے یہ تاثر دیا گویا اس نے انعام جیت لیا ہے۔ ایسا تھا نہیں۔ تقسیم کے وقت وہ پیرس

چلا آیا اور روانی سے فرانسیسی بولنا سیکھی۔ اس نے اور اس کی بیوی کملا نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کا محاصرہ کر لیا اور اسے یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کو قائل کرنے کا کہا کہ وہ اسے ملازمت دے دے۔ اسے شعبۂ ابلاغِ عامہ میں عارضی طور پر ایک کمتر ملازمت دے دی گئی۔ اس کی بیوی یورپ کے مختلف حصوں میں لیکچر دے کر اس کی آمدنی میں اضافہ کرتی تھی۔ ان کے پاس ایک کمرے کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ جب ان کی دو بیٹیاں سکول سے چھٹیوں میں انہیں ملنے کے لیے انگلینڈ سے آئیں تو انہیں اپنے والدین کی نیچے گلی میں کھڑی کی گئی کار میں سونا پڑا۔ انہوں نے اپنے کھانے مفت حاصل کرنے کا بھی منصوبہ بنایا۔ یونیسکو ہاؤس میں شاموں میں ہمیشہ ایک یا دو استقبالیے ہوتے رہتے تھے۔ کملا آتی اور میز بانوں سے پوچھتی کہ کیا انہوں نے اس کے شوہر کو کہیں دیکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا نہیں ہوتا تھا مگر کیا وہ اپنی تلاش دوبارہ شروع کرنے سے پہلے ایک جام نوش کرے گی؟ پھر بلدون اپنی بیوی کو ڈھونڈتا ہوا آ نکلتا اور اسے بھی ایک جام پینے کا کہا جاتا۔ کملا اس کے کانوں میں سرگوشی کرتی ''میں نے گھر پر کچھ نہیں پکایا ہے۔ تم ادھر ہی جو کھانا چاہتے ہو کھا لو۔'' انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھی خوب سکھا دیا ہوا تھا۔ کوئی ایک لنچ کے وقت آ ٹپکتی بلدون کے کسی رفیق کار سے مشورہ لینے کے لیے اور انہیں ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی جاتی۔ مجھے یہ جاننے میں تھوڑا وقت لگا کہ میں تو کم از کم ہفتے میں ایک مرتبہ لڑکیوں کو کھلاتا رہا تھا۔ کرپال اور دوسرے ہندوستانی ہر اگلے روز ان کا انتظار کرتے تھے۔
ڈھینگروں کی سب سے بڑی کامیابی وہ طریقہ تھا جس کے تحت انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کا انتظام کیا۔ انہوں نے پتہ چلایا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا پیرس کا دورہ کب ہوگا اور انہوں نے اس موقع پر اس سے اپنی بچی کے لیے دعا کرنے کا کہا۔ آشیرواد دینے کے اس کے خط سے مسلح وہ ہندوستانی سفیر تک پہنچے جس کے ساتھ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ٹھہرنا تھا اور اس سے اجازت مانگی کہ وہ اس کی رہائش گاہ میں شادی کی تقریب کا انعقاد کر لیں کیونکہ وہ کہیں بھی ''ہَوَن'' کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ وہ فوری طور پر آمادہ ہو گیا۔ نیز شادی کا استقبالیہ دینے پر بھی راضی ہو گیا۔ کملا سینور مونٹیسوری (میڈم مونٹیسوری کے بیٹے) کو اپنا ''دھرم بھائی'' بنا چکی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ یہ رسم ہے کہ ماں کا بھائی اپنی بھانجی کو سونے کی چوڑیاں دیا کرتا ہے۔ اس نے لڑکی کے لیے سونے کی چوڑیاں بنوا دیں۔ ڈھینگروں نے فیاضی کے ساتھ ان سب لوگوں کو دعوت دی جنہیں وہ جانتے تھے۔ کارڈ پر درج تھا کہ ہندوستان کا نائب صدر اس موقع پر رونق افروز ہوگا اور دولہا دولہن کو آشیرواد دے گا۔ ہر کسی نے دعوت قبول کر لی۔ ہر کوئی ایک قیمتی تحفے لیے آیا۔ ڈھینگروں کا کل خرچہ کارڈ چھپوانے اور ڈاک سے بھیجنے کا ہوا تھا۔
ڈھینگروں کی اس تدبیر کاری نے مجھے افسانہ ''مسٹر کانجو کا عظیم معجزہ'' لکھنے کی تحریک دی۔

کملا ہمارے ساتھ اکثر کھانا کھانے آتی تھی۔ میرے خاندان کے ہندوستان واپس چلے جانے کے بعد اس نے مجھے کھانے کی دعوت دی کہ میں کھانے کے لوازمات لے آؤں وہ میرے لیے کھانا پکا دے گی۔ میں نے کبھی اس کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بلدون ڈھینگرا یونیسکو میں کیا کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی اس کے کمرے میں جاتا تو وہ اسے ایک خالی دیوار کو تکتے ہوئے بے کار بیٹھا پاتا۔ وہ امید کرتے تھے کہ ایک روز وہ دنیا کو ہلا دینے والے تصور کے ساتھ باہر نکلے گا۔

ڈائریکٹر جنرل کا پیمانۂ صبر لبریز ہونا شروع ہوگیا۔ رادھا کرشنن کے دباؤ تلے اس نے دو بار چھ چھ ماہ کی توسیع دی۔ پھر فارغ کر دیا۔ میرے پیرس چھوڑنے سے پہلے کملا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کے دہلی والے گھر کے لیے خریدی گئیں کچھ چیزیں اپنے ذاتی سامان کے طور پر ساتھ لے جاؤں۔ وہ چیزیں اس کے غسل خانے کے لیے نہانے کا ٹب اور سنگِ مرمر کی ٹائلیں تھیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ بلدون پیرس میں ہی رہا' اس نے ایک انگریز معشوقہ رکھ لی اور اس سے ایک بیٹا پیدا کیا۔ کملا بہت مشتعل ہوئی۔ اپنی بچت سے اس نے دہلی میں جائیداد تعمیر کی تھی۔ اب ادھر ایک حرامی اس کا دعویدار ہو گیا تھا۔ چند ایک ماہ بعد بلدون خون کی شدید کمی کی وجہ سے مر گیا۔

یونیسکو میں ادیسیشیا' کرپال اور میرے علاوہ کوئی آدھی درجن ہندوستانی تھے۔ ادھر ڈاکٹر نائیڈو' ایک سائنس داں تھا' جس کی یورپی بیوی اور ایک خوب صورت بیٹی لیلا تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سکول کی وردی (یونیفارم) میں اور چہرے پر روشنائی کے دھبوں کے ساتھ مجھ سے ملنے میرے دفتر میں چلی آئی تھی۔ وہ مشکل سے پندرہ برس کی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک شہوت انگیز حسینہ بننے والی ہے۔ وہ شہوت انگیز حسینہ بنی۔ وہ ہندوستان کے ممتاز ہوٹل مالک کے بیٹے تکی اوبرائے کی نظروں میں آ گئی۔ انہوں نے ایک تباہ کن شادی کر لی۔ اس نے ان سے الگ ہو کر بمبئی میں فلمی صنعت میں شمولیت سے پہلے اس کی دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ پھر اس نے ڈوم موریس سے شادی کر لی۔

وہاں ایک جنوبی ہندوستانی جوڑا بھی تھا۔ وہ ایک بجٹ افسر تھا اور اپنے کام میں بہت طاق تھا۔ وہ دونوں اولاد کے حامل ہونے کے حوالے سے بہت مایوس و مضطرب تھے۔ مگر جتنا زیادہ وہ کوشش کرتا اتنا ہی اس کی بیوی حاملہ ہونے میں ناکام رہتی۔ اس نے دوسری عورتوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ ہر ویک اینڈ پر اسے جینوا میں کوئی اہم کام آن پڑتا تھا۔ وہ جمعے کی شاموں کو پیرس سے چلا جاتا اور سوموار کو دفتر جانے کے وقت پہنچ جاتا تھا۔ ایک سوموار کی صبح اس کے پاس صرف جلدی جلدی شیو کرنے' نئے کپڑے پہننے اور دفتر کو بھاگ نکلنے ہی کا

وقت تھا۔ اس کی بیوی نے سوچا کہ وہ اس کا سوٹ استری کر دے۔ جب وہ استری کر رہی تھی تو اسے اندر والی جیب میں ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھا محسوس ہوا۔ اس میں موجود چیزوں کی اسے کوئی سمجھ نہیں آئی کیونکہ انہیں اس طرح کی چیزیں استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ تاہم وہ ان کے بارے میں بہت مشکوک ہوگئی۔ وہ ایک پڑوسن امریکی خاتون کے پاس پوچھنے کے لیے گئی کہ وہ کیا چیزیں تھیں۔ جب بتایا گیا تو قابل فہم سی بات ہے کہ پریشان ہوگئی اور فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کا محاسبہ کرے گی۔ اس کی سہیلی نے اسے ایسا نہ کرنے کا قائل کیا۔ ''میں تمہارے لیے اس کا پکا بندوبست کردوں گی۔'' اس نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ اس خاتون نے ایلرمینز درد کش لوشن کی بوتل خریدی' جو گھوڑوں کے پٹھوں کو سکون دینے کے لیے استعمال ہوا کرتی تھی' تاہم اتنی مؤثر تھی کہ انسانی جلد پر جلن پیدا کرسکتی تھی۔ اس نے پیکٹ میں موجود چیزوں کے اندر والی جانب اس دوا کو لگا دیا اور اسے واپس شوہر کے کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ اس نے اپنے جنیوا کے اگلے دورے میں اس سوٹ کو پہنا۔ وہ اس کا آخری دورہ تھا۔

یونیسکو میں رونما ہونے والے دوسرے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو میرے ذہن میں رہ گئے ہیں۔ ایک کا تعلق چوہوں کے مسئلے سے تھا۔ ہوٹل میجسٹک میں زیر زمین سرنگیں تھیں جو تو سینغی بدرو نہروں سے' جو کہ سارے شہر کے طول وعرض میں زمین کے نیچے بہتی تھیں' جا ملتی تھیں۔ وہ عفریتوں کی سی جسامت کے بدرووں والے چوہوں سے بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے یونیسکو کے ریستورانوں اور کیفے ٹیریاؤں کے خوراک کی ذخیرہ گاہوں (فوڈ سٹوروں) تک راستے نکال لیے تھے اور وہ بھاری نقصانات کا باعث بنے تھے۔ یونیسکو کے رات کے چوکیداروں کو چوہوں کو مارنے کے لیے فلیش لائٹس اور پستول دیئے گئے تھے۔ وہ ان سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہیں تھے اور چند ایک کو تو چوہوں نے کاٹ کھایا تھا۔ لوتھر ایوانز کو مسئلے کا اندازہ تھا۔ عقل سلیم کا مالک ہونے کی وجہ سے اس نے مشورہ دیا کہ یونیسکو چند بلیاں خریدے اور انہیں بحران سے نمٹنے دے۔ بلیوں کو تو چوہوں کو مارنے اور کھانے کا زبردست موقع مل گیا۔ جب تک چوہے غائب ہوئے بلیاں دگنی چگنی اور چھوٹے چھوٹے چیتوں جیسی ہوگئی تھیں۔ چوہوں کے غائب ہونے کے بعد انہوں نے یونیسکو کے فوڈ سٹوروں میں گھسنا شروع کر دیا اور پہلے سے بھی زیادہ نقصانات کا باعث بننے لگیں۔ ایک مرتبہ پھر لوتھر ایوانز بچاؤ کے لیے آیا۔ بلیاں پکڑنے والوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک ویک اینڈ میں انہوں نے 80 سے زیادہ بلیاں پکڑیں' انہیں بوریوں میں ڈالا اور پیرس سے دور کسی مقام پر سین میں ڈبونے کے لیے اپنے ٹرکوں میں لاد دیا۔ جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تو بلیاں پکڑنے والوں پر رحم وترس کا غلبہ ہوگیا۔ 80 معصوم بلیوں کو ڈبونا؟ کیوں نہ انہیں اپنی حفاظت خود کرنے کے لیے

آزاد کر دیا جائے؟ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بلیاں پکڑنے والے یونیسکو واپس آئے اور اپنی فیس وصول کر لی۔ اگلے چند روز میں ایک کے بعد ایک بلیوں نے ہوٹل میجسٹک تک راستہ ڈھونڈ لیا۔ یہ واقعہ میرے افسانے ''ثقافت کے گھر میں چوہے اور بلیاں'' کا موضوع بنا۔

جیسا کہ کوئی بھی شخص توقع کر سکتا ہے کہ ایک ایسے ادارے میں جہاں لوگوں کے پاس' سوائے سٹینو گرافروں اور دوسرے چھوٹے عملے کے' کرنے کو بہت کم کام ہو اور خود کو بے حد مصروف ظاہر کرنے کے لیے بہت سا فالتو وقت ہو' وہاں معمول سے زیادہ تعداد میں خبطی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ایک مثال ہی کافی رہے گی۔ وہاں ایک نوجوان چیک لڑکی تھی' جس کا نام میں بھول گیا ہوں' وہ ٹیبل ٹینس کی بہت شوقین تھی۔ شام کو گھر جانے سے پہلے وہ ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ وقت سیلولائیڈ کی ایک گیند کو مارنے میں صرف کیا کرتی تھی۔ میرا بیٹا جو اپنی ماں کے ساتھ گھر تک کار میں سواری کرنے کے لیے آجاتا تھا' اس کے ساتھ اکثر کھیلا کرتا تھا۔ وہ ایک شرمیلی لڑکی تھی جسے ہر کوئی پسند کیا کرتا تھا۔ وہ اکیلی رہتی تھی اور اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ ایک روز نہ تو وہ دکھائی دی اور نہ ہی اس نے اطلاع بھیجی کہ وہ کیوں نہیں آئی۔ اس کے دوستوں میں سے ایک یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ گئی کہ سب ٹھیک تو ہے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے کسی قسم کی دل کی تکلیف ہے اور وہ باقاعدگی سے معائنہ کروایا کرتی تھی۔ جب وہ عورت اس کے اپارٹمنٹ گئی تو اس نے دروازہ کھلا ہوا اور لڑکی کو ٹیلی فون کے قریب پڑا ہوا پایا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ مر چکی ہے۔ یونیسکو میں اس کی دوستوں میں سے ایک نے ڈاکٹر کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور قسم کھائی کہ اس پر جادو کیا گیا ہے اور جس چیز کی اسے حقیقتاً ضرورت ہے وہ ہے کوئی ایسا شخص جو خفیہ منتر جانتا ہو اور اسے جادو سے نکال لے۔ کون اس کالے آدمی سے زیادہ منتروں کو جان سکتا تھا جو پگڑی باندھتا ہو اور ڈاڑھی والا ہو اور لڑکی کا دوست بھی مشہور ہو؟

تین عورتوں کا ایک وفد مجھے ملنے آیا۔ کیا میں سن چکا تھا کہ چیک لڑکی کے ساتھ کیا بیتی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ میں سن چکا تھا اور یہ سن کر بہت دکھی ہوا تھا کہ اتنی کم عمر اور پسند کیے جانے کے قابل لڑکی زندگی کی ابتدا ہی میں چلی گئی تھی۔ ''لیکن مسٹر سنگھ! کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ واقعی مر گئی ہے؟'' انہوں نے کہا ''وہ ایک شیطانی اثر میں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ اس کو اس سے نکالنے کا درست منتر جانتے ہیں۔'' میں تو بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے ان سے بحث کرنے کی کوشش کی۔ ''ڈاکٹر جانتے ہیں کہ وہ کسی سحر کے اثر میں ہے یا مر گئی ہے۔''...... میں نے احتجاج کیا۔ انہوں نے جواب دیا: ''ڈاکٹروں کو ایسی چیزوں کا کیا پتہ؟ اگر آپ منتر جانتے ہیں تو ہم آپ کو اس تک لیے چلتی ہیں اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ وہ مری نہیں

ہے صرف گہری نیند میں ہے۔‘‘ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا: اگرچہ میں مشرقی ہوں تاہم میں کسی باطنی علم کا حامل نہیں ہوں۔ ’’ڈھینگرا یا کرپال یا کسی دوسرے ہندوستانی یا پاکستانی سے کہو۔‘‘ میں نے تجویز دی۔ مجھے نہیں علم کہ انہیں ان سے کوئی کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں تاہم اگلے دن عملے کے سربراہ‘ ایک سوکھے سڑے انگریز ولیم فر نے مجھے اپنے دفتر میں آنے کا کہا۔ بہت سی عورتیں بشمول ان کے جنہوں نے مجھ سے ملاقات کی تھی‘ اس کی انتظار گاہ (ویٹنگ روم) میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں اندر گیا۔ بل فر نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور مجھ سے بولا :’’اگر تم اس بے چاری چیک لڑکی کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ تم جانتے ہی ہو کہ اسے آج شام دفنا دیا جانا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اسے زندہ دفنا دیا جائے۔‘‘ مجھے سرد مزاج انگریز کی درخواست سے مزید تکلیف پہنچی۔ ’’بل! کیا تم پاگل ہو؟ تم نے ان سب پاگل عورتوں کو سنا اور مجھ سے توقع کرتے ہو کہ میں مردہ کو زندہ کر دوں! یہ کیا پاگل پن ہے؟‘‘

اس بات نے اسے تھوڑا سا صدمہ پہنچایا۔ ’’میں جانتا ہوں یہ عجیب لگتا ہے‘ تاہم چونکہ یہ عورتیں اصرار کر رہی تھیں کہ تم درست منتر جانتے ہو اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں کوشش کرنے کے لیے کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔‘‘

میں یونیسکو پر کتاب نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔ میرے پاس پانچ سال کا معاہدہ تھا۔ میرے جیسے معاہدوں کو توسیع نہیں ملتی تھی۔ ابھی میں اس درجے میں نہیں آیا تھا کہ توسیع حاصل کر لیتا اور پانچ برس اتنی کم مدت تھی کہ لوئر کی سیر کرنے اور اچھے کھانوں اور وائن سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ بہت تھوڑا کام ہو سکتا تھا۔ مجھے جلد ہی وقفہ کر جانا تھا۔ میں نے کمپین‘ جہاں پہلی عالمی جنگ ختم کرنے کے لیے فرانسیسیوں اور جرمنوں کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے‘ کے نزدیک گھنے جنگل میں سینٹ جین آ بوئس (سینٹ جان کا جنگل) نامی بستی میں ایک خوب صورت مے خانہ ڈھونڈ نکالا۔ کار کے ذریعے یہ بورگ لارائن سے بمشکل کوئی چالیس منٹ کے فاصلے پر تھا تاہم آبادی سے لاکھوں میل دور دکھائی پڑتا تھا۔ جنگل اتنا تاریک اور گھنا تھا کہ دن کی روشنی میں بھی چلتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا احساس ہوتا رہا۔ کھانا باافراط تھا۔ وائن پینے لائق تھی۔ چیٹیو کے چند بڑھئی‘ کسان اور گورکن وہاں مے خانے میں اپنا شام کا جام نوش کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان دعا سلام ہوئی۔ انہوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ انہوں نے سنا ہوا تھا کہ میں وہاں کس لیے موجود ہوں: فرانسیسی لوگ کسی لکھاری کی مبالغہ آمیزی کی حد تک تعظیم کرتے ہیں۔ یہ جگہ کسی کے غور و فکر کرنے اور انہیں کاغذ پر منتقل کرنے کے لیے بہت اچھی تھی۔ میں نے اپنے دوسرے ناول پر کام شروع کر دیا: ’’میں بلبل کو نہیں سنوں گا۔‘‘ (I Shall not hear

the night ingale)۔

یونیسکو میں میرے غیر ولولہ انگیز زمانے میں ایک خوش گوار وقفہ میڈرڈ میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ کی رپورٹنگ کرنا تھا۔ مجھے سپین کی سیر کرنے کی بہت زیادہ خواہش تھی۔ جب میں لندن میں تھا تو میری وہاں جانے کی پہلی کوشش سپین کی خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد انٹرنیشنل بریگیڈ کے رکن کے طور پر تھی مگر وہ کوشش ایک فارم پر میرا نام درج کرنے سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ (واحد لوگ جنہیں اس کا پتہ تھا وہ تھی سی آئی اے۔ مجھے کمیونسٹوں کا ہمدرد مشہور ہونے کی وجہ سے امریکی ویزوں کے حصول میں دشواری پڑتی تھی اور میں 1970ء کے عشرے تک ان کی الرٹ لسٹ پر رہا) کرپال اور میں نے کار کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا۔ میری سیکرٹری یوون لی روجیٹیل نے ہمارے ساتھ مفت سواری کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے سارے راستے ڈرائیورنگ کرنا پڑی کیونکہ کرپال ایک لاپرواڈرائیور کے طور پر بدنام تھا۔ ہم دن میں دو سومیل کا سفر طے کرتے ہوئے مزے مزے سے ڈرائیونگ کرتے راتوں میں چھوٹے ہوٹلوں میں شب بسری کرتے گئے۔ ہمیں سپینی سرحد پر دشواری کی توقع تھی لیکن چونکہ ہمارے پاس سفارتی پاسپورٹ تھے اس لیے ہمیں بغیر دقت کے گزر جانے دیا گیا۔ جونہی ہم سپین میں داخل ہوئے میں نے دونوں ملکوں کے فطری مناظر اور زندگی کے معیارات میں فرق محسوس کیا۔ ہم جس سپینی قصبے کے قریب سے گزرے ہم نے لوگوں کو زیادہ تر بچوں کو ہجوم کیے اور دوڑتے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ریستورانوں میں کھانا محدود تھا' شرابیں (شیری کے سوا) دوسرے درجے کی تھیں۔ تاہم میڈرڈ میں موجود ہوٹل یورپ کے دوسرے اچھے ہوٹلوں جیسے تھے۔ کرپال کو ایگزیکٹو بورڈ میں کچھ کام تھا' مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ میں نے اپنا وقت عجائب گھروں اور گیلریوں میں گھوم پھر کر سودمند انداز میں گزارا۔ میں نے کرپال کو اپنے ساتھ پریڈو چلنے کے لیے قائل کیا۔ اس نے دعویٰ کیا: ''میں نے لوور کو دیکھا ہے' اس میں دنیا کے ہر آرٹسٹ کا بہترین شاہکار موجود ہے۔ میں اپنا وقت میڈرڈ میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔'' پریڈو کی دوسری مرتبہ سیر کرنے کے بعد میں نے کرپال کو بتایا کہ پریڈو میں لوور کی نسبت زیادہ اچھا ذخیرہ موجود ہے (جو کہ سچ نہیں تھا) اور جب وہ پیرس لوٹے گا تو یقیناً اس کے رفقائے کار اس سے وہاں جانے کے حوالے سے پوچھیں گے۔ وہ کس قسم کا شعبۂ ثقافت کا سربراہ ہے اگر وہ عظیم فن کاروں کے ناموں تک سے واقف نہ ہو؟ اس نے محسوس کیا کہ میری بات میں وزن ہے۔ اگلے روز وہ جاگا اور پریڈو کی راہداریوں میں گھومنے لگا اور محض پندرہ منٹ میں ہی مشہور آرٹ گیلری کی سیر کر ڈالی۔ جب پیرس میں اس کے رفقائے کار نے پوچھا تو اس نے پریڈو کی تعریف کرتے ہوئے اسے لوور سے برتر بتایا۔ وہ اس کے تبصرے سے مایوس ہوئے: ''ڈاکٹر کرپال آپ ایسا

کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لوور پریڈو سے تین گنا بڑی ہے اور جہاں تک فن کے ذخیرے کا تعلق ہے تو دنیا میں سب سے زیادہ باثروت ہے۔'' بعد میں کرپال نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''کے سنگھ! تم ہمیشہ مجھے گمراہ کرتے ہو۔'' مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس کو گیلری کی سیر پر لے جانے کا وہی واحد طریقہ تھا۔

ایک شام جب ہم اپنے ہوٹل کے پرہجوم استقبالیہ ہال میں چائے پی رہے تھے کرپال نے الزبتھ ادیسیشیا کو فون کرنے اور اسے ڈنر پر مدعو کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہوٹل کے مکینوں کے لیے دیوار میں نصب مخصوص ٹیلی فون تک گیا اور فون کیا۔ جب وہ لائن پر آئی تو وہ اپنی بلند ترین آواز میں چلایا: ''لزبتھ! تم ڈنر کے لیے کیا کر رہی ہو؟ ہمارے ہوٹل آ جاؤ اور ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ میلکم رسمی بینکوئٹ کر رہا ہے۔'' وہ فتح مندانہ انداز میں میز پر واپس آیا اور اعلان کیا: ''الزبتھ ڈنر ہمارے ساتھ کرے گی۔'' میں نے جواب دیا: ''میں جانتا ہوں: ہال میں موجود ہر شخص ایسا ہی کرے گا۔ تم جب بھی فون استعمال کرتے ہو تو اتنا کیوں چیختے ہو؟'' وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''اس کا ہوٹل یہاں سے پانچ میل دور ہے۔'' ......اس نے جواب دیا۔

اس سے مجھے ونسٹن چرچل کا اپنے ایک کابینہ کے ساتھی مسٹر براؤن' جو جنگ کے دوران میں ساتھ والے کیبن میں بیٹھا کرتا تھا' کے بارے میں تبصرہ یاد آ گیا۔ ایک روز وہ فون پر بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ چرچل نے اپنی سیکرٹری سے کہا کہ وہ جائے اور مسٹر براؤن سے کہے کہ وہ اپنی بلند ترین آواز میں باتیں نہیں کرے۔ سیکرٹری چرچل کو اطلاع دینے لوٹی: ''سر وزیر سکاٹ لینڈ بات کر رہے ہیں۔'' چرچل نے بہت طنزیہ انداز میں جواب دیا: ''مجھے یقین ہے وہ سکاٹ لینڈ بات کر رہا ہے مگر اسے کہو فون استعمال کرے۔''

میں یہ تسلیم کرتے ہوئے شرمندہ ہوں کہ سپین میں جن چیزوں سے میں بہت زیادہ لطف اندوز ہوا ان میں بیلوں کی لڑائی (بل فائٹنگ) بھی شامل تھی۔ میرے ساتھ ایک بہت کمزور انگریز عورت مسز پاؤل اور یونیسکو کے عملے میں شامل ایک جسیم' پہلوان نما فرانسیسی عورت تھی۔ بل فائٹ کا سب سے زیادہ دلکش نظارہ افتتاحیہ ہوتا ہے جب جھنڈے بردار' میٹا ڈور (بیل سے لڑنے والے)' بلم سوار اور ٹوریا ڈور اپنے بڑے سیاہ ہیٹوں اور سرخ چغوں میں گھوڑوں پر سوار اکھاڑے میں داخل ہوتے ہیں' ججوں کو سلام کرتے ہیں اور آغاز کے لیے اجازت طلب کرتے ہیں۔ جب ایک بہت جسیم بیل کو اندر آنے دیا جاتا ہے تو فائٹ شروع ہو جاتی ہے۔ اپنے کٹہرے سے اچانک باہر آ جانا اور پرشور تحسین اسے گھبرا دیتی ہے اور وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ اکھاڑے کے دوسرے سرے پر گھوڑے پر سوار ایک آدمی کو دیکھتا ہے۔ اس کی گھبراہٹ غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ گھوڑے اور سوار کی طرف لپکتا

ہے۔ شہ سوار لپکتے ہوئے بیل کی طرف بڑھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بیل اور گھوڑے میں ہولناک ٹکراؤ ہو جائے گا۔ ٹکراؤ سے لمحہ بھر پہلے گھوڑا چند انچ کے فاصلے سے کترا کر گزرتا ہے اور سوار بیل کی گردن میں دو برچھیاں گھونپ دیتا ہے۔ یہ ایک سانس روک دینے والا منظر ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ بہت وحشیانہ ہے۔ لمبے لمبے نیزوں سے مسلح بلم سوار زخمی بیل پر حملے کرتے ہیں؛ بیل گھوڑوں کو ٹکریں مارتا ہے اور ممکنہ طور پر ان کی پسلیاں توڑ دیتا ہے۔ گھوڑے کی آواز والی نالی کو اندر داخل ہونے سے پہلے سختی سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ درد کی وجہ سے اس کی چیخیں سنائی نہیں دیں۔ آخر میں زبردست فن کی نمائش ہوتی ہے۔ بیلوں سے لڑنے والا (میٹاڈور) سرخ کپڑے اور خمدار تلوار سے لیس تھکے ہوئے اور لہولہان بیل تک پہنچتا ہے۔ ہر مرتبہ جب بیل سرخ کپڑے پر حملہ کرتا ہے، میٹاڈور اسے کنی دے جاتا ہے۔ موت کا وحشیانہ رقص جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بیل بری طرح تھک جاتا ہے۔ اس کا سر جھک جاتا ہے اور زبان باہر لٹکنے لگتی ہے۔ تب بیل کے سینگوں سے ایک فٹ دور اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر میٹاڈور اس کے سر اور گردن کے درمیان ایک جگہ کا نشانہ لیتا ہے۔ ہجوم چلاتا ہے۔ ''اورا'' (اب)۔ وہ اپنی خمدار تلوار کو اس طرح پھینکتا ہے گویا وہ برچھی کو ڈارٹ بورڈ پر پھینک رہا ہو۔ اگر نشانہ درست ہو تو خمدار تلوار اس طرح جاتی ہے گویا مکھن میں چاقو اتر گیا ہو۔ بیل زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے ـــــ مردہ۔

پہلی لڑائی میں اس قدر خون کے نظارے نے میری طبیعت خراب کر دی اور قے میرے گلے تک آ گئی۔ مضبوط دکھائی دینے والی فرانسیسی عورت رونے لگی اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی کہ وہ ایسی درندگی کو مزید نہیں برداشت کر سکتی۔ کمزور مسز پاول بہت پُر جوش تھی اور ہر حرکت پر بے حد خوش ہوتی تھی۔ ابتدائی ردعمل کے بعد میں نے لڑائیوں سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا اور احساس جرم میں مبتلا ہوں کہ میں اس وحشیانہ کھیل سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ آخر میں ججوں نے میٹاڈوروں کو انعامات دیئے۔ اچھی کارکردگی پر میٹاڈور نے جس بیل کو مارا تھا اس کے کان دیئے گئے۔ اگر کارکردگی بہت ہی اچھی ہوتی تو جج اسے بیل کی دم رکھنے کے لیے دیتے تھے۔ انگریزی میں بروشر میں بل فائٹنگ کی تکنیکی باریکیوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ اگر جج میٹاڈور کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں تو وہ اسے بیل کے کان دے سکتے ہیں۔ تاہم وحشیانہ اور خونیں کھیل ہونے کے باوجود اس کا اچھا وصف یہ ہے کہ بیل کا گوشت فروخت کے لیے سٹیڈیم کے باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر میں ایک بیل ہوتا تو میں ایک غیر مساویانہ لڑائی میں مارا جاتا نہ کہ کسی مذبح میں ذبح ہوتا۔

فلیمنکو رقص سب سے جدا تھا۔ میں لندن میں سٹیج پر شاندار انٹونیو دیکھ چکا تھا۔ وہ

روسی پیلے کے مقابلے میں سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں زیادہ آسان تھا۔ شاید یہ اس کی مورش (مسلمانوں والی) بنیاد اور کتھک سے اس مماثلت تھی کہ اس نے مجھے بہت مزا دیا۔ فلیمنکو کے ساتھ گانا بھی مجھے شناسا محسوس ہوا۔

☆☆☆

پیرس واپس آ کر میں آگاہ ہوا کہ یونیسکو اور پیرس میں میرے دن ختم ہونے والے ہیں۔ سچ کا لمحہ تب آن پہنچا جب ٹور جیسڈیل کی سیکرٹری آئی اور اس نے مجھے جیسڈیل کی میرے حوالے سے لکھی ہوئی رپورٹ دی۔ قوانین کا تقاضا تھا کہ میں رپورٹ پڑھتا اور جو تبصرہ کرنا چاہتا اس پر لکھ دیتا۔ میں نے سیکرٹری کو کہا: ''میں جیسڈیل کی اپنے بارے میں رائے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔'' اور لفافہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ سیکرٹری نے اصرار کیا کہ میں اسے پڑھوں اور اس پر دستخط کروں۔ میں نے لفافہ پھاڑا اور اسے ردّی کاغذوں کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ جب سیکرٹری خالی ہاتھ واپس گئی اور جو کچھ ہوا تھا جیسڈیل کو بتایا تو اس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ صدمہ زدہ سا ہے۔ اس نے کہا: ''تمہیں کم از کم جو کچھ میں نے لکھا تھا اسے پڑھنا تو چاہیے تھا۔ تمہیں یہ فرض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ایک مخالفانہ رپورٹ تھی۔'' میں نے کہا: ''مسٹر جیسڈیل میں اپنے بارے میں تمہاری رائے جاننے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں کیونکہ یہاں میرے کرنے کو کوئی کام نہیں ہے۔''

میں نے ڈائریکٹر جنرل تک پہنچانے کے لیے جیسڈیل کو مطلوبہ تین ماہ کا نوٹس بھیج دیا۔ لوتھر ایوانز اس وقت تک جیسڈیل اور اس کے ساتھ نیویارک سے آنے والے اس کے دوستوں کے حوالے سے اپنی تحسین ختم چکا تھا۔ اس نے جیسڈیل کو بلایا اور اسے بتایا کہ وہ میرے ملازمت چھوڑنے کے فیصلے کا ذمہ دار اُسے ٹھہرائے گا۔ جیسڈیل نے مجھ سے صلح کی کوشش کی۔ اس نے مجھے جنیوا میں منعقد ہونے والی یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشنز کی ایک میٹنگ میں اس لیے شرکت کرنے کا کہا کہ مندوب ہو سکتا ہے کوئی سوال کریں تو میں ان کو یونیسکو کی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ کر سکوں۔ یہ میٹنگ ان میٹنگوں میں سب سے زیادہ بے فائدہ تھی جن میں میں نے شرکت کی تھی۔ میٹنگ میں شرکت کرنے والے مندوبین بڑے بڑے پیٹوں والے امریکی اور یورپی نواب تھے جن کے دلوں میں دنیا کی بہتری کی تمنائیں تھیں۔ پہلے تین دن انہوں نے اقوام متحدہ کی دوسری تنظیموں مثلاً یونیسف' ڈبلیو ایچ او اور آئی ایل او پر بحث و مباحثہ کیا۔ کوئی بھی یونیسکو میں دلچسپی لیتا ہوا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنا وقت ''ٹائمز'' کے معمے حل کرنے میں گزارتا تھا۔ پریشان نہ ہونے کی غرض سے میں نے ہسپانوی زبان والا ایئر فون بند کر دیا تھا جو میں نہیں سمجھتا تھا۔ ایک سہ پہر جب میں معمے میں ڈوبا ہوا تھا تو میں نے

یونیسکو کے لیے ہسپانوی لفظ ''یونیتھکو'' سنا۔ میں نے تیزی سے انگریزی ایئرفون کو چلا دیا اور سنا کہ چیئرمین اعلان کر رہا ہے کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یونیسکو کے مسٹر سنگھ ہمارے درمیان موجود ہیں اور اس نے مجھے اس تنظیم کے حوالے سے مندوبین کے سوالات کے جواب دینے کے لیے مدعو کیا۔ میں نے ان سوالات کو نہیں سنا تھا اور دماغ اتنا حاضر نہیں تھا کہ میں انہیں سوال دہرانے کا کہتا۔ خاموشی کے جس ایک منٹ میں مندوبین مجھے تک رہے تھے اور میں انہیں دیکھ رہا تھا اور پسینہ میری پیشانی پر بہہ رہا تھا' وہ منٹ مجھے لامختتم محسوس ہوا۔ چیئرمین نے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ میں ایک بے ڈھب آدمی ہوں۔ اس نے اعلان کیا: ''مسٹر سنگھ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے لہٰذا ہم ایجنڈے کے اگلے جزو کی طرف جا سکتے ہیں۔''

میں پیرس واپس آیا اور جیسڈیل کو رپورٹ دی کہ کسی نے یونیسکو کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ چند دنوں بعد چیئرمین کی طرف سے اسے ایک رپورٹ موصول ہوئی کہ یونیسکو کے حوالے سے کیے گئے سوالوں کے جواب نہیں دیئے گئے تھے۔

جیسڈیل نے آخری عنایت مجھ پر جو کی وہ تھا ڈنمارک اور سویڈن جا کر یونیسکو میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کرنا۔ میں نے کوپن ہیگن میں دو دن گزارے' کچھ مدیروں سے ملاقاتیں کیں اور ٹیوولی گارڈنز میں' جو اپنے مے خانوں کی وجہ سے مشہور تھا' شامیں گزاریں۔ کسی نے بھی یونیسکو میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ سٹاک ہام میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہاں سوائے حسین دوشیزاؤں پر مشتمل ایک گھرانے کے' جنہوں نے اپنے گھر پر میری خاطر مدارات کی تھی' میں نے میلوں لمبے ساحل دیکھے جہاں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اپنے بدن پر ایک دھجی بھی پہنے ہوئے ہو۔ یہ خاص طور پر روح کو ترفع عطا کرنے والا نظارہ نہیں تھا: بوڑھے مرد اور عورتیں اور بہت موٹے لوگ کپڑوں ہی میں بہترین نظر آتے ہیں۔

میرا اگلا پڑاؤ مالمو کا یونیورسٹی ٹاؤن تھا۔ میں صبح سویرے ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے جس ہوٹل میں کمرہ بک کروایا تھا' اسے تلاش کیا۔ ہوٹل کے شیشے والی کھڑکی سے میں دیکھ سکتا تھا کہ ہوٹل کا چوکیدار صوفے پر گہری نیند سویا ہوا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ گھنٹی بجائی اور دروازہ تھپتھپایا مگر اسے جگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس دروازے ہی میں رکھ دیا اور قصبے پر ایک نظر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ میں لوگوں کے گھروں سے باہر نکلنا شروع ہونے سے پہلے کوئی گھنٹہ بھر سرد اور سنسان گلیوں میں پھرتا رہا۔ میں بھوکا تھا اور کسی کیفے کو ڈھونڈ رہا تھا جہاں میں گرم گرم کافی کا ایک کپ اور کروئساں لے سکوں۔ میں ایک ایسی عمارت تک جا پہنچا جس کا تہہ خانہ روشنی سے دمک رہا تھا اور جہاں ایک کیفے ٹیریا بھی تھا' میں باہر لگی ہوئی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے سو شرمندگی سے بچنے کے لیے

میں نے اپنے سامنے اخبار پھیلا لیا۔ جب میں کاؤنٹر پر پہنچا اور اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے علاوہ ہال میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کا سکول تھا اور میں جس قطار میں شامل ہوگیا تھا وہ طالبات کی قطار تھی جو ناشتے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ میں بہت احمق لگ رہا تھا تاہم میں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے ایک کپ کافی اور ایک بن لیا۔ وہاں کوئی کیش کاؤنٹر نہیں تھا جہاں میں ادائیگی کرسکتا۔ میں نے اپنی خدمت کرنے والی ویٹریس کو مٹھی بھر سوئیڈش سکے دیئے۔ وہ مسکرائی اور انگریزی میں بولی: ''سکول' مفت۔'' میں نے جلدی جلدی اپنا بن کھایا اور کافی پی اور اپنے ہوٹل کو نکل بھاگا۔ وہاں بھی کوئی یونیسکو میں دلچسپی لینے والا نہیں تھا اور میں پیرس واپس آ گیا۔

میں نے اپنے خاندان کو واپس گھر بھیج دیا اور اپنی تعطیلات لے کر انہیں اپنے ناول پر صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے کبھی الوادعی تقریبات میں یقین نہیں رہا ہے۔ یونیسکو میں صرف ایک شخص کو پتہ تھا کہ میں جا رہا ہوں اور وہ تھی پالیٹ میتھیوز' اینگلو فرنچ ماں باپ کی اولاد ایک ساٹھ سالہ بیوہ جس کا پیرس اور ورسیلز کے درمیان ایک چھوٹے سے قصبے ہوڈن کے قریب فیوریز کی بستی میں ایک کاٹیج تھا۔ اس نے مجھے اس کاٹیج کو استعمال کرنے کی پیشکش کی جہاں اس کی نوے سالہ بوڑھی ماں ایک جرمن لڑکی کی زیرنگہداشت رہا کرتی تھی۔ اس کا دوسرا واحد ملازم لکڑی کی ٹانگوں والا مالی جیکس تھا جو دن میں اس کے پھولوں اور پھل دار درختوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ باغ میں ایک کاٹیج تھا جسے ہوڈن میں کام کرنے والے ایک بینک کلرک نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس کی ایک سالہ بچی تھی' اس کی بیوی چند ایک ماہ بعد دوسرے بچے کی ماں بننے کی متوقع تھی۔ ان کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا کتا تھا' جنا۔ سو ایک شام میں ہوٹل میجسٹک سے نکلا جیسا کہ گزشتہ دو برس سے زیادہ عرصے سے میرا معمول رہا تھا مگر بگر دی کوئین (ملکہ سے لواطت کرو۔۔۔ بورگ لارائن) جانے کی بجائے میں فیوریز میں پالیٹ میتھیوز کے کاٹیج چلا گیا۔

مجھے کام میں منہمک ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں اپنا ناشتہ خود تیار کرتا اور ناشپاتی کے پھلوں سے لدے ہوئے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور اپنے ناول پر کام کرتا رہتا۔ پالیٹ کی بوڑھی ماں دیر سے جاگا کرتی تھی اور اس کے پاس ایک لڑکی میریان تھی جو اس کے کمرے ہی میں اس کی صفائی کرتی اور کھانا کھلاتی تھی۔ میں انہیں بہت ہی کم دیکھا کرتا تھا۔ میریان سارا دن فرش صاف کرتے ہوئے' فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے اور مالی کی مدد کرتے ہوئے مصروف رہا کرتی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ مالی جرمن لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے اور اسے میری گھر میں موجودگی گراں گزر رہی ہے۔ بینک کلرک جلدی چلا جایا کرتا تھا اور

دیر سے واپس آتا تھا۔ اس کی بیوی دوسرے حمل میں دشواریوں کا شکار تھی اور اپنی ایک سالہ بیٹی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی۔ بچی میری طرف متوجہ ہوگئی وہ زیادہ تر وقت باغ میں میرے ساتھ گزارا کرتی اور جب تھک جاتی تو میری گود میں ہی سو جایا کرتی تھی۔ میں اسے اس کی بچہ گاڑی (پرام) میں باہر لے جایا کرتا تھا' جتنا ہمارے آگے آگے دوڑتا رہتا' ہم مکئی کے خوشوں سے بھرے ہوئے کھیتوں میں سے گزرتے اور چنڈول نیلے آسمان پر گاتے ہوئے اڑتے رہتے۔ پالیٹ شاموں میں دیر گئے شراب پینے اور ڈنر کرنے کے لیے بروقت پہنچ جایا کرتی تھی۔ صرف ویک اینڈ پر ہی وہ وہاں سارا وقت موجود ہوتی تھی۔ اتواروں کو میں اسے اور میریان کو چرچ لے جایا کرتا تھا ـــ اور انہیں واپس لے کر آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار میریان اور میں کھمبیاں چننے کے لیے صبح سویرے باہر جایا کرتے تھے۔ میں اسے چارٹرز کیتھڈرل اور ورسیلز بھی لے جایا کرتا تھا۔

ان مہینوں کے دوران میں یونیسکو میں میرا رابطہ صرف پریم کرپال سے تھا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ میں اس کے ایک بیڈروم والے اپارٹمنٹ میں جایا کرتا تھا۔ ہم اس وقت کی اس کی سہیلی ریمنڈ سوکولوسکی' ایک خوبصورت فرانسیسی یہودی لڑکی' جو روحانیت' اوسپنسکی اور گرجیف میں دلچسپی لیتی تھی' کے ساتھ ڈنر پر جایا کرتے تھے۔ بعض شاموں میں وہ ہمیں اپنے اپارٹمنٹ میں مدعو کو لیتی' پیانو بجا کر سناتی اور ہمیں ڈنر کھلاتی تھی۔ پریم اکثر اس پر توجہ دیتا تھا۔ وہ بھی جواب دیتی تھی اور امید کرتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے گا یا اسے بستر میں لے جائے گا۔ کرپال کی تو یہ عادت تھی اور جب بستر یا شادی کی انگوٹھی کا تصور ابھرتا تو وہ پسپا ہو جایا کرتا تھا۔ مایوس ہو کر ریمنڈ تسکین و تسلی کے لیے میری طرف متوجہ ہوگئی۔

فیوریز میں دو تین ماہ کا قیام بہت ہی باور آور ثابت ہوا۔ میں اپنے دوسرے ناول کے پہلے خاکے کی تیاری اور ریمنڈ اور میریان کی دوستی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ریمنڈ یونیسکو کی ایک کانفرنس کے دوران میں ہمارے ساتھ دہلی میں قیام کرنے آئی تھی اور میریان نے خطوں کے ذریعے رابطہ قائم رکھا۔ میں جب کبھی جرمنی جاتا تو دوپرٹل میں اس کے اور اس کے شوہر اور اس کی بیٹیوں کے ساتھ قیام کیا کرتا تھا۔ ہماری دوستی اس کے اپنے خاوند کو طلاق دینے کے بعد بھی جاری رہی۔ بعد میں ایسا ہوا کہ وہ کسی ہندو مسلک (Cult) میں شامل ہوگئی اور اس نے اپنے بال منڈوا دیئے اور زعفرانی لباس پہنا اور تب ہمارے درمیان رابطہ ختم ہوگیا۔ میں اسے اس کے کٹڑ کیتھولک ازم اور چرچ جانے سے باز رکھنے میں تو کامیاب ہوگیا تھا مگر اسے اس کے ہردوار میں واقع کسی غیر معروف آشرم کے جوش سے نہیں ہٹا سکا۔ وہ اپنے پہلے دورے میں ہمارے ساتھ دہلی میں رہی۔ میں نے یہ سمجھنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی کہ گنگا میں

نہانے سے‘ ان بتوں کو پوجنے سے جن کے ناموں تک سے وہ واقف نہیں اور ان بھجنوں کو گانے سے جن کو وہ سمجھتی نہیں وہ کیا حاصل کر رہی تھی۔ بینک منیجر کی بیوی‘ بیٹی اور بیٹا پالیٹ کے ساتھ مجھے اس وقت ملنے آئے جب میں ایک مرتبہ پیرس گیا ہوا تھا۔ میں جس ایک سالہ بچی سے واقف تھا وہ اب پروان چڑھ کر پندرہ برس کی خوبصورت سکول گرل بن چکی تھی۔ چند برس بعد اس نے مجھے اپنی شادی کی تصویریں بھیجیں۔

میں نے اپنی مرسیڈیز (نقصان پر) بیچی اور لندن کو جانے والی رات کی گاڑی پکڑنے کے لیے پیرس آ گیا۔ میں نے کسی کو اپنی روانگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کیا تھا مگر سٹیشن پر مجھے الوداع کہنے کے لیے یونیسکو سے تین خواتین آئی ہوئی تھیں جن سے مجھے اس وقت کوئی سروکار نہیں رہا تھا جب وہ میرے ساتھ کام کیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

میں گھر دہلی واپس آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں کسی کام کاج کے بغیر تھا اور میری جیب یا میرے بینک اکاؤنٹ میں بہت تھوڑا سا پیسہ موجود تھا۔ میرے نفع کے خانے میں جو کچھ تھا وہ افسانوں کا ایک انتخاب تھا جو میرے لیے کچھ اچھے تبصرے تو لایا تھا مگر پیسہ نہیں‘ ایک مختصر اور غیر تسلی بخش ”شارٹ ہسٹری آف دی سکھز“ (سکھوں کی مختصر تاریخ) جس کو روایتی سکھوں نے بہت برا بھلا کہا تھا اور ایک ناول جو میرے لیے پیسہ تو لایا تھا مگر اسے میں خرچ کر چکا تھا۔ اور دوسرے ناول کا مسودہ جسے ہنوز کسی پبلشر نے قبول کرنا تھا۔

گھر میں میرا خیر مقدم کرنے والوں میں ایک ایک مہینے کی عمر کا السیشن کا پلا تھا جو میری بیٹی مالا کو میرے باپ کے ایک دوست نے تحفے میں دیا تھا۔ ابتداء میں وہ اپنے مختصر انسانی خاندان میں‘ جو میری بیوی اور ہمارے دو بچوں پر مشتمل تھا‘ مجھے ایک حملہ آور تصور کرتے ہوئے ناراض رہا۔ وہ میرے باپ کے گھر میں اوپر والی خواب گاہ ہی میں سویا کرتا تھا اور پورچ کی چھت کو پاخانے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس وقت تک اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ میں نے پیرس میں چھوڑ دی گئی بلی کے نام پر اس کا نام سمبا رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ بیشتر السیشن ہوا کرتے ہیں‘ سمبا بھی یک شخصی کتا تھا۔ وہ میری بیٹی سے تعلق رکھتا تھا‘ میری بیوی اسے کھانا کھلاتی تھی‘ وہی اسے بیماری کی صورت میں جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی لیکن اس نے مجھے آقا کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ جیسا کہ میں نے کتوں کے بارے میں سنا تھا وہ انسانوں جیسا تھا اور ہماری خوشیوں کی طرح غموں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ جب ہم سجان سنگھ پارک میں اپنے فرشی منزل والے اپارٹمنٹ میں چلے گئے تو وہ ایک پلے سے پروان چڑھ کر طاقت ور پوری جسامت والا جرمن شیفرڈ بن گیا۔ وہ اب بھی ہماری خواب گاہ میں حصہ دار تھا‘ جہاں اس

کی اپنی چارپائی تھی۔ اور ہم نے اپنے سے زیادہ اس کے لیے کمرے میں ایک ایئر کنڈیشنر لگوایا۔ رات کو اکثر وہ میرے کان میں سوں سوں کرتا اور اپنے لیے جگہ فراہم کرنے کا کہتا۔ میں اس کے لیے جگہ بنا دیتا۔ وہ ممنونیت کی گہری آہ بھر کر خود کو بستر پر ڈھیر کر دیا کرتا اور باقی رات بھر کے لیے میرا آدھے سے زیادہ بستر گھیر لیتا۔

ہم اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ اگر ہم چیخنے کی اداکاری کرتے تو وہ تسلی دینے کے لیے ہمارے کانوں میں سوں سوں کرتا اور رونے میں ہمارا ساتھ دیتا۔ بووووؤ وووو۔ اگر وہ شرارت کرتا تو ہم اُسے کونے میں چلے جانے کا حکم دیتے۔ وہ اپنا سر ندامت سے جھکائے رکھتا۔ یہاں تک کہ ہم کہتے ''او کے اب تم واپس آ سکتے ہو۔''

سمبا نے مالا کی آیا کے ساتھ خصوصی رشتہ استوار کر لیا تھا' جو ایک ستر برس کی بوڑھی مائی تھی۔ ''دے سمبا'' جونہی وہ دروازہ کھولتی سمبا کو باہر باغ میں جانے کے لیے پکارتی تھی۔ وہ پوجا کے لیے ساتھ والے گردوارے میں جانے سے پہلے باغ میں اس کے اپنا کام کرنے تک اس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے گردوارے کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے اور باہر بیٹھ کر اس کے جوتوں کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ جونہی صبح کی پوجا ختم ہونے والی ہوتی وہ اس کی ایک جوتی اپنے منہ میں لیتا' گھر کو دوڑ آتا اور اسے بستر کے نیچے چھپا دیا کرتا تھا۔ مائی اس کی منتیں کرتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ''دے سمبا! تم نے میری جوتی کہاں چھپا دی ہے؟'' وہ اس وقت تک اپنی دم ہلاتا کمروں میں پھرتا رہتا جب تک وہ اپنی جوتی ڈھونڈ نہیں لیتی۔

سمبا اپنی شام کی سیر کے لیے ہمیشہ بے صبرا رہا کرتا تھا۔ وہ اپنا سر میری گود میں رکھ دیا کرتا اور درخواست کرنے والے انداز میں مجھے دیکھتا: ''کیا وقت ہو نہیں گیا؟'' اس کی آنکھیں پوچھا کرتی تھیں۔ ''ابھی نہیں'' میں جواب دیا کرتا تھا۔ تب وہ اپنی گلے کی ڈوری لاتا اور اسے میرے پیروں میں رکھ دیتا۔ ''اب؟'' میں اسے اتنا بے صبرا نہ ہونے کا کہتا۔ پھر وہ میری چھڑی لے آتا اور جو کتاب میں پڑھ رہا ہوتا اس پر اسے گرا دیتا۔ ''یقیناً اب!'' فرار کی کوئی راہ نہیں ہوتی تھی۔ جونہی ہم روانہ ہوتے وہ جوش کے عالم میں کانکتا اور کانپنے لگتا۔ جونہی وہ کار کی پچھلی نشست پر چھلانگ لگاتا اس کا کانکنا بلند ہو جاتا۔ وہ اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالے رکھتا اور سڑک پر جس بیل' گائے یا کتے کے پاس سے ہم گزرتے اسے چیلنج کرنا پسند کرتا تھا۔ اُسے لودھی گارڈنز کے داخلی دروازے پر چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ وہ کار کے ساتھ دوڑ لگاتا' صفائی کے لیے تھوڑا سا وقفہ کرتا اور دوبارہ پارکنگ لاٹ تک دوڑ لگاتا۔ اس زمانے میں پارک میں کچھ خرگوش ہوا کرتے تھے۔ وہ جھاڑیوں میں سے ان پر غراتا اور اس کے بعد ان کا تعاقب

کرنے لگتا' ان کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بھونکتا رہتا۔ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ تیز اور کنّی دے جانے والے تھے۔ تاہم وہ گلہریوں کے شکار میں ماہر ہوگیا تھا۔ وہ سیکھ گیا تھا کہ وہ نزدیک ترین درخت کی طرف فرار ہوتی ہیں اور تعاقب سے بچنے کے لیے اپنے بل کی طرف بھاگتی ہیں۔ وہ چپکے سے درخت پر چڑھ جاتا اور پھر ان کو شکار کرتا۔ کھلے میدان میں تو ان کی جائے فرار کوئی نہیں ہوتی تھی۔ تاہم جتنا میں اس کی لعن طعن کرتا حتیٰ کہ اسے مارتا تھا وہ بے ضرر گلہریوں کو ہلاک کرنے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔

ہفتے کی شاموں کو وہ باندھی جانے والی پکنک کی ٹوکریوں کو سونگھ کر اندازہ لگا لیا کرتا تھا کہ اگلا دن پوری طرح اس کے لیے مخصوص ہے۔ صبح ہونے سے بہت پہلے وہ جوش و خروش کے عالم میں ریں ریں کرنا شروع کر دیتا تھا اور ہر کسی کو جگا دیتا تھا۔ کار میں اس پر قابو رکھنا دشوار ہوتا تھا۔ جب ہم سورج کنڈ یا تلپت کے نزدیک کھلے دیہاتی علاقے میں پہنچتے تو ہمیں اسے کار سے باہر چھلانگ لگا دینے سے بچنے کے لیے اسے باہر جانے دینا پڑتا تھا۔ وہ گایوں کے گلوں کا تعاقب کرتا اور انہیں کھیتوں میں منتشر کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا منہ گائے کی پچھلی ٹانگ کی ضرب سے بال بال بچا اور ایک مرتبہ اس نے ایک بکری کو قریباً ہلاک ہی کر دیا تھا۔

کشادہ دیہی علاقے میں تین چار گھنٹے خرگوشوں' ہرنوں یا موروں کا تعاقب کر کے وہ خوش ہوتا ہوا تھک جاتا تھا۔ اپنی اتواروں کی صبحوں کی پکنکوں سے ہم خوابیدہ سمبا کو واپس لاتے تھے۔ اب وہ اپنی شام کی سیر کے لیے اتنا بے صبرا نہیں ہوتا تھا۔

پھر وہ ڈنر کے بعد خان مارکیٹ میں چہل قدمی کے لیے بے تاب ہو جایا کرتا تھا جہاں ہم پان لینے جایا کرتے تھے۔ وہ آئس کریم بیچنے والے کے پاس رک جاتا اور ہم سے اپنے لیے ایک آئس کریم خریدنے کی التجا کرتا۔ وہ آئس کریم کا زبردست شائق تھا۔ وہ بہت ملکیت پسند بھی تھا۔ ایک مرتبہ کوئی شخص ایک درخت کے نیچے دو پلّے بیچ رہا تھا ان پر ہمارے توجہ دینے پر وہ مشتعل ہوگیا۔ جب کبھی ہم درخت کے نیچے رکتے وہ وحشت کے ساتھ اس کے تنے کو کاٹتا تھا۔ سجان سنگھ پارک میں اور اس کے اردگرد کا ہر شخص سمبا کو جانتا تھا۔ پاس پڑوس کے بچے ہمیں سمبا کے والدین کے طور پر جانتے تھے۔

سمبا خوف ناک بھی ہوگیا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ میری بیوی اور بیٹی کے ساتھ لودھی گارڈنز میں گیا ہوا تھا تو ایک سائیکل سوار نے میری بیٹی کی کمر پر تھپڑ مارا اور رفو چکر ہوگیا۔ میری بیوی چلائی ''سمبا! اسے پکڑو!'' سمبا نے اس آدمی کا تعاقب کیا' اسے اس کی سائیکل سے گرا دیا اور اپنے دانت نکالے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اس بے چارے نے ہاتھ جوڑے اور معافی کی التجا کی۔ ایک اور مرتبہ جب میں ڈنر کے بعد اپنے فلیٹ سے باہر نکلا میں نے ایک

لڑکی کو مدد کے لیے چلاتے ہوئے سنا۔ دونو جوان لڑکے اُسے چھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سمبا کے ساتھ اس لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے سمبا کو انہیں پکڑنے کا حکم دیا۔ وہ بھاگا اور ایک لڑکے کو زمین پر گرا دیا۔ وہ بہت جسیم اور مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر سمبا کے اپنے ساتھ ہونے کی وجہ سے میں نے اس کے منہ پر کئی تھپڑ مارے اور اسے گالیاں دیتے ہوئے غنڈہ اور بدمعاش کہا۔ اس نے معافی مانگی اور قسم کھائی کہ دوبارہ کبھی عورتوں کو نہیں چھیڑے گا۔

ہم ہمیشہ سمبا کو مشوبرا یا کسولی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ وہ پہاڑوں میں بہت زیادہ خوش ہوا کرتا تھا۔ میں سیدھی ڈھلانوں پر ہمیں چڑھانے کے لیے اسے اکثر پٹا ڈال دیا کرتا تھا۔ وہ شملہ کی نسبت کسولی کو اس کے بندروں اور لنگوروں کے غولوں کی وجہ سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ ان کے خلاف ختم نہ ہونے والی جنگ چھیڑ دیتا تھا نیز پہاڑی کووں کے خلاف جو اس کے سہ پہر کا کھانا کھاتے وقت گھیراؤ کر لیتے تھے۔

بیشتر کتے چھٹی حس کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمارا سمبا ساتویں اور آٹھویں حس کا بھی حامل تھا۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے میں صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ مجھے اور میری بیوی کو دو ماہ کے لیے بیرون ملک جانا پڑ گیا۔ ہمارے بچے رہائشی (بورڈنگ) سکولوں میں تھے۔ ہم نے اپنے نوکروں کو چھٹی دینے اور فلیٹ کو مقفل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سمبا کو پریم کرپال کے گھر میں رکھوانا تھا: دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے' کیونکہ پریم ہر اتوار کو ہماری بیرونی سیروں میں ہمارے ساتھ ہوتا تھا اور ہمارے گھر مستقل طور پر آیا جایا کرتا تھا۔ وہ خوشی سے سمبا کو لینے پر متفق تھا۔ حکومت کا سینئر افسر ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کیننگ لین میں وسیع باغ والا ایک بنگلہ تھا۔ سمبا وہاں کئی مرتبہ جا چکا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہم اسے وہاں چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ پریشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میری بیوی مجھ سے چند دن پہلے دہلی واپس آ گئی تھی۔ وہ سمبا کو لینے کے لیے کیننگ لین گئی۔ اس نے خوشی کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہا مگر اس کی کار میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ پریم سمبا کی اُنسیت جیتنے میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ میری بیوی نے جھجکتے ہوئے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ ''اگر یہ تمہارے ساتھ ہی خوش ہے تو یہ یہیں رہ سکتا ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ واضح طور پر انہوں نے اس تاریخ کا ذکر کیا تھا جس تاریخ کو میں نے دہلی واپس آنا تھا اور سمبا نے سن لیا تھا۔ میرے دہلی واپس آنے سے ایک شام پہلے سمبا کیننگ لین سے چل کر سجان سنگھ پارک پہنچ گیا اور دروازے کو اپنے پنجوں سے کھرچ کھرچ کر اپنی آمد کا اعلان

کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگلی صبح میں آ رہا ہوں۔ پریم سمبا کے اسے چھوڑ جانے پر میرے اس کی محبوبہ کے اڑا لے جانے سے زیادہ مغموم و اداس تھا۔

سمبا دلکشی کے ساتھ بوڑھا ہوا۔ اس کے منہ کے اردگرد والے بال سفید ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ کبھی کبھار اسے بخار ہو جایا کرتا تھا: ایسے وقت بھی آئے کہ جب میری بیوی نے ساری ساری رات اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے تھپکتے ہوئے گزار دی۔ تب وہ ٹھیک تیرہ برس کا ہو گیا تھا۔ جب مجھے سوار تھمور کالج میں تین مہینے تدریس کی ذمہ داری تفویض کی گئی تو ہمیں اس کو اس کی حقیقی مالکہ میری بیٹی مالا کے پاس چھوڑ دینا پڑا۔ اسے اس کو قریباً ہر روز حیوانوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا۔ وہ بہتر نہیں ہوا۔ اس کی ٹانگیں جھکنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے ہمیں تار بھیجی؟ ''فوری طور پر واپس آئیں، سمبا سنگین بیمار ہے۔'' اگلے روز ہمیں مالا کی طرف سے ایک اور تار موصول ہوا: ''سمبا شانتی سے مر گیا۔''

واضح طور پر سلوتری (حیوانوں کے ڈاکٹر) نے مالا کو بتایا تھا کہ سمبا تکلیف میں ہے، اس کی ٹانگیں مفلوج ہو چکی ہیں اور وہ زیادہ عرصہ نہیں جی سکتا۔ اس کی اجازت سے اس نے اسے کسی مہلک چیز کی خوراک دے دی تھی جس نے اسے سلا دیا۔ اگر مجھے اپنی قریبی دوستوں کے بارے میں بات کرنا ہوتی تو سمبا میری فہرست میں اونچے درجوں میں ہوتا۔ ہم نے کبھی دوسرا کتا نہیں رکھا۔ ہم دوستوں کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتے۔

نواں باب

ہندوستان کی دریافت

جب میں یونیسکو میں تھا تو منصوبہ ساز (پلاننگ) کمیشن کے ترلوک سنگھ نے مجھ سے میرے ''یوجنا'' کا مدیر بننے کے امکان پر گفتگو کی تھی' جسے انہوں نے پانچ سالہ منصوبوں کی مشہوری کے لیے جاری کرنے کی تجویز دی تھی۔ ابتدائی طور پر اسے انگریزی اور ہندی میں ایک ہفتہ وار جریدہ ہونا تھا اور بعد میں دوسری علاقائی زبانوں میں۔ مجھے ہندوستان میں سفر کرنے' کمیونٹی کی ترقی کے پروگراموں کو دیکھنے' ڈیموں' کارخانوں' دیہی کلینکوں کا دورہ کرنے' چھوٹے چھوٹے قصبوں اور بستیوں میں قیام کرنے کا موقع مہیا کرتا۔ تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی تاہم اپنے وطن کو جاننے کا امکان بہت کشش انگیز تھا۔ میرے باپ نے مجھے سجان سنگھ پارک میں ایک گراؤنڈ فلور فلیٹ اور ایک کار دی تھی۔ فلیٹ کارپٹوں اور فرنیچر سے سجا ہوا تھا جو میری بیوی اپنے جہیز میں لائی تھی۔ میری ملکیتی واحد اشیاء میری کتابیں اور پرانے نسخے تھے جو میں نے لندن میں خریدے تھے۔ مجھے کسی اور شے کی ضرورت نہیں تھی اور میں دوبارہ ''نکھٹو'' کہلوایا جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرے پاس دو دفاتر تھے' ایک میٹکاف ہاؤس کے نزدیک اور جمنا کے مغربی کنارے پر واقع پرانے سیکرٹریٹ میں پبلیکیشنز ڈویژن میں دوسرا نئی دہلی میں پلاننگ کمیشن میں۔ اس سے مجھے بہت زبردست فائدہ یہ حاصل ہوا کہ میں ظاہر کر سکتا تھا کہ میں دوسرے دفتر میں تھا جبکہ میں کسی میں بھی نہیں ہوتا۔ مجھے آؤٹر رنگ روڈ پر کوٹلہ فیروز شاہ سے مع اس کے اشوکا ستون' گاندھی کی سمادھی' مغل دہلی کی قدیم دیواروں' زینت مسجد' لال قلعے اور نگم بودھ گھاٹ سے گزرتے ہوئے چھ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ ہر صبح مجھے دہلی کی تاریخ پر ایک ریفریشر کورس میں جانا ہوتا تھا۔ میں واپسی میں اکثر کچھ دیر کے لیے نگم بودھ گھاٹ میں رک جاتا اور مُردوں کو چتاؤں پر رکھتے اور آگ لگائے جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ یہ مشغولیت مجھے خیر کی دنیا میں لے جاتی اور مجھے بہت سی کمینگیوں سے پاک کر دیتی۔ مجھے ہلکا پھلکا محسوس ہوتا۔

پبلیکیشنز ڈویژن کا ڈائریکٹر یو۔ ایس موہن راؤ نامی میسور کا رہنے والا شخص تھا۔

ابتداء میں وہ میرے ساتھ بہتر نہیں تھا۔ تیکنیکی طور پر وہ میرا باس تھا لیکن میں اس سے زیادہ تنخواہ لیتا تھا۔ وہ اپنے اطوار کے اعتبار سے سودیشی مخلوق تھا اور اپنی ٹھیٹھ مقامی یو دیہی بولی میں بات کرتا تھا' ایک قصبہ جو اپنے جنوبی ہندوستانی پکوانوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے میسور' بمبئی اور دہلی کے علاوہ دنیا کا کوئی حصہ نہیں دیکھا تھا اور اسے کچھ یقینی طور پر پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے جس نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی تھی' کئی کتابیں لکھ چکا تھا اور اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ غیر ممالک میں گزار چکا تھا۔ وہ مجھے میرے دفتر اس عملے سے متعارف کروانے لے گیا جسے ''یوجنا'' کے لیے خصوصی طور پر چنا گیا تھا۔ ہندی ایڈیشن کی ادارت من متھ ناتھ گپتا نے کرنا تھی' وہ ایک بنگالی تھا جو غدار کے طور پر جیل میں رہ چکا تھا۔ ٹھیک ابتداء ہی سے وہ ہندی ایڈیشن کو انگریزی ایڈیشن سے آزاد کرنا چاہتا تھا' میں نے اس کی ایسا کرنے کی کوششوں کی مزاحمت کی۔ میرا ذاتی عملہ دو میسوریوں پر مشتمل تھا' سری نواسکر اور ایک نوجوان فوٹوگرافر ٹی۔ ایس۔ نگرجن اور دہلی میں پیدا ہونے والی شیلا دھر۔ انگریزی اور ہندی ایڈیشن میں بہت سے دوسرے افراد بھی تھے جن کے نام اب مجھے بھول گئے ہیں۔

جیسا کہ ترلوک سنگھ نے ہدایت دی تھی پہلے میں بھارت درشن دورے پر گیا' نگرجن کو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایک ماہ کے اندر اندر ہم نے ملک کے طول وعرض میں سفر کرلیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور جن جن لوگوں سے ملا اس کے نوٹس بنا لیے۔ نگرجن نے سینکڑوں بلیک اینڈ وائٹ فلموں سے تصاویر کھینچیں۔ ہم ''یوجنا'' کو شروع کرنے کے لیے بہت سارا مواد لے کر دہلی واپس آئے۔

مجھے کسی رسالے کو چلانے کا بہت تھوڑا تجربہ تھا۔ ''انڈیا نیوز'' جس کی ادارت میں لندن میں انڈیا ہاؤس کے لیے کیا کرتا تھا' سارے کا سارا دہلی سے خارجہ امور کی وزارت کی طرف سے بھیجے گئے مواد پر مشتمل ہوتا تھا۔ بیشتر کام جمال قدوائی کیا کرتا تھا۔ میں تو بس طابع (پرنٹر) کو بھیجنے کے لیے اسے منظور کرتا تھا۔ ''یوجنا'' کا معاملہ مختلف تھا۔ مجھ سے زیادہ سے زیادہ تحریروں کی یا اس کے لیے دوسروں سے لکھوانے کی توقع تھی۔ میں نے بہت سے چربے بنائے اور موزوں ٹائپ چنے۔ میں نے دریا گنج میں ''ٹائمز آف انڈیا'' میں کئی راتیں گیلیاں پڑھتے اور اصلاح کرتے ہوئے گزاریں۔ میں ایک سچے ہندوستانی رسالے کی ادارت کرتے ہوئے بہت پرجوش تھا۔

میں نے ''یوجنا'' کے اجراء کی کمپین پارٹی کی۔ کسی امتناع کا عہد کیے ہوئے ملک میں ایسا تو سنا بھی نہیں گیا تھا۔ جو مدیران آئے (ہندوستانی صحافی دوسرے لوگوں کی شراب کے

لیے بہت فیاض ہوتے ہیں) انہوں نے اجراء اور پہلے شمارے پر نکتہ چینی سے بھرے ہوئے تبصرے لکھے۔ ان کے ردعملوں نے مجھے اذیت دی کیونکہ ''یوجنا'' میری اولاد تھا اور میں اس کی وضع قطع اور مواد کے حوالے سے موافقانہ تبصروں کی توقع کر رہا تھا۔

مجھے مزید مایوسیاں ملیں۔ میں اخبارات بیچنے والوں کے سٹالوں پر گیا۔ ان میں سے بیشتر نے ''یوجنا'' کا سنا بھی نہیں تھا۔ پبلیکیشنز ڈویژن میں میری پیٹھ پیچھے میرے خلاف بہت باتیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ زیادہ فینسی مدیر وہ لندن اور پیرس سے لائے تھے' بالکل ناکام ثابت ہوا! تقسیم کا انچارج شخص' ایک شریر پست قامت پنجابی ہر کسی کو بتاتا پھرا کہ اس کے پاس گوداموں میں نہ بکنے والے شماروں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوڑے چننے والوں کو دینا پڑیں گے۔ مجھے پتہ چلا کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں کو ڈاک کے ذریعے بھیجے جانے والے ہزاروں شمارے پہلا شمارہ شائع ہونے کے ہفتہ بھر بعد بھی ہنوز دفتر کے گودام میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کھلم کھلا سبوتاژ تھا۔ میں موہن راؤ کے دفتر پر چڑھ دوڑا' جو ہمیشہ اس کے حاشیہ برداروں اور ملاقاتیوں سے بھرا رہتا تھا اور استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ میری جیب میں استعفیٰ رکھا ہوا تھا جس میں پبلیکیشنز ڈویژن کی رسالے کی فروخت کاری (مارکیٹنگ) میں عدم دلچسپی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ میرے ملازمت میں آنے کے ایک ماہ بعد ہی میرے چھوڑ جانے سے موہن راؤ کے کیریئر پر منفی اثر پڑتا۔ وہ ایک احمق مگر نیک نیت آدمی تھا۔ اس نے مجھے ٹھنڈا کیا۔ ''اگر یوجنا کے شمارے بروقت نہیں بھیجے گئے تو آسمان تو نہیں گر پڑے گا۔'' (اس کا تکیہ کلام) میں فوری طور پر اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔'' اس نے مجھے یقین دہانی کروائی۔ میں نے نہ جھکنے کا تہیہ کر رکھا تھا: ''اس پنجابی کو جو کہ تقسیم کا انچارج ہے جانا ہوگا یا میں چلا جاؤں گا۔'' ــــ میں نے حتمی طور پر اسے بتا دیا: ''جو کوئی ''یوجنا'' کو ردی کے طور پر فروخت کرنے کا کہے گا وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔''

موہن راؤ اس آدمی سے خوش نہیں تھا اور اس نے اس سے پیچھا چھڑوانے کے لیے میری دھمکی کو استعمال کیا۔ اسے معطل کر دیا گیا۔ ایک اچھے ہندو کی طرح' بجائے یہ وضاحت کرنے کے کہ اس نے اپنی ذمہ داری کیوں نہیں ادا کی' اس نے گئودان کے ذریعے اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ نہ تو گائے اور نہ ہی اس کے دیوتا اس کو بچانے آئے۔ اسے فارغ کر دیا گیا۔

یوجنا نان سٹارٹر ثابت ہوا: تمام حکومتی پبلیکیشنز نان سٹارٹر ہوتی ہیں۔ لوگ ان کے پراپیگنڈا ہونے کا شک کرتے ہیں' وہ حکومت کی طرف سے شہد میں لپٹے ہوئے اعداد و شمار کو نگل لیتے ہیں۔ خیر کون واناماہوتسو میں لگائے جانے والے درختوں' سڑے پتوں کی کھاد کے

گڑھے کھودنے اور پیدا ہونے والی بجلی کے میگا واٹس کے بارے میں پڑھنے کا خواہاں ہوتا ہے؟ مجھے وزیروں کی غیر متاثر کن تقریریں بھی چھاپنا پڑتی تھیں۔ جو کالم میں لکھتا تھا وہ حکومتی کچرے میں گم ہو جاتے تھے۔

اعداد و شمار کی سرکاری گھپلے بازی کی ایک دلچسپ مثال وہ کل ہندوستان (آل انڈیا) مقابلہ تھا جس کے ذریعے دیہاتیوں کی سڑے پتوں کی کھاد کے گڑھے کھودنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ نقد انعامات ہر بستی' دس بستیوں کے گروپوں' ضلع اور ریاست کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ بستی کی سطح کے افسروں نے سڑے پتوں کی کھاد کے گڑھوں کے اعداد و شمار تیار کیے' ضلعی افسروں نے انہیں دگنا کر دیا' ریاست کے افسروں نے دوبارہ انہیں دگنا کر دیا۔ جب جمع کیا گیا تو سڑے پتوں کی کھاد کے گڑھوں کا کل رقبہ ریاست کے کل رقبے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اگر وانا مہوتسو میں لگائے گئے درختوں کی حکومتی میڈیا سے بیان کی گئی تعداد درست تھی تو اب تک سارے کا سارا ہندوستان ایک وسیع جنگل بن گیا ہوتا۔

پلاننگ کمیشن کے اندر کھینچا تانی بھی تھی۔ سربراہ (وائس چیئرمین) ایک مہربان اور اہل شخص وی۔ ٹی۔ کرشنا مچاری تھا۔ بیشتر بوجھ ترلوک سنگھ کے کندھوں پر تھا جو چوبیس گھنٹے کام کرتا اور فاضلانہ رپورٹیں لکھنے والا ایک زبردست شخص تھا۔ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کو تین قانون ساز ادارے چلا رہے ہیں: لوک سبھا' راجیہ سبھا اور ترلوک سبھا (پلاننگ کمیشن)۔ وزیر مالیات ترش کلام ٹی۔ ٹی۔ کرشن مچاری ترلوک سنگھ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا پلاننگ کمیشن کے ضائع کیے گئے سارے کاغذ سے ہندوستان ایک اور بحری جہاز خرید سکتا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی' مہربان دکھائی دینے والا ترلوک سنگھ بھی چند لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروگرام کا بانی ایس۔ کے۔ ڈے تھا۔ میں نے اسے مسوری میں سنا تھا جہاں اس نے ہندوستانیوں کی غذائی عادات کو تبدیل کرنے کی ضرورت پر ایک غیر جذباتی لمبی تقریر کی تھی۔ ہندوستانیوں کے پاس لاکھوں نیم فاقہ زدہ مویشی اور لاکھوں ہی نیم فاقہ زدہ انسان ہیں: اس کا تجویز کردہ حل یہ تھا کہ ہندو بڑا گوشت کھانا شروع کریں۔ میں اس کی جسارت پر ششدر رہ گیا تھا اور ''یوجنا'' میں اس کی تقریر کو وسیع مشہوری دی تھی۔ جس روز شمارہ نکلا اس کے اگلے روز ترلوک سنگھ نے مجھے فون کیا اور اس قسم کی فضول بکواسیات پر اتنی زیادہ جگہ ضائع ہوتے دیکھ کر اپنی شدید ناخوشی کا اظہار کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ ''یوجنا'' مجھے کہیں نہیں لے جا رہا ہے۔ سارے ملک میں شمارے کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے دفتروں اور حکومتی محکموں کو ڈاک سے بھیج دیئے جاتے تھے۔ مجھے کوئی آراء و تبصرے (فیڈ بیک) نہیں ملتے تھے کیونکہ چند ہی افسر اسے پڑھنے کا تردد کرتے

تھے۔ نیوز ایجنٹ اسے لینے سے انکار کر دیتے تھے' چند فروخت یا واپسی کی بنیاد پر لیتے تھے مگر عمومی طور پر انہیں بھیجے گئے شمارے واپس آ جاتے تھے۔ میری واحد تسلی میرے رفقائے کار کی وفاداری تھی جس کے تحت وہ میرے لیے کام کرتے تھے۔ شیلا دھر تو قریبی دوست بن گئی تھی۔ وہ بڑی پیائشوں رکینہ جو مزاج والی' پرجوش اور سخی عورت تھی۔ وہ ایک بہت عمدہ نقال تھی: میں نے دوسروں لوگوں کے لہجے اور اطوار کی نقالی کو بمطابق اصل پایا۔ وہ کلاسیکی ہندوستانی موسیقی کی اچھی مغنیہ بھی تھی اور استادوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ میں کلاسیکی موسیقی کو اچھی طرح نہیں سمجھتا تاہم میں کبھی کبھی اسے اپنے استاد پران ناتھ سے سبق لینے جانے میں رفاقت دیا کرتا تھا۔ فرش پر بیٹھنا ہمیشہ کولہوں میں درد کرتا رہا ہے تاہم میں شیلا کی پرثروت' بھاری آواز میں مختلف راگوں کو سنتے ہوئے گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ نگرجن مجھے اپنے باپ کی طرح سمجھتا تھا اور میرے خاندان کا ایک رکن بن گیا تھا۔ جب اس کی شادی بیناکشی سے ہوئی تو وہ اسے ہم سے متعارف کروانے کے لیے لایا' وہ کسی فرمانبردار بہو کے مانند میرے پاؤں چھونے کے لیے قالین پر جھک گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ میں نے اسے اٹھنے میں مدد دی اور اس کے دونوں گالوں کو چوم لیا ___ ایک آزادی جسے تامل سسر اپنے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نہیں برتتے ہیں۔

کچھ مدت بعد میں موہن راؤ کو بھی پسند کرنے لگا۔ اگرچہ اس کا اپنے شعبے کو چلانے کا طریقہ بے ہنگم تھا تاہم وہ ہر شخص کو خوش رکھنے کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ وہ غرور کا اظہار بالکل نہیں کرتا تھا اور دفتر کے دوسرے لوگوں کے برعکس روپے پیسے کے معاملے میں ایمان دار تھا۔ میں اکثر اس کے کمرے میں لنچ پر اس کا ساتھ دیتا اور اس کے ساتھ اپنے لنچ باکس کے مشمولات بٹاتا اور اس کے ساتھ پہاڑی پر چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ جس چیز سے میں سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا وہ اس کا جنوبی ہندوستانی لہجہ تھا۔ ایک صبح جب میں اس کے ساتھ کافی پی رہا تھا اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھایا اور مجھے بتانے کے لیے کہ لائن کے دوسرے سرے پر کون ہے اپنا ہاتھ تیزی سے ماؤتھ پیس پر رکھا اور بولا ___ ''یہ یم یم پی ہے۔ (ایم۔ ایم۔ امیر رکن پارلیمنٹ)۔ وہ مجھ سے کوئی پرائیویٹ بات کرنا چاہتا ہے۔''

''یوجنا'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ میں نے ملنے والی ہر ذمہ داری قبول کر لی۔ ایک یونیسف کی طرف سے افغانستان میں اس کے کاموں کے حوالے سے کتابچہ لکھنا تھا۔ وہ میرے ساتھ فوٹوگرافر پی۔ این۔ شرما کو بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے تصویریں خود لے کر اخراجات بچانے کی پیشکش کی۔ میں بھرت رام کے پاس ایک زیئس آئیکون کیمرہ دیکھ چکا تھا۔ اس میں ایک ایکسپوژر میٹر اور فوکسنگ آلہ نصب تھا۔ آدمی کو سب کچھ جو کرنا پڑتا تھا یہی تھا

کہ کیمرے کو ہدف پر رکھے اور کلک کر دے۔ وہ فول پروف تھا۔ میں نے بھرت سے چند دن کے لیے وہ کیمرہ مستعار لے لیا۔ یونیسف کا ڈائریکٹر مجھے آزمانے کے لیے راضی ہو گیا۔ مجھے پہلے دن پورا ایک رول استعمال کرنا اور اسے دہلی روانہ کرنا تھا۔ اگر تصویروں کا معیار منظوری کے قابل ہوتا تو میں ساری تصویریں خود لے سکتا تھا اور مجھے ان کا معاوضہ ادا کیا جاتا۔ میں کابل گیا' میں نے تصویریں کھینچیں اور رول جہاز کے ذریعے دہلی بھیج دیا۔ اگلے ہی روز پی۔ این۔ شرما کابل پہنچ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا بھیجا ہوا سارا رول خالی تھا۔ میں لینس کیپ ہٹانا بھول گیا تھا۔

میری خواہش تھی کہ میں ایک فوٹو گرافر کے طور پر بہتر کام کروں۔ بری طرح ناکام ہونے کے بعد مجھے کابل ہوٹل میں شرما کے ساتھ ایک کمرے میں ہی رہنا پڑا' اس وقت وہ شہر کا واحد ہوٹل تھا۔ وہ ایک اچھا فوٹو گرافر اور عورتوں کے ساتھ اپنی مردانگی کی شیخیاں بگھارنے والا شخص تھا۔ اگرچہ وہ گنجا اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا آدمی تھا تاہم وہ خوب صورت لڑکیوں کو بغیر دشواری کے پھانس لیتا تھا اور اگر اس پر یقین کر لیا جاتا تو ان کو ہم بستری کے لیے راضی کر لیتا۔ وہ ایک کٹر برہمن تھا اور ایسی کوئی چیز نہیں کھاتا تھا جو دور سے بھی گوشت کی مہک دیتی ہو۔ اس کی بدقسمتی سے اور میری خوش قسمتی سے افغانوں کا واحد پکوان کا ذریعہ ''روغن'' تھا جو وہ بھیڑ کے گوشت سے حاصل کرتے تھے۔ جہاں تک شرما کا تعلق تھا تو پلاؤ تک خارج تھا۔ جو کچھ وہ کھا سکتا تھا تازہ پھل ہی تھے ــــ رس بھرے خربوزے' ذائقہ دار قندھاری انگور اور انار۔ کوئی شک نہیں وہ اس کی صحت کے لیے بہتر تھے تاہم خالی معدے میں تباہ کن حد تک ہوا پیدا کرنے والے ثابت ہوتے تھے۔ جس وقت ہم اپنے بستروں پر لیٹتے شرما ایک جیٹ جہاز جیسا بن چکا ہوتا تھا۔ وہ مسلسل اتنے زوردار پاد مارتا تھا کہ میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ جب میں احتجاج کرتا تو وہ قدیم سنسکرت متنوں میں بیان کی گئی پادوں کی قسمیں بتاتا۔ جو پاد وہ مارتا تھا' وہ مجھے یقین دلاتا تھا کہ وہ ''اتم پادوی'' ہوتے تھے ــــ اعلیٰ درجے کے اور بدبو سے بالکل خالی۔

اگلے روز ہم جنسی بیماریوں کے کلینک گئے جسے یونیسف بمبئی کے ایک ہندوستانی ڈاکٹر پرنجپے کے تحت چلاتی تھی۔ ایک برس پہلے یونیسف کے بھیجے گئے ایک یورپی ماہر نے جو افغانستان میں ان بیماریوں کے بہت زیادہ پھیلاؤ پر تحقیق کرنے آیا تھا رپورٹ دی تھی کہ سوزاک اور آتشک قابو سے باہر ہیں۔ واضح تھا کہ نہ تو اس نے اپنے ہوٹل سے قدم باہر نکالا تھا اور نہ ہی افغان ڈاکٹروں سے ملا تھا بلکہ اس نے افغان تاریخ کے اپنے مطالعے کی بنیاد پر رپورٹ تیار کر دی تھی: افغانستان وسطی ایشیا سے ہندوستان تک ان گنت یورشوں کا راستہ رہا

ہے اور یورش کرنے والی افواج جنسی بیماریاں پھیلانے کے لیے بدنام ہوتی تھیں۔ جہاں تک حقیقت تھی تو یہ بیماریاں وہاں بہت کم تھیں۔ طوائفیت (جسم فروشی) ممنوع تھی۔ کچھ عورتیں برقعوں میں مسجدوں کے گرد منڈلانے اور عبادت کر کے آنے والوں کو ورغلانے کے لیے بدنام تھیں۔ تاہم جب نشان دہی ہو جاتی تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا تھا۔

میں نے کلینک میں صرف دو کیس آتے ہوئے دیکھے ــــ ایک درمیانی عمر کی ایک عورت، دوسرا بیس کے پیٹے کا ایک نوجوان آدمی۔ عورت ایک ٹرک ڈرائیور کی بیوی تھی جو کابل اور پشاور کے درمیان ٹرک چلاتا تھا۔ وہ نصف درجن بچوں کی ماں بن چکی تھی جب اسے اپنے اعضائے تناسل کے اندر خارش محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ ایسا اس کے شوہر کے بہت زیادہ مطالبوں کی وجہ سے ہے۔ عورت نے مرد ڈاکٹر، افغان نرس اور ہم دونوں کے سامنے اپنا برقعہ اور شلوار اتارنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ ڈاکٹر نے ہماری موجودگی میں اس کا معائنہ کیا اور اسے بتایا کہ اسے آتشک ہے۔ اور یہ کہ اس کا علاج صرف اس کے اپنے شوہر کو کلینک لانے کے بعد ہی کیا جائے گا۔ اس کو بتایا گیا کہ ضرور اس کا خاوند اس بیماری کو پشاور کے کسی چکلے سے لایا ہے اسی نے اسے اس تک پہنچایا ہے۔ عورت مشتعل ہوگئی۔ اگر بیماری اس کے شوہر کے گلے پڑتی ہے تو وہ اس کا علاج کروانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ تو جب اس سے دور ہوتا ہے تو صرف اسے ہی یاد کرتا رہتا ہے۔

جب میں کلینک آرہا تھا تو میں نے ایک نوجوان افغان کو گلی میں اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے پایا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ جب وہ داخل ہو تو کوئی اسے پہچانے نہیں۔ وہ دوڑ کر سیڑھیاں چڑھا، خود کو ڈاکٹر کے آگے پیش کیا اور اپنی پراسرار بیماری کے بارے میں بتایا۔ ''اپنی شلوار اتار دو'' ڈاکٹر پرنجپے نے حکم دیا۔ وہ ہچکچایا۔ ''ان سب لوگوں کے سامنے؟ اور یہ عورت!'' وہ نرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''ہاں'' پرنجپے نے جواب دیا۔ ''یہ ڈاکٹر ہیں۔'' بے چارہ لڑکا شرم سے سرخ ہو گیا۔ آخر کار اس نے اپنی لمبی قمیض کو اٹھایا اور ازار بند کھولنے سے پہلے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پرنجپے نے اس کے ڈھیلے عضوِ تناسل پر کہانی کہنے والے پھوڑے کا معائنہ کیا۔ ''تمہیں آتشک ہے'' اس نے نوجوان کو بتایا۔ ''میں تمہارا علاج صرف تبھی کروں گا جب تم اس عورت کو لاؤ گے جس کے ساتھ تم نے مجامعت کی تھی۔'' نوجوان نے قسم کھائی کہ وہ نہ تو کسی عورت کے پاس گیا ہے نہ ہی کسی طوائف کے۔ ڈاکٹر نے اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اس نے ہکلاتے ہوئے کہا: ''مجھے ضرور یہ کسی لڑکے سے لگی ہے۔'' میں نے چند دن پہلے ایک لڑکے کے ساتھ لواطت کی تھی۔'' یہ جھوٹ تھا' پرنجپے نے اسے یہی کہا اور اسے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ افغانستان میں سماجی طور پر سدومیت کسی اجنبی عورت

کے ساتھ جنس کرنے سے زیادہ قابل قبول ہے۔

جنسی بیماریوں سے زیادہ ملیریا، ٹائیفائیڈ، ٹائیفس اور تپ دق (ٹی بی) عام تھیں۔ ہمیں سوویت سرحد کے قریب دریائے اوکسس کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسری طرف قندوز اور مزار شریف تک سفر کرنا تھا۔ وزیر صحت نے ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز، ایک بے حد تلخ مزاج شخص ڈاکٹر حکیمی (جو بعد میں وزیر صحت بنا)، کو ہمارے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ ہمارے ساتھ دو یورپی ڈاکٹر، غیر یقینی عمر کی فن لینڈ کی ایک عورت جو پشتو اور فارسی بولتی تھی اور ایک سویڈن کا باشندہ تھا۔ ایک صبح ہم ایک نئے برانڈ کی سٹیشن ویگن میں روانہ ہوئے۔ مضافات تضادات کا ایک دلچسپ سلسلہ تھے: ویران پہاڑ دفعتاً سبز وادیوں کو راہ دے دیتے جن میں چاول اور پھل اگے ہوئے تھے۔ وہاں صاف شفاف پانی کی کئی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ راستے کے ساتھ واقع چائے خانے جہاں ہم چائے پینے کے لیے رکتے تھے عمومی طور پر بہتی ہوئی ندیوں کے ساتھ واقع ہوا کرتے تھے، ان کے صحن انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ افغان بہت دوستانہ مزاج کے تھے۔ واحد شے جس نے مجھے غصہ دلایا وہ تھا ان کا مجھے مخاطب کرنے کا طریقہ۔ ان کے لیے میں ''لالہ'' تھا (تاجر یا ساہوکار) جیسا کہ بیشتر افغانی سکھ ہوتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں، جہاں ہم شب بسری کے لیے ٹھہرنا پسند کرتے تھے، ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ وہاں اتنے کافی کمرے کبھی نہیں ہوتے تھے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنے اپنے لیے ایک کمرہ حاصل کر لے۔ فن لینڈ کی عورت نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کا اپنے ساتھ کمرے میں شراکت کرنے کو تو برا محسوس نہیں کروں گا؟ میں نے کہا نہیں کیونکہ میں اس طرح شرما کے دھاکوں سے بچ سکتا تھا۔ تاہم اس سے ایک اور قسم کا مسئلہ درپیش ہوا۔ میں نے کبھی ہم بستری کی لائق عمر والی عورت کو اپنے کمرے میں شرکت کرنے نہیں دی تھی۔ کیا وہ میرے اس کی طرف جانے کی توقع رکھتی ہے؟ میں اس بارے میں سوچتا ہوا نیند سے محروم رہا۔ اگلی صبح شرما مجھے تنگ کر رہا تھا ''لالے! میم دی پھدّی لئی کہ نہیں۔'' جب میں نے اعتراف کیا کہ نہیں تو اس نے مجھے ''پھدو'' قرار دیا۔ اگلی دو راتیں اور مزار شریف میں بھی ایسا ہی ہوا۔ واپسی میں ہم بامیان میں بدھ مت کی غاروں کے باقیات، جو اجنتا کی غاروں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھیں، اور (گوتم) بدھ کے سخت چٹان میں تراشے گئے دو بہت بڑے بڑے مجسمے دیکھنے کے لیے رکے۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے ساتھ وادی میں سے بہہ کر جانے والی ندی میں نہانا پسند کروں گا۔ میں نے رضامندی ظاہر کی۔ ہم نے ایک الگ تھلگ جگہ تلاش کی۔ میں اپنا انڈرویئر پہنے رہا، وہ الف ننگی ہوگئی اور ندی میں اچھلنے لگی۔ وہ مجھ سے تھوڑی ہی بڑی تھی تاہم اس نے خود کو خوب سنبھالا ہوا تھا۔ اگر وہ کوئی پیغام دیتا

چاہتی تھی تو میں اسے سمجھ نہیں سکا۔ ہم ریسٹ ہاؤس واپس گئے اور اپنی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس شام اس نے مجھے کہا: ''مسٹر سنگھ اگر آپ برا نہیں مانیں تو اس مرتبہ میں سویڈش ڈاکٹر کے کمرے میں رہوں گی۔'' اگلی تین راتیں اس نے ایسا ہی کیا۔ شرما مجھے پھدو کہنے میں کوئی زیادہ غلط نہیں تھا۔

ملک میں تین ہفتے پر محیط عارضی قیام کے اختتام پر میں نے ایک کتابچہ ''آریانا سے افغانستان تک'' کے عنوان سے لکھا' جسے یونیسف نے شائع کیا۔ میری تکالیف پر افغان حکومت نے مجھے مٹھی بھر لاپیز لازولی دیئے۔ قوانین کے مطابق مجھے تحفہ قبول کرنے کے لیے اپنی حکومت کی اجازت لینا تھی۔ میں متعلقہ وزارت کے سیکرٹری سے ملا اور اس سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے پتھروں کی طرف دیکھا اور مجھ سے بولا: ''اگر تم نے انہیں حکومت کے حوالے کر دیا تو تم انہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھو گے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ انہیں جیب میں ڈالو اور سرکار کے بارے میں بھول جاؤ۔'' میں نے یہی کیا۔

☆☆☆

دوسری ذمہ داری حکومت ہند کی طرف سے سونپی گئی۔ اس زمانے میں لاکھوں ہندو' بدھ اور عیسائی مشرقی پاکستان سے مغربی بنگال فرار ہو کر آ رہے تھے۔ حکومت اس بڑے پیمانے پر خروج کو انگریزی جاننے والی دنیا میں مشہور کرنے کی شدید آرزومند تھی۔ ایک صبح مجھے وزارت مالیات کے سیکرٹری ایچ ایم پٹیل نے فون کیا اور وزیر مالیات ٹی۔ ٹی۔ کرشن مچاری سے ملنے کو کہا۔ اگلے روز میں پٹیل کے کمرے میں حاضر ہو گیا اور اس سے پوچھا کہ وزیر مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ''وہ تمہیں خود ہی بتا دے گا۔'' مجھے اپنے باس کے وسیع وعریض کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے پٹیل نے جواب دیا۔ ''میں کسی ایسے مصنف کا خواہاں ہوں جسے انگلینڈ اور امریکہ میں جانا جاتا ہو۔ اس کو مشرقی پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں پر ایک کتابچہ لکھنا ہوگا۔ یہ کام فوری طور پر کرنا پڑے گا۔ ہم نے اس مقصد کے لیے تین نام سوچے تھے: ''مسز جھابوالہ' نراد چوہدری اور تم''۔

''سر! مسز جھابوالہ تو حاملہ ہے اور وہ بنگالی نہیں بول سکتی۔ نہ ہی میں بنگالی جانتا ہوں۔ آپ کے لیے نراد چوہدری بہترین رہے گا۔ وہ مشرقی بنگال میں پیدا ہوا تھا اور انگریزی بولنے والی دنیا میں روتھ اور مجھ سے زیادہ معروف ہے۔''

''کیا تم اس سے بات کر سکتے ہو؟ وہ جو کچھ پسند کرے طلب کر سکتا ہے۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''سر! ڈاکٹر کیسکر (وزیر اطلاعات ونشریات) نے نراد پر کسی حکومتی ادارے کے

لیے کچھ لکھنے پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔''

''کیسکر کون ہوتا ہے؟'' وزیر مالیات نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم چوہدری کو بتا دو کہ پابندی اٹھائی جا رہی ہے۔ وہ جتنی رقم پسند کرے مانگ سکتا ہے۔'' میں خوش ہوا۔ نراد بہت مشکل زمانے سے گزر رہا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچوں کو اس کے سہارے کی ضرورت تھی۔ نیز ایک متنبیٰ لڑکا اور ایک نوجوان السیشن بھی کھانے والے تھے۔ نراد کے پاس ٹیلی فون نہیں تھا۔ میں نے اس نوٹ کے ساتھ کہ وہ جتنا جلد ممکن ہو سکتا ہو مجھ سے ملے میرے پاس اس کے لیے ایک اچھی خبر ہے اپنے چپڑاسی کو نکلسن روڈ اس کے گھر بھیجا۔

نراد اگلی صبح میرے دفتر آیا۔ میں نے اپنے اور وزیر مالیات کے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا اس کو بتایا۔ ''پابندی ختم کر دی گئی ہے' تمہارا پیسے کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔'' میں نے اُسے بتایا۔

اس نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور بولا: ''لہٰذا ہندوستان کی حکومت نے مجھ پر سے پابندی اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''ہاں'' میں نے جوش و ولولے کے ساتھ کہا۔

''لیکن نراد چوہدری نے حکومتِ ہند پر سے اپنی پابندی اٹھانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور مجھے ہکا بکا چھوڑ کر تیزی سے میرے دفتر سے باہر نکل گیا۔ وہ اس قسم کا انسان تھا: غربت اسے اپنی عزت پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکی تھی۔

مجھے ذمہ داری خود سنبھالنا پڑی۔ میں نے ایک مترجم اور ایک فوٹو گرافر کے ہمراہ درجنوں پناہ گزین کیمپوں کا دورہ کیا اور مشرقی پاکستان میں اپنے گھر اور زمینیں چھوڑ کر ہندوستان میں فی خاندان ایک روپیہ روز کی معمولی سی خیرات پر جینے کے لیے آنے والے بہت سے مردوں اور عورتوں سے گفتگو کی۔ جسمانی تشدد کا کوئی معاملہ نہیں تھا' تاہم محض چند ایک ہندو لڑکیوں کو اٹھا لیا گیا تھا' انہیں مسلمان کر کے ان کی شادی مسلمانوں کے ساتھ کروا دی گئی تھی۔ تقریباً ہر اس شخص نے' جس سے میں نے سوال کیا کہ اس مرد یا عورت نے پاکستان کیوں چھوڑ دیا' جواب دیا بھوئے ـــــ خوف۔ میں نے بنگالیوں میں اپنی قسمت بہتر بنانے کے حوالے سے تھوڑی سی جھجک دیکھی۔ مرد ایک دوسرے سے گپیں ہانک کر اپنے دن گزار رہے تھے یا ڈوری تھامے تالاب کے کنارے انہیں اس امید میں بیٹھے دیکھا کہ مچھلی پکڑی جائے گی اور ان کے چاول دال کے راشن میں اضافہ ہو جائے گا۔ ان کے درمیان بیس کے پیٹے میں ایک نوجوان تھا جو کالج گیا ہوا تھا اور انگریزی بول سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک سٹول پر بیٹھے خلا میں یونہی تکتے ہوئے پایا۔ خیمے کے اندر اس کی پرشباب خوب صورت بیوی برتن مانجھ رہی تھی

اور چار یا پانچ چھوٹے چھوٹے بچوں سے گھری ہوئی تھی۔ ''تم انگریزی بول سکتے ہو؟'' میں نے اس نوجوان سے پوچھا۔ اس نے سٹول سے اٹھے بغیر اوپر دیکھا اور سر ہلا دیا۔ ''تم کتنے عرصے سے اس کیمپ میں ہو۔'' میں نے پوچھا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا اور جواب دیا: ''دو مہینے! تین مہینے!'' میں نے غصے کے ساتھ اس سے پوچھا: ''کیا تم نے کلکتہ میں کوئی ملازمت ڈھونڈنے کی کوشش کی؟ تم ایک تعلیم یافتہ آدمی ہو۔''

اس نے کامل بے نیازی سے جواب دیا: ''میں نے نوکری تلاش کی تھی۔ مجھے اپنے مزاج کے مطابق کوئی نوکری نہیں ملی۔''

1947ء میں پاکستان سے آنے والے پنجاب کے لاکھوں ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے کتنا تضاد تھا! تم نوجوان لڑکیوں کو ٹانگے' بوڑھوں کو سائیکل رکشے چلاتے دیکھ سکتے تھے۔ کسی پنجابی کو تم شاذ و نادر ہی خیرات کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے دیکھو گے۔

میں نے ''پاکستان میں غیر مطلوب'' کے عنوان سے کتابچہ لکھا۔ اسے ایک پرائیویٹ پبلشنگ ہاؤس کے نام سے شائع کیا گیا تھا تاکہ یہ کسی آزاد مصنف اور پبلشر کا کام دکھائی دے۔ اس کے اجراء کے اگلے روز مجھے کسی نے فون کیا اور پوچھا کہ کس نے اس کو لکھنے کا کام مجھے سونپا تھا۔ بغیر یہ دریافت کیے کہ وہ کون تھا میں نے اسے بتا دیا۔ وہ پاکستان کے سفارت خانے سے کوئی شخص تھا۔ اگلے روز مجھے پاکستان کے سفیر ارشد حسین کا بہت تلخ نوٹ موصول ہوا۔ شیکسپیرین انگریزی میں اس نے لکھا تھا: ''افسوس! صد افسوس! آپ جیسے آدمی نے بھی جو پاکستان کا دوست ہونے کا دعوے دار ہے میری حکومت کے خلاف ایسی بہتان طرازی کی ہے۔''

مجھ سے احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے ہزاروں پناہ گزینوں کو دیکھ چکا تھا جو خوف زدہ ہو کر اس کے ملک سے بھاگ آئے تھے۔

مجھے ''یوجنا'' میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا جب مجھے بینٹ کولمین کے منیجنگ ڈائریکٹر جے۔ سی۔ جین کی طرف سے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش ہوئی کہ اس کا آئرش مدیر۔ سی۔ آر۔ مینڈی ریٹائر ہو رہا تھا۔ میں بمبئی گیا' مینڈی سے ملا اور ملازمت کی شرائط پر گفتگو کی۔ میں اپنی بیوی اور ترلوک سنگھ سے مشورہ کرنے کے لیے دہلی واپس آیا۔ میری بیوی اس کے خلاف تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ بمبئی رہنے کے اعتبار سے بہت غیر صحت مند مقام تھا اور وہ اپنے خاندان کو اس کی طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرنے والی گندی فضا میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ ترلوک سنگھ نے ''ہفتہ وار'' پر ناک بھوں چڑھائی۔ ''کون اسے سنجیدگی سے لیتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ یہ تو محض نئے شادی

شدہ جوڑوں کی تصویروں اور کارٹونوں سے مزین ایک تصویری رسالہ ہے۔ ''یوجنا'' میں تم اپنے وطن کے لیے کچھ کر رہے ہو۔'' میں اپنی بیوی کے استدلال سے متاثر نہیں تھا ۔۔۔ لاکھوں لوگ بمبئی میں خوشی کے ساتھ رہتے ہیں' میں نے اسے بتایا۔ نہ ہی میں ترلوک سنگھ کے حب الوطنی پر وعظ سے متاثر ہوا تھا۔ میں گیا تو ملازمت لینے تھا مگر راک فیلر فاؤنڈیشن کے دہلی میں ایک پروجیکٹ سکاؤٹ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے ملنے اور یہ بتانے آیا تھا کہ اس نے میری چھوٹی سی کتاب ''دی سکھ'' پڑھی ہے اور بہت متاثر ہوا ہے۔ ''تم ثانوی ذرائع پر مبنی اس کتاب کی بجائے اسی موضوع پر کوئی تفصیلی کام کیوں نہیں کرتے؟'' مجھے یہ آئیڈیا بہت بھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اپنی ملازمت چھوڑنا اور کافی سفر کرنا پڑے گا۔ ''ہم اس کو دیکھیں گے'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''تم منصوبہ تیار کرو' اس کے خرچے کا حساب لگاؤ اور میں دیکھوں گا کہ فاؤنڈیشن اسے قبول کر لے۔''

میں منصوبہ تیار کرنے بیٹھ گیا۔ مجھے دہلی' لندن (انڈیا ہاؤس لائبریری) میں ریسرچ کرنے' کینیڈا اور امریکہ میں غدر تحریک کی اصل دستاویزات دیکھنے اور جاپان' سنگاپور اور برما میں آئی۔ این۔ اے کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے میں تین سال لگنے تھے۔ اس نے میری تجویز کو اپنی قبولیت کے ساتھ آگے نیویارک بھیج دیا۔ میں نے اسے ڈنر پر مدعو کیا۔ اسے متاثر کرنے کے لیے میں نے امریکی سفارت خانے کی اس وقت کی فرسٹ سیکرٹری کیرول لائیس کو اس سے ملنے کے لیے کہا۔ ڈنر تو ایک تباہی تھا۔ کیرول گرمیوں کے مہینوں میں بہت چھوٹا لباس پہننے کی عادی تھی اور جب بیٹھتی تو اپنی ٹانگیں لمبی پھیلا لیتی تھی اپنی رانیں اور زیادہ عریاں کرتے ہوئے۔ راک فیلر کا آدمی تو سیکنڈلائز ہوگیا۔ اس نے اگلی صبح کیرول سے ملاقات کر کے مقامیوں کے سامنے اس کے خود کو یوں عریاں کرنے پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ کیرول نے اسے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور مجھے فون کر کے بتایا کہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے۔ میں نے راک فیلر پروجیکٹس سکاؤٹ کو بتایا کہ وہ ایک قریبی دوست سے اس انداز میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے کام سے سروکار رکھنے کا کہا۔ پروجیکٹ تو منظور ہوگیا مگر اس شخص نے میری راہ میں جتنا ممکن ہوسکتا تھا رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی۔

مجھے پروجیکٹ کی سرپرستی والے کسی ادارے کی تلاش تھی۔ میں نے سوچا سب سے بہتر دہلی یونیورسٹی رہے گی۔ میں نے وائس چانسلر ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ سے ملاقات کی' وہ شخص جنوبی ہندوستان کے دوسرے برہمنوں کی طرح اپنے بارے میں زبردست رائے رکھتا تھا۔ میں تو اس کے ردعمل پر حیران رہ گیا۔ ''مسٹر سنگھ! میں تمہیں اپنی یونیورسٹی کو اپنے مفاد

کے حصول کا ذریعہ نہیں بنانے دوں گا۔"

مجھے اس کی ناشائستگی نے بہت رنج پہنچایا۔ میرا اگلا انتخاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ ایک اچھی علامت ہوگی کہ ایک مسلم ادارہ سکھ مذہب اور تاریخ پر ایک پروجیکٹ کی سرپرستی کرے اور اس سے میں اس جھوٹے تصور کو ختم کرنے کے لیے تھوڑا کام کروں گا کہ مسلمان اور سکھ روایتی دشمن ہیں۔ وائس چانسلر کرنل بی۔ایم۔ زیدی نے اپنے شعبہ تاریخ کے اساتذہ سے مجھے گفتگو کرنے کے لیے علی گڑھ مدعو کیا۔ مجھے ڈاکٹر نورالحسن (بعد میں ایک وائس چانسلر اور مغربی بنگال کا گورنر) کی شکل میں ابھی ایک اور رکاوٹ کا سامنا کرنا تھا۔ نورالحسن کی مؤرخ کے طور پر شہرت بہت زیادہ تھی۔ اس نے تاریخی تحقیق پر استوار بہت کم کام شائع کروایا تھا اور دوسروں کے ایسا کرنے پر بہت برا محسوس کرتا تھا۔ "تم اتنے وسیع موضوع پر تین برس میں حقیقی تحقیق نہیں کر سکتے۔" اس نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔ اس کے رفیقِ کار پروفیسر رشید خاں نے، جو کبھی خالصہ سکول سرگودھا میں تاریخ پڑھاتا تھا، احتجاج کیا۔ امریکی پیسہ دے رہے ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ وہ تحقیق اور تحریر کا کام کر سکتا ہے۔ جو کچھ ہمیں کرنا ہے وہ یہی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام استعمال کرنے دیں۔" اس نے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وائس چانسلر نے نورالحسن کو مسترد کر دیا اور راک فیلر فاؤنڈیشن کو اس منصوبے کا خرچ اٹھانے کا رسمی خط لکھ دیا۔

میں نے جے۔سی۔ جین کو "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کی ادارت قبول نہ کرنے کا لکھ دیا اور "یوجنا" کے مدیر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے گرنتھ صاحب پڑھنے کے لیے ایک گرنتھی لیا اور اپنے ماڈرن سکول کے زمانے کے اردو کے استاد شفیق الدین نیر سے، جو اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تھے، مجھے فارسی پڑھانے کا کہا تاکہ میں سکھ دربار کے ریکارڈ پڑھ سکوں جو اس زبان میں تھے۔ لہٰذا دو سالوں کے اختتام پر میں ایک ملازمت سے باہر اور ہنوز دوسری ملازمت میں تھا۔

دسواں باب:

سکھ مذہب اور تاریخ

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جب میں نے ادب کو اپنا کیریئر بنانے کا فیصلہ کیا تو مجھے ادراک ہوا کہ تخلیقی ادب کی انتہائی مسابقتی دنیا میں مجھے خود کو قابل توجہ بنانے کا واحد موقع کسی ایک موضوع میں تخصص کا ہے اور یہ تاثر دینے کا ہے کہ میں اسے دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ میرا انتخاب میری اپنی کمیونٹی تھی۔ میں ایک روایتی سکھ گھرانے میں پلا بڑھا تھا' روزانہ کی پانچوں پرارتھنائیں مجھے زبانی یاد تھیں اور خالصہ روایتوں سے آگاہ تھا۔ اگرچہ جس وقت میں نے یہ فیصلہ کیا میں اپنے مذہب سمیت تمام مذاہب سے آزاد تھا تاہم مجھے سکھ کمیونٹی سے زبردست انسیت تھی اور اس کے نشیب وفراز میں جذباتی دلچسپی رکھتا تھا۔ سکھوں کی میری پہلی تاریخ مجھے اعتراف ہے کہ دوسرے درجے کا کام تھا تاہم میرے صبح کی پرارتھنا ''جاپ جی'' کے ترجمے نے مجھے طمانیت کا احساس بخشا تھا اور یہ امید کہ میں بہتر کام کر سکتا ہوں۔ پھر یونیسکو کا سکھ صحائف کے منتخبات کے تراجم کا منصوبہ آیا جس کے ساتھ میں پہلے ہی اپنی وابستگی بیان کر چکا ہوں۔

اب مجھے ملنے والی راک فیلر امداد (گرانٹ) سے میں نے ایک نائب محقق (ریسرچ اسسٹنٹ) اور سٹینوگرافر رکھنا تھا۔ مؤخرالذکر کے لیے میری دوسری سوچ تھی ہی نہیں۔ میں نے یوون لی روجیلیل کو خط لکھا۔ یہ عورت اگرچہ بہت درمیانے وسائل والی تھی' تاہم کبھی پیسے کی فکر نہیں کرتی تھی۔ اس نے میرے پیش کردہ حقیر معاوضے کو بخوشی قبول کر لیا اور اپنے خرچ پر دہلی آ گئی۔ میں نائب محقق کے حوالے سے غیر یقینی کا شکار تھا۔ کیپٹن باغ سنگھ ''سکھ ریویو'' کلکتہ کے مدیر نے مشورہ دیا کہ میں ترلوچن سنگھ کو' جو ''منتخبات'' کے معاملے پر مجھ سے فضول جھگڑ چکا تھا' ایک اور موقع دوں کیونکہ وہ سخت مالی مشکلات کا شکار تھا اور چند برس اسے اچھی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ جھجکتے ہوئے میں اسے ایک اور مرتبہ پرکھنے پر راضی ہو گیا اور اسے دہلی آ کر مجھ سے ملنے کا کہا۔ مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانا تھا۔

ترلوچن سنگھ کو ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ کیرول لائیس' جو اس وقت امریکی سفارت خانے

میں سینئر قونصلر تھی، موجود تھی۔ مجھے چند دنوں کے اندر ہی سپلیڈنگ فاؤنڈیشن کی زیر سرپرستی آکسفورڈ میں سکھ مذہب کے حوالے سے لیکچرز کی سیریز دینے روانہ ہونا تھا۔ میں نے ترلوچن سنگھ کو جو میں پیشکش کر سکتا تھا، بتایا۔۔۔ مجھے صحائف کے متنوں کے اپنے تراجم کی درستی کو دیکھنے اور تراجم پر اعراب کا اضافہ کرنے کے لیے ایک نائب کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے آکسفورڈ میں تقریر کی دعوت کا بھی بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور راک فیلر اور سپلیڈنگ فاؤنڈیشنوں کے پتے مجھ سے لے لیے۔ چند دن بعد جب میں نے آکسفورڈ میں پہلا لیکچر دیا (سامعین چھ سے زیادہ نہیں تھے۔) تو میں نے یہ کہتے ہوئے آغاز کیا کہ سکھ مت کی میری تعبیرات کو چند سکھ علما قبول نہیں کرتے۔ لیکچر کے اختتام پر فاؤنڈیشن کے سیکرٹری نے مجھے بتایا: ''میں آپ کے اس انداز سے آغاز کرنے پر خوش ہوں۔ ذرا اسے دیکھیے!'' اس نے مجھے ہندوستان سے موصول ہونے والا ایک تار (ٹیلی گرام) تھما دیا۔ اس میں من وعن وہی لکھا ہوا تھا جو میں نے کہا تھا۔۔۔ کہ سکھ مت پر میرے خیالات کو سکھ علما قبول نہیں کرتے، لہٰذا مجھے اس موضوع پر تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ دستخط ترلوچن سنگھ کے تھے۔ میں نے تار کو نظرانداز کر دیا اور اگلے روز اپنا دوسرا لیکچر دینے گیا۔ کچھ وقت بعد راک فیلر فاؤنڈیشن نے انہیں موصول ہونے والے ایک خط کی فوٹوسٹیٹ نقل (کاپی) مجھے ارسال کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مجھے دی جانے والی گرانٹ پر دوبارہ غور کیا جائے جو واضح طور پر امریکی سفارت خانے میں موجود کیرول لائیس نامی (اس نے پہلا نام درست نہیں لکھا تھا) میری قریبی دوست ایک سینئر افسر کے زیر اثر مجھے دی جا رہی ہے اور یہ کہ اس خط کو لکھنے والے نے پہلے ہی سکھ مذہب اور تاریخ پر مواد ترتیب دے رکھا ہے اور اسے مزید تحقیق اور اشاعت کے لیے گرانٹ مہیا کی جانی چاہیے۔ دستخط ترلوچن سنگھ کے تھے۔

نہ تو سپلیڈنگ فاؤنڈیشن اور نہ ہی راک فیلر فاؤنڈیشن نے ان مراسلات پر کوئی توجہ دی۔ ہندوستان میں ترلوچن سنگھ جیسے لوگ غیر معمولی نہیں ہیں۔ خاکستری ڈاڑھیوں اور شلوکوں کو گاتے ہوئے وہ کینے اور حسد کو ذخیرہ کیے رکھتے ہیں۔ ترلوچن سنگھ شدید افلاس میں 1993ء میں مر گیا۔

میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ طمانیت بخش کام سکھ مذہب اور تاریخ پر کیا ہے۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے پوری گرنتھ صاحب پنسل ہاتھ میں لے کر، اپنی سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ کو نشان زدہ کرتے ہوئے پڑھی۔ میں نے اپنا انتخاب کیا اور انہیں اپنے خیال کے مطابق بہترین ترجمہ کیا، اصل کی موسیقی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے عہد نامہ قدیم کی زبان کو نمونے کے طور پر استعمال کیا۔ میں نے انڈیا آفس لائبریری لندن میں کام کرتے

ہوئے کئی مہینے گزارے۔ اس زمانے میں' اپنی مجوزہ جلدوں کو لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کرنے کے علاوہ میں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سوانح عمری کا خاکہ بھی مکمل کیا (بعد میں اسے ایلن اینڈ انون' بلیکز اینڈ اور رینٹ لانگ مین نے شائع کیا) نیز انتشار کے ان دس برسوں پر' جن کے بعد مہاراجہ فوت ہوگئے' سکھ انگریز جنگوں اور پنجاب کے الحاق پر ایک کتاب۔ اسے بھی اور رینٹ لانگ مین نے شائع کیا۔

لندن میں قیام نے مجھے اور میری بیوی کو پرانی دوستیاں تازہ کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ ایلینو رسنکلیئر اور سوسن ہکلن نے ہمیں اپر برکلے سٹریٹ پر ایک چھوٹا سا فلیٹ ڈھونڈ دیا۔ صوفے کی خستہ حالت اور پولیس کی مستقل آمد کی وجہ سے یوں ظاہر ہوتا تھا کہ گزشتہ مکین کوئی طوائف رہی ہوگی۔ منظور قادر گھرانہ اپنے دوسرے بیٹے اصغر کے علاج کے لیے لندن آیا ہوا تھا۔ ہم اپنی بیشتر شامیں اکٹھے گزارا کرتے تھے۔ اس قیام کے دوران ایسا ہوا تھا کہ منظور اور میں ایک مرتبہ نیوز ریل سنیما میں ایک گھنٹہ گزارنے کے لیے گئے (اس زمانے میں لندن میں ایسے کئی سنیما ہوا کرتے تھے)۔ ایک منظر پیکنگ میں ڈاکٹر سن یات سین کی پیدائش کی تقریب میں ہونے والی پریڈ کا تھا۔ میں نے تبصرہ کیا کہ وہ کتنا عظیم انسان تھا۔ ''وہ کون تھا؟'' منظور نے پوچھا جو کہ قانون کی کتابوں اور اردو شاعری کے علاوہ کچھ بھی نہیں پڑھا کرتا تھا۔ '' مجھے مت کہو کہ تم نے کبھی ڈاکٹر سن یات سین کے بارے میں نہیں سنا ہے۔'' میں نے اسے کہا۔ وہ ناراض ہوگیا اور غرایا: ''کوئی ہوگا سالا بنگالی ڈاکٹر۔'' اس شام اس کے گھر ڈنر پر میں نے اس کی بیٹی شیریں کو اس کے باپ کے تبصرے کے بارے میں بتایا۔ ''اوہ ابو! کیا واقعی آپ نے ایشیا کے عظیم ترین لیڈر کے بارے میں ایسی بات کہی ہے!'' بے چارہ منظور سخت شرمندہ ہو کے رہ گیا۔ ''خدا کے لیے اس کہانی کو پھیلا مت دینا۔'' اس نے میری منت کی۔ جب اسے فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کا وزیر خارجہ بنایا تو میں نے اسے ایک تار بھیجا: ''ایک مشہور بنگالی ڈاکٹر سن یات سین کی طرف سے مبارک ہو۔''

انڈیا آفس لائبریری میں جن لوگوں کو میں نے دوست بنایا ان میں ایک پروفیسر رابرٹ کرین بھی تھا' اسے بھی کسی امریکی ادارے کی طرف سے ہندوستانی تحریک آزادی پر تحقیق کرنے کے لیے گرانٹ دی گئی تھی۔ وہ لائبریری میں تین نائبوں کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ وہ ایک بغلی کمرے میں سگریٹ نوشی کرتے ہوئے اور ان دستاویزات اور کتابوں کی فہرستیں تیار کرتے ہوئے ایک گھنٹہ گزارتے تھے جن سے وہ استفادہ کرنے کے خواہاں تھے۔ فہرستیں لائبریرین کو دے دی جاتی تھیں۔ پھر کرین اور اس کے ساتھ کافی پینے نیچے کیفے ٹیریا میں چلے جاتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد وہ یہ تصدیق کرنے کے لیے لائبریری میں واپس آتے تھے کہ جو کچھ

انہیں مطلوب ہے اسے ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ انہیں دستاویزات اور کتابیں دے دی جاتیں جو وہ نقلیں بنانے کے لیے فوٹوسٹیٹ سیکشن کے حوالے کر دیتے۔ تب وہ لنچ کے لیے کام ملتوی کر دیتے' جہاں میں اکثر ان سے ملا کرتا تھا۔ ''میری بات کا برا مت ماننا ڈاکٹر سنگھ مگر تم اس سب پرانے مواد کا یہیں مطالعہ کر کے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں تو بس ان کو فوٹو کاپی کروانا اور مزے سے پڑھنے کے لیے گھر لے جانا چاہیے۔'' وہ مجھے نصیحت کرتا تھا۔ جو کچھ وہ کہتا تھا اسے سمجھنے کے باوجود ایک قدیم فیشن کا ست رفتار محنتی ہونے کی وجہ سے میں اپنے طریقے تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ برسوں بعد مجھے کرین سے اس وقت ملنے کا اتفاق ہوا جس وقت میں پرنسٹن میں تھا اور وہ ڈیوک میں۔ ہم نے یونیورسٹی آف ہوائی میں ایک گرمیوں کی چھٹیوں کا کورس بھی پڑھایا تھا اور اس کے گھرانے نے ہمارے ساتھ کسولی میں چند دن بھی گزارے تھے۔ ڈاکٹر کرین کے تحقیق کے جدید طریقے بارآور ثابت نہیں ہوئے تھے۔

میری بیوی کے ہندوستان واپس جانے کے بعد جب گے ونٹ لندن میں ہوتا تو اکثر شب بسری کے لیے میرے فلیٹ میں آ جایا کرتا تھا۔ وہ میرے بستر پر اور میں خستہ حال صوفے پر سوتا۔ ایک شام جب مجھے اس کے آنے کی توقع تھی اور ڈنر تیار کر رکھا تھا وہ دکھائی دینے میں ناکام رہا۔ میں نے نہ تو اگلے روز اور نہ اس سے اگلے روز اس کے بارے میں سنا۔ پھر اس کی بیوی فریڈا نے آکسفورڈ سے مجھے فون کر کے بتایا کہ کیوں۔ آکسفورڈ سے لندن آتے ہوئے ٹرین میں گے کو دورہ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا ملاقاتی (وزٹنگ) کارڈ ایک ہم سفر کو دے دیا۔ اس آدمی نے مستعدی کے ساتھ گارڈ کو اطلاع دی جس نے میریلبون سٹیشن پیغام بھیج دیا۔ ایک ایمبولینس وین اس کی منتظر تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے فریڈا کو اطلاع دی تب اس نے مجھے فون کیا تھا۔ گے بچ گیا تھا' تاہم اسے جزوی فالج ہو گیا تھا۔ جب وہ بالکل تن درست تھا تب بھی وہ رواں نہیں بولتا تھا تاہم اب جب وہ آیا تو اس کی آواز میں ہکلاہٹ تھی اور وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔

لندن میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد میں غدر پارٹی کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے کینیڈا اور امریکہ روانہ ہو گیا۔ میں نے وینکوور میں گردوارہ ریکارڈ کھنگالتے ہوئے پندرہ دن گزارے۔ کچھ بوڑھے سکھ جو ''کام گتا مارو'' کے زمانے میں وہاں موجود تھے' سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔ انہوں نے نصف صدی سے اپنے پاس موجود تصویریں اور پرچے (لیف لیٹس) مجھے دیئے۔ میں حیران ہوا کہ ان میں سے بہت سوں نے جنہوں نے اپنی زندگیوں کا بہترین حصہ کینیڈا میں بسر کیا تھا' انگریزی سیکھنے کا تردد نہیں تھا۔ ''ہمیں لانوں کی

گھاس کاٹنے، باڑھیں لگانے اور گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے جیسے حقیر سے کاموں کے لیے انگریزی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانچ چھ لفظ مثلاً ''بری بات یار، میڈیم! بالکل! شکریہ اور ٹھیک ہے'' کافی ہیں۔'' انہوں نے مجھے یقین دہانی کروائی۔ ''وینکوورسن'' کی پرانی جلدوں سے برارڈ میں ہونے والی ''کام کتا مارو'' کی روزانہ کی کارروائیوں کی خبریں مل گئیں۔ سکھوں کے بیچ تشدد جس کے بعد گردوارہ میں قتل ہوئے، عدالت میں پولیس انسپکٹر ہاپکنز کا قتل اور اس قتل کے الزام میں بھائی میوا سنگھ پر مقدمے اور سزا کی خبریں ملیں۔

وینکوور سے میں سان فرانسسکو ان ابتدائی میٹنگوں کے ریکارڈ کو دیکھنے گیا جو بعد میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بنی۔ میں برکلے یونیورسٹی کے کیمپس میں قیام پذیر ہوا۔ دو خواتین پروفیسر مس فشر اور مارگریٹ بونڈ ورانٹ جو انڈین سٹڈیز کے شعبہ کی سربراہ تھی، نے مجھے مقامی روابط مہیا کیے اور مجھے ہندوستان سے کینیڈا اور امریکہ نقل مکانی کرنے والوں (وسیع طور پر سکھوں)' ان کے خلاف امتیاز برتے جانے اور جرمن قونصل فرانز بوپ جس نے ہندوستانی نقل مکانی کرنے والوں کو برطانوی راج کے خلاف بغاوت منظم کرنے کے لیے پیسہ دیا تھا کے بارے میں اور میں نے وفادار سکھ کمیونٹی میں برطانیہ مخالف احساس کی شروعات کے حوالے سے بہت سارا مواد حاصل کیا۔

میں سان فرانسسکو سے رش بہاری بوس، جنرل موہن سنگھ اور بعد ازاں سبھاش چندر بوس کی منظم کردہ انڈین نیشنل آرمی کے بارے میں مواد ڈھونڈنے کے لیے ٹوکیو گیا۔ میں وہاں نئے سال کی شام کو پہنچا اور انٹرنیشنل سنٹر میں قیام پذیر ہوا۔ میں نہ پڑھ سکا اور نہ لکھ سکا کیونکہ مجھ سے اگلے کمرے میں ایک درمیانی عمر والا مگر خود کو خوب سنبھالے ہوئے امریکی پروفیسر اپنی نوجوان انگریز معشوقہ کے ساتھ موجود تھا۔ درمیانی دیوار بہت پتلی تھی، میں ان کا ایک دوسرے سے کہا ہوا ایک ایک لفظ، چومنے کی آوازیں، بستر کی چرچراہٹ اور محبت کے دوران ان کے پرشور تاثرات کو سن سکتا تھا۔ مجھے پروفیسر کی جانداری سے حسد ہوگیا، میں سنٹر میں دس روزہ قیام کے دوران میں انہیں پہلے ناشتے، پھر قیلولے کے وقت اور پھر آخری مرتبہ رات کو سن سکتا تھا۔

مجھے جن چیزوں کی تلاش تھی ان کے لیے میں نے جاپانی وزارتِ دفاع کو لکھ دیا تھا۔ مجھے دفتر میں حاضر ہونے کا کہا گیا۔ وہ ایک عجیب انٹرویو تھا۔ مجھے ایک سپاہی کی معیت میں ایک سرد کم فرنیچر والے کمرے میں لے جایا گیا۔ تین جاپانی باوردی افسر، جو ایک جیسے دکھائی دیتے تھے، کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کھڑے ہوگئے اور میرے لیے جھکے۔ میں ان کی طرف جھکا اور بیٹھ گیا۔ ایک نے مترجم کے ذریعے مجھ سے میرے کاروبار کا پوچھا۔ میں نے

تفصیل سے جواب دیا کہ میں ایک راک فیلر سکالر ہوں اور آئی۔این۔اے کے بارے میں مواد ڈھونڈ رہا ہوں۔ چند ایک سوالوں سے مجھے احساس ہوا کہ وہ یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ میں سی آئی اے یا ہندوستانی انٹیلی جنس کا ایجنٹ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کی تفتیش کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس آئی۔این۔اے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ سوائے ایک کتابچے کے جو انہوں نے میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ جاپانی زبان میں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں جاپانی نہیں پڑھ سکتا۔ انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے ان جاپانی افسروں سے ملوا سکتے ہیں جن کے موہن سنگھ' نرنجن سنگھ گل یا سبھاش چندر بوس کے روابط تھے۔ سب سے بڑھ کر میں میجر فیوجی وارا سے ملنا چاہتا تھا جو آئی۔این۔اے کے ساتھ رابطہ افسر تھا۔ جب میری درخواست کا ترجمہ کیا جا رہا تھا تو اس دوران میں نے کتاب کے صفحے الٹ کر میجر فیوجی وارا کو چند تصویروں میں ہندوستانی افسروں کے ساتھ مرکز میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے تفتیش کاروں میں سے ایک کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی ہوئی دیکھی۔ میرے سامنے کوئی اور نہیں خود میجر فیوجی وارا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ روانی کے ساتھ انگریزی بول سکتا تھا اور تھوڑی سی ہندوستانی بھی سیکھے ہوئے تھا۔ میں کبھی نہیں جان پایا کہ انہوں نے مجھے اس معمے سے کیوں دوچار کروایا۔ میجر فیوجی وارا سے انٹرویو کی میری درخواست کو دو انگریزی لفظوں میں بری طرح مسترد کر دیا گیا۔ ''اجازت نہیں ہے۔'' فضول انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔ جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ جاپانی زبان میں کتابچہ تھا۔

تاہم میں رش بہاری بوس کے گھر کا دورہ کرنے کے قابل تھا' جہاں اس کی جاپانی بیوہ' بیٹی اور اس کا خاوند رہتے تھے۔ ان کے پاس مجھے بتانے کو بہت کم تھا کیونکہ بوس زیادہ تر وقت گھر سے دور رہا کرتا تھا۔ اس کی بیٹی نے بمشکل اسے اس کی زندگی کے آخری برس دیکھا تھا۔ میں نے اسے پوچھا اس کا باپ کہاں مرا تھا۔ چہرے پر بغیر کسی جذباتی علامت کے اس نے اپنے پیروں کی طرف فرش پر اشارہ کیا اور جواب دیا ''یہاں''۔

میں ٹوکیو سے خالی ہاتھ ہانگ کانگ چلا گیا۔ وہاں ایک پہاڑی مقام پر' جہاں سے مندر نظر آتا تھا' ایک خوب صورت گردوارہ تھا۔ عمارت ایک پارسی نے عطیہ کی تھی' سندھی سکھوں اور خالصوں نے پرامن طور پر آپس میں عبادت کے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ صبح کو ایک مرد اور اس کی بیوی کی جوڑی کیرتن گاتے تھے جو کانوں کو بہت ہی خوشگوار لگتا تھا۔ مجھے ''سروپا'' دینے پر اپنی شکریہ کی تقریر میں میں نے انہیں گردوارے کو ہم آہنگی سے چلانے پر ان کی تعریف کی۔ بعدازاں کمیٹی کے صدر نے مجھے آگاہ کیا کہ معاملات اتنے ہموار نہیں ہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں اور ہر سال جب وہ انتخاب کا انعقاد کرتے ہیں تو انہیں نظم وضبط برقرار رکھنے

کے لیے پولیس بلانی پڑتی ہے۔اس نے مجھے سکھ مذہب پر ایک کتابچہ بھی دیا۔متن میڈرین اور انگریزی میں تھا اور مبینہ طور پر ایک مقامی سکھ نے چینیوں میں تقسیم کرنے کے لیے لکھا تھا۔ مجھے اپنے ہوٹل کے کمرے میں پتہ چلا کہ انگریزی متن سارے کا سارا میری کتاب ''دی سکھز ٹوڈے'' میں سے لیا گیا ہے جسے اورینٹ لانگ مین نے شائع کیا تھا۔ میں نے صدر کو بتایا کہ یہ تو ادبی سرقہ تھا۔اس نے اعتراف کیا کہ وہ خود حیران ہوا تھا جب ڈاکخانے میں کام کرنے والے آدمی نے اسے مسودہ دیا تھا۔اس نے مبینہ مصنف سے وضاحت لینے کا وعدہ کیا۔اس شام وہ آدمی مجھ سے ملنے آیا اور اپنے کیے کی صفائی پیش کرنے لگا:''میرا خیال تھا آپ مدتوں پہلے مرچکے ہیں۔ میں کس طرح جان سکتا تھا کہ آپ ہانگ کانگ آئیں گے اور اس کتاب کو دیکھ لیں گے؟ میں آپ کو اپنے گھرانے کے ساتھ ڈنر کیے بغیر ہندوستان نہیں جانے دوں گا۔ صرف تبھی مجھے یقین آئے گا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔'' میں نے اس کے گھرانے کے ساتھ ایک بہت خوش گوار ڈنر کیا۔عمومی طور پر ہانگ کانگ کا دورہ فائدہ مند رہا کیونکہ میں نے موہن سنگھ اور سبھاش چندر بوس کی مدد کرنے والے کئی ہندوستانی کاروباریوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔

ایک اور سکھ سے ہانگ کانگ میں ہونے والا ٹکراؤ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ میں اپنے شانے سے کیمرہ لٹکائے ایک گلی میں چلا جارہا تھا۔ایک سفید ڈاڑھی والا سکھ بندوق میں کارتوس بھرے ایک چینی زیورات کی دکان کے باہر چوکیداری کررہا تھا۔ جونہی اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھا اس نے اپنا سر ہلانا شروع کر دیا۔''سردار جی دیسوں آئے ہو؟'' میں نے سر ہلایا۔اس نے اپنا سر زیادہ زور زور سے ہلایا''تم نے ہمارے ناک کٹوا دیئے —— نک وڈھا دتا۔ چینیاں توں بنڈ مروالئی (یہ 1962ء کی ہندوستان چین جنگ کے فوری بعد کا زمانہ تھا) میری چینی بیوی ہر وقت مجھے طعنے دیتی رہتی ہے۔ ککڑ کھان جوگے ہو۔ادھر شنگھائی پولیس میں ہم تھے، ہم نے چھ چینیوں کو ان کی دموں سے پکڑا اور پولیس سٹیشن لے گئے۔اب ہم ان سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ چینی ہمیں شکست دے سکتے ہیں۔''

میں نے سنگاپور کا دورہ بھی کیا اور جیل اور اس سے متصل ہسپتال دیکھا۔ہسپتال کے باہر میں نے ایک چھوٹے سے مزار کو دیکھا جو تامل لگتا تھا۔سنگ مرمر کی ایک تختی پر گرمکھی میں ایک روایت کندہ تھی: سادھی کرنی والا بابا۔ جو لوگ ہسپتال میں علاج کے لیے آتے وہ یہاں خوش بختی کے لیے نذر نیاز دیا کرتے تھے۔خود ساختہ تامل گدی نشین اسی نذر نیاز پر گزر بسر کرتا تھا۔ جب میں نے اس سے بابا کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔اس نے یہ گدی اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی جس نے اسے بتایا تھا کہ یہ جیل میں سو سال پہلے مرجانے

والے ایک مشہور سکھ کی لاش کو آگ لگائے جانے کی جگہ ہے۔ میں نے جلدی جلدی حساب لگایا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید یہ وہ جگہ ہے جہاں بھائی مہاراج سنگھ کی چتا کو آگ لگائی گئی تھی۔ اس شخص نے 1849ء میں سکھ سلطنت کے الحاق کے بعد برطانویوں سے لڑائی جاری رکھی تھی۔ گرفتاری کے بعد اسے سنگاپور بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے کوئی ایسا نمایاں سکھ یاد نہیں آسکا جو سو سال کے عرصے میں یہاں مرا ہو۔ میں کافی احمق تھا کہ اپنا یہ قیاس ایک سکھ رسالے میں شائع کروا دیا۔ سنگاپور کی سکھ کمیونٹی پہلے ہی کئی فرقوں میں منقسم تھی (ان کے ذات اور علاقائی امتیازات کی بنیاد پر نو گردوارے تھے) انہیں جھگڑے کے لیے نیا مسئلہ مل گیا۔ روایت پسندوں نے گرو گوبند سنگھ کی تحریروں سے حوالے دیئے کہ مزاروں اور قبروں کی پوجا ممنوع ہے۔ دوسروں نے کہا کہ یہ ایک خالی جگہ ہے جیسا کہ سنگ مرمر کی تختی کی تحریر ظاہر کرتی ہے۔ میرے مضمون کو مزاروں کی پوجا کرنے والوں کی پسندیدگی حاصل ہوگئی۔ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے اس کے گرد ایک گردوارہ بنا دیا۔ یہ ہوتا ہے سطحی تحقیق کا نتیجہ۔ میں ایک اور گردوارے کا ذمہ دار تھا۔ ایک مرتبہ پہلے میں نے ایسا ہی ایک قیاس قائم کیا تھا کہ آگرہ کے نزدیک سکندرہ میں اکبر کے مقبرے کے قریب ایک متروک یادگار وہ جگہ ہے جہاں نویں گرو تیغ بہادر نے دہلی آنے سے پہلے قیام کیا تھا جہاں 1675ء میں انہیں سزا دی گئی تھی۔ فوری طور پر آگرہ کی سکھ کمیونٹی نے وہاں گردوارہ بنا دیا تھا۔

میں رنگون چلا گیا۔ میں ایک مرتبہ پھر بہت سے ہندوستانی کاروباریوں سے ملا جن کے آئی۔ این۔ اے کے ساتھ روابط رہے تھے۔ میں نے ان کے کاموں اور آئی۔ این۔ اے کی میدان جنگ میں کارکردگی کے حوالے سے تفصیلی نوٹ لکھے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غدر پارٹی کی طرح آئی۔ این۔ اے نے ہندوستانی قوم پرستوں کو بارود تو مہیا کر دیا تھا مگر کوئی ٹھوس کامیابی نہیں حاصل کی۔ دنیا میں ایک سال تک پھرنے کے بعد میں دہلی واپس آ گیا۔ ہر شے کو قلم بند کرنے کا وقت تو اب شروع ہونا تھا۔

مجھے ان لوگوں سے حسد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ وہ لکھنے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں نے تو اسے ہمیشہ کولہوں میں درد کرنے والا ہی پایا ہے۔ اگر میں آمد کا انتظار کرتا رہتا تو میں کچھ بھی نہ لکھ پاتا۔ مجھے تو خود پر سخت ڈسپلن نافذ کرنا پڑتا تھا۔ یہ انہی برسوں کی بات ہے کہ مجھے صبح جلد اٹھ جانے کی عادت ہوگئی — 4 یا 5 بجے کے درمیان' اپنے لیے ایک جن سنگ کا کپ بناتا اور اپنے نوٹس کو کھنگالنے اور مواد کو ترتیب دینے بیٹھ جاتا۔ میرے باپ نے مجھے اپنی ساگوان کے تختوں والی سٹڈی دے دی تھی مع ایک غیر ملکی قالین اور ایک آتش دان کے۔ یوون نزدیکی انیکسی کے ایک کمرے میں میرے کزن کلبیر کے ساتھ بیٹھتی (آخر

دن تک یوون اس کے نام کا تلفظ Culbur کرتی رہی) جو میرے باپ کے سیکرٹری کے طور پر کام کرتا تھا۔ میں نے قسم کھائی ہوئی تھی کہ اس وقت تک کرسی سے نہیں اٹھوں گا جب تک میں اپنی میز پر رکھے سفید کاغذوں کو پر نہیں کرلوں گا۔ اکثر و بیشتر میں جو کچھ لکھتا تھا وہ بہت بدخط ہوتا تھا۔ میں اسے ٹائپ کرتا اور پھر اسے دوبارہ لکھتا تھا۔ بعض اوقات میں ایک سطر کو پانچ یا چھ بار لکھتا تھا تب وہ آسانی سے پڑھی جاسکتی تھی۔ میں کافی کا ایک وقفہ کرتا تھا۔ صبح کے درمیان میں کافی میرے والدین کے گھر کی ایک روایت بن چکی تھی۔ میری ماں تقریب کی صدارت کرتی اور ہر ایک کے لیے کافی انڈیلتی' بالائی اور چینی ملاتی۔ بہت سے ملاقاتی اس میں شرکت کرنے آتے تھے۔

ہر اتوار اور چھٹی کے دن کرشن شنگلو اور اس کی بیوی' سروجنی (بٹو) میرے اور میری بیوی کے ساتھ کناٹ پلیس کے کسی ریستوران میں کافی پینے کے لیے آتے تھے۔ میں ان کی آمد کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ کرشن بہت پڑھا لکھا تھا اور لاہور میں اس کی نظموں کا ایک انتخاب شائع ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ناول لکھنے کا منصوبہ بناتا رہتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے اس پر کام کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے دو ماہ کی رخصت بھی لی تھی۔ تب وہ زبردست تناؤ کی حالت میں ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے لیے نئی نوٹ بک اور بہت سی پنسلیں خرید لیتا۔ وہ ناول کو لکھنے سے پہلے میرے ساتھ اس پر بحث کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ ہم چاروں اکثر وولگا ریستوران میں ملتے تھے۔ اس کا چہرہ جوش سے چمک رہا ہوتا جب وہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا جاتا' وہ مجھ سے کہا کرتا تھا: ''کے سنگھ تمہارا کیا خیال ہے ناول کا یہ عنوان کیسا رہے گا۔ ''سنہری چھاتیوں والی عورت؟'' مجھے تسلیم کرنا پڑتا کہ وہ بہت تحریک دینے والا اور زبردست قابل فروخت عنوان ہے۔ ''مگر یہ کس کے بارے میں ہوگا؟'' میں پوچھا کرتا۔

وہ ڈھیلا پڑ جاتا اور پیچھے ہوکر بیٹھ رہتا۔ ''میں نے اسے ہنوز طے کرنا ہے۔ پہلی چیزیں پہلے۔ کسی کتاب کا عنوان ہمیشہ پہلی چیز ہوتی ہے جو کوئی شخص پڑھتا ہے۔'' شنگلو کبھی عنوانات کے نیچے اپنے نام کو بڑے حروف میں لکھنے سے آگے نہیں بڑھا۔ سنہری چھاتیوں والی عورت کبھی انسانی نگاہوں کے سامنے عیاں نہیں ہوئی۔ میں نے یہ بات شنگلو سے سیکھی کہ جو ادیب کتابوں کو تحریر کرنے سے پہلے ان کے عنوانات سوچتے ہیں وہ کبھی کبھار ہی آگے بڑھ پاتے ہیں۔

میں شنگلو کو لاہور میں ملاقات کے پہلے دن سے پسند کرتا تھا۔ وہ آکسفورڈ سے ابھی واپس ہی آیا تھا۔ وہ ایک طویل القامت' خوش لباس' بے خطا آداب والا انسان تھا۔ وہ کتابیں پڑھنے اور شاعری کرنے کے علاوہ اور کچھ کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ایک مشترکہ

خاندان میں رہتا تھا اور بظاہر تو اسے اپنی روزی کمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملات تقسیم کے بعد تبدیل ہو گئے جب خاندان لاہور میں اپنی جائیداد کھو آیا۔ اسے ملازمت ڈھونڈنا پڑی اور آل انڈیا ریڈیو میں اسے ملازمت مل گئی۔ اس کی شادی ایک اور کشمیری سروجنی (بٹو) سپرا سے ہو گئی۔ اس نے ایک نرسری سکول میں استانی کے طور پر ملازمت حاصل کر لی۔ وہ شنگلو کے والدین کے ساتھ ہی رہتے رہے۔ ہماری دوستی دہلی میں بحال ہو گئی۔ ہم کسی اور سے زیادہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں ڈنر کرتے تاکہ پی پلا سکیں، گپیں ہانک سکیں اور مل کر کھانا کھا سکیں۔ وہ بے حد ست تھا۔ میری بہترین یادداشت کے مطابق اس نے اے۔ آئی۔ آر میں اپنی ملازمت کے دوران جو واحد پروگرام لکھا اور پروڈیوس کیا وہ تھا ''طبلہ'' جس کی بنیاد ہندوستانی موسیقی میں استعمال ہونے والے مختلف تھاپ والے آلات پر تھی۔ وہ اس پر طویل مدت فخر کرتا رہا۔

ایک مرتبہ شنگلو نے مجھے اپنے ساتھ کشمیر پر ایک پروگرام تیار کرنے کے لیے بلایا۔ ہم نے اکٹھے ٹرین اور بس کے ذریعے سفر کیا۔ ہمیں ایک راستے میں واقع ڈاک بنگلے میں ایک ہی کمرے میں شب بسر کرنی پڑی۔ میں اس کے بلند خراٹوں کی وجہ سے سو نہیں سکا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کے سٹائلش خراٹے نہیں سنے تھے۔ ناک سے ناگوار آوازوں کے درمیان انگریزی کے لفظ نکلتے تھے: ''اوہ، نو، نو!...... اوہ یس! یس! بائی آل مینز۔'' وغیرہ۔ ہفتہ بھر کے دورے کے بعد ہم متفق ہو گئے کہ مل کر پروگرام لکھیں اور تیار کریں گے۔ اس کا اختتام اس پر ہوا کہ ان سب پروگراموں کو میں لکھوں گا۔ میں شنگلو کی کاہلی اور سنجیدہ کام کرنے کی نااہلی سے مانوس ہو چکا تھا۔

جس چیز نے مجھے لکھنے کا شیڈول رکھنے پر مائل کیا وہ یہ فضول خوف تھا کہ میں اسے بروقت مکمل نہیں کر پاؤں گا۔ جلد فنا ہو جانے کا خوف بیشتر ادیبوں کو ڈراتا ہے۔ میرے ساتھ اضافی خوف یہ تھا کہ ہو سکتا ہے میرے لکھ چکنے کے بعد مجھے کوئی پبلشر نہیں ملے۔ دوسرا خوف پہلے کی نسبت جلد ختم ہو گیا تھا۔ ایک نوجوان امریکی جوڑا دہلی میں ہمارا دوست بنا۔ جیک کرن ایک لمبا تڑنگا۔ خوب صورت مرد اور پرنسٹن کی ایک پیداوار، آر۔ ایس۔ ایس پر مقالہ لکھ چکا تھا اور امریکی سفارت خانے میں سیکنڈ سیکرٹری تھا۔ اس کی بیوی کیتھی جو کسی فلمی اداکارہ کے جیسی لگتی تھی پروکٹر اینڈ گیمبل خاندان کی وارث تھی۔ جیک نے پرنسٹن سے اپنے روابط برقرار رکھے تھے اور میرے تحقیقی منصوبے کے شعبے کے چند ارکان کو واضح طور پر کہہ دیا تھا۔ جب میں اپنی ''سکھوں کی تاریخ'' کی پہلی جلد کی نوک پلک سنوار رہا تھا تو مجھے پرنسٹن یونیورسٹی پریس سے ایک خط ملا جس میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ میرے کام کو شائع کرنے میں دلچسپی رکھتے

ہیں۔ میں نے انہیں پہلی جلد بھیج دی۔ اسے قبول کرلیا گیا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں زبردست اعتماد کے ساتھ دوسری جلد پر کام کرنے بیٹھ گیا۔ میری تین سالہ گرانٹ اختتام کے قریب تھی۔ مجھے اپنا کام ختم کرنے کے لیے مزید ایک سال کی ضرورت تھی اور میں نے راک فیلر فاؤنڈیشن سے درخواست کی کہ میری گرانٹ میں ایک اور سال کی توسیع کردی جائے۔ میری درخواست کو مسترد کردیا گیا — بلاشبہ اس شخص کی طرف سے جس نے اس کام کی تحریک دی تھی اور پھر مجھ سے اس کا جھگڑا ہوگیا تھا۔ مجھے دوسری جلد ختم کرنے کے لیے اپنے بل پر کام کرنا تھا۔ مجھے یوون لی روجیٹیل کی طرف سے غیر متوقع مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

میں نے دونوں جلدوں کو اپنے والدین کے نام کرکے ان کے احسانات کا بدلہ چکایا۔ میں نے یوون لی روجیٹیل کا شکریہ ادا کیا جس نے ایک ہندوستانی ٹائپسٹ کی تنخواہ پر میرے ساتھ کام کرتے ہوئے دہلی میں چار برس گزارے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جو اس کی سرپرستی کرنے پر راضی ہوئی۔ دوسری جلد کے آخر میں میں نے دو لاطینی الفاظ کا اضافہ کیا: اوپس ایکسیجی (Opus Exegu) ...... میرا کارحیات تمام ہوا۔ اس کو مکمل کر کے مجھے اس شخص کی طرح محسوس ہوا جو مستعار وقت پر جی رہا ہو' اپنے اور دنیا کے ساتھ شانتی سے ہو۔ اگر میں اور کچھ نہیں لکھوں تو مجھے کوئی فکر نہیں تھا۔

میری دو جلدوں کی دو مؤقر یونیورسٹی پبلشنگ ہاؤسز' پرنسٹن اور آکسفورڈ کی طرف سے اشاعت نے مجھ پر تعلیمی اداروں کے دروازے کشادہ کردیئے۔ جولڑکا اپنے سکول اور کالج کے امتحانات پاس نہیں کرسکا تھا ایک پروفیسر بن گیا تھا اور بغیر ڈاکٹریٹ کیے اسے ڈاکٹر سنگھ کہا جاتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے مدعو کرنے والی یونیورسٹی آف روچیسٹر تھی۔ میں وہاں سردیوں میں گیا تھا جب ہر شے نے برف کا کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ میں نے ہالیڈے ان میں پندرہ دن گزارے جو کہ مجھے دی گئی گرانٹ سے بہت زیادہ بالا تھا۔ میں کمرے میں دستیاب روٹی اور مکھن اور کافی پر گزارا کرتا تھا پھر مجھے طلبہ کے ہاسٹل والے بلاک میں وزٹنگ پروفیسروں کے لیے مخصوص ایک بیڈروم دے دیا گیا۔ مجھے کوئی کورسز نہیں پڑھانے تھے بلکہ مختلف اداروں میں میرے لیے چند لیکچروں کا انتظام کیا گیا تھا میں بیشتر وقت کوڈک اور سیروکس کارخانوں کے گڑھ اس صنعتی شہر کی سیر میں گزارا کرتا تھا۔ وہ ایک بدنما' ناقابل بیان' لمبی لمبی سیدھی گلیوں' خراب و خستہ مکانوں' گیس سٹیشنوں اور ٹرک ڈرائیوروں کے ہوٹلوں والا قصبہ تھا۔ فقط دو خوشگوار مقامات ہائی لینڈ پارک اور ایک وسیع قبرستان تھے' جہاں قصبے کے آباؤ اجداد سوئے ہوئے تھے ...... ان کے درمیان بدنام گروہ باز (گینگسٹر) بفلو بل کوڈی بھی تھا۔ خریداری اور تفریح کے لیے واحد خوشگوار جگہ ایک وسیع و عریض شاپنگ پلازہ تھا' جس کے ساتھ گھومنے والا

کلاک لگا تھا جو اس کے مرکزی ہال میں دنیا کے مختلف حصوں کا وقت دکھاتا تھا۔ میں نے وہاں دہلی کا وقت دیکھتے ہوئے کئی سہ پہریں گزاری تھیں۔

روچسٹر کا ایک یادگار تجربہ میری پیرس کے طالب علمی کے زمانے کی سیاہ فام دوست ہیزل میری سٹوکس کی ایک اتوار پر آمد تھی۔ اس کے بارے میں میری پیرس کی یادیں ایسی تھیں جن کے مطابق وہ ایک طویل القامت' ایک بہت دل آویز تناسبات والی نفیس و نازک عورت تھی جس کے گھنگریالے بال سر پر ڈھیر کی طرح پڑے رہتے اور جس کے ہونٹ چومنے لائق تھے۔ ہمارا رابطہ خطوں اور کرسمس کارڈوں کے ذریعے برقرار رہا تھا۔ وہ سکول ٹیچر بن گئی تھی' اس نے دو شوہروں سے شادی کی اور انہیں طلاق دے چکی تھی مگر کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ ڈیٹرائٹ میں اپنی اندھی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس نے ایک گرے ہاؤنڈ بس لی اور روچسٹر پہنچنے کے لیے رات بھر سفر کیا تھا۔ میں اس کے استقبال کے لیے بس سٹیشن پر موجود تھا۔ میں حیران رہ گیا کہ تیس برس کے بعد وہ کیسی لگ رہی تھی۔ وہ بس سے اتری' گوشت کا ایک عظیم پہاڑ۔ وہ زبردست جوش کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی اور خوشی سے بولی: '' ہنی! تم تو موٹے اور بوڑھے ہو گئے ہو۔''

میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا: ''میری تم تو اک ذرا نہیں بدلی ہو۔ تمہیں پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسی: ''جھوٹے! میں جانتی ہوں میرا وزن تھوڑا سا بڑھ گیا ہے۔''

ہم نے میرے اپارٹمنٹ آنے کے لیے ٹیکسی لی۔ وہ بہت تھوڑا سوئی تھی اور تھکی ہوئی اور بھوکی تھی۔ ''میں فوراً نہاؤں گی' کپڑے بدلوں گی اور پھر تم مجھے ناشتے کے لیے باہر لے جا سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ وہ باتھ روم چلی گئی مگر مجھ سے باتیں کرتے رہنے کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ اگر میں کچھ کہتا اور وہ سن نہیں پاتی تو وہ صابن ملتی ہوئی باہر نکل آتی اور پوچھتی: '' ہنی! تم نے کیا کہا تھا؟'' مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ نہانے کے بعد وہ خود کو تولیے سے پونچھنے کے لیے الف ننگی باہر آ گئی اور مجھ سے اپنے شوہروں' اپنی ماں اور اپنے کام کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا' اُسے چوما اور اُسے اپنے بستر پر لے گیا۔'' ہنی! تم میرے ساتھ ہم بستری نہیں کرنا چاہتے۔'' اس نے کہا: ''لہٰذا آؤ پرانے دنوں کی باتیں کریں' ٹھیک ہے نا؟'' میں ٹھنڈا ہو گیا۔ یقیناً میں اس کے ساتھ ہم بستری کرنا نہیں چاہتا تھا مگر محسوس کیا کہ شاید وہ کسی ایسا کرنے والے کی تمنائی ہو اور اگر میں نے کوشش نہیں کی تو تذلیل محسوس کرے گی۔ اس نے ایک ارغوانی رنگ کا لباس پہن لیا ــــ اس کا تیز' خیرہ کن لباسوں کا ذوق تبدیل نہیں ہوا تھا۔ میں اسے شاپنگ پلازہ لے گیا جو اتواروں کو کھلا ہوتا تھا۔

اس نے انڈوں، سور کے خشک نمکین گوشت اور کافی کا ناشتہ کیا۔ ''بڑی عورت کو بڑے ناشتے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس نے چہکتے ہوئے اعلان کیا تھا۔ ''اب میں ضرور نئے کپڑے خریدوں گی مجھے شاپنگ سے محبت ہے۔'' ہم دکانوں میں گھومتے پھرے۔ اس نے نئے جوتے اور کپڑے دیکھے۔ اُسے کچھ بھی پورا نہیں آیا۔ اس نے پوچھا کیا یہاں خاص دکانیں ہیں جہاں بڑی جسامت کے مردوں اور عورتوں کا سامان ہو۔ وہاں ایسی دکانیں تھیں۔ اس نے صبح کا باقی وقت چھوٹے کمروں میں مختلف لباس پہن پہن کر دیکھتے ہوئے گزارا، وہ باہر آتی اور مجھ سے تصدیق کرواتی ''کیا تمہارے خیال میں یہ مجھ پر جچے گا؟'' اس نے نئے کپڑے، نئے جوتے، مصنوعی زیورات اور ہر وہ شے خرید لی جس نے اسے متوجہ کرلیا۔ اب اپنی جنس سے عاری زندگی میں اسے ضرورت سے زیادہ کھانے اور سیر و تفریح پر جانے کی ضرورت تھی۔ لنچ میں اس نے گائے کے گوشت کے بڑے قتلے پر مکھن کا پیڑا رکھ کر کھایا، پیاز کھائے اور کھٹی کریم سے بھرے ہوئے آلو کھائے۔ اس کے بعد اس نے گرم چاکلیٹ ڈال کر آئس کریم کھائی۔ جب تک لنچ ختم ہوتا، سہ پہر ہو چکی تھی اور اس کے ڈیٹرائٹ روانہ ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بس سٹینڈ پر الوداع کہا اور اسے ایک پر جوش الوداعی بوسہ دیا۔ وہ میرا دن بہت ساری خوشی اور باتوں سے معمور کرگئی تھی۔ جب میں اپنے اپارٹمنٹ واپس آیا تو وہ سنسان لگ رہا تھا اور افسردہ کر دینے کی حد تک خاموشی۔

اگلی دعوت پرنسٹن یونیورسٹی کی طرف سے آئی۔ مجھے جنوری سے اپریل تین مہینے تقابلی ادیان پر ایک کورس کی تدریس کرنا تھی۔ میں نے پہلے قیام کرنے اور اپنی بیوی کے ایک ماہ بعد مجھ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ میں نیویارک پرواز کر گیا اور پروفیسر ہیزرڈ اور اس کی بیوی سوسن کے ساتھ دو دن گزارے۔ میں نے اسے اپنے وارسا کے ایک ہفتے کے دورے میں دوست بنایا تھا اور سوویت قانون پر اس کی تقریر سنی تھی جو وہ کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ میں یقین نہیں کر سکا تھا کہ کوئی شخص سوویت قانون جیسے بے رنگ بے کیف مضمون پر اس قدر وضاحت اور شگفتگی کے ساتھ بات کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے مین ہٹن میں اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے تفصیلی ہدایات دی تھیں اور ٹیکسی کا کرایہ بھی بتا دیا تھا۔ اس دورے نے مجھے سکھایا تھا کہ لوگوں کے کتنے سٹیریو ٹائپ (یک رخے) تصورات ہو سکتے ہیں۔ عمومی طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں ٹیکسی ڈرائیور عیار ہوتے ہیں۔ نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بری شہرت کے حامل ہیں۔ جس وقت میں کینیڈی ایئرپورٹ سے ٹیکسی میں سوار ہوا میں نے اپنی نگاہ میٹر پر رکھی۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک اطالوی تھا اور بولنے سے مجبور۔ اس نے مجھے گزرنے والی عمارتوں کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے ہوئے نوٹ کر لیا۔ ''فوسٹ ٹوائم ان نو

یوک؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''قریباً پہلی مرتبہ۔'' میں نے جواب دیا: ''میں نے کینیڈا جاتے ہوئے آدھا دن یہاں گزارا تھا۔'' ''نویوک بہت عظیم شہر ہے۔'' وہ شروع ہوگیا اور مختلف عمارتوں کی نشاندہی کرنے لگا۔ مجھے شک ہونا شروع ہوگیا کہ وہ مجھے یونہی گھمارہا ہے۔ میں نے میٹر پر عقابی نگاہ رکھی۔ ''تم تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر کیوں نہیں رکتے ـــــ وہ ہمارے راستے میں ہے' مسز سے ملؤ ایک کپ چائے یا سمپین پیو؟'' میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک فریبی ہے مگر میں اس کے دام میں نہیں آیا۔ ''نہیں شکریہ'' میں نے سختی سے جواب دیا۔ ''میرا میزبان اپنی دہلیز پر میرا انتظار کررہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے پہنچنے کے لیے ایئرپورٹ سے فون کردیا تھا۔'' اس نے میری ڈانٹ کا برانہیں مانا اور خوش خوش باتیں کرتا رہا۔ ''رہنے کے لیے دنیا میں سب سے اچھا شہر'' وہ بولتا رہا۔ ''دیکھو' میں اطالوی ہوں لیکن میں یہاں رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں: گوڈمنی' گوڈ پیپل' ' جب ہم پروفیسر ہیزرڈ کی دہلیز پر پہنچے تو اس نے صفروں کی لڑی دکھانے کے لیے میٹر گرادیا۔ میں عدد دیکھ چکا تھا' وہ بالکل وہی تھا جو مجھے ہیزرڈ نے بتایا تھا۔ '' کتنے؟'' میں نے پوچھا: '' کچھ نہیں'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ تمہارا میرے ملک میں فوئسٹ ڈے ہے۔ ہیوا نائس ڈے۔'' اور گاڑی بڑھا لے گیا۔ میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔

ہیزرڈ کا رام کرشنا مشن کے سامنے ایک بڑا تین منزلہ مکان تھا جس کے ایک طرف ہارلم اور دوسری طرف سنٹرل پارک تھا۔ اوپر والی منزل پر ایک پولینڈ کا طالب علم رہتا تھا۔ جو اپنے کرائے کی جگہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ واضح طور پر وہ بہت آسودہ حال تھے۔ مجھے کہا گیا کہ میں جب کبھی نیویارک آؤں ان کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھوں۔

اگلی صبح میں ٹرین میں پرنسٹن گیا۔ موسم بہت سرد تھا۔ میں نے رہائش کے لیے مجھے دیئے گئے اپارٹمنٹ کے پتے تک ٹیکسی لے لی۔ میرے ہدایات والے خط میں دو چابیاں تھیں۔ ٹیکسی خالی گلی میں دو سوٹ کیسوں کے ساتھ مجھے چھوڑ گئی جہاں تیز روشنیاں کھڑکیوں کے پار دکھا رہی تھیں۔ سڑک سے میرے دروازے تک کے راستے پر تین فٹ برف پڑی ہوئی تھی۔ میں برف پر اپنے سوٹ کیسوں کو گھسیٹتا چلا گیا۔ جب میں دروازے تک پہنچا میرے جوتے اور جرابیں بھیگ چکے تھے اور انگلیاں ٹھٹھر رہی تھیں۔ میں نے چابیوں کو ٹٹولا' ہر ملک میں تالوں اور چابیوں کی اپنی ہی قسم ہوتی ہے اور ان سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ آخرکار میں نے دروازے کو غیر مقفل کیا۔ پھر میں نے سوئچوں کے لیے دیواروں کو ٹٹولا: ہندوستان میں تم انہیں نیچے دباتے ہو' امریکہ میں تم انہیں اوپر دباتا۔ میں اسے اوپر دبانے سے پہلے ایک مرتبہ نیچے دبانے کی کوشش کی' پھر کمرہ روشنی کے سیلاب سے جگمگانے لگا۔ ہال وے میں ایک میز پر پلے کارڈ رکھا تھا: ''پرنسٹن میں خوش آمدید۔'' بے شک! میں نے خود سے کہا'

جونہی تیزی سے میں اپنے سوٹ کیسوں کو اندر لایا میں نے اپنے گیلے جوتے اور جرابیں اتار پھینکیں۔ یہ اتوار تھا اور میں نے سٹیشن سے آتے ہوئے راستے میں کوئی کیفے نہیں دیکھا تھا۔ میں ڈنر کہاں کروں گا؟

میں نے کمرۂ نشست (سٹنگ روم) میں دیکھا۔ میز ڈنر کے لیے لگا دی گئی ہوئی تھی' ایک ٹکڑا روٹی اور روٹی کاٹنے کا چاقو ساتھ پڑا تھا۔ اس کے علاوہ سکاچ کی ایک بوتل بھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے فریج کھولا۔ اس کے اندر انڈے' دودھ' وائن' سوڈے کی بوتلیں' شہد اور جام اور چاکلیٹ رکھے ہوئے تھے۔ ریکوں میں سوپ اور سبزیوں کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر خواب گاہ (بیڈ روم) میں گیا۔ بستر میرے سونے کے لیے لگا دیا گیا ہوا تھا۔ غسل خانے (باتھ روم) میں ٹائلٹ پیپر کے رولز' صابن کی ٹکیاں اور کولون کی ایک بوتل موجود تھی۔ آج تک میں نہیں جانتا ہوں کہ کس نے میرے لیے یہ سب کچھ کیا تھا' نہ ہی میں نے ان اشیاء کا معاوضہ ادا کیا تھا۔

میں شعبۂ فلسفہ و مذہب سے منسلک تھا۔ ماضی میں اس شعبے سے بہت مشہور و معروف لوگ منسلک رہ چکے تھے مثلاً پروفیسر حِتّی اسلام کی تدریس کیا کرتے تھے۔ اس وقت والٹر کافمین' جس نے اپنی کتابوں کے علاوہ بہت سے جرمن کلاسیکوں کا ترجمہ کیا تھا' شعبۂ فلسفہ کا سربراہ تھا۔ اس نے اپنی تصنیف ''فیتھ آف اے نان بیلیونگ جیو'' (Faith of a Nonbelieving Jew) جرمن شاعری اور فلسفے پر لکھی گئی کتابوں کے تراجم سے نام کمایا تھا۔ ڈاکٹر فلپ ایشبی شعبۂ مذہب کا سربراہ تھا۔ اس کے رفقائے کار کے درمیان یہودیت کا ایک ممتاز عالم (سکالر) پروفیسر ڈائمنز تھا۔ وہ ایک سائیکل پر گیا ہوا تھا۔ مجھے تین ماہ کے لیے اسی کا کمرہ دیا گیا تھا۔ دونوں شعبے ایک ہی عمارت میں قائم کیے گئے تھے تاہم سوائے لاؤنج کے الگ الگ تھے' لاؤنج میں وہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت گرم کافی پیتے اور بسکٹ کھاتے تھے۔ فلسفی مذہب کے اساتذہ کو مذہبی پیشوا کی حیثیت سے تحقیر سے دیکھتے تھے' مذہب کے اساتذہ فلسفیوں کو مغرور سمجھتے تھے' جن کے پاس غرور کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ اور دونوں فلسفیوں اور مذہب کے اساتذہ کو دیگر شعبوں کے ارکان تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے خصوصاً معیشت داں جن کے پاس سڑک کے پار ایک جاپانی ماہر تعمیرات (آرکیٹکٹ) کی ڈیزائن کردہ کئی منزلہ سفید عمارت تھی۔ جو سب سے زیادہ مشہور نام پرنسٹونینز کے ذہنوں میں اب بھی تازہ تھا وہ البرٹ آئن سٹائن تھا جس کا انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز میں واقع گھر ایک معبد — ایک جائے پرستش قرار پا چکا تھا۔ اس وقت شعبے میں صرف دو مزید ہندوستانی موجود تھے۔ دونوں ریاضی داں تھے' ڈاکٹر ہریش چندر اور ڈاکٹر بابو مرتھی۔ وہاں کوئی ہندوستانی طالب علم نہیں تھا۔ پرنسٹن

مکمل طور پر ایک مردانہ ادارہ تھا۔ تاہم میری سولہ طالب علموں کی جماعت میں دو عورتوں کو بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی۔

پرنسٹن ہلکے پھلکے لمحات بھی تخلیق کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ طلبہ کو اپنے ہوسٹلوں میں ویک اینڈ پر عورتوں کی تواضع کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ طلبہ آسودہ حال خاندانوں سے آئے ہوئے تھے' بیشتر کے پاس اپنی کاریں بھی تھیں' جن کی وجہ سے کیمپس میں کافی جگہ رک جاتی تھی۔ پولیس چاہتی تھی کہ یونیورسٹی طلبہ کے کاریں لانے پر پابندی عائد کردے۔ صدر گوہین (بعدازاں ہندوستان میں سفیر) نے طلبہ کو انتخاب دیا کہ یا تو وہ کاریں ساتھ لے کر آیا کریں یا پھر ویک اینڈز پر اپنی خاتون دوستوں کو ملا کریں۔ صحت مند پُر شباب نوجوان ہوتے ہوئے طلبہ نے لڑکیوں کو منتخب کیا تھا۔ قوانین کا تقاضا تھا کہ عورتیں مردوں کے ہاسٹل سے آدھی رات سے پہلے پہلے رخصت ہو جائیں۔ تام ایک سردیوں کے موسم میں ایک رات تین بجے ایک ہاسٹل میں آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ کو اوپری منزلوں پر رہنے والے طلبہ کو بچانے کے لیے اپنی لمبی لمبی سیڑھیاں استعمال کرنا پڑیں۔ جن لوگوں کی انہوں نے جانیں بچائیں ان میں کافی تعداد میں بے لباسی کے مختلف مرحلوں میں عورتیں بھی تھیں۔

انسان کو یہ تصور لے کر نہیں جانا چاہیے کہ کسی امریکی یونیورسٹی کے کیمپس میں زندگی بس کھیل تماشا ہی ہوگی۔ کئی مرتبہ راتوں کو بس پر نیویارک سے واپسی پر میں نے آدھی رات ہو جانے کے باوجود سارے کیمپس بشمول لائبریریوں کی بتیاں روشن دیکھیں۔ طلبہ پڑھ رہے ہوتے تھے۔ میرے اپنے تدریس کے تجربے نے مجھے اپنے لیکچروں کو سنجیدگی سے لینا سکھایا۔ ہر وہ کتاب جس کو میں مطالعے کے لیے تجویز کرتا تھا میرے لیکچر دینے تک پڑھ جا چکی ہوتی تھی۔ میں نے طلبہ کا ہم قدم ہونا اپنے لیے دشوار پایا اور اکثر ایسا ہوتا کہ میں خود سے کیئے جانے والے طلبہ کے متجسسانہ سوالات کے جواب دینے میں ناکام ہو جاتا۔ ٹرم کے اختتام تک میں ان کو اتنا کچھ تو دے چکا تھا کو وہ میری تحسین کرتے تاہم اندر سے میں جانتا تھا کہ میں بہت کامیاب نہیں ہوا ہوں۔ مجھے دوست بنانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہیفل فنگر ز اپنی رشتہ دار لوسیا بیلینٹائن کو خط لکھ چکا تھا' جس کی شادی ٹرینٹن میں پڑھانے والے ایک خوب صورت پروفیسر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اسے ہیفل فنگر کی دولت میں سے کچھ ورثے میں حاصل ہوئی تھی اور وہ ایک تین منزلہ بڑے مکان میں بڑے آسودہ انداز میں رہ رہی تھی اس کے پاس ایک باورچی اور ایک ملازمہ بھی تھے۔۔۔ امریکہ میں شاذ سہولیات ۔ وہ خیر کے کاموں کی بھی شوقین تھی اور نوجوان مجرموں۔۔۔ بیشتر سیاہ فاموں۔۔۔ کو ویک اینڈز پر دعوت دیتی تھی' جب انہیں جیل سے باہر جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ جونہی اُسے پتہ چلا کہ میں کہاں قیام پذیر ہوں اس نے میری

خبر گیری کی۔ وہ اکثر ایک خوب صورت مطلقہ' دو بچوں کی ماں جارجین ہال کو بھی مدعو کیا کرتی تھی
—اس کی بیٹی کی عمر پندرہ سال اور بیٹے کی عمر بارہ سال تھی۔ جارجین اکثر ٹی وی پر آیا کرتی تھی
اور جہاں کہیں بھی جاتی اسے پہچان لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دم ہی دوست بن گئے۔ اس نے مجھے
لوسیا سے لے لیا اور مجھے اپنے بچوں کے ساتھ ڈنر کے لیے اکثر بلانے لگی۔ وہ مجھے دیہاتی
علاقے میں لانگ ڈرائیوز پر بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ لوگ ہم دونوں کو اتنا زیادہ اکٹھے
دیکھ کر حیران تھے۔ اس وقت تک مجھے بھی خاصا جانا جانے لگا تھا' کیونکہ میرے لکھے ہوئے کئی
مضامین ''نیویارک ٹائمز'' میں شائع ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ شعبہ کے ارکان نے بھی مجھے میرے
استحقاق سے زیادہ سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا تھا۔ جارجین کے اندازے کے مطابق میں ایک
مشہور شخص بن چکا تھا۔ میں اس کی توجہ سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک شام اس نے
مجھے فون کیا اور فوری طور پر ہسپتال پہنچنے کا کہا جہاں اس کی بیٹی کار کے ایک حادثے میں لگنے
والے زخموں کی وجہ سے داخل کی گئی تھی۔ لڑکی کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ درد سے چلا
رہی تھی' جارجین مایوسی کے عالم میں لڑکی کے باپ سے رابطہ کرنے کی کوششیں کر رہی تھی تا کہ
اسے صورتحال سے آگاہ کر سکے۔ لڑکی اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی' اس نے ڈاکٹر سے التجا کی کہ
مجھے اس کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں اس وقت تک رہنے دیا جب تک اس کو صاف کر کے اس
کے زخموں کو ٹانکے نہیں لگا دیئے جاتے۔ ڈاکٹر کو سمجھ نہیں آیا کہ اس منظر میں ایک سیاہ فام شخص
اپنی پگڑی اور ڈاڑھی کے ساتھ کیونکر موزوں ہے۔ اس نے مجھے اس کے ساتھ رہنے کی
اجازت دے دی۔ جب نرس اس کے کپڑے اتار رہی تھی تو لڑکی نے میرے ہاتھوں کو پکڑا
ہوا تھا اور میز پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ہموار جلد والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ میں اپنے آپ کو
یاد دلاتا رہا کہ میں اس کی ماں کا دوست تھا اور مجھے اس کے بچوں کی دیکھ بھال اس طرح کرنی
چاہیے جیسے کہ ان کا باپ اپنی اولاد کی دیکھ بھال کرتا۔ لڑکی کو خواب آور دوا دے دی گئی اور
جلد ہی وہ گہری نیند سو گئی۔ جب میں تھیٹر سے باہر آیا تو لڑکی کے باپ سے میری مختصر سی
ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے اور جارجین کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے اور وہ اپنے اپنے گھروں کو
واپس جا کر سو سکتے ہیں۔

دوسروں کے درمیان جنہوں نے مجھے اپنا دوست بنایا فلسفی پروفیسر کافمین بھی تھا۔
وہ مجھے اپنے گھر اکثر مدعو کرتا تھا' جہاں وہ مشہور و معروف لوگوں' خاص طور پر یہودیوں کی خاطر
مدارات کیا کرتا تھا۔ میری بیوی کے مجھ سے آملنے کے بعد ہمارے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع
ہو گیا۔ سردیوں نے بہار کو اور برف نے سبزے اور میگنولیا کو راستہ دے دیا تھا جس شخص نے بھی
امریکہ میں میگنولیا کو کھلتے ہوئے نہیں دیکھا ہے اس نے دنیا کے سب سے زیادہ حسین نظاروں

میں سے ایک نظارے کو گنوا دیا ہے۔ جب میں دوسری یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے لیے نہیں جاتا تھا (انہوں نے مجھے میری تنخواہ سے زیادہ روپیہ فراہم کردیا تھا) تو ہم کسی نہ کسی خاندان کے ساتھ باہر جایا کرتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں رہنے والے مشہور و معروف لوگوں میں لوئیس فشر بھی شامل تھا جس نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس پر یونیورسٹی میں کوئی تدریسی ذمہ داری نہیں تھی مگر مستقل طور پر وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں لنچ کیا کرتا تھا۔ ہم اکثر اکٹھے واپس آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ڈرگ سٹور سے میں نے آئس کریم کا کارٹن لیا' میں اور میری بیوی دونوں آئس کریم کے شائق تھے تاہم ہم سب سے سستی ورائٹی خریدا کرتے تھے۔ لوئیس فشر نے سب سے مہنگی آئس کریم خریدی اور مجھے اپنی بیوی کو دینے کے لیے تھما دی۔ ''اس کا چہرہ بہت پیارا ہے'' اس نے جواز کے طور پر مجھے بتایا۔ ''مجھے آئس کریم بہت پسند ہے مگر ذیابیطس کی وجہ سے یہ مجھے منع ہے۔ میں جن لوگوں کو پسند کرتا ہوں انہیں اسے دے کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔''

پرنسٹن میں رونما ہونے والا ایک واقعہ بہت مزیدار ہے۔ گرمیوں کے ایک دن میں اپنے عقبی باغیچے میں لکڑی کے بنچ پر دھوپ تاپ رہا تھا۔ لکڑی کی ایک ننھی سی پھانس میرے انگوٹھے میں چبھ گئی۔ میں نے اس پر اس وقت تک توجہ نہیں دی جب تک کہ اس میں پیپ نہیں پڑ گئی۔ فل ایشی نے میرے ہاتھ پر سوجن کو محسوس کیا اور مجھے سوچنے کا موقع دیئے بغیر یونیورسٹی کے کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر نے سرجری کے لیے مجھے ہسپتال بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یونیورسٹی کے دو سیاہ فام پولیس والوں کے سپرد کردیا گیا اور سرجری کے لیے لے جایا گیا۔

جب میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے سرجن کو اپنے پولیس والوں سے بات کرتے سنا:

''تم اپنے ساتھ کسے لائے ہو؟ یہ مجرم ہے یا اس پر کسی جرم کا الزام ہے؟'' پولیس والوں نے اپنی آوازیں آہستہ کرلیں اور میں سن نہیں سکا کہ انہوں نے جواب میں کیا کہا۔ مجھے سرجری کے لیے اندر لے جایا جارہا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا بات ہوئی ہے؟ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کسی ڈاکٹر یا پروفیسر کی طرح بولنا شروع کردیا: ''یہ تو ایک جرم ہے۔'' اس نے مجھے کہا: ''میں اسے باہر نکالوں گا اور تمہیں دو دن یونیورسٹی کے ہسپتال میں گزارنا پڑیں گے۔'' جرم کو کاٹ دیا گیا' میرے ہاتھ کو پٹی باندھ دی گئی اور مجھے سیاہ فام پولیس والوں کے حوالے کردیا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا: ڈاکٹر سنگھ میں آپ سے مزید ملنا پسند کروں گا۔ میری بیوی آپ سے مل کر خوش ہوگی۔''

مجھے ہسپتال میں دو دن اور دو راتیں گزارنا پڑیں۔ مجھے خواب آور ادویات کے زیر اثر

رکھا گیا۔ جو کہ غیر ضروری تھا کیونکہ مجھے کوئی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ بشمول صدر کی بیوی مسز گوہین کے میرے لیے چاکلیٹ اور پھول لے کر آئے ــــ جنہیں قبول کر لیا گیا۔ امریکہ میں وہ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔

ہر سال اپریل میں نیویارک ہوٹل میں لیکچراروں اور پروفیسروں کی عظیم الشان نیلامی ہوتی ہے۔ وہ معلمین جو اس جگہ سے خوش نہیں ہوتے تھے جہاں وہ موجود تھے' یا وہ سمجھتے کہ وہ زیادہ بہتر کے مستحق ہیں وہاں بڑی تعداد میں آتے تھے۔ اسی طرح مختلف یونیورسٹیوں کے ڈینز بھی بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ ان کی ملاقاتیں مے نوشی' دوپہر کے کھانوں اور رات کے کھانوں پر ہوتیں۔ تبدیلی کے خواہشمند یا نئے شعبوں کو قائم کرنے والے ڈینز دستیاب معلموں کے تعلیمی کوائف کا معائنہ کرتے اور انہیں پیشکش دیتے تھے۔ ملازمت کی شرائط پر کافی مول تول ہوتی۔ یہ حقیقتاً غلاموں کی ایک منڈی کے مانند تھا' جہاں درخواست دہندگان کی شکل وصورت تو نہیں البتہ شائع شدہ کتابوں اور عالمانہ مقالوں کو آنکا جاتا تھا۔ رابرٹ کرین نے تجویز دی کہ میں وہاں آؤں' اگر ملازمت کے لیے نہیں تو پھر دوسرے ہندوستان کے ماہروں' مستشرقین اور دوسرے علوم کے ماہروں سے ملاقات کرنے کے لیے آؤں۔

میں امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ملازمت میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا: اگرچہ پیسہ تو اچھا تھا مگر وہ مجھے آسودگی اور طمانیت کا احساس نہیں دیتا تھا۔ جب میں اس اجتماع میں موجود تھا تو یونیورسٹی آف ہوائی کے ڈین آف سٹڈیز' ایک جاپانی نیسی نے' مجھے ہندوستانی مذاہب اور معاصر ہندوستانی تاریخ پر گرمیوں کی کلاسوں کو چھ ہفتے کا کورس پڑھانے کی پیشکش کی۔ اس کا مطلب پرنسٹن یا کسی اور جگہ جانے سے پہلے ہوائی میں مہینہ بھر قیام تھا۔ ڈین نے اس کی تلافی کے طور پر ہوائی اور بعد میں ہندوستان کے لیے میرے اور میری بیوی کے لیے ہوائی سفر کے کرائے کی فراہمی کا وعدہ کیا۔ اپنی بیوی سے مشورے کے بعد میں نے اس پیشکش کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے مجھے اتنی رقم مہیا ہو جاتی کہ میری بیٹی مالا کے جو اس وقت نیو ہال کیمبرج (انگلینڈ) میں تعلیم حاصل کر رہی تھی' ہوائی سفر کے اخراجات نکل آتے' یوں وہ اپنی گرمیوں کی چھٹیاں ہمارے ساتھ ہوائی میں گزار سکتی تھی۔ مجھے ایک دولت مند سندھی تاجر کی امریکی بیوی مسز ایلن میٹومل کی طرف سے بھی خط موصول ہوا کہ وہ مجھے ساحل پر واقع اپنے فرنیچر لگے ہوئے اپارٹمنٹس میں سے ایک بہت کم کرائے میں دے دے گی۔ نیویارک' فلاڈیلفیا' شکاگو' واشنگٹن میں اپنے امریکی دوستوں کے ساتھ قیام کرنے اور میری سٹوکس اور اس کی ماں کے ساتھ دو دن بسر کرنے نیز ونکانسن' ڈیوک اور روچسٹر میں لیکچر دیکر مزید ڈالر کمانے کے بعد ہم ہوائی کی طرف پرواز کر گئے۔ کچھ دنوں بعد مالا ہم سے آ ملی۔ وہ بڑے

خوف ناک موڈ میں تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکی تھی اور اسے کیمبرج سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے اپنی بری کارکردگی کا ذمہ دار ٹھہرایا کیونکہ میں اسے اپنے ساتھ ساتھ دہلی سے لندن' اوٹاوہ' پیرس اور پھر واپس دہلی گھسیٹتا پھرا تھا' کہیں بھی اسے قیام پذیر ہونے کا موقع دیئے بغیر۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے بس اس لیے کیمبرج بھیجا تھا تاکہ اپنے دوستوں کو کہہ سکوں کہ میری ایک بیٹی وہاں پڑھتی ہے۔ چونکہ وہ ناخوش تھی اس لیے میں بھی ناخوش ہوگیا۔ میں دن بھر یونیورسٹی میں ان سے دور رہنے پر خوش رہتا اور شام ہی کو اپنے خاندان سے ملتا۔

ہوائی میں مجھے Largish کلاس ملی تھی۔ ان میں سے بیشتر سنجیدہ طالب علم نہیں تھے بلکہ سرفنگ' تیراکی اور سن باتھنگ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چند ایک عورتیں تھیں جو ڈیپارٹمنٹ سٹوروں' کیفے اور ریستورانوں میں کام کرتی تھیں۔ ہندوستانی مذاہب پر میری کلاس میں' جس میں مالا بلا معاوضہ بیٹھتی تھی' دوننیں بھی تھیں۔

یونیورسٹی میں میرے پاس ایک خوش گوار چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ ایک ہندوستانی سکالر شرما کا کمرہ تھا جس کی بیوی کی تصویر میری میز پر لگی ہوئی تھی۔ وہ ضرور ہی ایک ہوش ربا عورت رہی ہوگی۔ جب میں شرما کی کتابیں ایک شیلف میں رکھ رہا تھا تو میں نے اس کی بیوی کی تصویر جوں کی توں رہنے دی تھی۔ ہوائی نے مجھے ان لیکچروں کو مزید بہتر بنانے کا موقع فراہم کیا جو کہ میں نے پرنسٹن میں دیئے تھے۔ میں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور آزادی کی تحریک کی تاریخ اور آزادی کے بعد ہندوستان کی کارکردگی کا مطالعہ بھی کیا۔ وہاں اچھے کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ شعبے کے ارکان بشمول رابرٹ کرین چینی ریستورانوں کو جایا کرتے تھے۔ جب ہمارے چینی سپیشلسٹس کھانے کا آرڈر دیتے تو برف کی ڈلیوں کی ایک ٹوکری اور رائی وہسکی کی ایک بوتل میز پر رکھ دی جاتی۔ جب تک کھانا ختم ہوتا ہم چوپ سوئی اور امریکی وہسکی سے لبریز ہو چکے ہوتے تھے۔ میرے ساتھی پروفیسر سہ پہر کو کیا پڑھاتے ہوں اس کا اندازہ کوئی بھی شخص آسانی سے لگا سکتا ہے۔ ایسے دو یا تین دوپہر کے کھانوں کے بعد میں تو چیخ اٹھا اور ایسٹ ویسٹ سنٹر سے چلتا ہوا کیفے ٹیریا میں کھانے کو ترجیح دینے لگا۔ سنٹر کا ماحول بہت مریضانہ سا تھا۔ وہاں موجود بیشتر فیلوز ممتاز علما نہیں تھے اور عدم تحفظ محسوس کرتے ہوئے وزٹنگ لیکچراروں کو شک و شبے اور معاندت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ وہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ میں سنٹر میں ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

اپنے طلبہ کے ساتھ میرے اپنے مسائل تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہندوستان' اس کی تاریخ یا مذہب کے بارے میں تھوڑا سا بھی علم نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اپنے لیکچر بہت ابتدائی

بنانے پڑتے تھے اور جتنے قصے کہانیاں میں کھوج سکتا تھا ان سے اپنے لیکچروں کو بھر دیتا تھا۔ خاص طور پر پریشان کرنے والی دونیسی جاپانی لڑکیاں تھیں جو میرے بولنا شروع کرتے ہی اونگھنے لگتی تھیں۔ انہیں جگائے رکھنا ایک چیلنج بن گیا تھا۔ میں تو اس کام کو انجام دینے میں ناکام ہوگیا۔ میں نے ان دونوں کو ٹرم کے وسط میں ہونے والے امتحانوں میں فیل کر کے ان سے انتقام لیا۔ جب وہ مجھ سے ملنے میرے دفتر میں آئیں تو میں نے ان سے صاف صاف کہا: ''جب تم کسی شخص سے گفتگو کر رہی ہو اور وہ سو جائے تو تم کیا محسوس کرو گی؟ یہ تو بہت نظر انداز کر دینے والا رویہ ہوگا۔'' انہوں نے معافی مانگی اور بتایا کہ وہ ایک نائٹ کلب میں صبح تین بجے اس کے بند ہو جانے تک کام کرتی ہیں۔ ان کے پاس میرے لیکچر میں آنے سے پہلے بمشکل تین گھنٹے سونے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ کورس چھوڑ گئی تھیں۔

جب میں اپنی صبحیں کیمپس میں گزارتا' میری بیوی اور بیٹی اپنی صبحیں شاپنگ پلازوں میں گزارتی تھیں۔ جب میں واپس آتا تو سمندر میں ایک گھنٹہ نہاتا۔ ہونولولو اپنے خوب صورت ساحلوں کے علاوہ تماش بینی کے لیے ایک زبردست مقام ہے۔ ہر کسی نے بہت مختصر سا لباس پہنا ہوتا ہے اور تمام دروازے اور کھڑکیاں سمندری ہوا کو اندر آنے دینے کے لیے کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ہر بلند اپارٹمنٹ سے تم اپنی فیلڈ گلاسز کے ذریعے عریاں مردوں اور عورتوں کا نظارہ کر سکتے ہو۔ جب میری بیوی اور بیٹی وہاں نہیں تھیں تو میں خوب صورت لوگوں کو تخلیق کرنے پر خالق کا شکریہ ادا کرنے میں کئی گھنٹے گزار دیا کرتا تھا۔

ہوائی کے پاس پیش کرنے کو بہت کچھ ہے۔ شیریں ترین اور رس سے لبریز تازہ خربوزے' اناس' ایووکیڈو' ناشپاتیاں اور سب سے بڑھ میکاڈیمیا اخروٹ ان جزیروں کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارا تعارف جنگلی چاول سے بھی ہوا جنہیں ریڈ انڈین دلدلوں میں اگاتے اور ذخیرہ کرتے ہیں۔ یہ عمدہ ترین باسمتی سے کہیں زیادہ موٹے ہوتے ہیں اور ان پر بغیر کسی چیز کا اضافے کیے کھانے میں بہترین ہوتے ہیں۔ یہ بہت مہنگے بھی ہوتے ہیں۔

ہوائی کا مرکزی جزیرہ ہیلو ہونولولو سے جہاز کے ذریعے تھوڑے سے فاصلے پر ہے اور اس پر ایک زندہ آتش فشاں پہاڑ موجود ہے۔ جس کے اردگرد ایسے نباتات اور حیوانات پائے جاتے ہیں جو ہر جگہ سے مختلف ہیں۔ دو ہندوستانی خاتون معلموں نے' جو ہندوستان کے لیے طلبہ کا امن دستہ تیار کر رہی تھیں' ہمیں ہندوستانی بھوجن دیا۔ حیران کر دینے والی شے کھانے کے اختتام پر آئی: انہوں نے اپنے باغ میں پان اگا رکھے تھے اور ہیلو کے ویرانے میں انہوں نے ہمیں ''مگھنی'' پان کھلائے۔

اپنے تدریس کے دورانیئے کے اختتام پر میں نے اپنے لیے ایک تقریب کا اہتمام

کرنے کا فیصلہ کیا: میں ایک نائٹ کلب میں کھانا کھایا کرتا تھا جہاں ننگی چھاتیوں والی ویٹریسیں خدمت کیا کرتی تھیں "اپنی عمر کا خیال کریں پاپا۔" میری بیٹی نے مجھے کہا۔ "تم ضرور سٹھیا گئے ہو" میری بیوی نے کہا تھا۔ میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ آخر کار انہوں نے میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ نائٹ کلب کا دورہ بے نتیجہ ثابت ہوا۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے ایک ننگی چھاتیوں والی ویٹریس میری برساتی (رین کوٹ) اتارنے میں میری مدد کرنے کو بڑھی۔ "آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی پروفیسر" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے بولی۔ وہ میری طالب علم تھی۔

ایک جگہ جس کے لیے میری بیوی اور میری بیٹی مجھے منع نہیں کرتی تھیں' ہیلتھ کلب تھی' جہاں میں سوانا باتھ لینے کے لیے باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ جسم پر مالش کرنے والی عورتوں میں ایک نوجوان' دل کش' ایتھلیٹک سیاہ فام لڑکی بھی تھی۔ ہر مرتبہ جب میں جاتا وہ آنکھوں میں شرارت بھر کر مجھے کہتی: "ہنی! کیا تم پسند نہیں کرو گے کہ میں تمہاری مالش کروں؟" "نہیں میں پسند نہیں کروں گا۔" میں جواب دیا کرتا۔ "کیوں؟ کیا میرے اندر کوئی خرابی ہے؟" وہ بڑی شوخی کے ساتھ پوچھا کرتی۔ "ایسا نہیں ہے بلکہ تمہاری تو ہر چیز زبردست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے اپنے بدن پر مالش کرتے ہوئے اپنے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتا۔" وہ خوشی سے ہنس ہنس کر دہری ہو جایا کرتی تھی۔

ہوائی کے مقامی لوگ بہت زیادہ محنت میں یقین نہیں رکھتے۔ میں نے تو انہیں سارا سارا دن اپنے پورچوں کے لکڑی کے قدمچوں پر بیٹھے بیئر پیتے اور بینچوں پر گاتے ہوئے دیکھا۔ ایک شام جب میں ہیلتھ کلب سے آیا تو میری بیوی اور میری بیٹی میرے ساتھ ساحل پر شام کی چہل قدمی کے لیے چلے گئے۔ وہ آگے بڑھ گئیں۔ مجھے ایک امریکی عورت نے متوجہ کر لیا جو اپنے گھنگریالے بالوں والے کتے کو پیشاب کروا رہی تھی۔ جیسے ہی چھوٹے سے کتے نے اپنی آنتوں کو خالی کیا عورت نے اپنے دستی بیگ میں سے ٹائیلٹ پیپر نکالے اور اس کے مقعد کو صاف کیا۔ جب میں یہ منظر دیکھ رہا تھا تو ایک ہوائی لڑکی' واضح طور پر بیئر سے مخمور' میرے پاس آئی اور بولی: "ہیلو"۔ اس نے میرے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں ہوائی میں کیا کر رہا ہوں۔ "تفریح کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم یہیں آباد کیوں نہیں ہو جاتے؟" اس نے پوچھا: "تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو اور ہمارا بڑا پیارا سا گھر ہوگا۔" میں اس کے اس کھلم کھلا انداز میں شادی کی پیشکش کرنے پر ہکا بکا رہ گیا' وہ طوائف جیسی نہیں لگتی تھی۔ "میں تم سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹی ہے اور گھر پر میرا بیٹا ہے۔ سامنے سڑک کے آخر پر انہیں سیر کرتے ہوئے دیکھو؟" اس نے دونوں ہیولوں پر نظر ڈالی اور جواب دیا: "لیکن وہ آگے جا چکی ہیں' تم انہیں چھوڑ سکتے ہو اور میرے ساتھ

آ سکتے ہو۔'' میں نے اس کی فراخ دلانہ پیشکش پر اس کا شکریہ ادا کیا' اس کے لیے اپنے بہت زیادہ بوڑھے ہونے پر معذرت کی اور اپنے قدموں کو تیز کرلیا۔

ہم ہانگ کانگ میں تھے جب ہم نے روپے کی قدر کی کمی کے بارے میں سنا۔ ڈالر میں میری بچتیں روپوں میں دگنی ہوگئی تھیں۔ ہم نے ان سب قلموں (Pens)' گھڑیوں اور موتیوں کے ہاروں کو خرید لیا جنہیں لے جانے کی ہندوستانی کسٹمز اجازت دیتے ہیں۔

مجھے دوبارہ ایک سال یا کچھ دیر بعد پرنسٹن کا دورہ کرنا تھا' میں اس مرتبہ امریکی طالب علموں کے ایک گروپ کو دنیا کی سیر کرانے والے تین پروفیسروں میں سے ایک تھا۔ دوسرے پروفیسروں میں سے ایک ماہر عمرانیات فیلیکس موس تھا' ایک نازی جو سی آئی اے کے لیے کام کرنے والا انتہائی محبِ وطن شخص بن گیا تھا' اس کے ساتھ اس کی جاپانی بیوی فیوسا اور دس سالہ بیٹی تھی۔ دوسرا جارج سٹونی تھا' نیویارک سے تعلق رکھنے والا فلم پروڈیوسر' دو مرتبہ کا طلاق یافتہ اور اس کے ساتھ اس کی معشوقہ تھی۔ میں تیسرا تھا۔ ہمیں جرمنی' ہندوستان اور جاپان میں دو دو مہینے گزارنے تھے۔ مجھے نوجوان مردوں اور عورتوں کو جرمن' ہندوستانی اور جاپانی ادب سے متعارف کروانا تھا اور انہیں تخلیقی ادب کی طرف مائل کرنا تھا۔ سٹونی کو انہیں فلمیں تیار کرنے سے متعارف کروانا تھا' موس مجموعی طور پر سربراہ تھا اور اس نے جاپان میں ہمارے قیام کا بندوبست کرنا تھا۔ اس نے اپنی ذمہ داری میں بہت تھوڑی دلچسپی لی اور جرمنی میں ہمارے زیادہ تر قیام کے دوران میں بیچ (Batch) کو خودمختار چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں یاد کہ سٹونی نے کیا کیا۔ تاہم اس سے مجھے بروکٹلی' مینوٗ اسچے سے بریخت اور گنتر گراس تک انگریزی میں ترجمہ شدہ جرمن کلاسیکوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ہندوستان میں ہمارا قیام دہلی اور حیدرآباد میں برابر برابر بٹا ہوا تھا۔ طلبا نے نیودہلی میں خاندانوں کے ساتھ قیام کیا۔ موس نے' جس نے جاپان میں ہماری رہائش اور کھانے کا بندوبست کرنا تھا' ہمیں اپنی حفاظت خود کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ سٹونی اور میں موس سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے اور جس وقت اسائن منٹ ختم ہوئی تو ہم نے اس کے ساتھ بول چال بھی نہیں رکھی۔

مجھے امریکہ میں ایک اور تدریسی اسائن منٹ حاصل ہوئی۔ یہ اسائن منٹ سوارتھمور کالج کے لیے تھی جو کہ ایک کوئیکر (Quaker) ادارہ تھا اور فلاڈیلفیا کے مغرب میں قریباً چالیس میل دور واقع تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کالج تھا مگر مؤقر آئیوی لیگ کے رکن کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے طالب علموں کی ذہنی سطح اتنی ہی بلند تھی جتنی کہ پرنسٹن کے طالب علموں کی تھی۔ مجھے دو کلاسوں کو پڑھانا تھا۔۔۔ ہندوستانی مذہب اور معاصر سیاست پر۔ لیکچر دینا میری ملازمت کا چھوٹا سا جزو تھا' زیادہ وقت تو سیمیناروں میں طلبا کو ان کے اپنے منتخب کردہ

موضوعات پر لکھوانے میں اور اپنے گھر میں بحث مباحثوں میں صرف ہوتا تھا۔ یہ بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ میری ایک طالب علم لڑکی نے چتپون برہمنوں کا مطالعہ کرنے کا انتخاب کیا۔ اس کے مضمون نے اسے پونا میں ایک سکالرشپ جتوا دی۔ میں نے اس سے اس کمیونٹی پر پہلا مضمون لکھوایا' السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں شائع ہونے والی سیریز کا پہلا مضمون' جس نے اس رسالے کی فروخت میں اضافے کی شروعات کی۔ لیکچروں اور مباحثوں کے بعد میں نے جو کچھ کہا یا سنا ہوتا تھا اسے لکھ لیتا تھا۔ اس سے مجھے چھوٹے سے کتابچے ''انٹروڈکشن ٹو انڈیا'' (وژن بکس) کو لکھنے کے لیے مطلوب مواد حاصل ہوا' جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ سوار تھمور میں قیام کے تین مہینوں کے دوران میں ہم نے جو واحد دوست بنائے وہ ڈچ آسٹرین جوڑا' وان روم اور اس کی بیوی تھی۔ ان کے دو چھوٹے بچے تھے۔ ہم نے آپس میں ایسا انتظام کیا جو کہ ہر دو کے لیے موزوں تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ہم ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور وہ میری بیوی کو فلمیں دکھانے کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ میں چھوٹے بچوں کو سنبھالنے کے لیے وہیں ٹھہر جایا کرتا تھا' ان کے بچوں کو بستر پر لٹا دیتا' انہیں کہانیاں سناتا اور انہیں لوریاں تک سناتا یہاں تک کہ وہ متفق نہ ہو جاتے کہ مجھے گاتے ہوئے سننے سے سو جانا بہتر ہے۔ اس طرح میں اپنے لیکچر کے نوٹس پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔

گیارہواں باب

بمبئی، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (1969-79ء) اور اس کا حاصل

بمبئی، تمہیں بتایا گیا ہوگا، ہندوستان کا واحد شہر ہے، ان معنوں میں جن معنوں میں لفظ شہر کو مغرب میں سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے عروس البلاد (Metro Polises) مثلاً کلکتہ، مدراس اور دہلی بڑے حجم کی بستیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بمبئی میں ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے زیادہ بلندتر عمارتیں ہیں: جب تم سمندر کے ذریعے اس تک پہنچو تو یہ ننھا نیویارک دکھائی دیتا ہے۔ یہ شہر کے رتبے کے جواز کے لیے دیگر اشیاء کا بھی حال ہے: یہ پرہجوم ہے، یہاں سارا سارا دن ٹریفک جام رہتی ہے، یہ انتہائی آلودہ ہے اور اس کے بہت سے حصے تو تعفن سے سڑے ہوئے ہیں۔ آرتھر کوئسلر نے سانتا کروز ائیرپورٹ پر اپنی آمد کو اپنے چہرے پر کسی بچے کے گیلے پوتڑے کے ٹکرانے سے تشبیہہ دی تھی۔ بمبئی اپنے ایک کروڑ یا اس سے زیادہ باسیوں کے فضلے کو ساحل سے اس قدر قریب سمندر میں گراتا ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو آنے والی نہریں دوبارہ زمین پر لے آتی ہیں، استعمال شدہ کنڈوم اچھلتے پانیوں میں سے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ شہر کے کچھ ساحلی علاقوں میں انسانی فضلے کی بدبو چھائی رہتی ہے۔ چونکہ اس میں بہت ہی تھوڑے عوامی بیت الخلا ہیں اس لیے اس کے بازار پیشاب کی بدبو سے بھرے ہوتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ، بہار اور خزاں کے شروع میں ساحل کے ساتھ [illegible] مچھلیاں مرجاتی ہیں اور سڑتی ہوئی مچھلیوں کی تیز بدبو بہت زوردار ہوتی ہے۔

اس [illegible]ی ذکر پارک یا باغ نہیں ہے: صرف چند چھوٹے چھوٹے پارک ہیں جہاں سمینٹ کنکریٹ [illegible] گھومتے رہتے جیسے جانور پنجروں میں۔ عمومی طور پر واحد جگہ جہاں [illegible] اٹی سینڈز سے نری من پوائنٹ تک میرین ڈرائیور ہے۔

[illegible] ف تیز رفتار کاریں اور بسیں اور دوسری طرف [illegible] کر ساتھ ساتھ استوار ہیں تاکہ وہ مزید

آگے نہ بڑھ آئے۔ سہ شاخے اتنے باسہولت زاویوں سے لگائے گئے ہیں کہ شہری یہاں آسانی سے اپنے پیروں کو آرام دے سکتے ہیں' اپنے ٹراؤزر اتار کر یا دھوتیاں اوپر کر کے خود کو صاف کر سکتے ہیں۔ باایں ہمہ صبح کے وقت ہزاروں بمبے والے میرین ڈرائیو پر ہجوم کر آتے ہیں اور شام کو انسانوں کے انبوہ میں دھکم پیل کرتے راستہ بناتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ راستے میں پڑی ہوئی بنچوں پر بوڑھے لوگ بیٹھ کر سمندری ہوا کھاتے اور گپیں ہانکتے ہیں۔ میرین ڈرائیو بمبئی کا فخر ہے اور مسرت بھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد' جب سٹریٹ لائٹس روشن کر دی جاتی ہیں وہ حیرت کے عالم میں اسے منہ پھاڑ کر دیکھتے اور اسے کسی ملکہ کا ہیروں کا ہار کہتے ہیں۔

تاہم بمبئی کے حق میں بھی چند دلائل ہیں۔ یہ مختلف نسلوں' مذاہب اور لسانی گروپوں کے مختلف العناصر امتزاج کا حامل ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اپنے ہمسایوں کے بارے میں تردد نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان میں غیر واجب دلچسپی رکھتے ہیں خواہ وہ خوشی خوشی شادی کریں' طلاق دے دیں' افیئر ز چلائیں یا گناہ کی زندگی جیئیں۔ مختلف نسلی اور مذہبی پس منظر کے حامل لوگ خوب گھل مل گئے ہیں۔ 1982ء تک بمبئی میں زیادہ فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے تھے تاہم یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مختلف کمیونٹیاں آپس میں انسیت رکھتی ہیں۔ ہر کمیونٹی تصور کرتی ہے کہ وہ دوسری سے بہتر ہے اور ان کی پیٹھ پیچھے ان کے لیے اہانت آمیز تاثرات کا اظہار کرتی ہے۔ پارسی اپنے آپ کو سب سے افضل و برتر تصور کرتے ہیں۔ بے شک وہ سب سے زیادہ خوشحال ہیں اور بمبئی کو دوسری کمیونٹیوں سے زیادہ دے چکے ہیں۔ انہیں اپنی برتری کا احساس ہے اور وہ دوسروں کو ''گھاٹی'' — ساحلی کچرا — قرار دیتے ہیں۔ دوسرے پارسیوں کو مخبوط الحواس' سٹھیائے ہوئے' باواجی تصور کرتے ہیں' ان میں سے بیشتر بہت زیادہ سنکی اور پاگل ہونے کے قریب ہیں۔ چونکہ وہ بہت بولنے والے بھی ہیں' اس لیے انہیں ''کاگا کھاؤ'' — کوے کھانے والے — بھی کہا جاتا ہے۔ پھر ہمارے پاس گجراتی ہیں' زیادہ تر تجارت' مالیات اور صنعت میں' ان کی زبان گجراتی 'مراٹھی سے' جو کہ لاتعداد مہاراشٹریوں کی زبان ہے' زیادہ بولی جاتی ہے۔ گجراتی عمومی طور پر امن پسند' قانون کے پابند اور سبزی خور ہیں۔ ان کی پیٹھ پیچھے انہیں ''گجو'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں مختلف قسم کے مسلمان بھی رہتے ہیں جو اگرچہ ایک دوسرے سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں تاہم مسلمانوں کے خلاف تشدد رونما ہو تو اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سنی اور شیعہ کی بڑی تقسیم کے علاوہ ادھر اسماعیلی (دو قسموں کے)' بوہرا (دو قسموں کے) اور میمن (کچھی اور ہلائی) موجود ہیں۔ ان سب کو میاں بھائی کہا جاتا ہے۔ وہاں عیسائیوں کی بھی کافی تعداد والی کمیونٹی آباد ہے' کیتھولک

اور پروٹسٹنٹ ہردو انہیں ''مکاپاؤ'' — روٹی کھانے والے — کہا جاتا ہے۔ (پاؤ پرتگالی میں روٹی کو کہتے ہیں)۔ تازہ ترین آمد سندھیوں اور پنجابیوں کی ہے۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی انداز میں وہ شہر کے کاروبار اور جائیداد کے بڑے حصے پر قابض ہوتے جارہے ہیں اور نتیجتاً انہیں ہتھیانے والوں کے طور پر شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تاہم بمبئی میں باہر سے آنے والے (آؤٹ سائیڈرز) خود اسلوب پہلے سے رہنے والوں (ان سائیڈرز) سے تعداد میں بڑھ گئے ہیں جو اپنے آپ کو دھرتی کے بیٹے کہلواتے ہیں اور بمبئی کو اس کے اصل نام ''ممبئی'' سے پکارے جانے پر زور دیتے ہیں' جو اس کی سرپرست دیوی مہا امبا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کوئی تعلیم یافتہ ہندوستانی اسے بمبئی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہتا ہے۔

بمبئی ہندوستان کا امیر ترین شہر ہے۔ ہندوستان کے کل انکم ٹیکس کا نصف صرف اس شہر سے حاصل ہوتا ہے۔ بمبئی ہندوستان کا سب سے زیادہ کرپٹ شہر بھی ہے: گردش میں موجود کالے دھن کا نصف سے زیادہ بمبئی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے تین عروس البلاد کی مجموعی تعداد سے زیادہ لکھ پتی رہتے ہیں۔ اس میں لامختتم تعداد میں آؤٹ سائیڈرز کے لیے کشش موجود ہے جو اپنی قسمت بنانے کے لیے یہاں مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ممکنہ طور پر اس میں دنیا کے کسی دوسرے شہر سے زیادہ طوائفیں اور کال گرلز موجود ہیں۔ بمبئی کے امیر لوگ بہت اچھی زندگی بسر کرتے ہیں: سمندر کے سامنے ہوا سے ٹھنڈے ہونے والے بڑے بڑے اپارٹمنٹس میں جن میں نہانے کے تالاب اور چھتوں پر باغات ہوتے ہیں۔ ایک سندھی کروڑ پتی کے ہاں مے خانے ونشست گاہ کے اوپر شیشے کی تہہ والا نہانے کا تالاب ہے۔ جب کبھی وہ کسی پارٹی کا اہتمام کرتا ہے وہ نوجوان لڑکیوں کو اس میں ننگا نہانے کے لیے کرائے پر منگواتا تاکہ اس کے مہمان سکاچ کی چسکیاں لیتے ہوئے ان کا نظارہ کرسکیں۔ بمبئی ہندوستان میں سب سے اچھے کھانے مہیا کرتا ہے: مغلئی' یورپی' چینی اور سبزی خوروں والے۔ یہ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے زیادہ اچھے اور سستے ریستورانوں کا حامل ہے۔ بمبئی ہندوستان کا سب سے زیادہ تفریح کے قابل شہر ہے — اگر تم رہنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ سکو تو۔

میں بمبئی کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا تھا جب مجھے پہلی مرتبہ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس وقت میں نے سکھوں کی تاریخ لکھنے کے لیے راک فیلر گرانٹ کی وجہ سے اسے مسترد کر دیا تھا — 1969ء کے بہار کے موسم میں جب میں سوار تھمور میں تھا تو مجھے ''ٹائمز آف انڈیا'' کے پبلشرز بینیٹ کولمین اینڈ کو کے جنرل منیجر جے۔ سی۔ جین کی طرف سے دوسرا خط موصول ہوا جس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا میں اب ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کو سنبھالنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے جین کو ملازمت

میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے خط لکھا مگر دریافت کیا کہ موجودہ مدیر رمن کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے جواب میں خط لکھا کہ میں اس کی پیشکش قبول کرتا ہوں یا نہیں رمن کو نکال دیا جائے گا۔ جس وقت میں دہلی واپس پہنچا خود جین کو فارغ کر دیا گیا تھا لیکن میرے لیے پیشکش ہنوز برقرار تھی۔

دہلی میں اپنے والدین کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد میں ٹرین کے ذریعے بمبئی روانہ ہو گیا۔ میری بیوی نے دہلی ہی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا بیٹا راہول میرے لیے کام آسان تر بنا دیتا تھا۔ وہ ''ٹائمز آف انڈیا'' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ اس نے اسی انتظامیہ کے ساتھ کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے اس کا باپ کام کرے اور اس کی جگہ ریڈرز ڈائجسٹ کے ہندوستانی ایڈیشن کا فرسٹ ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے میری خاطر ایک پارسی جوڑے فردوس اور ایمی جہانگیر کے ساتھ اپنی رہائش اور کھانے کا انتظام بھی ختم کر دیا۔ اسی سہ پہر میں چرچ گیٹ سٹیشن کے قریب جہانگیر کے تیسری منزل والے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا اور ان کے ایک سالہ بیٹے اور چھ مہینے کے باکسر پلے بیلا سے دوستی کر لی۔

اگلی صبح میں ''ٹائمز آف انڈیا'' کے دفتر گیا۔ میں نے چوکیداروں اور لفٹ مین سے اپنا تعارف کروایا۔ مجھے تیسری منزل پر میرے دفتر تک لے جایا گیا۔ یہ دفتر کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے کا وقت تھا۔ عملے کا جو واحد رکن موجود تھا وہ تھا اسسٹنٹ ایڈیٹر سبرو تو بینر جی' جس نے رمن کے ہٹائے جانے کے بعد سے عہدہ سنبھال رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ رمن کیوں چلا گیا۔ ''خود سے نہیں'' اس نے جواب دیا ''اسے فارغ کیا گیا ہے۔ اسے ادارت کا نشہ ہو گیا تھا۔ اس کا دوپہر کے کھانے کا وقفہ سہ پہر تک طول کھینچ جاتا تھا۔ وہ اکثر نشے میں چور آیا کرتا تھا ــــ ایک مرتبہ جب وہ سویا ہوا تھا' ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسے زمین پر پھینک کر توڑ دیا۔ اسے ارل ڈائٹ سے جوڑنا پڑا تھا۔'' اس نے مجھے فون پر لگے ہوئے جوڑ دکھائے۔ ''پھر اسے بیرون ملک سے چند دعوتیں ملیں اور انتظامیہ سے اجازت حاصل کیے بغیر ہی چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اسے اپنی ملازمت سے ہٹا دیئے جانے کا نوٹس تھما دیا گیا۔'' میں نے اس سے اپنے ہونے والے رفقائے کار کے نام اور کام کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بینر جی سے کہا کہ میں رسالے کے کچھ گذشتہ شماروں کا معائنہ کرنے کے بعد ان کو باری باری بلاؤں گا۔ گزشتہ بارہ مہینوں کے شمارے میری میز پر رکھ دیئے گئے۔ ''ویکلی'' کی اسی ہزار کے لگ بھگ اچھی خاصی سرکولیشن تھی' اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ مصور' شاعر' افسانہ نگار اور رقاص اس کے صفحات پر ظاہر ہونے کے مشتاق رہتے تھے۔ جب میں نے اس کے گزشتہ شماروں کا تنقیدی جائزہ لیا تو میں نے بہت کم مطالعہ کے قابل مواد پایا اور اس

کے مواد میں بے جان یکسانیت پائی۔

مینڈی، رمن سے پہلے زیادہ قابل احترام مدیر، اپنا ہفتہ وار کالم ''گیلی مافری'' (Galli-Maufry) لکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کو نہیں پتا تھا کہ اس لفظ کے کیا معانی ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کھانوں کا ملغوبہ ــــ ''ایک کھچڑی''...... حقیقتاً ''ویکلی'' یہی کچھ تھا ــــ بغیر کسی مرکزی تصور کے مضامین کا ایک گڈمڈ انتخاب۔ اس میں اجنبی ناموں والی پارسی بیگمات مثلاً لیڈی نمبو پاونی کی برپا کی گئیں کاک ٹیل پارٹیوں کے بارے میں گپ شپ ہوتی تھی، جس نے اسے بمبئی کے پارسیوں کے غلبے والے سماجی حلقوں (سوشل سرکلز) میں مقبول بنا دیا تھا۔ چند صفحے ''وہ بیاہے گئے'' کے لیے مخصوص کیے گئے تھے اور ہندوستان کے مختلف حصوں کے نو بیاہتا جوڑوں کی تصویروں سے مزین ہوتے تھے، وہ سب ہونٹ بھینچے ہوئے افسردہ اور ناخوش سے دکھائی دیتے تھے۔ ایک ''گھریلو رسالہ'' (فیملی میگزین) کی حیثیت سے اس میں کچھ صفحے بچوں کے لیے مخصوص تھے، بشمول ''آنٹی وینڈی کا کالم'' کے جس میں آنٹی وینڈی اپنے بھانجوں، بھانجیوں کو دلکش وعظ کیا کرتی تھی۔ باقی رسالہ سنڈیکیٹ فیچرز سے لیس ہوتا تھا جنہیں امریکہ سے خریدا گیا ہوتا تھا اور کارٹون ہوتے تھے (''سپرمین'' سب سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا) قارئین جس واحد صفحے کو پہلے اور اکثر کھولتے تھے وہ تھا ''ستارے کیا پیشگوئی کرتے ہیں''، مستقبل کے واقعات کے بارے میں ہفتہ وار پیش گوئی، اسے بھی ایک غیر ملکی سنڈیکیٹ سے خریدا جاتا تھا۔

رمن کا کارنامہ رسالے کو ہندوستانی بنانے کا تھا۔ اس کے لیے اس نے ہندوستانی آرٹ، ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر تبصروں کے ساتھ ساتھ گانے والیوں اور رقص کرنے والیوں کی تصویروں کی زبردست خوراکیں دی تھیں۔ وہ مذہب پسند بھی تھا ــــ اور خاص طور پر اسے اپنی ترویج سے دلچسپی تھی۔ ستیہ سائی بابا پر ایک شمارے میں، جس کو وہ بھگوان کا اوتار مان کر پوجا کرتا تھا، اس کی اپنی، اس کی بیوی اور اس کے بیٹے کی دیوتا کو تعظیم دیتے ہوئے آٹھ تصویریں تھیں۔ رمن کے آنے سے ''ویکلی'' کی سرکولیشن میں تھوڑا بہت اضافہ ہوا تھا۔ تاہم یہ پہلے ہی کی طرح بے جان و بے کیف رہا تھا اور عمومی طور پر ڈاکٹروں، ہیئر ڈریسروں اور دانداں سازوں کی انتظار گاہوں (ویٹنگ رومز) میں دکھائی دیتا تھا۔ اگر میں اس میں جان نہیں ڈال سکا تو میں اسے مزید بے کیف بھی نہیں کروں گا۔ میرے ذہن میں تین واضح مقاصد تھے: آگاہی، تفریح اور اشتعال۔ میں اسے ہندوستانیوں کو اپنے ہی ملک کے بارے میں بتانے کے لیے استعمال کروں گا، میں انہیں ان کی دماغی کاہلی سے جھنجھوڑوں گا اور متنازعہ مضامین شائع کر کے انہیں سوچنے پر ابھاروں گا اور کچھ نہ کچھ مسخرا ہوتے ہوئے میں انہیں تفریح مہیا کرنے کی

کوشش کروں گا۔اس سہ رخی کلئیے کے ساتھ میں نے محسوس کیا میں ناکام نہیں ہوسکتا۔

مجھے سبروتو بینرجی کے کیے ہوئے ناسا کے ساتھ خلائی تحقیق اور ایک ہندوستانی مصنف کے ساتھ گاندی کی ایک سٹرپ کارٹون سوانح عمری کے طویل المیعاد معاہدوں کو پورا کرنا تھا۔ وہ قریباً چھ چھ صفحوں پر محیط ہوتے تھے اور انہوں نے چھ مہینوں تک جاری رہنا تھا۔ یہ تبدیل کا ایک آہستہ روعمل ہوتا۔ میرے پاس سرورق (کورپیج) کے لیے نیا ڈیزائن تھا جو پرانے سے قریبی مماثلت تو رکھتا تھا مگر اس سے بہتر تھا۔ میں نے ''وہ بیاہے گئے'' کو خارج کر دیا اور آنٹی وینڈی کو نوٹس جاری کیا کہ میری نیت بچوں کے صفحات کو ختم کرنے کی ہے۔ میں عملے میں موجود فوٹو گرافروں سے ملا اور بمبئی سے باہر کے فوٹو گرافروں کو بھی خطوط لکھے کہ وہ مجھے معاصر دلچسپی کے موضوعات پر واضح اور بولتی ہوئی تصویریں بھیجیں۔

میرے عملے کے ارکان باری باری مجھے ملنے کے لیے آئے۔ سبروتو بینرجی کو میں نے ایک بہت مناسب شخص پایا مگر ایک اچھے بنگالی کی طرح وہ معاملات کو جیسے وہ ہوتے ویسے ہی رہنے دیا کرتا تھا اور بظاہر معقول و اثر آفرین وضاحتیں پیش کرتا کہ وہ کیوں بہتر نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق تھا مجھے ان سب کو بتانے میں کچھ دن لگ گئے اور مزید اقدامات لینے میں اور بھی زیادہ دن لگ گئے۔

میرا ایک سیکرٹری تھا' خاص الخاص میرے لیے ــــ سوامی' ایک تامل۔ سوامی جتنا اپنے کام میں قابل و ماہر تھا اتنا ہی مہربان انسان بھی تھا۔ مگر وہ شرمیلا تھا۔ ایک مرتبہ جب نیویارک سے میرے ایک دوست نے میرے لیے ایک رسالے ''سکریو'' (Screw) کے چند شمارے بھیجے' جو عریانیت کے لیے مخصوص تھا' تو سوامی نے معمول کے مطابق اسے میری میز پر رکھنے کے لیے کھولا۔ درمیانی صفحے (سنٹر سپریڈ) نے تو اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ عورت کی اندام نہانی کی آٹھ تصویریں تھیں' اس کیپشن کے ساتھ: ''کون کہتا ہے کہ تمام فرج ایک سی ہوتی ہیں؟'' اس واقعے کا اختتامیہ بہت مزیدار تھا۔ میں بمبئی کسٹمز کے سربراہ سے ملا اور اسے بتایا کہ جب ''پلے بوائے'' کے میرے لیے بھیجے گئے شمارے فحاشی کے الزام میں باقاعدگی سے ضبط کیے جا رہے تھے تو ایک حقیقتاً فحش رسالہ بعنوان ''سکریو'' ان کی نظر سے بچتا رہا تھا۔ اس نے تفتیش کی اور پتا چلایا کہ متعلقہ افسر نے فرض کر لیا تھا کہ ''سکریو'' ایک انجینئرنگ میگزین تھا۔

عملے کا آخری فرد میں نے جس کا انٹرویو کیا ''آنٹی وینڈی'' تھی۔ یہ فاطمہ نکلی' رفیق زکریا کی بیوی' جو اس وقت مہاراشٹر کی حکومت کا سینیئر وزیر تھا۔ وہ ''ویکلی'' کی تنخواہ دار نہیں تھی بلکہ ہفتے میں ایک مرتبہ اپنی تحریر لاتی اور اس کے پروف پڑھتی تھی۔ اس کو بتا دیا گیا تھا کہ میری نیت ''آنٹی وینڈی'' کو ختم کرنے کی ہے اور وہ ایک خط لے کر آئی تھی جس میں بیان کیا

گیا تھا کہ وہ رسالے کے لیے مزید نہیں لکھے گی۔ میں نے اسے پڑھا اور پھاڑ دیا۔ ''میں آنٹی وینڈی' کو نکال رہا ہوں' تمہیں نہیں'' میں نے کہا: ''اگر تم ''ویکلی'' کے ساتھ اپنا تعلق بحال رکھنا چاہتی ہو تو ہم دوسری چیزوں پر غور کریں گے جو تم کر سکتی ہو۔'' اس نے اپنا سر ہلایا۔ اس نے مجھے اپنے گھر ڈنر کے لیے' اپنے شوہر اور بچوں سے ملاقات کے لیے بلایا۔

زکریا گھرانہ تیزی سے میرا دوست بنا۔ وہ ایک غصیلا خاندان تھا' جہاں ایک دوسرے پر چیخنے چلانے کے بعد اتنے ہی سکون کے مراحل آتے تھے۔ اس کا غصہ بے قابو تھا: کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب بھڑک اٹھے گا۔ وہ متحمل تھی مگر مسلسل طعنے دے دے کر جو چاہتی تھی اسے حاصل کر لیتی تھی۔ وہ خوب دعوتیں دیا کرتے تھے مگر صرف ان لوگوں کو بلاتے تھے جو ان کے کرئیر میں کام آ سکتے تھے۔ اسے سیاست میں مرار جی ڈیسائی لایا تھا' جو کبھی مہاراشٹر کا وزیر اعظم رہا تھا۔ زکریا کے سٹنگ روم میں ڈیسائی کی تصویر (پورٹریٹ) کئی برس جائے تعظیم رہی تھی۔ جب مرار جی ناپسند قرار پایا تو اس کا پورٹریٹ ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ یش ونت راؤ چاون کی تصویر نے لے لی جو اس وقت مہاراشٹر کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اس کی بیوی اس کے سیاسی عزائم کی تکمیل میں اس کی مدد کرتی تھی۔ وہ اس کی ملاقاتوں کا انتظام کرتی' ہر صبح ان کی تصدیق کرتی اور اس کی فائلوں کو ترتیب سے رکھتی تھی۔ زکریا اپنے رفقائے کار سے خود کو ایک ادیب کی حیثیت سے ممتاز رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں بھی اس کی بیوی اس کی مدد کرتی۔ مواد اکٹھا کرتی اور جو کچھ وہ لکھتا اس کی اڈیٹنگ (اصلاح) کرتی تھی۔ ہندوستانی اسلام پر ایک کتاب کے بعد اس نے اور اس کی بیوی نے سلطانہ رضیہ کی ایک تخیلاتی سوانح عمری لکھی تھی۔ میں نے اس پر غیر حامیانہ تبصرہ لکھا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ میں اس کی تعریف کروں گا۔ وجوہات صرف اسی کو پتا تھیں' زکریا مجھ پر شک کرتا تھا کہ میں مسلمانوں کے خلاف تعصب رکھتا ہوں: ''آنٹی وینڈی'' کو ختم کرنے کو وہ ایک مسلمان کی جز وقتی خدمات کو ختم کرنا تصور کرتا تھا۔ بچوں کو سکھوں کے بارے میں سٹیریو ٹائپ خیالات کے تحت پروان چڑھایا جاتا تھا' کہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں' دوپہر کو وہ پاگل ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ فاطمہ کی ماں نے جو ایک بڑی جسیم عورت تھی اور ان کے ساتھ رہ رہی تھی' انہیں سکھ ڈرائیوروں والی ٹیکسیوں میں بیٹھنے سے خبردار کر رکھا تھا۔ وہ بالکل نہیں سمجھتی تھی کہ میں ان کے گھر میں کیا کر رہا ہوں اور اپنے آخری دن اس نے مجھے ''چھاپے والا'' کہا۔ گھر کے دوسرے افراد میں ایک گوا کا رہنے والا پاسکل لوبو' ایک دبلی پتلی' باہر نکلے ہوئے دانتوں والی مہاراشٹرین ملازمہ ونتی اور ایک باورچی تھا' جو مجھ سے کبھی ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ میں اسے ''حشیشین'' کہا کرتا تھا کیونکہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے کھانے میں زہر ملا سکتا ہے۔ وہ ایک بڑے سرکاری بنگلے

میں رہتے تھے جس پر مسلح پولیس والے اور ایک آوارہ کتا، جس نے ان کے ہاں رہائش اختیار کر لی تھی، پہرہ دیتے تھے۔ میں باروچی اور کتے کے علاوہ گھر کے تمام افراد سے روابط استوار کرنے کا اہل تھا۔ باروچی نے کبھی میرے ساتھ ایک لفظ کا تبادلہ نہیں کیا، جب کبھی میں آتا یا رخصت ہوتا کتا مجھ پر دانت ضرور نکالتا تھا۔

زکریا کے گھر پہلی شام ہم نے ایک دوسرے کو جانچا۔ انہوں نے مجھے سکاچ پیش کی، زکریا نے اس تصنع کو برقرار رکھا کہ کانگرس پارٹی کے رکن کی حیثیت میں وہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔ مجھے کہا گیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں کہ مجھے ان کے گھر شراب پیش کی گئی تھی۔ تینوں لڑکے منصور (زکریا کی پہلی بیوی سے)، ارشد اور فرید بے یقینی سے مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ زکریا نے اپنے دباؤ ڈالنے والے داؤ پیچ شروع کیے۔ میں اس کی بیوی کو عملے میں مستقل ملازمت کیوں نہیں دے دیتا؟ وہ کمیٹی کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس کے۔ٹی۔ڈیسائی اور جنرل مینجر تارنیجا سے کہے گا تاہم پہل مجھے کرنی پڑے گی۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ فاطمہ کتنی اچھی یا بری ورکر ثابت ہوگی تاہم میں اپنے اوپر پڑنے والے دباؤ کی مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ میں اسے سب (Sub) کے طور پر آزماؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ خود کو کس طرح منواتی ہے۔ تاہم زکریا نے تجویز لکھوائی اور میں نے انتظامیہ کو بھیج دی۔ فاطمہ زکریا تین اسسٹنٹ ایڈیٹروں میں سے ایک ہوتی تھی۔ زکریا نے ڈیسائی اور تارنیجا سے کہا۔ تجویز کو فوری طور پر قبول کرلیا گیا۔ چند دنوں کے اندر اندر فاطمہ اسسٹنٹ ایڈیٹر بنادی گئی اور اس نے میری سب سے سینئر مصاحب کے اختیارات سے خوب لطف اٹھایا۔ اس سے توثیق لیے بغیر کوئی مجھ سے نہیں مل سکتا تھا، میرے لیے آنے والی تمام ٹیلی فون کالیں پہلے وہ سنا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ میری سماجی زندگی (سوشل لائف) بھی اسی کے زیرانتظام آ گئی۔ میں ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ ان کے ساتھ ڈنر کیا کرتا تھا، دوسرے دنوں میں اگر میں کہیں مدعو نہ ہوتا تو کھانا میرے اپارٹمنٹ بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ بہت ملکیت پسند عورت ثابت ہوئی جو اپنی تصدیق کے بغیر میرا کسی مرد یا عورت کو دوست بنانا برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ تاہم اس کے کردار کا ایک بہت مثبت پہلو بھی تھا۔ اگرچہ وہ نہ لکھتی تھی نہ لکھ سکتی تھی تاہم وہ مضمونوں کے انتخاب اور اشاعت کا انتظام کیا کرتی تھی۔ وہ بہت عمدہ سب (Sub) تھی اور ''ویکلی'' کو شائع ہوتا دیکھنے کے لیے ان تھک کوششیں کرتی تھی۔ اس کی اپنے کام اور میرے ساتھ وابستگی و اخلاص کامل تھا۔ اس کے بغیر میں رسالے کو چلا نہیں سکتا تھا۔

چند دنوں کے اندر اندر میری زندگی ایک معمول میں آ گئی۔ میں نے ہر کسی سے ایک گھنٹہ پہلے دفتر پہنچنے کو ایک اصول بنالیا تھا۔ جس وقت دوسرے آتے میں اپنی ڈاک نمٹا چکا

ہوتا اور نئے شمارے کے لیے مضامین کو ایڈٹ کر چکا ہوتا۔ مجھے ملاقاتیوں کا کال نہیں تھا۔ کارٹونسٹ آر۔کے لکشمن آتا' کافی کا آرڈر دیتا اور گپ شپ کرنے میں صبح کا اچھا خاصا حصہ ضائع کر دیتا۔ فاطمہ ہمیشہ اس کے ساتھ اندر آتی اور دوسرے اوقات میں جب کبھی اس کا جی چاہتا آ جایا کرتی تھی۔ لکشمن' جو دوسروں کا وقت ضائع ہونے کا کبھی نہیں سوچتا تھا' جب کام کر رہا ہوتا تو کسی کو اپنے کیبن میں آنے کی بالکل اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں کبھی اس کا برا نہیں مناتا تھا کیونکہ وہ ایک اچھا کارکن تھا اور بلاشبہ ایک 'جینیئس تھا' میری رائے میں اپنے زمانے کا سب سے اچھا کارٹونسٹ زیادہ بامروت سیکنڈ کارٹونسٹ ماریو مرانڈا تھا۔ وہ اپنے معمول سے ہٹ کر بھی میرے لیے کام کرنے کی خاطر کوئی دریغ نہیں کرتا تھا اور اس نے میرے لیے بلب لوگو ڈیزائن کیا تھا جس میں میں اسیر رہا۔

وہاں ملک کے خیرخواہ بھی موجود تھے۔ بغیر کسی استثنیٰ کے' وہ مکالمے کا آغاز ''یہ ڈیش کہاں جا رہا ہے'' سے کرتے تھے۔ میں عموماً لنچ روم میں دوسرے ایڈیٹروں کے ساتھ شامل ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے مینیو میں خرشف اور ایووکیڈو ناشپاتی کو متعارف کروایا اور کبھی کبھی فلمی دنیا' سیاست اور سماجی زندگی کے اہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے آیا کرتا تھا۔ بیشتر سہ پہریں پروف پڑھنے میں گزرا کرتی تھیں۔ میں نے ''ویکلی'' کے لیے ابتدائی طور پر تصویروں کا انتخاب خود کرنے اور کیپشن خود لکھنے کو اصول بنا لیا تھا۔ بچی کا نگا تیزی سے مطلب سمجھ جایا کرتی تھی اور مین نے یہ کام اس پر چھوڑنا شروع کر دیا۔ ابتدائی چند ماہ میں سب سے آخر میں دفتر سے جایا کرتا تھا۔ میں پارسی کنویں سے گزر کر چرچ گیٹ تک پرہجوم گلیوں میں سے پیدل چلتا ہوا جایا کرتا تھا۔ میں نے بہاری بھیاؤں کو دوست بنا لیا تھا جو فٹ پاتھوں پر اخبارات بیچتے تھے اور ان سے پوچھتا کہ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کیسا فروخت ہو رہا ہے۔ جہانگیر کے فلیٹ میں واپسی پر بیلا مجھے خوش آمدید کہتی۔ میں اس کے ساتھ کھیلتا رہتا یہاں تک کہ اس کے کان اچانک کھڑے ہو جاتے اور وہ اپنے سر کو ایک طرف جھکاتی' یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ درست سن رہی ہے۔ نیچے سے گزرنے والی سینکڑوں کاروں میں سے وہ اپنے مالک کے کار کے انجن کو پہچان سکتی تھی۔ وہ خوشی سے بھونکتی اور وہ کان کھڑے کیے دروازے تک دوڑی جاتی۔ یہاں تک کہ ایلیویٹر رکتا اور دروازہ اسے باہر نکلنے دینے کے لیے کھلتا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے غرض نہیں رکھتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سڑکوں' ان کیفوں میں' جہاں میں باقاعدگی سے جاتا تھا' ملنے والے لوگوں سے میری سلام دعا ہونے لگی نیز کوکونٹ بیچنے والوں' پان والوں' کتوں' فقیروں اور کوچہ گردوں سے بھی۔ میں نے کوکونٹ کے تازہ جوس کا ذوق پیدا کر لیا۔۔۔ کسی کے

منہ کا ذائقہ تازہ کرنے کے لیے دنیا میں اس کا کوئی مقابل نہیں ہے— یا مثانے کو آلودگی سے پاک کرنے میں۔ پان ایک خوفناک نشہ بن گیا: میں ہر کھانے کے بعد اس کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا اور اپنے کام میں ارتکاز کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی شے چبانی پڑتی تھی— میں نے اپنے دانتوں کے ڈاکٹر کی تنبیہہ کو نظر انداز کر دیا کہ میں اپنے دانتوں کو تباہ کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو گلے اور منہ کے کینسر کے لیے مہیا کر دیا ہے۔

چرچ گیٹ میں، بالائی متوسط طبقے کا علاقہ ہونے کی وجہ سے کوچہ گرد نہیں تھے۔ اگر وہاں کوئی تھے تو میں انہیں پہچاننے میں سست تھا۔ ایک شام ڈنر کے بعد گھر واپس آتے ہوئے ایک سٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑی ہوئی عورت نے مجھ سے وقت پوچھا— گنگا بائی ٹاور کلاک سامنے ہی تھا لیکن میں نے اپنی گھڑی دیکھی اور اسے ٹھیک ٹھیک وقت بتا دیا۔ اس نے نکھری ستھری اردو میں میرا شکریہ ادا کیا: ''بہت شکریہ، سردار صاحب!'' جب میں لفٹ میں اوپر جا رہا تھا اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ اس عورت نے تو مجھے دعوتِ وصال دی تھی۔ ایک اور لڑکی جس نے میری توجہ مبذول کروائی ایک گیس سٹیشن کے نزدیک فٹ پاتھ پر رہتی تھی جہاں دو پان والے اور ایک بھیل پوری والا پمپوں کی طرف جانے والے ڈرائیو وے میں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ بیس کے پیٹے میں بھیک مانگنے والی تھی اور اس کے بھیل پوری والے کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے جو اس کو اپنا بچا کھچا دے دیا کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی کسی کو ورغلاتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ ہی زیادہ جیبوں کی طرف دیکھتے پایا۔ وہ ذہنی طور پر غیر متوازن تھی اور ظاہرہ طور پر اس کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ جتنا زیادہ میں پان والے یا بھیل پوری والے سے باتوں کے دوران میں اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا وہ میری موجودگی کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ جون کے دوسرے ہفتے مون سون شروع ہونے کے بعد میں اسے دیکھنے گیا کہ وہ کیسی لگتی ہے۔ مون سون کا آغاز ایک ایسا تجربہ ہے جسے کبھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے ظہور سے ہفتوں پہلے چرچ گیٹ کے فٹ پاتھوں پر لوگ چھتریاں اور گم بوٹ بیچنے لگے تھے۔ آخر کار وہ پانی کی چادروں کی صورت سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں پانی کے سیلاب کے ساتھ آ گیا۔ میں متجسس تھا کہ فقیرنی اس طوفانی موسم سے کس طرح نبرد آزما ہوئی ہو گی۔ ایسے موسم میں بھیل پوری والے کے زیادہ گاہک نہیں آ سکتے تھے اور میں نے سوچا کہ شاید میں اس لڑکی کے لیے شام کا کھانا خرید سکوں۔ جب میں اپنا پان لینے گیا تو وہاں کوئی بھیل پوری والا نہیں تھا۔ لڑکی بارش کے گرداب سے بمشکل ایک انچ اوپر ایک دکان کی سیڑھیوں پر گھٹنے سینے سے جوڑے لیٹی ہوئی تھی۔ واضح طور پر اس کے پاس کوئی دنیاوی اشیا نہیں تھیں اور بدلنے کے لیے کپڑے تک نہیں تھے۔ وہ ساری رات مجھے ستاتی رہی۔

جب اگلی صبح میں جاگا تو گنگا بائی ٹاور کلاک پانچ بجا رہا تھا۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی اور میدان جھیل میں بدل گیا تھا۔ بارش اب بوندا باندی میں بدل گئی تھی' تاہم آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ صبح کی ملگجی روشنی میں مجھے میدان کے وسط میں ایک گندی سفید دھوتی لپیٹے ایک عورت کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ چوتڑوں کے بل بیٹھی ہوئی ٹین کے ایک ڈبے سے اپنی رانوں کے درمیان پانی ڈال رہی تھی۔ واضح طور پر وہ کہیں جھاڑیوں کے پیچھے رفع حاجت کرنے کے بعد اپنے آپ کو صاف کر رہی تھی۔ میں نے اپنی فیلڈ گلاسز نکالیں اور انہیں اس پر فوکس کیا۔ دھونے کے بعد اس نے اپنے اردگرد دیکھا کہ اسے دیکھا تو نہیں جا رہا ہے پھر اس نے اپنی دھوتی اتار دی بارش کا گدلا پانی اپنے اوپر انڈیلا' اپنی چھاتیوں اور درمیان پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے۔ وہ وہی فقیرنی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس نے وہی گندی دھوتی اپنے گیلے بدن سے لپیٹ لی اور چرچ گیٹ سٹیشن کے نزدیک اپنے ٹھکانے کی طرف چل دی۔ ایسا کس طرح تھا کہ اس برائی سے بھرے ہوئے شہر میں کسی نے اس فقیر دوشیزہ پر توجہ نہیں دی تھی؟ مجھے چند دنوں بعد جواب مل گیا۔ میں اس فٹ پاتھ کے پاس سے گزر رہا تھا جہاں وہ ہر رات سوتی تھی' وہ مجھے وہاں دکھائی نہیں دی۔ کیا اسے اس کا خاوند واپس لے گیا؟ میں اپنے تجسس پر قابو نہیں پا سکا اور بھیل پوری خریدتے ہوئے' جسے کھانے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی' یونہی سے لہجے میں دریافت کیا کہ اس عورت کے ساتھ کیا ہوا۔ جب اس نے جواب دیا تو اس کی آواز گلے میں پھنس گئی: ''کچھ نہ پوچھو سردار جی' بھڑوے پھسلا کر لے گئے۔'' شاید بیچاری کا انجام کمتی پورہ کے کسی چکلے میں ہوا ہوگا۔

مون سون دوسرے تجربے بھی لے کر آیا۔ اکثر مجھے دفتر ایک فالتو قمیض کے ساتھ آنا پڑتا اور جب میں گندے پانی سے گزرتا تو مجھے اپنی چپلیں ہاتھوں میں اٹھانا پڑتی تھیں۔ جب بارش ہوتی تو چھتری میری پگڑی کو بھیگنے سے مشکل ہی بچا پاتی۔ کئی غیر متوقع مسائل بھی پیدا ہو جاتے تھے۔ ایک صبح جب میں فلورا فاؤنٹین پہنچا تو میں نے بدرو کے ایک بڑے چوہے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا' کوے اور چیلیں اس پر حملے کر رہے تھے۔ میں نے دوسری طرف چلے جانا محفوظ تصور کیا۔ بدرو کے چوہے نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں سڑک کے درمیان تھا جب وہ چھپنے کے لیے میرے پیچھے دوڑا' اپنے تعاقب کرنے والوں سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ پا کر اس نے میری ٹانگوں میں پناہ حاصل کی۔ اس نے میرے ٹراؤزر میں چڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے بدحواسی میں چوہے کو اپنی ٹانگ سے گرانے اور اپنے سر پر منڈلاتے ہوئے کوؤں اور چیلوں کی طرف چھتری لہرا کر دور رکھنے کی کوشش کی۔ تماشا دیکھنے کے لیے فٹ پاتھ پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں بدرو کے چوہے کو ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا اور

تحفظ کے لیے پار بھاگ گیا۔ بجائے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے ایک شخص نے مجھے طعنہ دیا: ''ارے سردار جی! چوہے سے ڈر گیا!'' میں نے احتجاج کرنے کی کوشش کی کہ وہ کوئی چوہا (Mouse) نہیں تھا بلکہ بدرو کا جنگلی چوہا (Rat) تھا۔ مجھے پتا چلا کہ ہندی میں تو چوہے (Mouse) اور جنگلی چوہے (Rat) کے لیے الگ الگ لفظ نہیں ہیں۔ اور بعد میں یہ کھلا کہ کسی ہندوستانی زبان میں چھوٹے سے چوہے (Mouse) اور بلی کی جسامت کے جنگلی چوہے (Rat) کے لیے الگ الگ لفظ نہیں ہیں۔ کترنے والے جانوروں کی نوع میں سے وہ صرف چوہے اور بندی کوٹ سے واقف ہیں۔ ہماری زبانوں میں برف (Snow) اور جمے ہوئے پانی (Ice) کے لیے الگ الگ لفظ نہیں ہیں— دونوں ہی ''برف'' ہیں۔ ان میں بگلے (Seagull) کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے— وہ فقط ایک ''جل کوا'' ہے— حالانکہ ہمارے ساحلوں پر بگلوں کی ایک درجن سے زیادہ انواع موجود ہیں۔

دفتر میں بھی کئی دلچسپ واقعات رونما ہوئے۔ ایک سہ پہر مجسمہ ساز فریڈا بریلینٹ اور اس کا شوہر ہربرٹ مارشل مجھے ملنے کے لیے آئے۔ وہ کرشنا مینن کے قریبی دوست تھے: اس نے کانسی سے مینن کا ایک بہت ہی عمدہ سر بنایا تھا۔ اسے روسی کا عالم ہونے کا دعویٰ تھا اور اس نے مایا کووسکی کی نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کروایا تھا۔ میں نے انہیں کافی ناپسندیدہ پایا تھا اور خود کو ان سے فاصلے پر رکھتا تھا۔ ظاہرہ طور پر انہوں نے اس بات کو سمجھا نہیں تھا۔ وہ کشادہ بانہوں کے ساتھ اندر آئی' چاہت کی ندی بہاتی ہوئی۔ ''ڈرالنگ! ڈارلنگ خوشی! تم کیسے ہو؟'' میں شائستگی سے ان سے پوچھتا رہا کہ وہ ہندوستان میں کیا کر رہے ہیں اور ان کے لیے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ نیشنل آرٹ گیلری کو نہرو اور مینن کے سر فروخت کرنے کے بارے میں مذاکرات کر رہی تھی اور یہ دیکھ رہی تھی کہ اسے مزید اسائن منٹس حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ ہندوستانی ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کی نمائش سے آ رہے تھے اور انہوں نے گول چھوٹے چھوٹے شیشوں سے بھری ہوئی ایک رنگین قمیض خریدی تھی۔ اس نے تعریف کے لیے مجھے وہ قمیض نکال کر دکھائی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے یہ مجھ پر اچھی نہیں لگے گی؟'' میں نے اسے یقین دلایا کہ ضرور اچھی لگے گی۔ ''ذرا مجھے اپنے لیے اسے پہننے دو۔'' وہ بولی۔ ''تم دونوں اپنے چہرے دیوار کی طرف موڑ لو' میں اپنی قمیض تبدیل کروں گی۔'' اس کے خاوند اور میں نے فرمانبرداری کے ساتھ اپنے چہرے دیوار کی طرف موڑ لیے۔ دفعتاً فریڈا چلائی: ''باہر نکلو'' اس کے چلانے کے بعد چینی کے برتن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ہم یہ دیکھنے کے لیے مڑے کہ کیا ہوا ہے۔ فریڈا اپنی ننگی چھاتیوں کو اپنے ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بیرہ جو چائے اندر لے کر آیا تھا اس نے میم صاحب کو نیم برہنہ دیکھ لیا تھا اور اس کے

ہاتھ سے ٹرے گر گئی تھی۔ کہانی دفتر میں کئی دنوں تک گھومتی رہی۔

ایسا ہی واقعہ تب رونما ہوا جب پیگی ہالرائیڈ میرے ساتھ ایک سہ پہر گزارنے کے لیے آئی۔ اس نے دہلی سے ٹرین کے ذریعے سفر کیا تھا اور اس نے آسٹریلیا اپنے گھر واپسی کے لیے رات کی پرواز پکڑنا تھی۔ میں نے اسے بمبئی سنٹرل سٹیشن سے لیا' اپنے اپارٹمنٹ میں اسے اتارا (تب میں سینٹینل ہاؤس کولابے میں رہتا تھا) اور دفتر واپس آ گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پیگی نہانے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے تولیہ لیا اور خود کو پونچھتی ہوئی دروازہ کھول دیا۔ وہ میرا شام کے کھانے کا ٹفن اٹھائے فاطمہ زکریا کا نوکر پاسکل لوبو تھا۔ پاسکل بدحواس ہو گیا تھا۔ پیگی نہیں' اس نے اپنے آپ کو پونچھنا جاری رکھا جبکہ پاسکل نے ٹفن بکس میرے باورچی خانے میں رکھا اور تیری سے نکل بھاگا۔ مجھے زکریا کے گھر کافی جواب دہی کرنی پڑی: یہ کیسے ہوا کہ ننگی مسز ہالرائیڈ نے میری توقع میں دروازہ کھول دیا؟ میں اسے کس قدر جانتا ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔ میرے احتجاج میں کوئی جان نہیں تھی کہ پیگی ایک مہربان لڑکی تو تھی—— مگر اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔

پھر ادھر خوبصورت اطالوی لڑکی مرسیا گرازیانو' اچاریہ رجنیش کی ایک شاگرد (چیلی) تھی۔ وہ ایک نوجوان' چھوٹے قد کی' سنہرے بالوں اور بڑی بڑی کالی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ اپنے سر کے گرد زعفرانی رنگ کا پٹکا باندھتی' قمیض پہنتی اور تہمد باندھا کرتی تھی۔ وہ اپنی سادھوؤں والی کی پوشاک میں بہت دلکش دکھائی دیتی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج تھی اور شاذ و نادر ہی مسکراتی تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس کے گرو سے ملوں' اس کے طبع شدہ وعظ پڑھوں اور اس کا چیلا بن جاؤں۔ اس نے مجھے ڈھیر سارے کتابچے دیئے۔ اس کی دوسری یا تیسری آمد پر میں نے اس کو پھانسنے کی کوشش کی۔ ''مرسیا تم مجھے اپنے عقیدے میں لانا چاہتی ہو؟ میں بالکل تیار ہوں۔ مجھے تمہارے گرو سے نہیں ملنا اور جو کتابیں تم میرے لیے لائی تھیں انہیں نہیں پڑھنا۔ میری قیمت تو مختلف ہے۔'' اس نے یوں ظاہر کیا گویا وہ میرا مدعا سمجھی نہیں ہو۔ جب اس کے بعد کے دورروں میں میں نے تبدیلی مذہب کی پیشکش کو دہرایا تو اس نے اپنی سیاہ آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور پوچھا: ''تم میرے ساتھ سونا چاہتے ہو؟ کیا ایسا نہیں ہے؟ اگر تم میرے جسم کو پسند کرتے ہو تو اسے لے سکتے ہو۔ جسم تو کچھ نہیں ہے' اصل شے تو روح اور ذہن ہوتی ہے۔'' سرد مہر جنس کی براہ راست پیشکش نے تو میری شہوت کو ہی ختم کر دیا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر میں اسے بستر پر لے جاتا تو وہ سودے بازی میں اپنا حصہ رکھتی۔ تاہم وہ مجھ پر یہ بھی ثابت کر دیتی کہ روح کے جسمانی تعلق سے الگ ہوتے ہوئے' جسم بہت کم قدر رکھتا ہے۔ مرسیا میری دوست بن گئی۔ جب وہ اٹلی واپس چلی گئی تو ہم نے ایک دوسرے سے خطوں کے ذریعے رابطہ

رکھا۔ بیلیجیو کی طرف جاتے ہوئے اس نے روم میں مجھے اور میری بیوی کو پرتکلف ڈنر دیا تھا۔ جب میں اگلی مرتبہ اس سے لاس اینجلس میں ملا تو اس نے ایک ٹی وی پروڈیوسر سے شادی کر لی تھی اور بظاہر شادی سے خوش نظر آتی تھی۔

☆☆☆

بمبئی میں میری زندگی میں آنے والے دو کردار ناولوں کے عمدہ موضوعات بن سکتے تھے: انیس جنگ اور اے۔ جی۔ نورانی۔ انیس سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہو چکی تھی جب میں امریکی طالب علموں کی ایک پارٹی کو دنیا کا دورہ کروا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف یوں کرایا کہ وہ امریکہ سے حال ہی میں ادب میں ڈگری لے کر واپس آئی ہے' میرے بیٹے راہول سے بمبئی میں ملی تھی اور اس نے ہمارے ساتھ رابطہ رکھنے کا کہا تھا۔ انیس لوگوں کو اس طریقے سے رام کر لیتی تھی ـــــ میری بیوی کے لیے راہول کا کوئی بھی دوست خاندان کا دوست تھا۔ اسے لنچ پر مدعو کر لیا گیا۔ وہ زبردست باتونی نکلی ـــــ وہ امریکی لہجے کے ہلکے سے بھی اثر کے بغیر انگریزی بولتی تھی اور اردو بالکل حیدر آبادی انداز سے بولتی تھی جو مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔

وہ عظمت کے سرابوں میں کھوئی خیالوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ اس نے مجھے حیدر آباد کی اشرافیہ کے بارے میں بتایا ـــــ جاہوں' جو دولاؤں اور جنگوں کے بارے میں اور اپنے باپ نواب ہوشیار جنگ کے بارے میں جو اس کے بقول نظام کی حکومت میں وزیر تھا۔ درحقیقت وہ محض ایک ''مصاحب'' تھا جس کی گفتگو سے نظام لطف اٹھایا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انیس نے یہ صلاحیت اپنے باپ سے وراثت میں پائی تھی کیونکہ وہ مجھے ملنے والی ہر عورت سے زیادہ باتوں کی دھنی تھی۔ اس نے مجھے ان محلوں جیسی رہائش گاہوں کا بتایا جن میں وہ مقیم رہی تھی اور ان انگریز گورنسوں کا بتایا جو انہوں نے ملازم رکھی ہوئی تھیں۔ خاندان کی دولت کہاں غائب ہو گئی تھی' مجھے نہیں بتایا گیا۔

انیس میری زندگی میں دوبارہ اس وقت نمودار ہوئی جب میں ''السٹریٹڈ ویکلی'' کی ادارت کر رہا تھا۔ اس نے ''یوتھ ٹائمز'' کے مدیر کے عہدے کے لیے درخواست گزاری تھی' ''ٹائمز آف انڈیا'' گروپ اس نئے رسالے کو دہلی سے جاری کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ انٹرویو بورڈ مشتمل تھا چیئرمین جسٹس ڈیسائی' رجنی پٹیل' رام تارنیجا منیجر اور مجھ پر۔ وہ پٹیل اور تارنیجا کو تو پہلے ہی رام کر چکی تھی مگر ڈیسائی سے ملاقات کرنے میں قاصر رہی تھی۔ پٹیل اور تارنیجا نے تجویز دی تھی کہ درجن یا اس سے زیادہ امیدواروں کے پینل انٹرویو کے باوجود' فیصلہ مجھی نے کرنا ہو گا ـــــ اس وقت انتظامیہ میں میرا اثر و رسوخ بہت اونچا تھا۔ میں نے انیس کو

منتخب کرلیا۔۔۔اس نے دہلی میں ''ٹائمز آف انڈیا'' کی عمارت میں اپنا دفتر قائم کیا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر وہ رام تارنیجا کی زبردست منظور نظر بن گئی' وہ شخص جو سب سے زیادہ اہم تھا۔ جوں جوں جنرل مینجر اس کی چاہت میں بڑھتا گیا: وہ ابتدا میں اسے تارنیجا پھر رام اور آخر کار تنو پکارنے لگی۔ وہ جب چاہتی تھی بمبئی آ جاتی تھی یا بمبئی سے چلی جاتی تھی۔ اس نے مجھ سے رابطہ رکھا مگر فاطمہ زکریا کو وہ برداشت نہیں کر سکی' فاطمہ بھی اسے برداشت نہیں کر پائی۔ جب وہ بمبئی میں ہوتی تو اس نے یہ ایک معمول بنالیا تھا کہ وہ پورچ میں کھڑی ہوئی تارنیجا کی کار میں بیٹھ جاتی تھی تاکہ دفتر سے اپنے اپنے گھروں کو جانے والے لوگ اسے جنرل مینجر کی کار میں دیکھ سکیں اور صحیح پیغام حاصل کرلیں۔ وہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ عجیب سی بات ہے تاہم انیس اپنی تمام تر بری عادات صرف اونچے لوگوں کو ورغلانے' بیشتر عورتوں بشمول میری بیوی کے خلاف بھونکنے اور مجھے اونچے اور طاقتور لوگوں کو اپنے فتح کرنے اور بعد میں مکمل طور پر نظرانداز کر دینے کی لامختتم کہانیاں سنانے کے باوجود میں نے صرف اس سے دوستی برقرار رکھی بلکہ اپنے بعد کے برسوں میں دوسری عورتوں کی نسبت اس کے ساتھ رہنے کا زیادہ منتظر رہنے لگا۔

اے۔جی۔نورانی ایک بالکل ہی مختلف قسم کا آدمی تھا۔ وہ ایک وکیل اور صحافی تھا۔ مجھے ملنے والا سب سے زیادہ جھگڑالو اور جلد ناراض ہو جانے والا شخص تھا۔ اپنے قانون کے علم کے باوجود اس کے پاس زیادہ قانونی کام نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے مؤکلوں' وکیلوں اور ججوں سے جھگڑے کھڑے کرتا رہتا تھا۔ تاہم وہ سیاست' آئین اور اونچی سطحوں پر کرپشن پر تحریروں کے ذریعے صحافی کے طور پر نام کما چکا تھا۔ وہ حقائق کی سخت چھان بین کرتا تھا اور نمایاں فصاحت کے ساتھ لکھتا تھا۔ ہم دوست بن گئے۔ اس نے بتایا کہ زندگی میں اس کو صرف دو دلچسپیاں ہیں: وکالت اور سیاست۔ اس کی ایک اور دلچسپی بھی تھی۔

ہماری دوستی ایک یا دو برس ہی برقرار رہی۔ ہم قریباً ہر شام میرین ڈرائیو پر چہل قدمی کے لیے ملتے تھے۔ واپسی پر میرے فلیٹ میں وہ مالٹے کا جوس (وہ کٹر تارک منشیات تھا) پیتا اور میں اپنی سکاچ کا کوٹا پورا کرتا' پھر ہم ڈنر کے لیے باہر جاتے' پاس پڑوس کے مختلف ریستورانوں کو آزماتے۔ ابتدا میں وہ بہت سلجھا ہوا اور محتاط تھا۔ وہ یورپی لباس پہنتا تھا' گرم ترین دنوں میں ٹائی باندھتا' جرابیں اور بوٹ پہنتا تھا۔ وہ اپنی وضع قطع کا خاص خیال رکھتا تھا اور اپنے خوب تیل لگے ہوئے بالوں پر مسلسل ہاتھ پھیرتا رہتا تھا اور باہر جانے سے پہلے آئینے میں دیر تک تصدیقی جلوہ دیکھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بعد کے زمانے کا محمد علی جناح تصور کرتا تھا' وہی اس کے رویے کی سرد سادگی اور سوچ کی وہی شفافیت۔ جلد ہی میری فحش کلامی کے تحت اس کی سرد مہری پگھل گئی۔ میں اس کے غلیظ اشعار اور بے ہودہ لطیفوں کے ذخیرے سے خوشگوار

طور پر حیران ہوا۔ اس کی شخصیت کا یہ وہ پہلو تھا جو اس نے کسی پر بھی عیاں نہیں کیا تھا۔ نہ ہی سفید فام عورتوں کے لیے اپنی پسندیدگی کو عیاں کیا تھا۔ وہ بے حد معصوم ہو سکتا تھا۔ جب دو کینیڈین لڑکیاں، دونوں فلم پروڈیوسر، مجھے ملنے کے لیے تعارفی خطوط کے ساتھ آئیں تو ہم انہیں ڈنر کے لیے باہر لے گئے۔۔۔ ڈنر کے بعد ہم نے ان کے ہوٹل تک ان کے ساتھ چہل قدمی کی۔۔۔ سوڈیکسٹر ایک چھ فٹ لمبی لڑکی اور میں آگے آگے اور چھوٹی اور کم عمر لڑکی نورانی کے ساتھ ہم سے چند قدم پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب ہم انہیں شب بخیر کہہ کر واپس آ رہے تھے تو میں نے نورانی کو بہت پر جوش پایا۔ ''یار! تمہیں پتا ہے اس لڑکی نے کیا کہا؟ جب میں نے اس سے پوچھا کیا وہ شادی شدہ ہے تو اس نے جواب دیا ''ہاں میں شادی شدہ ہوں، مگر میں جنسی تعلقات استوار کرتی ہوں۔'' اب تم اس سے کیا مطلب نکالتے ہو، سوائے ہم بستری کی کھلی دعوت کے؟''

اگلے چند دنوں تک نورانی لڑکی کا محاصرہ کیے رہا، اسے اپنے کنواروں کے اپارٹمنٹ میں مدعو کرنے کے لیے فون کرتا رہا۔ آخر کار لڑکی اس کے اصرار سے تنگ آ گئی، اس نے مجھے فون کیا اور کہا کہ نورانی کو اس سے پرے لے جاؤں۔ ''کیا تم نے اسے جنسی تعلقات استوار کرنے کے بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا

''ہاں، میں نے بتایا تھا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ قائم کروں گی۔''

اس ناکامی کے بعد وہ باز نہیں آیا اور میری متعارف کرائی ہوئی ایک بیلجیئن مطلقہ کو چن لیا۔ اس کے پاس ایک بڑی کار تھی اور وہ نورانی کو جوہو بیچ پر لمبی ڈرائیو پر لے جایا کرتی تھی۔ تاہم ہر مرتبہ گھر لوٹتے ہوئے گیس ختم ہو جاتی اور وہ کہتی وہ اپنا پرس گھر ہی بھول آئی ہے۔ نورانی نے عورت کے ساتھ کہیں بھی جائے بغیر کئی مرتبہ پٹرول کے لیے ادائیگی کی۔ ایسا ہی قونصلیٹ میں متعین ایک پرکشش جرمنی سیکرٹری کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اس کا پیچھا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے اکتا گئی۔ کچھ وقت کے لیے اس نے میرے اپارٹمنٹ کے پیچھے واقع پنشن میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ میں نورانی کو یہ بتا کر چھیڑتا تھا کہ میں اکثر اسے ننگے غسل خانے میں آتے جاتے دیکھا کرتا ہوں۔ آخر کار ایک امیر گجراتی نے جرمن لڑکی کو حاصل کر لیا اور نورانی ٹھنڈا ٹھار رہ گیا۔

میرا خیال تھا انیس جنگ اور نورانی ایک عمدہ جوڑا بن سکتے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں سنا ہوا تھا، ایک دوسرے کے مضامین پڑھ رکھے تھے مگر کبھی ملے نہیں تھے۔ کسی مہربان شخص نے دہلی میں ان کی ملاقات کا اہتمام کیا۔۔۔ شادی کے نظریئے کے تحت۔

وہ اوبرائے ہوٹل میں صبح کے وقت کافی پر اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ نورانی وقت کے بارے میں بہت احتیاط کرتا تھا۔ انیس اتنی پروا نہیں کرتی تھی۔ اوبرائے میں بہت سے ریستوران تھے اور انہوں نے طے نہیں کیا تھا کہ کونسا ریستوراں ان کے وعدۂ وصل کے پورے ہونے کی جگہ ہے۔ نورانی ایک منزل پر واقع ریستوراں میں بے صبری سے انتظار کر رہا تھا انیس کسی دوسری منزل پر سکون سے بیٹھی تھی کسی کردار کے انتظار میں جو نورانی ہوسکتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد نورانی اس نتیجے پر پہنچا کہ جو عورت اسے اتنی دیر انتظار کرواسکتی ہے وہ شناسائی کے قابل نہیں ہے عین اسی وقت انیس نے فیصلہ کیا کہ وہ کافی انتظار کر چکی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ایک ہی ایلیویٹر میں پایا۔ نورانی غصے میں تھا اور اسے اس کو ننگا کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا: ''شاید آپ مس جنگ ہیں؟'' اس نے اس کے نام کا غلط تلفظ ''جونگ'' بولتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں میں انیس جنگ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

اس نے اس کی کلائی کی گھڑی اوپر کی اور وقت کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں مجھ سے 11 بجے ملنا تھا جبکہ اس وقت ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت ہے۔'' انیس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک دوسرے ریستوران میں اسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ نورانی کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ دو محبت کرنے والوں کے لیے طے کی گئی پہلی ملاقات غصے بھرے الفاظ کے تبادلے اور کافی کے بغیر ایک تلخ الوداع پر اختتام پذیر ہوئی۔

☆☆☆

مجھے ''ویکلی'' کی طرف واپس آنے دو۔

میں نے اس چیز کو بہتر جانا کہ میں خود کچھ لکھوں تاکہ میرے رفقائے کار کا تصور واضح تر ہو جائے کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ میں بھیجی گئی کہانیوں کی سخت اڈیٹنگ کرتا تھا' بعض اوقات تو قریباً دوبارہ لکھتا تھا۔ وہ اپنے طبع شدہ ناموں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور دوسرے رسالوں سے زیادہ معاوضے حاصل کرتے تھے۔ مدیر کے طور پر میں نے اپنی پہلی سٹوری رمن رگھو کے مقدمے پر لکھی۔ اس آدمی نے لوہے کی سلاخ سے جھونپڑپٹی میں رہنے والے تیس سے چالیس مرد' عورتوں اور بچوں کی کھوپڑیوں کو توڑ دیا تھا۔ اس کا مقدمہ بمبئی کے ایک سیشن جج کی عدالت میں چلنا تھا۔ میں نے وکیل استغاثہ تک رسائی حاصل کی اس سے اس کی فائلیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ میں نے پولیس سے رگھو کو عدالت میں لائے جانے کے وقت اس کی تصویریں اتارنے کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ فوٹوگرافر جیتندر آریا میرے ساتھ آیا تھا۔

جب رگھو کو بلیک ماریا سے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے باہر لایا گیا تو میں نے آریا کو اس کے کیمرے کے ساتھ تیار رہنے کو کہا۔ رگھو چالیس کے پیٹے میں ایک سیاہ، گٹھیلا اور مضبوط کاٹھی والا آدمی تھا۔ جونہی اس نے فوٹوگرافر کو دیکھا اس نے چلانا اور اچھلنا کودنا اور ہر کسی کو فحش گالیاں بکنا شروع کر دیا۔ ''اب تصویر لے لو!'' میں نے آریا کو چیخ کر کہا۔ ''اسے پرسکون تو ہونے دیجئے۔'' آریا نے جواب دیا۔ مجھے ادراک ہوا کہ آریا کبھی ایک کرائم فوٹوگرافر نہیں بن پائے گا اور اسے مشہور شخصیات کے پورٹریٹ بنانا اور ننگی چھاتیوں والی لڑکیوں کی تصویریں ہی اتارنی چاہئیں۔ جو تصویر آخر کار اس نے اتاری وہ بہت بے لطف ثابت ہوئی۔ میں تین دن جاری رہنے والے مقدمے کی کارروائی سنتا رہا۔ رگھو اپنے جرائم کو تسلیم کرنے پر بالکل تیار تھا اور پولیس اور مجسٹریٹ کے سامنے کیے گئے اعترافات کو دہرانے پر آمادہ تھا۔ اس نے لوہے کی وہ بھاری سلاخ دکھائی جسے اس نے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس نے اسے اتنے پیار سے پکڑا ہوا تھا گویا وہ اس کی قریبی دوست رہی ہو۔ لمحہ بھر کے لیے تو عدالت میں موجود ہر شخص گھبرا گیا تھا۔ ''ڈرو نہیں'' اس نے ہمیں تسلی دی تھی ''میں تم میں سے کسی کو قتل نہیں کروں گا۔'' جج کے ساتھ اس کا رویہ بالکل لاپروایانہ تھا۔ جب ان لوگوں کے نام جنہیں اس نے قتل کیا تھا، اس کے سامنے پڑھے گئے اور اس سے پوچھا گیا کہ کیا اس نے ان کو قتل کیا تھا تو اس نے جواب دیا: ''ہاں میں نے انہیں قتل کیا تھا ـــ میں نے ان سب کو قتل کیا تھا اور تم مجھے پھانسی چڑھا سکتے ہو۔ میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں'' ـــ یہ امر واضح تھا کہ وہ ایک نفسیاتی مریض تھا اور اس کے وکیل صفائی کو اس کے پاگل پن کے حوالے سے مقدمہ لڑنا چاہیے تھا۔ جب سیشن جج نے اسے موت کی سزا سنائی تو رمن رگھو نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ ہائی کورٹ نے، جس نے موت کی سزا کی توثیق کرنا تھی، اس کا طبی معائنہ کروایا اور پاگل قرار دیا۔ موت سے پہلے وہ پاگل خانے میں زنجیروں میں جکڑے کئی سال بند رہا تھا۔ کسی دوسرے اخبار یا رسالے نے رمن رگھو کے مقدمے کی اتنی تفصیلات نہیں دیں جتنی کہ ''ویکلی'' نے شائع کی تھیں۔ ہماری سرکولیشن بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے غزل گائیکہ شکیلہ بانو بھوپالی پر فیچر لکھا۔ میں نے اسے دہلی میں گاتے ہوئے سنا تھا۔ وہ ایک عمدہ، گول چہرے والی عورت تھی، تیس کے پیٹے میں بالائی طبقے کی ایک طوائف کی چنچلتا اور شوخی کی حامل تھی۔ اس کی آواز بہت زیادہ سریلی نہیں تھی تاہم اپنے گانوں کے درمیان جا بجا چھیڑ چھاڑ والے فقروں اور کھلے ڈلے لطیفوں کو سنانے کے لیے اس نے اپنی آواز کو تیار کیا ہوا تھا۔ وہ پست ذوق والی تھی اور اپنے آپ کو اردو شاعری کے صاحب ذوق اور نکتہ رس سمجھنے والے عامیوں میں بہت زیادہ پسند کی جاتی تھی۔ وہ اپنے بارے میں ایک انگریزی رسالے

میں لکھے جانے پر بہت خوش تھی۔ آریا نے گاتے ہوئے اس کی بہت سی تصویریں بنائیں۔ میں نے سرورق پر اس کی تصویر دی اور ایک طویل مضمون میں اس کا پس منظر بیان کیا اور اس کے اپنی ماں جمیلہ بانو سے تربیت حاصل کرنے کا احوال درج کیا۔ شکیلہ خوش تھی، غزل گانے والوں کی مارکیٹ میں اس کا مقام بلند ہو گیا تھا اور وہ اپنا معاوضہ دگنا کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ بہت سے قارئین نے احتجاج کیا۔ مؤقر گھریلو رسالے کو کیا ہو گیا تھا ــــ اس میں قاتلوں اور گانے والی لڑکیوں پر خصوصی مضامین آنے لگے تھے!

اس کے بعد میں نے عریاں کیبرے ناچوں پر ایک فیچر شائع کیا۔ ایک تصویر بہت مختصر لباس پہنے ہوئے ٹینگو ناچ ناچتے ہوئے ایک جوڑے کی تھی جو ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ یوں لگتا تھا گویا وہ ملاپ کر رہے ہوں۔ عارضی جنرل مینجر مینلکیر نے اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں نے اسے اپنے کام سے کام رکھنے کا کہا۔ میں جیسا بہترین سمجھتا تھا ویسے ہی ''ویکلی'' کو چلاتا رہا، ہر شمارے میں ننگی چھاتیوں والی ایک قبائلی دوشیزہ یا گوا کے ساحل پر سمندر سے نکلنے والی کسی سفید فام ہپی کی تصویر شائع کرتا تھا۔ میں تصویروں کے کیپشن بہت احتیاط سے جتنا ہو سکتا تھا معلوماتی اور سادہ بناتا تھا: قبائلی لڑکیوں کے ساتھ ان کی چھاتیوں یا کولہوں کے ماپ کی بجائے صرف ان کے قبیلوں کے نام، ان کی تعداد، ان کی آبادیوں وغیرہ کے بارے میں معلومات دیتا تھا، ہپیوں کے ساتھ درج کیپشنوں میں منشیات کے فتنے اور روایت پرستوں کی اپنے نوجوانوں کے لیے کھلی ترغیبات کے خلاف تنقید کو بیان کرتا تھا۔ رقیب رسالے ''بلٹز'' اور ''کرنٹ'' نے جو ایسی ہی تصویریں شائع کرتے تھے کبھی لڑکیوں کے اعضا کی پیمائشوں'' اور یہ اس کا ٹیلی فون نمبر نہیں ہے'' کے جملہ معترضہ بیان کرنے کے علاوہ کچھ مزید نہیں شائع کیا تھا یا گھٹیا تک بندی کو کیپشن کے طور پر دیتے تھے۔ مجھ پر کبھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا گیا۔

''ویکلی'' کو سب سے بڑی کامیابی اس سلسلے (سیریز) نے دی جس میں ہندوستان کی مختلف کمیونٹیوں ــــ چٹ پون، آئینگر، آئر، لنگ پرست، وو کلیگ، میمن، بوہرہ، مہیشور، کائیستھ، جاٹ، اگروال ــــ کا احوال بیان کیا گیا ہوتا تھا۔ میں نے جس جس مذہبی، نسلی، ذات یا ذیلی ذات کے بارے میں سنا تھا اس کو بیان کر دیا تھا۔ ان مضامین میں متعلقہ کمیونٹیوں کی ابتداء، ان کے اصل علاقے، ان کے عظیم فرزندوں اور بیٹیوں کے کارناموں کو بین کیا جاتا تھا۔ ہر شمارے کو کمیونٹی کے ارکان خرید لیا کرتے تھے۔ ہماری فروخت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ بینیٹ اینڈ کولمینز پبلی کیشنز میں سب سے نیچے ہوتے ہوئے ہم انہیں باری باری پیچھے چھوڑتے چلے گئے، ان کے ساتھ زبردست فرق کے ساتھ ان سے آگے نکل گئے۔ میں ہر کامیابی کو

منانے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا اور مٹھائیاں منگوا کر سارے دفتر میں تقسیم کرواتا تھا۔

اس بورڈ روم میں جہاں مدیروں کو کبھی کبھی ڈائریکٹروں سے ملنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ہمارے رسالوں کی سرکولیشن دکھانے والے چارٹ آویزاں تھے۔ دوسروں کے نشیب و فراز ہوتے یا جوں کے توں رہتے تاہم ''ویکلی'' کا گراف ہمیشہ اٹھتا ہوا رجحان ظاہر کرتا تھا' کسی فاتح عضو تناسل کے مانند فحش زاوئے سے اوپر اٹھتا ہوا۔ اس سے مجھے میرے ساتھی مدیروں میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ جس آخری رسالے کو ہم نے پار کیا تھا وہ ہندی رسالہ ''دھرم یگ'' تھا' جس کی ادارت ادیب ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کرتا تھا۔ جب میرے عملے کا ایک فرد اس کے دفتر میں ہماری کامیابی کی خوشی منانے کے لیے لڈو دینے گیا تو وہ بہت گڑ بڑایا۔

ہماری سرکولیشن میں اگلا ابھار بنگلہ دیش کی آزادی پر لڑی جانے والی ہندو پاک جنگ کے ساتھ رونما ہوا۔ مجھے ''نیویارک ٹائمز'' نے اس کی خبر سازی کے لیے متعین کیا۔ میں نے وہی مضامین بہت سی مزید تصاویر کے ساتھ ''السٹریٹڈ ویکلی'' میں شائع کر دیئے خوش قسمتی سے میں تشدد اور اس کے نتائج کی پیش گوئی کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ تاہم میں یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ وہ مجرموں' طوائفوں' کیبرے رقص کرنے والوں' کمیونٹیوں' فلمی ستاروں یا سیاست پر لکھے گئے میرے فیچر نہیں تھے جنہوں نے بلند ترین نشان کو چھوا بلکہ راجو بھارتن کے کرکٹ پر تحریر کردہ فیچر تھے جو اس کے ذاتی ذخیرے کی تصویروں سے مزین ہوتے تھے۔ ہم ہر دور سے زیادہ 410,000 شماروں کی فروخت تک پہنچ گئے۔ ہم اس سے زیادہ آگے بھی جا سکتے تھے تاہم ہمیں اشتہار۔ ایڈیٹوریل تناسب نے محدود کر دیا جس کے تحت زیادہ اونچی سرکولیشن کا مطلب نفع نہیں خسارہ ہوتا ہے۔ میرے پاس فخر کرنے کے تمام جواز تھے: پانچ برسوں میں ''ویکلی'' کی سرکولیشن چار گنا ہو گئی تھی۔

بنگلہ دیش کی جنگ ختم ہونے کے بعد میں نے دو مرتبہ پاکستان کا دورہ کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کس طرح کام کر رہا ہے اور شکست خوردہ پاکستان اپنی فوج کی شدید پٹائی کو کیسے لے رہا ہے۔ میں اپنے پہلے دورے میں بھٹو سے کراچی اور دوبارہ اسلام آباد میں ملا۔ دوسری ملاقات زیادہ سود مند رہی' کیونکہ میں کراچی میں بیگم پارا اور اس کے بچوں سے اور اسلام آباد میں بھٹو اور جنرل ٹکا خان سے ملا۔ میرے پاس ''ویکلی'' میں شائع شدہ مواد سے زیادہ بھٹو سے ملاقات کے حوالے سے کہنے کو کچھ نہیں ہے' سوائے اس کے کہ میں نے اس کی طرف سے مسز گاندھی کو ایک ذاتی پیغام پہنچایا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا: ''وہ ایک پکا جھوٹا ہے۔'' بیگم پارا اور ٹکا خان کے ساتھ ملاقاتیں بڑی یادگار تھیں۔

بیگم پارہ' کسی زمانے میں ہندوستانی پردۂ سیمیں کی سب سے بڑی خاتون ولن (سپرویمپ)' ناصر خان (یوسف المعروف دلیپ کمار کے بھائی) سے شادی کے بعد بہت موٹی ہوگئی تھی اور اس کے دو خوبصورت بچوں' ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو جنم دے چکی تھی۔ اس کا شوہر مر چکا تھا' وہ اس کے لیے باندرہ میں ایک فلیٹ اور دو فلموں کے سوا بہت کم چھوڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کا دیور جو لاکھوں کما رہا ہے اس میں اس کا بھی کچھ حق ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں وہ قابل لحاظ ورثے کی حامل تھی جو کہ اس کے دعوے کا منتظر تھا۔ میں اس کی بہن کی بیٹی رخسانہ سلطانہ کی وساطت اس سے ملا تھا۔ میں بمبئ میں بیگم پارہ اور اس کے بچوں سے بہت مرتبہ ملا تھا۔ کئی اتوار کی صبحوں کو یہ گھرانہ مجھے جم خانہ کلب کے نہانے کے تالاب میں تیراکی اور ناشتہ کرنے کے لیے ملا تھا۔ بیگم پارا اکثر پیسے کا سوال اٹھایا کرتی تھی۔ اگر کوئی اسے چالیس پچاس ہزار روپے فراہم کر دے تو وہ اپنی فلمیں دوبارہ چلا سکتی تھی اور قسمت بنا سکتی تھی۔ میں نے اس اشارے پر توجہ نہیں دی تھی۔ شدید مایوسی کے عالم میں وہ اپنی وراثت کا دعویٰ کرنے کے لیے پاکستان ہجرت کر گئی۔ اس کے دو بھائی اونچے مراتب پر تھے' ایک بھائی بھٹو کی حکومت میں وزیر تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے رشتہ دار کسی شے کی ذمہ داری قبول کرنے کو راضی نہیں تھے اور وہ پہلے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرنے کی وجہ سے کمزور موقف کی حامل تھی۔ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی فلموں اور ٹی وی پر آ کر بہت تھوڑی روزی کما رہی تھی۔ اس کے بچے ناخوش تھے۔ بمبئ کی آزاد اور سہل فضا کے بعد' لڑکی نے جو تیزی سے ایک خوبصورت عورت میں نشوونما پا رہی تھی' پاکستان کی روایت پرستانہ فضا کو بہت دم گھونٹ دینے والا پایا تھا۔ بیگم پارا نے مجھے ہندوستان واپسی میں مدد دینے کے لیے کئی خط لکھے تھے۔ میں نے جواباً لکھا تھا کہ میں جلد ہی کراچی آ رہا ہوں اور ہم اس معاملے پر گفتگو کریں گے۔

میں سرشام ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ بیگم پارا اور اس کے بچے میرے استقبال کے لیے ائیرپورٹ پر موجود تھے۔ اس طرح چیف آف پروٹوکول بھی میرے استقبال کے لیے ائیرپورٹ پر موجود تھا — کیونکہ میں حکومت کا مہمان تھا — وی آئی پی لاونج میں ہماری تواضع کی گئی۔ بچوں کو کیک اور بسکٹ کھلا کر گھر بھیج دیا گیا۔ بیگم پارا نے میرے ساتھ اس ہوٹل میں ڈنر کرنے کی دعوت قبول کر لی جہاں میں نے صبح اسلام آباد روانہ ہونے کے لیے رات بھر قیام کرنا تھا۔ چیف آف پروٹوکول نے ہمیں میرے ہوٹل اتار دیا۔ بیگم پارا میرے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی — میں نے سوڈے اور برف کا آرڈر دیا اور سکاچ کی بوتل نکالی جو میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا — اس زمانے میں پاکستان میں کوئی ممانعت نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں نے

بیگم پارا کی مے نوشی کے مسئلے کے بارے میں قصے سنے ہوئے تھے۔ وہ اس کی قیمت کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ پاکستان میں سکاچ کی ایک بوتل کی قیمت ہندوستان سے دگنی تھی۔ ''کیا تم ایک جام لینا پسند کرو گی؟'' میں نے اس سے پوچھا' مجھے پکا پتہ نہیں تھا کہ وہ اب بھی ایک مے نوش خاتون ہے کہ نہیں ـــ ''میں تھوڑی سی لوں گی۔'' اس نے جواب دیا ''میں نے مدتوں سے اصل سکاچ نہیں دیکھی ہے۔''

میں نے تیز وہسکی کے دو جام بھرے اور ایک اسے دیا۔ ہم نے پنجابی میں دوبارہ باتیں شروع کر دیں ـــ ابھی میں نے آدھا گلاس بھی نہیں پیا تھا کہ میں نے دیکھا وہ اپنا گلاس خالی کر چکی ہے۔ میں نے اس کے لیے ایک اور جام بھرا۔ وہ اسے بھی چڑھا گئی اور میں نے اپنے جام کو دوبارہ پینا شروع کرنے سے پہلے اس کا جام پھر بھرا ـــ جب تک میں اپنا تین لارج وسکی کا کوٹا پورا کرتا بیگم پارا نو جام چڑھا چکی تھی۔ بوتل قریباً خالی ہو چکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمیں جلد کھانا کھانا ہوگا کیونکہ مجھے صبح سویرے پرواز پکڑنی ہے۔ وہ میرے ساتھ ڈائننگ روم چلنے کے لیے ہچکچاتے ہوئے اٹھی۔

ڈائننگ روم پہلی منزل پر تھا۔ ہمیں اس تک جانے کے لیے سنگ مرمر کا ایک چکردار زینہ چڑھنا پڑا تھا۔ کھانے کا کمرہ پر ہجوم تھا۔ جیسا کہ پاکستان میں معمول ہے کمرے میں بہت کم عورتیں تھیں۔ لوگ بیگم پارہ کو اس کے ٹی وی پر آنے کی وجہ سے پہچانتے تھے۔ وہ اسے ایک سکھ کی صحبت میں شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ہمیں دو افراد کے لیے ایک میز پر لے جایا گیا۔ ہم نے اپنے کھانے کا آرڈر دیا۔ ''کیا آپ کھانے کے انتظار کے دوران کچھ پینا پسند کریں گے؟'' ویٹر نے پوچھا۔ ''میرے لیے تو کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور بیگم پارا کی طرف دیکھا: ''میں ایک اور سکاچ اور سوڈا لوں گی۔'' وہ بولی۔ سوپ پیش کیے جانے سے پہلے اس نے دو جام پیے۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی اور اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی کھانے کے ساتھ ایک جام لینا چاہتی تھی میں نے مزید نہیں پی۔

دیر بعد کھانا ختم ہوا۔ میں نے بیگم پارا کو اس کی کرسی سے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ کھڑی ہوئی' تھوڑی سی لہرائی اور قالین پر گر گئی۔ ویٹر اسے اس کے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے دوڑے آئے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دینے کے لیے اس کا بازو تھام لیا۔ ڈائننگ روم میں سب کی نظریں ہماری طرف مڑ گئی تھیں۔ میں چکردار زینے سے اترتے ہوئے دگنا محتاط تھا۔ میں نے اس کے فربہ بازو کو تھام لیا اور اسے حکم دیا: ''ایک وقت میں ایک قدم اٹھاؤ۔'' ہم ہال تک اسی طرح گئے۔ میں نے اس کے لیے ٹیکسی بلائی اور تحمل کے ساتھ اس کڑی

آزمائش کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ ایک ٹیکسی پورٹیکو میں آئی۔ میں نے ڈرائیور کو سو روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ خاتون کو گھر لے جائیے۔ وہ بیگم پارا کو پہچانتا تھا اور اسے پتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ میں نے ٹیکسی کا عقبی دروازہ کھولا اور بیگم پارا کی مدد کے لیے پیچھے گیا۔ جونہی اس نے قدم آگے رکھا' اس کا پاؤں لڑکھڑا گیا اور وہ ایک مرتبہ پھر زمین پر گر گئی' اس مرتبہ ایک زوردار پاد کے ساتھ۔ اس کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ ''ہائے ربا میں مرگئی۔'' ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ایک مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے کوئی غیر رشتہ دار ایک عورت کو چھو نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کے پیروں پر کھڑا کرنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی۔ وہ میری طاقت سے زیادہ موٹی تھی۔ میں نے کار ڈرائیور سے مدد کے لیے التجا کی۔ میری پیشگی بخشیش کارگر ہوئی تھی۔ ہم نے اسے اس کے پیروں پر کھڑا کیا اور سیٹ پر دھکیل دیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور عجلت میں اسے الوداع کہا۔ میں ہجوم میں سے راستہ بناتا گزرا اور جتنی تیزی سے ممکن تھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹوں بعد میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کا ایک سب انسپکٹر کھڑا تھا جس کے نچلے ہونٹ سے سگریٹ لٹک رہا تھا۔ وہ مجھے دھکیل کر اندر داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سکاچ کی قریباً خالی بوتل اور سوڈا واٹر کی بوتلوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔۔۔ ''پاسپورٹ'' اس نے درشتی کے ساتھ حکم دیا۔

میں نے اپنا پاسپورٹ نکالا اور اسے تھما دیا۔ وہ اس کے ورق الٹتا رہا۔ ''کیا تم نے کسی پولیس سٹیشن پر اپنی آمد کی اطلاع کی ہے؟'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں ایسا کرنے سے مستثنیٰ ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے ویزا کو دوسری مرتبہ دیکھا اور اس میں کچھ غلط نہیں پایا۔

''کراچی میں تمہیں کیا کام ہے؟''

''یہاں مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ میں تو اسلام آباد جا رہا ہوں۔''

اس نے میرے پاسپورٹ کے ورق الٹنا اور سگریٹ پینا جاری رکھا۔

''تم کیا کرتے ہو؟ کیا تم میوے کا کاروبار کرتے ہو؟''

''نہیں میں صحافی ہوں۔'' اس ٹیڑھے سب انسپکٹر کے لیے میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا تھا۔

''تم اسلام آباد میں کہاں ٹھہرو گے؟''

''تمہارے وزیراعظم' مسٹر بھٹو کے ساتھ۔ میں اس کا مہمان ہوں۔''

گو کہ یہ پوری طرح سچ نہیں تھا تاہم اس کا برقیاتی اثر پڑا۔ پولیس والے نے تیزی سے اپنا سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا نکالا اور کھڑا ہو گیا۔

''کیا تم کوئی منسٹر شنسٹر ہو؟''
''نہیں'' میں نے جواب دیا ''میں فقط ذاتی طور پر مسٹر بھٹو کا واقف ہوں۔''
اس نے مجھے مستعدی سے سلیوٹ کیا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

میں جنرل ٹکا خان سے انٹرویو کرنے والے پہلے صحافی کی حیثیت سے اتنا ہی مشتاق تھا جتنا کہ جنرل کسی ہندوستانی سے سروکار نہ رکھنے کے بارے میں پرعزم تھا۔ اسے غصہ تھا کہ ہندوستانی پریس اسے ''بنگلہ دیش کا قصائی'' کے نام سے موسوم کرتا رہا تھا اور ہندوستانی فوج کی طرف سے پاکستان پر مسلط کی گئی رسوا کن شکست پر اذیت کا شکار تھا۔ اس نے انٹرویو کے لیے میرے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ منظور قادر تھا جس نے اس سے میری سفارش کی تھی اور مجھے ''پاکستان کا ایک دوست'' قرار دے کر قائل کیا تھا۔

جنرل ٹکا خان نے اپنے بنگلے میں خوش اخلاقی و شائستگی سے میرا استقبال کیا۔ وہ چھوٹے قد کا گٹھیلا تندخو نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ سپاہی سے زیادہ ایک بینک کلرک دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا اردلی تھا' پٹھانوں جیسی ٹوپی پہنے' کلف زدہ پگڑی باندھے ایک لحیم شحیم آدمی۔ جب میں نے اردگرد پر نظر ڈالی تو اونچے رتبوں والے فوجیوں کے گھروں میں عمومی طور پر دکھائی دینے والے لوازمات دیکھے ــــ رجمنٹل امتیازی نشانات' ٹرافیاں اور چاندی کے فریموں والی تصویریں۔ دیواروں اور مینٹل پیس پر قرآن کی آیات آویزاں تھیں' ان میں سے ایک کو میں پڑھ سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے تک رکھا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ جنرل کے ساتھ مکالمے کے دوران میں یہ میرے کام آئے گی۔

وہ ایک تلخ آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی اور غیر ملکی پریس میں پاکستانیوں کی طرف سے کیے گئے قتل عام اور گروہی زنا (گینگ ریپ) کی کہانیاں جھوٹی تھیں۔ ''ہم اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ میرے سپاہی نظم وضبط کے پابند تھے۔ انہوں نے معصوم بنگالیوں کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی۔ یہ تم ہندوستانی ہو جنہوں نے جھوٹ کو پھیلایا اور برطانوی اخباروں نے ہمارے خلاف ان بہتانوں کو شائع کیا۔'' اس نے براہ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے جنگ کے فوری بعد بنگلہ دیش کا دورہ کیا تھا اور وہاں بنگالی مسلمانوں کے منہ سے پاکستانی فوجیوں اور افسروں سے سرزد

ہونے والے مظالم کی کہانیاں سنی تھیں۔ ''وہ سب تو جھوٹے نہیں ہو سکتے'' ـــ میں نے کہا۔
''اور میں نے پاکستانیوں کے خلاف بہت زیادہ اشتعال دیکھا۔ ہندوستانی فوجیوں کے ان کی حفاظت کرنے کے باوجود بنگلہ دیشی ہجوم پاکستانی جنگی قیدیوں کو ہلاک کر رہا تھا۔''
''اس طرح کے چند ایک واقعات ہوئے ہوں گے۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''ہر ریوڑ میں کالی بھیڑیں بھی ہوتی ہیں اور تم جانتے ہو کہ بنگلہ دیشی ہر بات کو بڑھا چڑھا دینے کے معاملے میں کتنے طاق ہیں!'' اس نے ایک اردو شعر کا حوالہ دیا

شوقِ طولِ پیچ اس ظلمت کدے میں ہے اگر
بنگالی سے بات سن اور بنگالن کے بال دیکھ

مجھے یہ بہت مزیدار لگا اور میں نے اسے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا' اپنے بنگالی دوستوں کو تنگ کرنے کے لیے۔ میں نے جنرل سے سوال کیا کہ میدانِ جنگ میں پاکستانیوں نے اتنی خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیونکر کیا تھا۔ ''وہ ایک برابر کی جنگ نہیں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پہلے تو تم نے مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہوائی رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر تمہارے آدمی ہمارے ساتھ جنگ کا اعلان کرنے پر مجبور ہونے سے بہت پہلے مشرقی پاکستان کے اندر گھس آئے تھے۔ مکتی باہنی کی یہ سب کہانیاں پروپیگنڈا تھیں۔ مکتی باہنی گوریلا جنگ کے لیے تربیت یافتہ ہندوستانی سپاہی تھے' تمہارے افسران کی قیادت کرتے اور انہیں ہدایات دیتے تھے۔ ہمارے فوجیوں کو اپنے سامنے اور اس کے ساتھ ساتھ عقب سے دشمن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔''

اردلی نے رضا کارانہ طور پر اپنی رائے دی ''عوام ہمارے خلاف ہو گیا تھا۔''

جنرل نے اپنے اردلی کو ایک رائے کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں دی اور اسے خاموش کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

''ٹھیک یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ اگر ایک ملک کی پوری کی پوری آبادی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو کوئی فوج کیا کر سکتی ہے؟''

''یہ ہندوستانی پروپیگنڈا تھا۔'' جنرل نے بات سنبھالی۔ میرے پاس اس سے مزید کچھ پوچھنے کو نہیں تھا۔

☆☆☆

''ویکلی'' میرے لیے دیگر انعامات لایا۔ مدیر کا صفحہ وسیع پیمانے پر پڑھا جانے لگا:
اس نے بعدازاں میرے آزاد (فری لانس) کالم نگار کے طور پر کیریئر کا راستہ ہموار کیا۔ اس نے مجھ پر بہت سے دروازے بھی کھولے۔ مجھے ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی کابینہ کے ارکان تلاش کرنے لگے۔ (ریلوے کے وزیر پنڈت کملاپتی تریپاٹھی نے مجھے ہندوستان میں کسی بھی جگہ سفر کرنے کے لیے فری پاس دے دیا تھا) میں جب چاہتا مسز گاندھی مجھے تبھی انٹرویو دینے کو تیار تھی۔ میرے صحافت اور ادب میں مفروضہ حصے (کنٹری بیوشن) کے صلے میں پدم بھوشن کا اعزاز دینے کے لیے فاطمہ اور رفیق زکریا سے رجنی پٹیل تک نے میرا نام تجویز کیا تھا۔ میں نے 1975ء میں صدر وی۔ وی۔ گری سے یہ اعزاز وصول کیا۔

کامیابی میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ میں نام بھولنے لگا۔ یہ فقط میری بیوی اور بیٹی تھیں جو مجھے تھوڑا نیچے لے آئیں۔ تاہم میری انا کو پچکانے والے ادھر بہت سے مزید لوگ بھی تھے۔ میں نے ''السٹریٹڈ ویکلی'' کو اپنی اولاد تصور کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ کہ جس دن میں نے چھوڑا یہ مرجھا جائے گا۔ ایسی سوچ مہلک ہوسکتی تھی۔ میرے زوال کا دن زیادہ دور نہیں تھا۔

مدیر کے طور پر میرے عہدے کے کچھ اچھے پہلو تھے۔ کچھ موضوعات کے حوالے سے' جن پر میں کامل آزادی کے ساتھ تحریر کرسکتا تھا' میں مثبت رائے کا حامل تھا۔ ایک موضوع ہندوستانی مسلمانوں کی قابل رحم حالت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے خلاف امتیاز روا رکھا جا رہا ہے اور انہیں پاکستان کی مفروضہ حمایت کے الزام کے تحت تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ جب بھی پاکستان کے ساتھ تناؤ ہوتا تھا ان کی وفاداریوں پر شبہ کیا جاتا تھا۔ وہ حکومت میں ملازمتیں حاصل کرنے میں دشواریاں پاتے تھے اور وسیع پیمانے پر ہندوؤں کے کنٹرول والے نجی ملکیت والے کاروباری اداروں میں بھی ان کے لیے ملازمت کا حصول قریباً ناممکن تھا۔ ان کے پاس ان کے خدشات کے اظہار کا کوئی فورم نہیں تھا سوائے اردو اخبارات کے جن کی تھوڑی سی سرکولیشن اپنی ہی کمیونٹی تک محدود تھی۔ میں نے ''السٹریٹڈ ویکلی'' کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک فورم بنایا۔ جب کبھی کوئی ہندو مسلم فساد ہوتا اس کے لیے میں واضح طور پر مسلمانوں کی حمایت کرتا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لیے پاکستان کے ساتھ دوستانہ روابط لازمی تھے۔ جہاں کہیں پاکستانی اور ہندوستانی موقف مختلف ہوتے وہاں میں پاکستانی موقف کو واضح کرنے کی بہترین کوشش کرتا تھا۔

اگرچہ میں نے 1971ء میں بنگلہ دیش پر جنگ کے دوران میں جنرل یحیٰی خان کی فوجی حکومت اور بنگالیوں کی نسل کشی پر جنرل ٹکا خان کو علانیہ مجرم ٹھہرایا تھا تاہم

''السٹریٹڈ ویکلی'' واحد ہندوستانی رسالہ تھا جس نے 93000 پاکستانی جنگی قیدیوں کو جنگ ختم ہو جانے کے بعد رہا کر دینے کے لیے حکومت کو مستقل طور پر قائل کیا تھا۔ میں نے چار افراد کا وفد لیا بشمول گنگا بھائی مہتہ (امریکہ میں ایک مرتبہ ہندوستانی سفیر) اور ادیبوں خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر، اور مسز گاندھی کو جنگی قیدیوں کو رہا کر دینے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے گنگا بھائی کو امریکہ کی کٹھ پتلی کہتے ہوئے ڈانٹ دیا اور عباس اور کرشن چندر کو چپ کروا دیا تھا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی کہ میری تحریریں اسے کس طرح شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری اس کاوش (ایکسرسائز) کا مقصد بھی اسے شرمندہ کرنا تھا اور میں خوش ہوں کہ میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے مجھ پر ملامت کی ایک نگاہ ڈالی اور بولی: ''مسٹر سنگھ! ممکن ہے آپ خود کو ایک عظیم مدیر تصور کرتے ہوں تاہم مجھے بتانے کی اجازت دیجئے کہ آپ سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔'' میں نے اتفاق کیا کہ میں سیاست کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں اور اضافہ کیا: ''مسز گاندھی! مجھے یقین ہے کہ جو کچھ اخلاقی طور پر غلط ہوتا ہے سیاسی طور پر کبھی درست نہیں ہوسکتا۔'' مسز گاندھی نے دوبارہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھ پر جما دیں اور مجھے جھاڑ دیا: ''اخلاقیات پر مجھے لیکچر دینے کا شکریہ۔'' اور ہمیں رخصت کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے دوبارہ کبھی بات نہیں کرے گی۔ تاہم چند دنوں بعد جب وہ بمبئی میں گورنر علی یاور جنگ اور اس کی بیوی بیگم زہرہ کے ساتھ قیام پذیر تھی تو اس نے مجھے وسیع و عریض، پر ہجوم استقبالیے میں ڈھونڈ نکالا اور نہایت دوستانہ انداز میں باتیں کیں۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنا موقف اس کے ذہن نشین کر چکا تھا۔

''ویکلی'' میں اسلام، اسلامی تاریخ اور تحریکِ آزادی میں ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کے حوالے سے بڑی تعداد میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ میں نے اپنے عملے میں دو مسلمانوں کو بھرتی کیا تھا: ممتاز ناول نویس قرۃ العین حیدر (بعد ازاں جن پیٹھ ایوارڈ جیتنے والی) اور ایم۔ جے۔ اکبر جو اس پیشے میں عروج پر پہنچا اور ''ٹیلیگراف'' کا مدیر اور پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ سال میں تینوں عیدوں پر ہم مسلمان بھائیوں کے لیے سرورق پر ایک باکس میں نیک تمنائیں شائع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رکھشا بندھن پر میں نے لتا منگیشکر کو قائل کیا کہ وہ دلیپ کمار (یوسف خان) کی کلائی پر راکھی باندھے۔ ہم نے اس تصویر کو سرورق پر شائع کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں خود کو ہندوستانی مسلمانوں کا دوست ظاہر کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب میں راجیہ سبھا کا رکن بننے کے لیے نامزد کیا گیا تو بہت سوں نے کہا: ''پارلیمنٹ میں ہمارے پاس ایک اور مسلمان ہوگا۔'' دوسروں نے، جو میرے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، مجھے پاکستان کا بلا معاوضہ ایجنٹ کہا۔ میں نے دونوں خیالات کو تعریف سمجھا۔

میری آزمائش کا لمحہ مئی 1975ء میں تب آیا جب مسز گاندھی نے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی اور میرے ممدوح جے پرکاش نارائن کو گرفتار کر لیا۔ میں نے بہار میں 1967ء کے قحط کے دوران میں اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ چند دن گزارے تھے۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ مکمل انقلاب کے لیے اس کی پکار' جس میں قانون ساز اداروں کے گھیراؤ کر کے لوگوں کے منتخب کردہ ارکان کو ان کے فرائض کی ادائیگی سے روکنا شامل تھا' جمہوریت کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے اسی بات کا اظہار اسے خط لکھ کر بھی کیا۔ اس نے اپنے موقف کا دفاع کرتے ہوئے مجھے طویل جوابی خط بھیجا تھا۔ میں نے اس کو پورا شائع کر دیا تھا۔ انارکی کی صورتحال چھا چکی تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی نوع کا بندھ (ہڑتال) ہوا کرتی تھی' ملک کے متاثرہ حصوں میں سکول اور کالج بند پڑے تھے۔ بڑے بڑے جلوس سڑکوں پر مارچ کرتے' دکانوں کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیتے اور سڑک پر کھڑی ہوئی کاروں کو تباہ کر دیتے تھے۔ مسز گاندھی مایوس ہو گئی تھی۔ اس کا موقف کمزور ہو گیا جب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس ورما نے اسے انتخابی بے قاعدگیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے نااہل (ڈس کوالیفائی) قرار دے دیا۔ مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ آئین کو معطل کر دے' حزب مخالف کے ارکان کو گرفتار کر لے اور پریس پر دباؤ ڈالے۔

میں اس وقت میکسیکو میں تھا اور ہنگامی حالت کے اعلان کی اگلی صبح بمبئی واپس پہنچا۔ میں تشویش زدہ تھا۔ میں ''ٹائمز آف انڈیا'' گروپ کے ان ارکان میں تھا جنھوں نے عزم کیا کہ وہ اپنے اوپر سنسر شپ کے نفاذ کو نہیں مانتے۔ جن لوگوں نے احتجاج کرنے سے انکار کر دیا ان میں ''ٹائمز آف انڈیا'' کا مدیر شام لال شامل تھا' جن لوگوں نے کسی کے ساتھ کوئی وابستگی ظاہر نہیں کی ان میں اندر ملہوترا شامل تھا۔ اس شام ''ٹائمز آف انڈیا'' کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ایک رکن اور مسز گاندھی کے ایک بااعتماد آدمی میرے دوست رجنی پٹیل نے مجھے فون کیا اور واضح طور پر بتایا: ''میرے دوست اگر تم جیل جا کر شہید ہونا چاہتے ہو تو ہم تمہاری حوصلہ افزائی کر کے خوش ہوں گے۔'' بورڈ کے چیئرمین جسٹس کے۔ ٹی۔ ڈیسائی نے تحمل کا مشورہ دیا: ''Take your time تاہم اگر تم نے شائع کرنے سے انکار کیا تو ہمیں کسی اور مدیر کو ڈھونڈنا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ہنگامی حالت کی طرف میرا رویہ دورخا تھا۔ میں نے قانون شکنوں (بشمول جے پرکاش نارائن) کو گرفتار کرنے کی کارروائی کی حمایت کی تھی تاہم محسوس کیا تھا کہ پریس پر سنسر شپ برعکس نتائج کو جنم دے گی کیونکہ یہ مسز گاندھی کی حمایت کرنے والے میرے جیسے مدیروں کو اعتماد سے محروم کر دے گی۔ تین ہفتے میں نے ''ویکلی'' کو شائع نہیں کیا اور جب اشاعت دوبارہ شروع کرنے پر مجبور کیا گیا تو میں نے ہدایت دی کہ مسز گاندھی یا اس

کے وزیروں کی تصویریں استعمال نہیں کی جائیں۔ مجھ سے نرمی برتی گئی کیونکہ مجھے مسز گاندھی اور سنجے کا دوست تصور کیا جاتا تھا۔ مجھے مسز گاندھی سے ملاقات کے لیے دہلی بلوایا گیا۔ میں نے اپنے جیسے لوگوں پر سنسرشپ کے نفاذ کے خلاف احتجاج کیا۔ میں نے اپنی بات کہہ دی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے اسے بتایا: ''میری بیوی کو یقین ہے کہ اگر میں نے اپنی سوچ بیان کردی تو آپ مجھے جیل بھجوادیں گی۔'' وہ مسکرادی اور مجھے الوداع کہا۔ ''ویکلی'' کو خصوصی معاملے کے طور پر لیا گیا تھا۔ میں ہنگامی حالت کے ناقدوں کے مضامین شائع کرتا اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مقدمہ لڑتا تھا۔

مسز گاندھی سے میری ملاقات خفیہ تھی۔ میں بمبئی واپس پہنچا تو میری میز پر ایک خط پڑا تھا' لکھا تھا: ''میڈم ڈکیٹر سے تمہاری ملاقات کیسی رہی؟ جارج'' یہ جارج فرنانڈس کی طرف سے تھا جو اس وقت زیرِ زمین تھا۔ چند دن بعد آر۔ایس۔ایس کے چار سینئر رکن' جن کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے' سکون کے ساتھ میرے دفتر میں آئے' میرے ساتھ کافی پی اور مجھ سے پوچھا کہ وزیراعظم کے ساتھ میری میٹنگ میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے تاثر حاصل کیا کہ آر۔ایس۔ایس ہنگامی حالت کے خلاف نہیں تھی اور اگر اس کے لیڈروں کو آزادی دے دی جائے تو وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لیے راضی ہے۔

چند ہفتے تو ''ویکلی'' کا ہر مضمون سنسر سے کلیئر کروانا پڑا۔ انہیں صرف سیاست کا تردد تھا اور وہ میرے رسالے میں بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ''پلے بوائے'' کے ہندوستانی چربے ''ڈیبونائر'' کے مدیر نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی اپنا مواد کلیئرنس کے لیے لے کر گیا' سنسر افسر یہ کہتے ہوئے کہانیوں اور لڑکیوں کی تصویروں سے گزر گیا: ''فحاشی ٹھیک ہے' سیاست نہیں۔''

ہنگامی حالت نے اقتدار میں موجود لوگوں میں ایک قسم کی غیر ذمہ دارانہ نخوت پیدا کر دی تھی' جو میرے دہلی سے واپس آنے کے چند دنوں بعد مجھ پر عیاں ہوئی۔ صدر فخرالدین علی احمد کے اعزاز میں گورنر یاور جنگ بہادر نے راج بھون میں لنچ کا اہتمام کیا۔ صدر نے ہنگامی حالت پر کچھ تنقیدی مضامین پڑھے تھے' اس نے (غلط طور پر) فرض کرتے ہوئے کہ وہ ''السٹرٹیڈ ویکلی'' تھا مجھ سے مذاقیہ لہجے میں پوچھا: ''تم کہاں پہنچے ہوئے ہو؟ کیا کسی نے تمہیں بتایا؟'' مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ کس حوالے سے بات کر رہا ہے' میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ نہ ہی صدر کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ ایس۔بی چاون کو پتا تھا۔ حقائق کا پتا لگائے بغیر اس نے ''ویکلی'' کے خلاف اقدامات کا حکم دے دیا۔ جب میں واپس آیا تو مجھے ہر مضمون اور تصویر کو شائع ہونے سے بہت پہلے سنسر کو بھجوانے کے احکامات تھما دیئے گئے۔ میں نے مسز گاندھی کو فون کیا اور اس کے پریس کے مشیر شاردا پرشاد

کو لائن پر پایا۔ مسز گاندھی نے اسی شام ماسکو روانہ ہونا تھا۔ شاردا پر سادا شتعال انگیز مضمون کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ وہ ''فیمینا'' میں شائع ہوا تھا۔ صدر نے اتفاق کیا کہ انہوں نے مذاق کیا تھا' چاون کو ''السٹرٹیڈ ویکلی'' کے خلاف احکامات واپس لینے کا کہا گیا اور اسے آرڈر جاری کرنے کے دو گھنٹے کے اندر اندر واپس لینا پڑا۔

بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہیں گاندھی خاندان کے افراد نے محض ضرر پہنچانے کی نیت سے جیل میں بند کروا دیا تھا۔ ایک تھی پرمیلا (رِکنا) لیوس' ہمارے قریبی دوستوں ولبرن اور اوشالال کی بیٹی۔ اس کی شادی ایک انگریز چارلس لیوس سے ہوئی تھی' جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں کام کرتا تھا۔ ان کا ایک بہت کم عمر بیٹا تھا۔ کنا نے دہلی کے اردگرد بستیوں میں زرعی مزدوروں کو منظم کیا تھا جبکہ مسز گاندھی کا چھترپور کے نزدیک ایک بستی میں فارم ہاؤس تھا۔ کنا جیل میں رکھے جانے اور خاندان سے الگ رہنے سے تھک گئی تھی۔ اس کی بہن اور ماں میرے پاس آئیں کہ میں مسز گاندھی پر اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر اسے آزادی دلوا دوں۔ رِکنا ایک تحریری معافی نامہ لکھ کر دینے پر راضی تھی۔ میں اپنے کنگز کالج لندن کے زمانے کے ہم جماعت لیفٹیننٹ گورنر کشن چند سے ملنے دہلی گیا اس نے معاملے کو حل کرنے کا وعدہ کیا اور مجھے یقین دہانی کرائی کہ وہ رِکنا کی رہائی کا بندوبست کر لے گا۔ مسز گاندھی نے نرمی برتنے سے انکار کر دیا۔ بیچاری لڑکی نے ہنگامی حالت کا ڈیڑھ برس زندان میں گزارا۔ بعد میں اس نے اس تجربے کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ اس نے اپنے آپ کو ہیروئن کے طور پر پیش کیا تھا' یہ اعتراف کیے بغیر کہ اس کی قوت ارادی بکھر چکی تھی اور وہ معافی مانگنے پر رضامند تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی گائتری دیوی' جے پور کی راج ماتا اور بہت سے دوسروں کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ دھرے جانے والے مکمل طور پر بے گناہوں کے درمیان پنجاب کا سابق وزیر اعلیٰ بھیم سین سچار بھی تھا' جو اس وقت ستر کے پیٹے میں تھا۔ مسز گاندھی میں رحم وترس بالکل نہیں تھا۔ ہنگامی حالت کے اختیارات نے سول ملازمین کو سر پھرا بنا دیا تھا: وہ درشت اور جابر ہو گئے تھے۔ دیگر ایسے بھی تھے' جو ناخوشی کے ساتھ' خود کو ملنے والے احکامات پر بغیر احتجاج کیے پیروی کرتے تھے۔ میرا دوست کشن چند انہیں میں سے ایک تھا۔ ہنگامی حالت اٹھائے جانے کے بعد اختیارات کے غلط استعمال کے خلاف تحقیقات شروع ہوئیں تو کشن چند دباؤ برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے اردو میں ایک مختصر نوٹ لکھا: ذلت سے موت اچھی ہے ـــ اور ایک کنویں میں کود گیا۔

☆☆☆

ایک مقبول عام ہفتہ وار کا مدیر ہونے کی وجہ سے فلمی صنعت میں میری بہت مانگ

تھی۔ میں نہ کبھی زیادہ فلم جانے والا تھا' نہ ہوں اور جو تھوڑی بہت ہندی فلمیں میں نے دیکھی تھیں وہ مجھ میں اداکاروں' ہدایت کاروں' پروڈیوسروں' موسیقاروں یا پس پردہ گلوکاروں کی کوئی تکریم پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ میرے لاہور کے کچھ دوستوں نے اچھا کام کیا تھا: بلراج ساہنی' اوما کیشیپ (کامنی کوشیل) اور دیو آنند اونچے درجے کے اداکار تھے' بی۔ آر۔ چوپڑا چوٹی کے پروڈیوسروں' ہدایت کاروں میں شامل تھا' چیتن آنند کے کھاتے میں کئی فلاپ فلمیں تھیں۔ نئے اداکاروں' ہدایت کاروں اور گانے والوں کی پوری کھیپ سامنے آ چکی تھی۔ میں نے ان کی تصویریں ''فلم فیئر'' اور ''سٹار ڈسٹ'' جیسے فلمی رسالوں میں دیکھی تھیں۔

فلم میں میری دلچسپی کو دیویانی چوپال نے فزوں تر کر دیا تھا' جو نالنی کی چھوٹی بہن تھی جس نے لندن میں میرے ساتھ مختصر عرصہ کام کیا تھا۔ میں نے فلمی ستاروں کی نجی زندگی پر دیویانی کے ہندوستانی انگریزی (ہنگلش) میں جس سے میں لطف اندوز ہوتا تھا' لکھے ہوئے کٹیلے مضامین پڑھے تھے۔ ایک لنچ پر ہماری ملاقات نے ہمیں احساس دلایا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں۔ وہ مجھ سے دو انچ لمبی عورت تھی اور کافی جسیم تھی۔ بایں ہمہ وہ دلکش تھی مع اپنی سیاہ پلکوں کے جو تلوار کے مانند اوپر کو خم کھائے ہوئے تھیں۔ اس کی آواز بھاری مردانہ تھی۔ وہ حیرت ناک نقاد تھی۔ وہ فلمی ستاروں کے بارے میں جو کچھ لکھتی تھی اس کی وجہ سے ان کے ساتھ اس کے تعلقات اکثر خراب ہی رہتے تھے۔

ایک مرتبہ دیویانی نے دھرمیندر کا خاکہ لکھا' تب وہ فلمی دنیا میں چوٹی پر تھا۔ اس نے اس کی تصویر کشی ایک نسل کش چیمپئن کے طور پر کی تھی جو ایک دن میں تین تین چار چار عورتوں کی خدمت کر سکتا تھا۔ دھرمیندر بال بچوں والا تھا۔ اس کی معشوقہ تھی ـــــ ہیما مالنی' جو اس کی دوسری بیوی اور دو بچوں کی ماں بنی۔ ان دو کے علاوہ' دیویانی نے الزام لگایا کہ اگر اس کے ساتھ اداکاری کرنے والی چھوٹی اداکارائیں بھی جنس کی شائق ہوں تو وہ ان کا شوق بھی پورا کر سکتا تھا۔ دھرمیندر مشتعل تھا۔ اس نے ریس کورس کے نزدیک کہیں اسے راستے میں پکڑ لیا۔ دیویانی نے بھاگنے کی کوشش کی مگر اپنے جسم اور ساری کی وجہ سے زیادہ دور نہیں بھاگ سکی۔ مجھے یقینی طور پر نہیں پتا کہ دھرمیندر نے اسے مارا یا نہیں تاہم اس نے اس کے خلاف حملہ کرنے اور مارنے کی شکایت درج کروا دی۔ اگلی صبح کے اخبارات نے صفحات اول پر اس واقعے کی خبروں کو شائع کیا۔ دیویانی کے لیے اپنی اُنسیت کے باوجود میں نے اپنے کالم میں لکھا کہ دھرمیندر نے اس کے ساتھ جو کیا اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو وہی کچھ کرتا۔ پولیس نے دیویانی کی شکایت پر کوئی توجہ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ دھرمیندر میرے پاس اسے ایک پولیس کیس سے بچا لینے پر شکریہ ادا کرنے آیا۔ جب دیویانی میرے دفتر آئی تو اس نے مجھے اپنی تحقیر کرنے پر گالیاں

دیں تاہم اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

چند ماہ بعد دیویانی ایک اور تنازعے میں پھنسی ہوئی تھی' اس مرتبہ ایک اداکار کے ساتھ جو تیزی سے زوال پذیر تھا۔ اس کی جنسی آوارگیوں کے علاوہ اس نے اس کی اداکاری کی صلاحیتوں پر بھی تہمتیں لگائی تھیں۔ وہ جوہو میں ہوٹل سن این سینڈز میں ایک فلمی پارٹی میں شریک تھی۔ مہمانوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے وہ ایک منڈیر پر بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اداکار کے دو بیٹے' دونوں ہی بہت زیادہ شراب پیے ہوئے اس کی بے خبری میں اس کی طرف بڑھے۔ ''کتیا! تم نے ہمارے باپ کے بارے میں ایسی گندی باتیں لکھنے کی جرأت کیسے کی؟'' وہ چلائے ''اب اسے لو۔'' ایک نے بیئر کی بوتل کا مواد اس کے سر پر انڈیلتے ہوئے کہا۔ وہ مدد کے لیے چلائی: ''بچاؤ'' کسی مہمان نے اسے بچانے میں عزت نہیں سمجھی: وہ اس کی مصیبت زدگی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لڑکوں نے اس کے سر پر بیئر کی دوسری بوتل خالی کر دی اور صاف صاف لفظوں میں اسے بتا دیا کہ اگر اس نے ایسی چیزیں دوبارہ لکھیں تو وہ اس کے ساتھ کیا کریں گے۔ دیویانی نے مشکل سے جیسے تیسے نجات حاصل کی اور پولیس سٹیشن میں شکایت درج کروا دی۔ اگلی صبح وہ دفتر میں اپنے ڈراؤنے خواب جیسے تجربے کے بارے میں بتانے آئی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے تاہم مجھے یقین سے علم نہیں تھا کہ وہ خود کو دی جانے والی دھمکیوں پر حقیقتاً پریشان تھی یا پھر وہ ان کے پورا ہونے کی منتظر تھی۔ ''تمہیں پتا ہے انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ زنا کریں گے جب تک تمہارا حلیہ نہیں بگڑ جاتا' ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ لواطت کریں گے کہ تمہارے چوتڑ زخم زخم ہو جائیں گے۔'' آنسو بہاتے ہوئے اس نے ان کے الفاظ ان کے کیے ہوئے اشاروں کے ساتھ یوں سنائے گویا تجربے کا مزا لے رہی ہو۔

دیویانی مجھے راج کپور کے نجی سنیما میں ''ستیم' شوم' سندرم'' کے افتتاحی مناظر دکھانے کے لیے لے گئی۔ میں نے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ کے اوپر رہنے والے سندھی خاندان کے افراد شیلا' اس کی بیٹی جیوتی اور ان کی گھریلو ملازمہ فاطمہ کو لیا' وہ سب عظیم اداکار سے ملنے کے شائق تھے۔ زینت امان بھی موجود تھی۔ میں راج کپور اور زینت امان کے درمیان بیٹھا تھا۔ دیویانی میرے مہمانوں کے ساتھ پچھلی صف میں بیٹھی تھی۔ ہم نے دیکھا زینت امان ایک دیہاتی تالاب سے باہر نکل رہی تھی' اس کی ساڑی گیلی ہو کر اس کے بدن سے چمٹی ہوئی تھی اور اس کے تراشیدہ پستان جھلک رہے تھے۔ ''میں چھاتیوں کو پسند کرتا ہوں'' راج نے جوش کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''کیا تم نہیں کرتے ہو؟'' میں نے اتفاق کیا کہ خوبصورت چھاتیاں اپنی ہی خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں۔ ''تمہاری لال پری کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

اس کا اشارہ شیلا کی طرف تھا جس نے ایک تیز سرخ ساڑی باندھی ہوئی تھی۔ اس نے سمجھا کہ وہ میری معشوقہ ہے۔

''مجھے اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بتا دو'' اس نے اصرار کیا۔ ''وہ مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ مگر کوئی نہیں بتا سکتا کہ حقیقتاً چولی کے پیچھے کیا ہے' کیا کوئی بتا سکتا ہے؟''

☆☆☆

ایک مرتبہ رفیق زکریا مجھے ایک موسیقی کی محفل میں لے گیا۔ ہم تھوڑی دیر سے پہنچے تھے۔ اس نے پہلی صف میں اپنے لیے مخصوص نشست مجھے دی اور کہا: ''تم اس سے باتیں کرو۔'' اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے مجھے مسکراہٹ سے نوازا۔ حقیقتاً وہ ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت عورت تھی تاہم میں اس کے ساتھ زیادہ کھل نہیں سکا۔ جب روشنیاں بجھا دی گئیں تو میں نے اس کے کہا کہ ہمارا تعارف تو ہوا نہیں ہے۔ ''میں مینا کماری ہوں'' اس نے جواب دیا۔ نام نے مدہم سی گھنٹی تو بجائی مگر مجھے کچھ مزید یاد نہیں دلا سکا۔ ''آپ کیا کام کرتی ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔ فقط اپنی سگریٹ سلگائی اور دوسری طرف بیٹھے شخص سے بات کرنے کے لیے رخ ادھر کر لیا۔ مینا کماری اس وقت ہندی سکرین کی سب سے زیادہ مشہور اداکارہ تھی۔

نرگس دت کے ساتھ تعارف ''فیمینا'' کے مدیر گلشن ایونگ کے ذریعے ہوا۔ میں اسے ''مدر انڈیا'' میں سٹار رول اور کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ گلشن نے مجھے بتایا تھا کہ نرگس مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ دت بہت اچھا کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ فلموں سے ریٹائر ہو چکی تھی' اس نے ہنوز آزادانہ طور پر اپنے نام کو بنانا تھا۔ ان کے دو بچے سناور سکول میں تھے' جو کسولی میں میرے کاٹیج سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جب نرگس ''ٹائمز آف انڈیا'' بلڈنگ میں پہنچی تو ہر کسی نے اسے پہچان لیا۔ میری اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ بہت لجاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا کیا وہ میرے کاٹیج میں اکتوبر میں سناور کو قائم کرنے والوں کے ہفتے کے دوران میں قیام کر سکتی ہے۔ ''صرف ایک شرط پر'' میں نے اسے کہا۔ وہ قدرے پریشان سی دکھائی دی۔ ''میری شرط یہ ہے کہ نرگس میرے بستر میں سوئے۔'' وہ قہقہے لگانے لگی۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہمیں ایک ہی زمانے میں راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ نشستیں دی گئی تھیں۔ جب کبھی کوئی ہمیں متعارف کروانے کی کوشش کرتا وہ کہا کرتی: ''ہمارا تعارف مت کروائیے' میں ان کے بستر میں سو چکی ہوں۔''

میں پروین بابی سے دیو آنند کی دی گئی ایک پارٹی میں ملا۔ میں عموماً کاک ٹیل پارٹیوں میں خاموش گوشوں میں خود دو جام پیتا اور بغیر بتائے کھسک لیتا تھا۔ اس شام پروین آئی اور میری کرسی کے نزدیک قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کے خوبصورت بال کتنے لمبے تھے! اور کیا سحر انگیز آنکھیں تھیں! میں نے جتنی زیادہ ممکن تھا خوشامد کی۔ میں آدھی رات کے بعد پارٹی سے چلا آیا اور زیادہ ٹھہرنا چاہتا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ صبح سویرے دہلی کی پرواز پکڑنا تھی۔ میں نے بہت تھوڑی نیند لی اور پرواز سے مطلوبہ ایک گھنٹے پہلے ہی سانتا کروز ایئر پورٹ پر پہنچ گیا۔ میں چند رسالے خریدنے کتابوں کی دکان پر گیا۔ ایک نوجوان عورت جو خاصی جانی پہچانی لگتی تھی مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں اس تک گیا: ''مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے کہیں مل چکے ہیں۔'' میں نے اسے کہا۔ ''مت بتاؤ کہ تم مجھے پہچانتے نہیں ہو! ابھی چند ہی گھنٹے پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ تم نے میرے جیسی حسین کوئی عورت نہیں دیکھی! میں پروین بابی ہوں!'' اس نے مجھے معاف کر دیا بلکہ دہلی میں اس نے مجھے اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت بھی دی۔

فلموں میں خود میری قریب ترین شرکت آئیوری مرچنٹ کی ایک پیشکش تھی کہ میرے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' کو فلمایا جائے۔ انہوں نے ظفر حئی سے اس کی ہدایت کاری کا کہا۔ ایک معروف اردو ادیب کا مکالمے لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کئی شامیں میری سکاچ پیتے ہوئے اسے پنجابی الفاظ سمجھانے میں مدد دینے کے بعد اس نے یہ کام انجام دیا۔ ششی کپور فلم کے لیے پیسہ دینے اور مردانہ مرکزی کردار ادا کرنے پر راضی ہو گیا۔ میں شبانہ اعظمی سے بھی ملا جسے میں ہندی سکرین کی بہترین اداکارہ تصور کرتا تھا' اسے ہیروئن کا کردار ادا کرنا تھا۔ چھ ماہ بعد دوسروں کی طرف سے میری گیلنوں سکاچ پی لینے پر ایک لفظ بھی معذرت کا ادا کیے بغیر اس منصوبے کو ترک کر دیا گیا۔

میں جن بہت سی فلمی شخصیتوں سے ملا ان میں سب سے زیادہ رنگین مزاحیہ اداکار آئی۔ ایس۔ جوہر تھا۔ میں پہلے اس کے بارے میں ایک اداکار سے زیادہ کی حیثیت سے رائے نہیں رکھتا تھا اور ابتدا میں تو پبلسٹی حاصل کرنے کی اس کی خام کوششوں سے بجھ سا گیا تھا۔ جونہی اس کا اداکاری کا کیریئر زوال پذیر ہوا اس کی خود کو خبروں میں رکھنے کی کوششیں فزوں ہو گئیں۔ میں نے ''السٹریٹڈ ویکلی'' میں اس کے چند ایک مضامین شائع کر دیئے۔ میڈیا کو کوئی مزید دلچسپ فروخت کرنے کے لیے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس نے پروتیما بھاٹیہ سے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا۔ دونوں شادی شدہ تھے اور بالغ بچوں کے حامل تھے۔ پروتیما نے کبیر بیدی کو طلاق دے دی ہوئی تھی اور ہندوستان کے بیشتر رسالوں کو جو ہو بیچ پر اپنی عریاں تصویریں فراہم کر چکی تھی۔ اس کا بدن خوبصورت تھا۔ جوہر نے راما سے شادی کی تھی جس سے

اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ راما نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے طلاق لیے بغیر اپنے دہلی میں موجود کزن ہرہنس سے شادی کر لی ــــ لہٰذا اس کا نام تھا راما ہنس۔ وہ بمبئی میں جوہر کے پاس آئی۔ وہ میری جاننے والی واحد خاتون تھی جس کے دو زندہ شوہر تھے اور وہ ایک سے زیادہ شوہروں کے ساتھ خوش تھی۔ وہ جوہر کے ساتھ نہیں رہتی تھی لیکن اکثر اس کے ساتھ ڈنر کرنے جاتی تھی اور ہفتے میں ایک مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ جوہر برج کا ماہر کھلاڑی تھا۔ اپنے لوٹس کورٹ والے اپارٹمنٹ سے راما اسے کرکٹ کلب آف انڈیا (سی سی آئی) ہمارے پہنچنے کا فون کر دیتی اور کلب کو چینی کھانے کا آرڈر دے دیتی۔ جب ہم اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوتے تھے تو میں اس کے ننھے سے مڑی ہوئی ناک والے پھینو نامی پیکی کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ راما اپنی میٹریس کو دراز سے اٹھاتی (وہ فرش پر سویا کرتی تھی) اور بہت مختصر لباس پہنے ہوئے نوجوان عورتوں کی تصویریں دکھاتی تھی جو فلموں میں آنے کے لیے جوہر کی مدد چاہتی تھیں۔ جب وہ آتا تو وہ اپنی بہترین سکاچ نکالتا وہ بہت تھوڑی پیتا تھا' راما تارک منشیات تھی۔

جوہر زبردست قصہ گو تھا' بشمول اس کی جنسی زندگی سے جڑی ہوئی کہانیوں کے۔ میں کبھی پر یقین نہیں ہو سکا کہ اپنے ماضی کے حوالے سے وہ جو کچھ مجھے بتاتا تھا اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا کچھ اس نے میری دلچسپی قائم رکھنے کے لیے گھڑ لیا تھا۔ بمبئی سے آنے کے بعد میں نے جوہر کی کوئی شے نہیں دیکھی۔ میں نے اسے کبھی اداکار یا فلموں کے پروڈیوسر کی حیثیت سے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مجھے اس کا تحریر کردہ اور دہلی میں کھیلا جانے والا ڈرامہ ''بھٹو'' دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ یہ بہت اچھا سوچا گیا ڈرامہ تھا آسکر وائلڈ کی سی حاضر جوابی کے ساتھ۔ سہیل سیٹھ نے ''بھٹو'' کا کردار بہت شاندار طریقے سے ادا کیا تھا۔ میری تمنا تھی جوہر اسے دیکھتا۔ اس وقت وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

میں بمبئی میں تھا جب میرا باپ دہلی میں فوت ہو گیا۔ میرے والدین کے ساتھ میرے تعلقات ویسے تھے جیسے روایتی ہندوستانی خاندانوں میں ہوتے ہیں۔ ادب واحترام کے روایتی اصول نبھائے جاتے تھے' تاہم اعتماد نہیں ہوتا تھا۔ چار بیٹوں میں سے کوئی اس کا پسندیدہ نہیں تھا۔ شاید میں اس کا قریب ترین بیٹا تھا لیکن میں نے اس کی مجھ سے وابستہ روایتی کامیابی کی امیدوں کو پورا نہیں کر کے اسے مایوس کیا تھا۔ بیشتر باپوں کے مانند وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتا تھا جسے وہ تحفوں سے نوازتا اور جس کے لیے اس نے اپنے بیٹوں کے لیے چھوڑے گئے حصوں سے بہت بڑی جائیداد چھوڑی تھی۔ میری ماں امتیازی طور پر اپنے

سب سے چھوٹے بیٹے دلجیت کو چاہتی تھی۔ میرے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائیوں میں ایک تلخ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ میری ماں نے میرے سب سے بڑے بھائی کی بیوی کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اور واضح طور پر دلجیت کی حمایت کرتی تھی۔ میں جائیداد کی تقسیم پر اپنے بھائیوں میں پھوٹ پڑنے اور ایک دوسرے کو عدالت میں کھینچنے سے غیر آگاہ تھا۔ یہاں تک کہ میرے باپ نے مجھے لکھا اور آنے کا کہا۔ میں ان معاملات کو جان کر' جن پر وہ جھگڑ رہے تھے بہت دکھی ہوا۔ میرا چچا اجل سنگھ دونوں کے درمیان مصالحت کی کوششوں میں ناکام ہو گیا تھا۔ میں نے یہ ناخوش گوار ذمہ داری سنبھالی۔ جب سطح پر موجود جواز کے تحت دلجیت زیادہ فرمانبردار دکھائی دے رہا تھا تو اس نے مشترکہ سوسائٹی میں میرے ساتھ کیے گئے تحریری حلف کو توڑ دیا جبکہ اس کا بڑا بھائی باہر گیا ہوا تھا۔ میں اپنے والدین کی موجودگی میں اس سے لڑا اور غصے کے عالم میں اسے دغاباز کہا۔ وہ رونے لگا اس نے ماں کی قسم کھائی۔۔۔ وہ ہمیشہ اس کی قسم کھایا کرتا تھا۔۔۔ کہ دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔ میں نے اس اجلاس کی کارروائی کا خلاصہ پھاڑ دیا جس میں اسے کاروبار کا انتظام سونپا گیا تھا اور دونوں کے درمیان باہمی طور پر قابل قبول تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے والدین کے درمیان تعلقات برسوں میں ہونے والی سمندر کی تبدیلیوں کی طرح تھے۔ برسوں تک وہ مضبوط ہاتھوں سے قانون پر عمل کرواتا رہا۔ جب وہ زیادہ بوڑھا ہوا اور اونچا سننے لگا تو اپنی بیوی پر اس کا انحصار بڑھ گیا۔ وہ اسے لوگوں کو جو کچھ انہوں نے کہا ہو اسے دہرانے کا کہتا۔۔۔ ہیں؟ کیا کہا؟۔۔۔ کے جملوں پر اور بے ڈھب ہونے پر مطعون کرنے لگی۔ کھانے کے دوران وہ کھانا اپنی ٹائی اور کوٹ پر گرا دیتا تھا۔ وہ جلد ہی غصے میں آجاتا تھا مگر جلد ہی ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ جب بھی میں اسے ملتا وہ مجھے اخبارات پڑھ کر سنانے کا کہتا اور حالات و واقعات پر میری رائے سنتا۔ وہ کبھی ورزش نہیں کرتا تھا: لان میں ٹہل قدمی کرنے ہی کو وہ خود کو چست رکھنے کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ وہ کھانے کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ وہ کارن فلیکس' انڈوں' سموسوں' توس اور شہد اور چائے پر مشتمل بھاری ناشتہ کرتا تھا۔ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے جن کے دو جام پیا کرتا تھا۔ سہ پہر کی چائے کے ساتھ وہ کیک' بسکٹ یا ہندوستانی مٹھائیاں کھایا کرتا تھا۔ وہ رات کے کھانے سے پہلے دو یا تین جام سکاچ کے پیا کرتا تھا اور اس کے بعد اکثر برانڈی پیتا تھا۔ ڈنر کم از کم چار یا پانچ کھانوں پر مشتمل ہوتا تھا: سوپ' مچھلی' گوشت' سبزی اور پڈنگ۔ جب وہ سفر کرتا تو پلیٹ فارموں پر دستیاب ہر شے کھاتا تھا۔ کار کے ذریعے مشوبرا آتے ہوئے اس نے کالکا سے چار میل آگے ایک ڈھابے پر اچار چکھے اور جبلی میں پیڑے کھائے۔ اس کا وزن کبھی نہیں بڑھا اور وہ آخر تک دبلا پتلا ہی رہا۔ وہ

گولیاں کھانے میں بھی ایک زبردست شخص تھا—— بھوک بڑھانے کے لیے' جو کچھ اس نے کھایا ہے اسے ہضم کرنے کے لیے۔ اس کے کئی آپریشن ہو چکے تھے—— گردے کی پتھریوں کے لیے' موتیا بند کے لیے' بواسیر کے مسوں کے لیے اور ہرنیا کے لیے۔ جو چیز وہ کبھی ضائع نہیں کرتا تھا وہ تھی اس کی نیند۔ جونہی وہ سر کو تکیے پر رکھتا تھا اسے نیند آ جاتی تھی۔ ہر چیز سے بڑھ کر یہ اس کی گہری نیند تھی جس نے اسے نوے برس تک زندہ و برقرار رکھا۔

اسے بوڑھا اور ضعیف دیکھنا اداس کر دیتا تھا۔ میں ہر پندرھواڑے دہلی آتا اور اس کے ساتھ صبح کے وقت ایک گھنٹہ گزارتا یا اس کے ساتھ شام کو اپنی سکاچ پیتا یا اسے اپنے ساتھ ڈنر کے لیے لے جاتا—— آخری مرتبہ جب میں نے اسے جیتا جاگتا دیکھا' وہ ہمیشہ سے زیادہ کمزور دکھائی دے رہا تھا اور واضح طور پر آگاہ تھا کہ وہ زیادہ دن نہیں جئے گا۔ جب میں نے رخصت لی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگلی مرتبہ میرا دہلی کب آنا ہوگا۔ میں نے اسے کہا کہ میں پندرہ دن بعد آؤں گا۔ ''پندرہ دن؟'' اس نے کہا اور مزید کچھ نہیں بولا۔

ایک ہفتے بعد میری بیوی نے مجھے فون کیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے اور وہ اسے ملنے جا رہی ہے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے دوبارہ فون کر کے بتایا کہ وہ کافی بہتر ہے اور وہ اس کے ساتھ ایک جام پی چکی ہے۔ میری ماں اور بہن اس کے ساتھ تھیں۔ چند منٹ بعد اس نے مجھے یہ بتانے کے لیے تیسرا فون کیا کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ وہ 18 اپریل 1978ء کو 8:30 بجے کا وقت تھا۔

میں سن ہو کر رہ گیا۔ بہت دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا' نہیں جانتا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ پھر میں نے زکریا کے ہاں فون کیا اور فاطمہ سے پوچھا کہ کیا وہ راہول کو بتا سکتی ہے اور مجھے دہلی کے لیے صبح سویرے کی پرواز پر روانہ کر سکتی ہے۔ اس نے بحران میں مجھے کبھی ناکامی نہیں ہونے دیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں مجھے ملنے آ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں تاکہ میں کچھ دیر سو سکوں۔

میں اس رات سو نہیں پایا۔ مجھے اپنے باپ کی زندگی کے حالات و واقعات یاد آتے رہے۔ وہ ایک خودساز (سیلف میڈ) شخص تھا' ایک فیاض باپ جسے میں مشکل ہی سے ایک انسانی ناکامیاں رکھنے والے شخص کے طور پر جانتا تھا۔ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہ اس کی مستقل مدد نہ رہی ہوتی تو میں کبھی ایک کتاب بھی لکھنے کا اہل نہ ہو پاتا۔

کسی زمانے میں نئی دہلی کا سب سے بڑا عمارت ساز ہونے کی وجہ سے اس کی موت کی خبر نے تمام روزنامہ اخباروں کے صفحہ اول پر جگہ پائی۔ برقی چتا سوز میں اس کی چتا جلانے پر بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اور اس کی آخری رسومات کی تقریب میں

سجان سنگھ پارک کا سارا لان اس سے بھی بڑی تعداد میں آنے والے لوگوں سے بھر گیا تھا۔
میرے باپ نے موت کو چہرے پر مسکراہٹ سے زیادہ بہتر طریقے سے برتا' اس کے ہاتھ میں بستر مرگ پر لیٹنے سے چند منٹ پہلے سکاچ کا ایک گلاس تھا۔

☆☆☆

جب میں بمبئی میں تھا تو میں خود سے سوال کرنے پر مجبور تھا کہ میں کتنا ایک سکھ ہوں؟ میں مذہبی عقیدے اور رسومات کو مسترد کر چکا تھا۔ میں نے خالصہ عقیدے کی خارجی علامتیں یعنی سر کے بالوں اور ڈاڑھی کو تراشے بغیر رہنے دیا تھا۔ میں نے دوسرے کافوں کے بارے میں تردد نہیں کیا تھا مثلاً کبا (لوہے کا کڑا)' کنگھا' کچھا اور کرپان۔ نہ کبھی میں نے سوچا تھا کہ کھانا اور پینا کسی شخص کے مذہبی اعتقادات کے تحت ہوسکتا ہے یا ہونا چاہیے۔ خالصہ روایت کے برعکس میں حلال نیز بڑا گوشت بھی کھاتا تھا۔ میں نے اپنے سکاچ کے نشے کو کبھی راز نہیں رکھا تھا۔ میں نے دیگر روایت کی ممنوع شدہ چیزوں کو بھی آزمایا تھا۔ مثلاً تمبا کونوشی اور تمبا کو والا پان کھانا۔ میں نے انہیں مذہبی جذبے کے تازہ ہونے کی وجہ سے ترک نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے ترک کیا تھا کہ جو کام میں کھل کر نہیں کرسکتا وہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔
سکھ مذہب اور تاریخ پر میری کتابوں نے مجھے سکھ کمیونٹی کے لیے قابل قبول بنا دیا تھا۔ وہ میرے ان اعلانات کو کہ میں ایک دہریہ ہوں سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ جب کبھی میں گیا انہوں نے مجھے گردواروں میں مذہبی اجتماعوں سے خطاب کی دعوت دی اور سروپے پیش کیے: ایک چھوٹی' زعفرانی رنگ کی نچلی پگڑی اور ایک کرپان۔ میں اس اعتراف پر ممنون تھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک میں ایک خالصہ کی وضع قطع برقرار رکھوں گا خالصہ مجھے اپنے میں سے ایک تسلیم کرتا رہے گا اور جس ستائش کا وہ مجھے مستحق سمجھیں گے' مجھے دیتے رہیں گے۔ اگر میں نے اسے ترک کر دیا تو وہ بھی مجھے ترک کر دیں گے۔ اس بات نے میرے اندر سکھ کمیونٹی سے تعلق کا احساس پیدا کیا۔ میں تجربے سے جانتا تھا کہ جو سکھ اپنے سر کے بال اور ڈاڑھی منڈوا دیتے ہیں انہیں ذات باہر تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ گردواروں میں کتنی زیادہ عبادت کرتے ہیں' کتنے بھاری لوہے کے کڑے وہ پہنتے ہیں اور کتنی جارحیت سے وہ اپنے سکھ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' سکھ انہیں اپنے میں سے ایک نہیں مانتے۔
میں نے جتنا ہوسکتا تھا تعلق کے اس احساس کو پروان چڑھایا۔ گرو گوبند سنگھ کی پیدائش کی تین سو سالہ تقریبات پر تین سکھ عالموں کو بیرونی ممالک میں سکھ مت پر لیکچر دینے کے لیے چنا گیا تھا۔ چونکہ کپور سنگھ اور گوپال سنگھ ڈارڈی مجھ سے زیادہ رسوخ کے حامل تھے انہوں نے امریکہ کینیڈا اور یورپ کا انتخاب کر لیا' میرے لیے جرمنی' فرانس اور انگلینڈ رہ گئے

تھے۔ ہم سب کو ہمارے اخراجات کے لیے پیسہ مہیا کر دیا گیا تھا۔ جرمنی اور فرانس میں میرے جلسوں میں بہت کم سامعین شریک ہوئے تھے۔ جو کچھ میں کہتا تھا اسے فرانسیسی یا جرمن میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا اور بہت تھوڑا تاثر قائم ہوتا تھا۔ انگلینڈ میں معاملہ مختلف تھا۔۔۔ لندن میں البرٹ ہال میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ طے شدہ جلسے سے ایک شام پہلے میں البرٹ ہال گیا تھا کہ دیکھا جائے کہ اس کی تشہیر کر دی گئی ہے۔ میں بہت بڑے ہورڈنگ پر اپنا نام مرکزی خطیب کے طور دیکھ کر پر جوش ہو گیا تھا۔ دیگر چھ میں آرچ بشپ آف کینٹر بری اور پی۔ این ہسکر ہندوستان کا عارضی کمشنر شامل تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ ہال آدھا خالی رہ جائے گا۔ اگلے روز جب میں وہاں پہنچا تو میں نے پارکنگ لاٹس میں سینکڑوں بسوں کو دیکھا۔ سارے انگلینڈ سے سکھ اس جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ میں نے ڈائس پر اپنی جگہ سنبھالی۔ میز پر مقرروں کے لیے پانی کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ میں نے چند چسکیاں لیں اور پھر اپنی سکاچ سے بھری ہوئی ہپ فلاسک کو چپکے سے خالی کر دیا: جب میں نروس ہوتا ہوں تو اکثر ایسا ہی کرتا ہوں۔ سکاچ نے میری زبان کو ڈھیلا کر دیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے پنجاب کے دیہاتوں کے سرسوں کے پھولوں، آٹے کی چکیوں کی دھونکنی کی سیٹیوں، اونٹوں کے جلتے ہوئے خاروں کی مہک کی بات کی، میں نے انہیں کہا کہ میں خود کو کس قدر مراعات یافتہ سمجھ رہا ہوں کہ مجھے ہندوستان میں ان کے سکھ بھائیوں نے اپنے انگلینڈ میں رہنے والے بھائیوں تک ان کی طرف سے مبارکباد پہنچانے کے لیے منتخب کیا ہے۔ میرے بہت سے سامعین جو گھروں کی یاد میں تڑپ رہے تھے، رونے لگے۔ میں گرو گوبند سنگھ کے دھرم یدھ کے تصور کے حوالے سے اپنے نظریے پر پر جوش تھا۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر اپنا نظریہ پیش کیا کہ انگلینڈ میں رہنے کا انتخاب کرتے ہوئے انہیں چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے اختیار کردہ ملک کے ساتھ مکمل طور پر شناخت کروائیں اور فخر سے کہیں: ''میں سکھ ہوں، میں برطانوی ہوں۔'' میری تقریر کو بولے سو نہال، ست سری اکال کے زوردار نعروں سے تحسین پیش کی گئی۔ میں اپنی کارکردگی پر بہت فخر کر رہا تھا اور نہ صرف ایک سکھ ہونے پر فخر کر رہا تھا بلکہ سکھ بھی مجھ پر فخر کر رہے تھے۔

میری تقریر کے اقتباسات کو برطانوی اور ہندوستانی اخبارات میں وسیع پیمانے پر شائع کیا گیا تھا۔ جب میں ہندوستان واپس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس مجھے دی گئی رقم میں سے دو سو پاؤنڈ بچ گئے ہیں تاہم کسی نے مجھ سے حساب کتاب نہیں لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس رقم کا تعلق مجھ سے نہیں بلکہ سکھ پنتھ سے ہے۔ میرے پاس جو کچھ بچا تھا وہ میں نے واپس کر دیا۔ نہ تو کپور سنگھ اور نہ ہی ڈارڈی نے حساب کتاب دیا اور نہ ہی کوئی بقایاجات واپس کیے۔ جب انہوں نے سنا کہ میں نے کیا کیا ہے تو انہوں نے مجھے بے وقوف قرار دیا۔

بمبئی میں وہ کیہر سنگھ گل تھا جس نے میری کمیونٹی کا ایک فرد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے مجھے گرونا نک کی تقریبات سالگرہ کے لیے مجھے یوگنڈا بھیجنے کے واسطے پیسہ اکٹھا کیا۔ میں سکھ مت پر بات کرنے سے زیادہ کینیا اور یوگنڈا میں جنگلی حیات (وائلڈ لائف) دیکھنے کا آرزومند تھا۔ میں ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی سے نیروبی اور آگے کمپالا گیا۔ میرا میزبان چندن سنگھ مجھے پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے کار کے ذریعے گزار کر نیل کے کناروں پر لے گیا۔ چندن سنگھ ہندوستان سے ایک معمولی بڑھئی کے طور پر آیا تھا مگر عمارت ساز کے طور پر آسودہ حال ہو چکا تھا۔ وہ ایک وسیع وعریض بنگلے میں رہتا تھا اور اس کے پاس دو کاریں تھیں۔ میں نے گرونانک کی سالگرہ کے جلوس میں شرکت کی جس کی رہنمائی اسماعیلیہ گرلز سکول کے بینڈ نے کی (سب مسلمان) اور جنجا کی گلیوں سے گزر کر اپنے گردوارے تک گئے۔ میں نے پنجابی میں تقریر کی۔ دیگر جلسوں میں جو میرے لیے مقامی ہندوؤں نے منعقد کیے تھے میں نے انگریزی میں تقریریں کیں۔ چندن سنگھ جو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا تھا' ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ شام کو جب ہم سکاچ پی کر سکون حاصل کرتے وہ مجھ سے معصومیت کے ساتھ کہتا: ''خوش ونت سنگھ جی! سمجھ تے کجھ نہیں آیا' پر آنند بہت آیا۔'' میرے سامعین میں سردار اندر سنگھ بھی شامل تھا جو بہت سے افریقی ملکوں میں کاروبار کرنے والا لکھ پتی شخص تھا۔ جنجا میں اس کے محل سے وہ مقام دکھائی دیتا تھا جہاں نیل وکٹوریا جھیل سے الگ ہو کر یوگنڈا' سوڈان اور مصر کے راستے بحیرہ احمر تک اپنے ہزاروں میل طویل سفر پر روانہ ہو جاتا۔ اس نے مجھے دریائی گھوڑوں کے بارے میں بتایا جو اکثر اس کے باغ پر ہلہ بول دیتے تھے اور مگرمچھوں کے بارے میں بتایا جو اس کے صحن کے بالکل باہر دھوپ تاپتے تھے۔ اس نے جنگلی حیات میں میری دلچسپی کو بھانپ لیا۔ ''تمہیں مرکیسن آبشار ضرور جانا چاہیے۔'' اس نے کہا ''دنیا میں اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔'' مرکیسن آبشار یوگنڈا اور سوڈان کی سرحد پر جنجا سے کئی سو میل دور ہے' میرے پاس وہاں جانے کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی پیسہ ـــــ دونوں کا انتظام سردار اندر سنگھ نے کی۔ اس کے پاس اپنا ہوائی جہاز تھا اور ایک نوجوان اسماعیل پائیلٹ' جو جہاں وہ چاہتا اسے اڑا لے جاتا تھا۔ ہم نے مرکیسن آبشار کی طرف پرواز کی۔ میں نے کبھی اتنی چھوٹی جگہ پر اتنی زیادہ جنگلی حیات نہیں دیکھی: سینکڑوں کی تعداد میں دریائی گھوڑے' زرافے' مگرمچھ' بارہ سنگھے اور زیبرے اور ہر شکل' جسامت اور رنگوں کے پرندوں کی حیرت ناک اقسام۔ ہم شام تک کمپالا واپس آ گئے تھے۔ جس آخری جلسے سے میں نے خطاب کیا تھا وہ جنجا میں ایک گردوارے میں ہوا تھا' مذہبی احتجاج نے مجھے پانچ پاؤنڈ کے نوٹوں کا ہار پہنایا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کتنے تھے ـــــ تاہم ایک خام سے اندازے کے مطابق وہ سو سے زیادہ تھے' پانچ سو پونڈ۔ مجھے تحفہ قبول کرنے کا لالچ

ہوا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہ پیسہ میرے لیے نہیں ہے بلکہ پنتھ کا ہے۔ میں نے نوٹوں کا ہار اپنی گردن سے اتارا اور اسے گرنتھ صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

کیہر سنگھ گل نے بمبئی یونیورسٹی میں سکھ مت پر لیکچروں کی سیریز کا اہتمام کیا۔ وائس چانسلر نے لیکچر دینے کے لیے مجھے دعوت دی۔ مجھے ان پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ جب میرا چچا اجل سنگھ ریاست کا گورنر تھا تو اس سے پہلے میں نے مدراس یونیورسٹی میں اس موضوع پر سیریز میں لیکچر دیئے تھے۔ مدراس یا کسی بھی جگہ کی طرح سامعین کی اکثریت سکھوں پر مشتمل تھی۔ ان لیکچروں کے دوران میں مجھے اپنے بیٹے راہول کا ایک خط ملا جو اس وقت ریڈرز ڈائجسٹ کی کسی اسائن منٹ پر انگلینڈ میں تھا کہ اس نے اپنے لمبے بال کٹوا دیئے ہیں۔ اس نے اپنے اس فیصلے کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا۔ وہ ایک دہریہ ماحول میں پروان چڑھا تھا۔ اسے کبھی ناقابل فہم اور بے زار کر دینے والے اکھنڈ پاٹھوں میں گرنتھ صاحب پڑھنے کا کہا نہیں گیا تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ لمبے بالوں اور ڈاڑھی کا اخلاقیات اور دھرم سے کیا سمبندھ ہے اور چونکہ اس کے قریباً تمام دوست انگریز، ہندو یا مسلمان تھے اس لیے اس میں سکھ کمیونٹی سے تعلق کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ مجھے ادراک ہوا کہ وہ درست ہے— بہت حیرت ناک انداز میں اس نے مجھے دکھی کر دیا اور میں اپنے لیکچروں کو ملتوی کرنے کا آرزومند ہو گیا۔ مجھے پتا تھا اس سے میری بیوی کو اذیت پہنچے گی (اگرچہ وہ عبادت ترک کر چکی تھی) اور میرے والدین کو اس سے بھی زیادہ رنج ہو گا۔ میں نے بغیر تبصرے کے خط اپنی بیوی کے آگے رکھ دیا۔ اس نے لکھا کہ وہ دوبارہ اپنے بیٹے کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں نے اسے یہ بتانے کے لیے واپس لکھا کہ ہمارے پاس کسی بالغ آدمی کو حکم دینے کا کوئی حق نہیں ہے جبکہ ہم نے اس کی پرورش روایتی سکھ کے طور پر نہیں کی ہے۔ اور اس سے قطع تعلق کر کے وہ فقط خود اپنے آپ ہی کو اذیت پہنچائے گی۔ میرے باپ کے ردعمل نے تو مجھے سب سے زیادہ حیران کر کے رکھ دیا۔ میری بہن کے بیٹوں نے بال کٹوا دیئے تھے اور انہیں ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کر لیا گیا تھا۔ راہول اس کا پسندیدہ پوتا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ اپنے لمبے بالوں کو ایک جوڑے میں باندھ کر کیمبرج یونیورسٹی کے لیے ٹینس کھیلتا تھا۔ اپنی وصیت کے پہلے مسودے میں میرے باپ نے جن پتھ پر واقع تین ایکڑ کے لان اور ایک انیکسی والا بہت بڑا گھر میرے بیٹے کے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں تاہم واضح طور پر وہ ناخوش تھا۔ راہول اپنی پگڑی میں بہت خوبصورت لگتا تھا اور پگڑی اور اپنی ڈاڑھی مونچھوں کے بغیر وہ کسی عجیب سے مولوی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں اس کی نئی وضع قطع کا عادی ہونے میں چند برس لگ گئے تھے۔

☆☆☆

میرے بینیٹ اینڈ کولمین کے ساتھ معاہدے میں دو مرتبہ توسیع ہو چکی تھی اور تیسری کی توقع تھی۔ تاہم ملک اور کمپنی کے حالات انقلابی انداز میں تبدیل ہو گئے۔ کئی برس کے حکومتی کنٹرول کے بعد بینیٹ اینڈ کولمین اس کے اصل مالکوں' جینوں کو واپس کر دی گئی۔ مسز گاندھی انتخابات کے ذریعے اقتدار سے ہٹا دی گئی تھی اور اس کی جگہ مرار جی ڈیسائی نے لے لی تھی۔ میں نہ تو اشوک جین کے ساتھ' جو کہ کمپنی کا چیئرمین بن گیا تھا اور نہ ہی مرار جی ڈیسائی کے ساتھ' جو کہ وزیراعظم بن گیا تھا' روابط استوار کرنے کا اہل تھا۔ میں نے مسز گاندھی کی حمایت اور اس کے بیٹے سنجے کا دفاع جاری رکھا۔ ایک شمارے میں ہم نے ملک کے سب سے زیادہ مقبول و معروف آدمی کے بارے میں رائے لی۔ ووٹ بہت بڑی تعداد میں سنجے گاندھی کے حق میں پڑے۔ وہ آدمی جس سے نئی حکومت اس کی ماں سے بھی زیادہ نفرت کرتی تھی۔ مرار جی ڈیسائی ''السٹریٹڈ ویکلی'' سے تنگ تھا جو ملک میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا رسالہ تھا۔ جب وہ بمبئی آیا تو میں نے اسے انٹرویو دینے کے لیے وقت مانگا' مجھے تین سطری جواب ملا کہ میں سانتا کروز ائیرپورٹ پر اس سے ملوں تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اس کے پاس مجھ سے ملاقات کے لیے وقت ہے یا نہیں۔ میں ائیرپورٹ گیا' اس کے مداحوں کے ہجوم کو بزور ہٹاتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے سلام کیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑایا: ''اچھا تو تمہارے خیال میں سنجے ملک کا ہیرو ہے!'' میں نے احتجاج کیا کہ وہ میری رائے نہیں تھی بلکہ قارئین کی رائے تھی — ''کیا قارئین؟'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''وہ سب گھڑا گھڑایا تھا۔'' جب وہ اپنی کار میں بیٹھنے والا تھا تو میں نے اسے کہا: ''مرار جی بھائی! اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔'' وہ جواب دینے سے پہلے لمحہ بھر چپ رہا ''نہیں میں تمہیں ملوں گا۔ تم پانچ بجے میرے بیٹے کے اپارٹمنٹ پر آؤ۔''

جب میں کنٹی ڈیسائی کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں برآمدے اور اس کے باپ کی خواب گاہ میں لوگوں کا ایک اور ہجوم لگا ہوا تھا۔ مرار جی اپنے بستر پر بیٹھا ہوا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ملاقاتیوں کو چلے جانے کا کہا۔ ''میں اسے ملاقات کا وقت دے چکا ہوں' میں اس سے اکیلے میں بات کرنا پسند کروں گا۔'' اس نے حکم دیا' ہجوم رخصت ہو گیا۔ مرار جی نے مجھے اپنے ساتھ بستر پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ اس شخص سے مختلف تھا جس سے میں آج صبح ائیرپورٹ پر ملا تھا۔ اس نے میرا موقف تسلیم کیا کہ قارئین کی اکثریت نے سنجے کے لیے ووٹ دیئے تھے تاہم قرار دیا کہ یہ سب کچھ ضرور دھاندلی رہی ہو گی۔ (وہ درست تھا' جیسا کہ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایک ہی شخص نے سنجے کے حق میں سینکڑوں ''قارئین'' کے ووٹ بھیجے تھے) میں نے اپنا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا اور اس سے ہنگامی حالت' جیل میں اس کی قید اور ہندوستان

کے لیے اس کے منصوبوں کے حوالے سے بہت سے سوالات دریافت کیے۔ میں نے اس سے خاص طور پر سوال کیا کہ کیا وہ امتناع دوبارہ نافذ کرے گا حالانکہ جہاں بھی اسے نافذ کیا یہ ناکام رہا ہے۔ وہ اڑا ہوا تھا' امتناع دستور کی ایک ہدایتی شق ہے' ملک کے بہت سے حصوں میں کامیاب رہا ہے' خصوصاً ایک کے مقامی علاقے گجرات میں اور وہ اسے پورے ملک پر نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب میں نے سارے سوال کر لیے تو اس نے کہا کہ میں ٹیپ ریکارڈر بند کر دوں: وہ مجھ سے ذاتی طور پر یا دوستوں کے انداز میں گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ ''تم نے میرے امتناع پر اصرار اور پیشاب تھراپی کو مذاق بنالیا ہے۔ اگر میں تمہیں قائل کروں کہ شراب نوشی بری ہے تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے؟''

''مرارجی بھائی! میں پچاس برس سے پی رہا ہوں اور اپنی زندگی میں کبھی ایک بار بھی مجھے نشہ نہیں چڑھا ہے۔ اگر میں آپ کو قائل کرتا ہوں کہ شراب نوشی آپ کے لیے بری نہیں ہے تو کیا آپ شراب پئیں گے؟'' میں نے جواباً پوچھا تھا۔

اس نے میری تجویز پر چند لمحے غور کیا اور جواب دیا: ''یہ ایک اچھی پیشکش ہے' اگر تم نے مجھے قائل کر لیا کہ الکوحل پینا صحت کے لیے برا نہیں ہے تو میں اسے آزمانے کا وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ پیشاب تھیراپی کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ اس نے مجھے بیماریوں کے ان گنت کیسوں کے بارے میں بتایا جنہیں ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا تھا' اور تازہ پیشاب سے ختم ہو گئیں۔ ''میرے پاس کینسر کے علاج کے لیے بھی ایک نسخہ ہے۔ ہر طرح کی خوراک ترک دو۔ صرف تازہ انگوروں اور گرم پانی پر جیو اور وہ تمہارے نظام سے کینسر کو نکال دیں گے۔'' وہ میرے ساتھ اتنا دوستانہ تھا کہ اس نے مجھے اپنے ایک اور خبط کے بارے میں سوال پوچھنے دیا: ''مرارجی بھائی! میں آپ کے جنس سے پرہیز کے عہد کے حوالے سے بھی لکھ چکا ہوں۔'' اس سے پہلے کہ میں مزید بات جاری رکھتا' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا: ''میں اس موضوع پر تمہارے ساتھ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔'' انٹرویو جو کوئی گھنٹہ بھر جاری رہا تھا' اختتام پذیر ہوا۔

مرارجی ڈیسائی اپنے خبطوں کے باوجود ایک راست اور دیانتدار انسان تھا جو شاذونادر ہی جھوٹ بولتا تھا۔ ایسا اس کے بیٹے کنتی کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا' جس پر وہ شیدا تھا۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا تو کنتی غلطی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چند دن بعد جب اشوک جین نے مجھے دہلی میں اپنے گھر ناشتے پر مدعو کیا تو میں نے اپنے معاہدے کا موضوع چھیڑ دیا۔ نہایت نرمی مگر مضبوطی سے اس نے مجھے بتایا کہ کنتی ڈیسائی میرے مدیر کے طور پر تسلسل کے حوالے سے مضبوط تحفظات رکھتا ہے اور میرے معاہدہ کو تازہ نہیں کیا جائے گا۔ ہفتوں بعد جب

یہ مشہور ہو گیا کہ مدیر کے طور پر میرا عہد اب چند مہینوں کے اندر اندر ختم ہونے والا ہے کیونکہ اس کے لیے مالکوں پر ڈیسائیوں کا دباؤ پڑ رہا ہے تو مرار جی ڈیسائی نے مجھے دہلی سے فون کیا: ''کیا تم مجھ پر یقین کرتے ہو کہ میں نے اشوک جین سے تمہارے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا؟'' میں نے جواب دیا: ''مرار جی بھائی! اگر آپ ایسا کہتے ہیں تو میں اس پر یقین کر لوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔'' یہ بات اشوک جین اور کنٹی ڈیسائی پر صادق نہیں آتی تھی۔ اشوک جین نے انکار کر دیا کہ اس نے کبھی مجھے یہ بتایا تھا کہ ڈیسائیوں نے اسے میرے حوالے سے کچھ کہا ہے۔ جب مرار جی حکومت نے اپنے خلاف لگائے گئے انتقامی کارروائیوں کے الزامات کی تحقیقات کے لیے اونیاش لنگم کمیشن قائم کیا تو ایک سوال کے جواب میں کنٹی ڈیسائی نے کہا وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کون تھا۔

میں اپنے معاملات کو سلجھانے کے لیے بمبئی واپس آ گیا۔ میرے پاس اپنے بعد آنے والے کو ذمہ داریاں سونپنے کے لیے تین مہینے تھے اور میں نے دوسری ملازمت کی تلاش یا اپنے ناول ''دلی'' پر کام کرنے کے لیے تین ماہ کی رخصت لے لی۔ اپنے جانشین کے طور پر میں نے خود آر۔ جی۔ کے کا نام پیش کیا۔ اسے مسترد کر دیا گیا۔ میری رخصتی کی تاریخ متعین کر دی گئی تھی۔ میں نے اپنے ادارتی صفحے کے لیے الوداعی جذباتی تحریر قلم بند کی کہ میرا بلب لو گو اب مزید ''ویکلی'' میں نظر نہیں آیا کرے گا۔ کسی شرارت ساز نے انتظامیہ سے لگائی بجھائی کی کہ میں نے بینیٹ اینڈ کولمین کے خلاف ایک سخت تحریر لکھی ہے۔ میرے اپنے عہدے کو چھوڑنے سے ایک ہفتہ پہلے معمول کے مطابق میں وقت سے ایک گھنٹہ پہلے دفتر آیا۔ دس بجے ایک سینئر کلرک جنرل مینجر رام تارنیجا کے خط کے ساتھ آیا: ''سر! میں نے اسے کل آپ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر آپ گھر جا چکے تھے۔ میں قاصد بننے پر معذرت خواہ ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔'' اس نے کہا۔ یہ ایک پیراگراف والا خط تھا جس میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ میری ملازمت فوری طور پر ختم کر دی گئی ہے اور مجھے ایم۔ وی۔ کامتھ کو چارج فی الفور سونپنا ہے۔ مختصر یہ کہ میں اپنی ریٹائرمنٹ کی مقررہ مدت سے ایک ہفتے پہلے نکال دیا گیا تھا۔ میں نے فاطمہ زکریا کو بلا بھیجا' اسے خط دیا اور اسے کہا کہ میرے جانے کے بعد عملے کو اطلاع کر دے۔ میں نے اپنی چھتری اٹھائی اور ''ٹائمز آف انڈیا'' بلڈنگ سے باہر آ گیا۔

مدیروں کے ساتھ خواہ مخواہ کی بدسلیقگی جین خاندان کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی۔ انہوں نے اپنے سب سے ممتاز مدیر فرینک موریس کے ساتھ بھی ایسا ہی غیر مہذبانہ سلوک روا رکھا تھا۔ اندر ملہوترا اور پریم شنکر جھا' دونوں ہی اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے' انہیں ذلیل کیا گیا اور جبراً نکال دیا گیا۔ گری لال جین جس نے اپنی زندگی ''ٹائمز آف

انڈیا'' کی امتیاز کے ساتھ نوسال ادارت کرتے ہوئے گزار دی تھی مجھ سے بھی کم عزت کے ساتھ نکال دیا گیا تھا۔

میں ''دلی'' کے اگلے باب پر کام کرنے لگا۔ علامہ اقبال کے ایک شعر نے مجھے بہت متاثر کیا

جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

☆☆☆

میں نے باقی ماندہ تین ماہ اپنے ناول پر کام کرتے ہوئے گزارے۔ مجھے ''فری پریس جرنل'' کی ادارت سمیت بہت سے ملازمتوں کی پیشکش کی گئیں۔ ان پر کچھ وقت سوچنے کے بعد میں نے انہیں رد کر دیا۔ بمبئی سے میرا جی بھر گیا تھا اور میں اپنے خاندان اور دہلی واپس جانے کا آرزومند تھا۔ زکریا خاندان' کیہر سنگھ گل' ہرجیت کوہلی اور کچھ دوسرے سکھ مجھے سٹیشن پر الوداع کہنے آئے۔ جس وقت میں بمبئی سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر دور آ گیا تو میرے ذہن سے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں گزارے ہوئے میرے نوسال نکل چکے تھے۔ اگلی صبح نظام الدین ریلوے سٹیشن پر میری بیوی اور بیٹی مالا نے میرا استقبال کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اپنے آپ کو ان سے سنگ دلانہ دوری رکھنے پر معاف کر دیا گیا ہے۔

بمبئی کے نظارے کئی پر مہینے مجھے یاد آتے رہے: کافی انوکھی بات ہے' مجھے لوگ نہیں یاد آئے بلکہ مون سون' میرین ڈرائیو کے ساتھ ساتھ ''گڈی پڑوا'' میں شرکت کرنے والے رقاصوں کی گھنٹیوں کی صدا' بارش کے پانی کا باریک پردے کی طرح گرنا' دفتر جاتے وقت میرے راستے میں آنے والے کتے جو مجھے دیکھ کر اپنی دمیں ہلاتے تھے۔ دہلی واپسی کے ابتدائی چند مہینے میں زکریا خاندان اور دوسرے دوستوں کے ساتھ قریبی تعلق برقرار رکھنے کے لیے جتنا ہوسکتا تھا زیادہ سے زیادہ بمبئی جایا کرتا تھا۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ فاطمہ کے لیے میں یاد ماضی سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ اس نے تیزی سے اپنی وفاداریاں اور چاہتیں اپنے نئے باس گری لال جین کی طرف منتقل کر لی تھیں اور اس کے دفتر میں اتنا ہی زیادہ وقت گزارتی تھی جتنا کہ میرے دفتر میں اور اس کی ملاقاتوں کا انتظام کرتی' اسے کھانے پر مدعو کرتی اور اسے کھانا بھیجا کرتی تھی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس چیز نے مجھے گہرا دکھ پہنچایا۔ مجھے اس دکھ سے خود کو نکالنے میں کافی وقت لگ لیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک بیماری ہے جس کا نام ''باسوفیلیا'' (باس کی محبت) ہوسکتا ہے جو عموماً عورتوں کو لگتی ہے۔ یہ پیشہ ورانہ جوکھم ہوتا ہے جس سے کام کرنے والی عورتوں کو سامنا ہوتا ہے اور بیشتر اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ایک کام کرنے

والا آدمی عمومی طور پر ''باسوفوبیا'' کا شکار ہوتا ہے اور اپنے باس کو نفرت سے' نا قابل تفہیم اور غیر ہمدردانہ مسخرے کے طور پر دیکھتا ہے۔ ایک کام کرنے والی عورت الیکٹرا کمپلیکس میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اپنے باس کو اپنے باپ کے مشفق متبادل' محبوب یا نئے خاوند کے طور پر دیکھتی ہے۔ فاطمہ ''باسوفیلیا'' کی انتہائی مثال تھی۔ وہ ایک پرستش کیے جانے والے باس کے ریٹائر ہوتے ہی مساوی طور پر قابل پرستش باس کے ذریعے اس کی جگہ پر کر لیتی تھی۔ اس تجربے نے مجھے بمبئی سے نفور کر دیا' میرے وہاں کے دورے کم ہونے لگے اور میں نے دہلی ہی میں سکون پایا جو وہ شہر تھا جس سے میں تعلق رکھتا تھا اور جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔

دہلی میں چند مہینوں کے بعد مجھے ''نیشنل ہیرالڈ'' کی ادارت کی پیشکش کی گئی۔ ''نیشنل ہیرالڈ'' میں میرے چھ مہینے بہت پریشان کن تھے۔ یش پال کپور نے مجھ تک رسائی حاصل کی' جو مسز گاندھی کا دست راست اور انتخابات کے دوران استعمال ہونے والی اس کی جمع کردہ رقم کا امین تھا۔ اس نے مجھے اسی تنخواہ کی پیشکش کی جو میں ''السٹریٹڈ ویکلی'' کے مدیر کے طور پر لیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ''نیشنل ہیرالڈ'' سرخ ہے۔ وہ پی ٹی آئی اور یو این آئی کی تجویز کردہ تنخواہ بھی ادا کرنے کا اہل نہیں اور اس کی سرکولیشن دو ہزار سے زیادہ نہیں' میں نے پیشکش قبول کر لی جب کہ اخبار طویل ہڑتالوں کی وجہ سے اشاعتی بندش کا شکار تھا۔ مجھے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ ورکروں اور ادارتی عملے سے خطاب کروں اور انہیں کام دوبارہ شروع کرنے پر راضی کروں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اس وقت تک کوئی تنخواہ نہیں لوں گا جب تک ان میں سے ہر کسی کی تنخواہ ادا نہیں کر دی جاتی۔ انہوں نے اپنی تنخواہیں حاصل کر لیں' میں کچھ نہ پا سکا۔

تاہم مجھے بالواسطہ تلافی فراہم کر دی گئی۔ میں مسز گاندھی سے قریباً ہر دوسرے دن ملا کرتا تھا۔ میں اس کے پرناب مکرجی جیسے مشیروں اور روز کے ملاقاتیوں سیتارام کیسری اور کلپناتھ رائے جیسے لوگوں سے بھی ملا۔ میں ہندوستانی کلیشے کے مطابق اس کے طریق کار اور کسی حد تک اس کی خاندان زندگی کو دیکھنے کا اہل تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود کو یش پال کپور سے فاصلے پر رکھنا چاہتی ہے مگر ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ میری شکایت کے باوجود کہ کپور دفتر کبھی کبھار آتا ہے (وہ بے تنخواہ ورکروں کے ہاتھوں پٹائی سے ڈرتا تھا) وہ اس کو کچھ نہیں کہتی تھی۔ ہر دوسرے مہینے' جب ورکر دوبارہ ہڑتال کرنے کی دھمکی دیتے کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس پراسرار طریقے سے دفتر میں نمودار ہو جاتا تھا: ورکروں کے بقایا جات ادا کر دیئے جاتے' اور ہم پی ٹی آئی اور یو این آئی کی سبسکریشن ادا کرنے کے قابل ہو جاتے اور نیوز پرنٹ کی رسد حاصل کر لیتے۔

مجھے شک تھا کہ اس سخاوت کے پیچھے جو آدمی تھا وہ کمپا کولا کا چرن جیت سنگھ تھا۔

پولیس یہ جاننے کے لیے پریشان تھی کہ اخبار زندہ کیسے ہے۔ میرے عرصہ ادارت میں انہوں نے دو مرتبہ چھاپہ مارا تھا۔ مجھے اس وقت تک ان چھاپوں کا پتا نہیں چلتا جب تک لیش پال' اگر وہ وہاں ہوتا' اور اکاؤنٹنٹ سے تفتیش نہ کر لی گئی ہوتی۔ پولیس کبھی میرے کمرے میں داخل نہیں ہوتی تھی۔ دفتری اوقات میں میرے فقط دو رفقا ہوا کرتے تھے' اسسٹنٹ ایڈیٹر تھریان اور ایک دلکش آزاد صحافی (فری لانسر) سنیتا بدھی راجا۔ پولیس کی چوبیس گھنٹے نگرانی کی وجہ سے ہیرالڈ کے دفتر میں چند ہی لوگ آنے کی جرأت کرتے تھے۔ میرے ''نیشنل ہیرالڈ'' کی ادارت کے زمانے کے دوران میں سوائے بابو جگ جیون رام کے بیٹے سریش کمار اور اس کی کالج پڑھنے والی معشوقہ کی فحش تصویروں والے پیکٹ کے پائے جانے کے واقعے کے اور کوئی دلچسپ واقعہ رونما نہیں ہوا۔

دفتر کے وقت کو اچھا گزارنے کے لیے میں نے جنگلی کبوتروں کے ایک جوڑے کو دوست بنا لیا تھا جنہوں نے میری کھڑکی کی لگر پر اپنا گھونسلہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے خاکروب اور چپراسیوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں مت پریشان کریں۔ میں نے اپنی ڈائری میں انڈے دیئے جانے کا وقت درج کر لیا تھا اور جب وہ انہیں سیتے تھے۔ میں نے بدنما' بے بال گھونسلے والے بچوں کے پر اگنے' خوراک مانگنے کے لیے انہیں اپنی چونچیں پھیلانے' پروں کو حرکت دینے اور پھر اڑنے کا مشاہدہ کیا۔ ہیرالڈ میں میرے چھ مہینے مجموعی طور پر ضائع نہیں گئے۔

میں نے پیسوں کے بغیر کام کرنے کو برا نہیں جانا تاہم قارئین کا نہ ہونا سخت تکلیف دہ تھا۔ ''آنند بازار'' گروپ کے اویک سرکار نے مجھ تک رسائی کی اور ''نئی دہلی'' کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کی' جو ایک پندرہ روزہ رسالہ ہوتا اور انہوں نے اسے دارالحکومت سے جاری کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ سنجے سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے یہ ملازمت اختیار کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میرے لیے پارلیمنٹ سٹریٹ پر واقع پی ٹی آئی بلڈنگ میں ایک بہت خوبصورت لکڑی کے تختوں (پینلوں) سے مزین چھوٹا سا دفتر تیار تھا۔ نائبین جاوید لئیق' چیتنیہ کالباغ' ویویک سین گپتا' مدھوجین اور فوٹوگرافر رگھو رائے پر مشتمل عملے کو بھرتی کیا گیا۔ میں نے نندنی مہتہ کو اپنے ساتھ کام کرنے پر قائل کیا۔ چند شماروں کے شائع ہوتے ہی ہم ''نئی دہلی'' کے بارے میں ملک کے سب سے اچھے تحریر کیے گئے رسالے کی ساکھ قائم کرنے کے قابل ہو گئے۔ تاہم سرکولیشن 35000 پر ہی جامد رہی! رسالے کو کلکتہ سے طبع کروانا پڑتا تھا اور طباعتی عملہ مسلسل ہڑتالوں پر رہتا تھا اور پندرہ روزہ اکثر باسی ماہنامہ بن جاتا تھا۔ میں نے رسالے کے لیے چند طویل فیچر مضامین تحریر کیے۔ ایک فیچر تانترک سادھوی شردھا ماتہ پر تھا جس نے ایم۔ او۔ متھئی کے بقول وزیراعظم نہرو کے ایک غیر قانونی بچے کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے نگم

بودھ شمشان گھاٹ میں پایا۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں ایک خوب سنبھلی ہوئی' جوبن والی عورت تھی۔ وہ بالکل میری دوست بن گئی۔ میں جب بھی جے پور گیا میں نے ہیتھرائے فورٹ میں اس سے ضرور ملاقات کی' جہاں وہ اپنے کتوں میں گھری تنہائی میں رہا کرتی تھی۔

جب ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی تو میں اسلام آباد میں موجود واحد ہندوستانی صحافی تھا۔ میرا دوست ایم۔اے۔رحمٰن' جو وکلائے استغاثہ کی ٹیم میں سے ایک تھا اور جنرل ضیاء الحق کے قریب تھا' سزا کے وقت کے بارے میں اندازہ رکھتا تھا۔ اس نے مجھے ''ایک تاریخی واقعے'' پر موجود ہونے کے لیے دعوت دی اور جنرل ضیاء الحق کے ساتھ انٹرویو بھی طے کروایا' اس کا کسی ہندوستانی کو دیا جانے والا پہلا انٹرویو۔ میں نواب آف قصور کے خاندان سے ملاقات کرسکتا تھا' یقین کیا جاتا تھا کہ اسے بھٹو کے کرائے کے آدمی نے قتل کیا تھا اور بھٹو کے آخری دنوں اور ایک عیسائی تارا مسیح ـــ جس نے تب اس کی سونے کی گھڑی چرالی تھی' کے ہاتھوں اس کو سزا دیئے جانے کی تفصیلات حاصل کرسکتا تھا۔ ''نئی دہلی'' واحد ہندوستانی رسالہ تھا جس نے' عینی شاہد کا بیان کہلائے جاسکنے والے' پاکستانیوں کے اپنے لیڈر کی پھانسی پر ردعمل کو شائع کیا تھا۔ ان مضامین کو دوسرے اخبارات نے وسیع پیمانے پر شائع کیا تھا۔ آخر الامر وہ پست طباعتی شیڈول تھا جس نے ''نئی دہلی'' کے لیے میرے ولولے کو ٹھنڈا کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے خود کو بہت سے وقت کی دسترس میں ہونے کے ساتھ پایا۔

میں علامہ اقبال کے ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کا ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ میں صبح کے وقت سب سے پہلے ایک شعر سے زور آزمائی کرتا تھا۔ میں نے مجتبیٰ حسین اور شاعر علی سرداز جعفری جیسے اپنے دوستوں کو الفاظ کے بالکل ٹھیک معانی جاننے کے لیے میں دق کر دیا ـــ اور میں کئی شاموں میں پاکستانی سفارت خانے کے مجاہد حسین اور اس کی بے حد حسین وجمیل بیگم کو اپنے آتش دان کے قریب لے کر بیٹھتا اور جو کچھ میں ترجمہ کر چکا ہوتا تھا' انہیں سنایا کرتا تھا۔ ترجمے کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے قبول کرلیا اور اسے شائع کیا۔ اس کا اجراء پاکستانی سفیر عبدالستار کی طرف سے منعقد کی گئی ایک تقریب میں ہوا اور اصل سے اقتباسات یاسمین (منیر) شیخ نے پڑھے جن کے ساتھ ساتھ میں نے اپنا متعلقہ ترجمہ سنایا۔ اگرچہ ادب کے مبادلے پر عائد احمقانہ پابندیوں کی وجہ سے یہ کتاب پاکستان میں فروخت نہیں ہوسکتی تھی تاہم میرے تراجم کے اقتباسات پاکستانی رسالوں میں وسیع پیمانے پر شائع کیے گئے اور ہندوستان میں اس کتاب کی کئی باز اشاعتیں (Re-Prints) تیزی سے فروخت ہوگئیں۔

❁ ❁ ❁

بارھواں باب

گاندھیوں اور آنندوں کے ساتھ

تاریخ میں ایسی زیادہ مثالیں نہیں ہیں جن میں کسی عورت اور اس کی بہو کے درمیان مسموم تعلق نے کسی قوم کی رفتارِ حالات کو متاثر کیا ہو۔ ایسا تو ممکن ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں ایسے کھنچاؤ ماں سے لگاؤ رکھنے والے بادشاہوں کو اپنی بیویوں سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیتے یا زن مرید حکمرانوں کو اپنی ماؤں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیتے تاہم ہندوستان ایک جدید جمہوریت کی انوکھی مثال ہے ــــــ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت جیسا کہ ہندوستانی ہر کسی کو یاد دہانی کرواتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے ــــــ جہاں ایک عورت اپنی بیوہ بہو سے اتنی ناراض تھی کہ اس کے فیصلوں پر اس ناراضی نے اثر ڈالا نیز حکمران اشرافیہ کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا: وہ جو اس کے ساتھ تھے اور وہ جو اس کی بہو کے ساتھ تھے۔

یہ کہانی اتنی ہی عمومی ہے جتنا کہ ساس بہو کا کوئی بھی جھگڑا ہو سکتا ہے اور اس کی تفصیلات اتنی بھلی نہیں کہ جن پر توجہ دی جائے سوائے اس حقیقت کے کہ ملوث فریقین ایک طرف تو ہندوستان کی وزیر اعظم اور دوسری طرف اس کے چہیتے بیٹے کی بیوہ تھیں، جس کے بارے میں اسے (وزیر اعظم) اور بہت سے دوسرے لوگوں کو، بشمول میرے، امید تھی کہ اس کے بعد ہندوستان کی حکمران ہو گی۔ اس نے دونوں عورتوں کو قابل تبصرہ معاملات میں احمقانہ تُو تُو مَیں مَیں کا شکار بنا دیا اور غیر اہم ہونے کے باوجود وہ ہر ہندوستانی خاندان کے لیے انتہائی دلچسپی کے موضوعات بن گئے جہاں ایسے تناؤ عام ہوا کرتے ہیں۔

میرا بیانیہ متعلقہ پارٹیوں خصوصاً مانیکا اور سنجے گاندھی کے ساتھ مختصر دورانئے کی ذاتی شناسائی کی بنیاد پر استوار ہے۔ میں آیا تو مانیکا اور اس کی ماں کی دوستی سے لطف اندوز ہونے تھا ــــــ اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ اکثر وہ مجھے اپنی وسیع تر تشہیر کی امید میں خبریں مہیا کرتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ مسز گاندھی مجھے مانیکا کے کیمپ سے تعلق رکھنے والا اور یہاں تک کہ اس کا اہم مشیر اور اسی لیے ایک ''دشمن'' تصور کرتی تھی (یہ لفظ اس نے میرے لیے ایک سکھ وفد کے سامنے استعمال کیا تھا)، تاہم میں نے جتنا ممکن تھا غیر جانبدار ہونے کی کوشش کی تھی۔

اس وقت اندرا گاندھی ساٹھ کے پیٹے کے وسط میں تھی۔ وہ اپنی عمر کی کسی بھی میری جاننے والی عورت کے مانند صحت مند اور خوبصورت تھی۔ وہ 70-1965ء تک ہندوستان کی وزیراعظم' ڈھائی سال اقتدار سے باہر رہی تھی اور دوبارہ 1980ء سے اقتدار میں تھی۔ قوم کی سربراہی کے طویل برسوں نے اسے ایک خاص آمرانہ تکبر و خود پسندی اور تنقید کے حوالے سے عدم برداشت عطا کی تھی۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اندرا گاندھی اپنی شادی کے حوالے سے عظیم کامیابی نہیں حاصل کر سکی تھی۔ اس کا شوہر فیروز گاندھی الہ آباد کے ایک پارسی شراب فروش کا بیٹا تھا۔ اس کے دو بیٹوں راجیو اور سنجے کو جنم دینے کے بعد وہ اپنے باپ کے ساتھ اس کے گھر کی نگران اور میزبان کے طور پر رہنے کے لیے شوہر کو چھوڑ آئی تھی۔ کئی برس پنڈت نہرو کے پرسنل سیکرٹری رہنے والے ایم۔او۔ متھئی کے مطابق نہ تو باپ اور نہ ہی بیٹی جنسی طور پر رکے ہوئے تھے۔ نہرو خاندان کے اپنے ہی مسائل تھے۔ یہ اہم ہے جیسا کہ بعد میں مسز گاندھی نے کہا تھا کہ مانیکا ان کے خاندان یا طبقے سے کے برابر نہیں تھی۔

اندرا گاندھی اہل اور دیانت دار مشیروں کو' اگر ان کے خیالات اس کو پسند نہ آتے تو' سبکدوش کر دیتی تھی' فقط وہ مٹھی بھر لوگ' جو کہ وہی کچھ کہتے تھے جو وہ سننا چاہتی تھی' اس کے لیے قابل اعتماد رہے۔ ان میں سے محمد یونس گھریلو معاملات کا مشیر تھا۔ اس کی سب سے بڑی اہلیت یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کے لیے بے ہودہ گو بن جایا کرتا تھا جو نہرو یا مسز گاندھی کی حمایت کھو بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ خارجہ سروس کے لیے نامزد ہوا تھا اور ایک سفیر کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ مثلاً ٹریڈ فئیر اتھارٹی آف انڈیا کا سربراہ اور پھر اسے راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا۔ یونس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کابینہ وزیروں کو اپنے دفتر کے باہر منتظر رکھتا اور اپنے راستے میں آنے والے سینئر بیوروکریٹوں کو جھاڑ دیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا عادل شہریار مسز گاندھی کے چھوٹے بیٹے سنجے کا بچپن کا دوست تھا۔ وہ دونوں کئی ''شرارتوں'' بشمول کار چوری میں ملوث رہے تھے۔ عادل امریکہ چلا گیا تھا جہاں اس نے قانون شکنی کی اور جیل بھیج دیا گیا تھا۔ راجیو گاندھی نے وزیراعظم کے طور پر اسے معافی دلائی تھی۔ عادل چند سال بعد دہلی میں مر گیا تھا۔

گھریلو معاملات کے مشیروں اور بااعتمادوں میں ایک بہار کا خوبصورت' نیم تعلیم یافتہ یوگا انسٹرکٹر دھیریندر برہمچاری بھی تھا جس نے گھر پر قابل لحاظ اثر و رسوخ قائم کیا ہوا تھا اور اپنے لیے دولت کمائی تھی: اس کے پاس ذاتی جہاز' درآمد شدہ کاریں' جرسی کی گائیوں کا ایک ریوڑ' ایک اسلحہ ساز فیکٹری' ایک فلم سٹوڈیو اور زمینیں تھیں۔ وہ طلاق کے ایک مقدمے میں عدالت میں بھی پیش ہوتا رہا تھا۔ برہمچاری کو سوامی جی کہا جاتا تھا۔ وہاں

آر۔ کے۔ دھون بھی تھا جو پنڈت نہرو کا سٹینو گرافر رہا تھا اور اس کی وفات کے بعد اندرا گاندھی کے ذاتی عملے میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ ایک خوشامدی انسان تھا۔ اوشا بھگت کے ماتحت کام کرتے رہنے کے بعد رفتہ رفتہ اس نے مسز گاندھی کے سب سے زیادہ بھروسے کے آدمی کے طور پر اس کی جگہ لے لی تھی۔

مسز گاندھی کا بڑا بیٹا راجیو پروان چڑھ کر ایک لمبا اور بہت خوبصورت نوجوان بن گیا تھا۔ کیمبرج سے ڈگری کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد وہ انڈین ایئر لائنز میں پائیلٹ بن گیا تھا۔ اس نے ایک پرکشش اطالوی لڑکی سے شادی کی۔ وہ تورین کے نزدیک ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک عمارت ساز کی بیٹی تھی۔ ان کے دو بچے تھے راہول اور پریانیکا۔ راجیو اور سنجے کی کبھی نہیں بنی تھی۔ جب سنجے نے ماروتی کار پراجیکٹ کو تہس نہس کر دیا اور پیسے کے لیے اپنی ماں کو ساز باز کے الزامات کے لیے بے نقاب کر دیا تو راجیو نے اسے خاندان کی بدنامی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ جب سنجے اقتدار میں آیا تو راجیو ناراض ہو گیا اور جتنا ہو سکتا تھا اس سے کم سروکار رکھا۔ جب وہ کھانے کے لیے خاندان کے کھانے کے کمرے میں آتے تو مشکل ہی سے ایک دوسرے سے سلام دعا کرتے تھے۔ مسز گاندھی راجیو کی ذہانت کے بارے میں بھلی رائے نہیں رکھتی تھی۔ تاہم سنجے کی موت کے بعد اس نے اسے اپنے جانشین کے طور پر کامیابی سے تیار کر لیا تھا۔ راجیو نے سنجے کے آدمیوں سے چھٹکارا پایا اور ان کی جگہ اپنے آدمیوں کو لے آیا۔ اس نے جن مشیروں کو منتخب کیا ان میں بہت سے آدمی اس کے ساتھ ایک مہنگے سکول کی محدود فضا میں رہے تھے۔

ساس بمقابلہ بہو ڈرامے کی دوسری طرف آنند خاندان تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم امتیشور تھی جو منٹگمری (اب ساہیوال، پاکستان) کے زمیندار اور مویشی پالنے والے سردار ترسنگھ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اس کی سب سے بڑی بیٹی نے ایک ناخوشگوار شادی کر لی تھی اور آنند مائی ماں کے آشرم میں چلی گئی تھی۔ اس کے دو بیٹے بھی تھے ــــ ایک کچھ برس رلی برادران کے ساتھ کام کرتا رہا، پھر اپنے باپ کی موت پر خاندانی اثاثے سنبھالنے کے لیے ملازمت چھوڑ دی۔ اس نے امتیشور کی وارثت غصب کر لی۔ دونوں جو کبھی ایک دوسرے کے قریب ہوتے تھے، تلخ مقدمے بازی میں الجھ گئے۔ دوسرا بیٹا چنی نارمل نہیں تھا اور اسے بھوپال میں رکھا گیا تھا۔

امتیشور درمیانی تعلیم کی حامل تھی۔ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجا گیا اس سے پہلے کہ وہ اپنا کورس مکمل کرتی اسے گھر واپس بلا لیا گیا اور ایک خوبصورت فوجی افسر تیجندر سنگھ آنند سے بیاہ دیا گیا۔ شادی کامیاب نہیں رہی تھی۔ بایں ہمہ آنندوں کے تین بچے تھے،

مانیکا' ویرن اور امبیکا۔

کس طرح اور کب دونوں عورتیں اندرا گاندھی اور امتیشور آنند اکٹھی ہوئیں؟ میرے پاس مانیکا کا موقف ہے' اس کی ماں سے تصدیق شدہ۔ مانیکا کی سنجے گاندھی سے پہلی ملاقات 14 دسمبر 1973ء کو اپنے چچا میجر جنرل کپور (مانیکا کے باپ کی بہن' اپنے وقت کی مشہور حسینہ کا شوہر) کے ہاں ان کے بیٹے وینو کپور کی ہونے والی شادی کی خوشی میں منعقد کی گئی کاک ٹیل پارٹی میں ہوئی۔ سنجے وینو کے سکول کے دوست کی حیثیت میں موجود تھا۔ وہ سنجے کا جنم دن (برتھ ڈے) بھی تھا۔ وہ اونچا اڑ رہا تھا۔ (الکوحل کی وجہ سے نہیں' کیونکہ اس نے کبھی شراب کو چھوا بھی نہیں تھا) وہ ہندوستان کا سب سے مطلوب کنوارا تھا: خوبصورت' وزیراعظم کا بیٹا' جواہرلال کا نواسا اور موتی لال نہرو کا پڑنواسا۔ وہ اپنے آپ کو گاڑیوں کا صنعت کار بنانے کی کوشش میں مصروف ومحو تھا۔ وہ خوبصورت لڑکیوں پر آنکھ رکھنے کے حوالے سے مشہور تھا مگر ان لڑکیوں سے احتیاطاً دور رہتا تھا جن کے بارے میں اسے شبہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان کے خاندان اول کا فرد بنانے کے لیے ''مبتلا'' ہوئی ہیں۔ مانیکا اس وقت سترہ برس کی تھی: دبلی پتلی' چھائیوں والی لڑکی' اتنی کافی دلکش کہ کالج کا مقابلہ حسن جیت لے اور تولیہ سازوں کی فرم کے لیے ماڈل بن سکے۔ وہ بہت ہی زیادہ فوٹوجینک (جس کی تصویر کیمرے میں بہت اچھی آئے) تھی اور ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ سنجے اس پہلی ملاقات میں مانیکا کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اس نے وہ شام اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔ دونوں اگلے روز ملنے پر متفق ہو گئے تھے—— اور شاید باقاعدگی سے۔ امتیشور نے اپنی بیٹی کے لیے سنجے کی پسندیدگی کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ اگرچہ اس نے کہا کہ وہ سنجے کو داماد بنانے کے امکان پر چونکی تھی تاہم مجھے پکا یقین ہے کہ وہ اس رشتے میں معروف ہونے کی اپنی زندگی کی آرزو کی جزوی تکمیل دیکھ رہی تھی۔

اس کے بعد سنجے اور مانیکا روزانہ ملنے لگے۔ سنجے ریستورانوں میں یا فلمیں دیکھنے کے لیے جانے والا نوجوان نہیں تھا اور عوام میں پہچان لیے جانے کی وجہ سے شرمیلا تھا۔ .ہ یا تو مانیکا کو اس کے گھر ملنے یا اسے اپنے گھر لے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ 1974ء کی شروعات میں اس نے مانیکا کو کھانے پر مدعو کیا۔ مانیکا وزیراعظم سے ملاقات پر قابل فہم انداز میں نروس تھی اور جب وہ اس سے ملی تو وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا بات کرے۔ مسز گاندھی نے خاموشی توڑی ''چونکہ سنجے نے ہمارا تعارف نہیں کروایا اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم ہی مجھے بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے اور تم کیا کرتی ہو'' اس نے پوچھا۔

مسز گاندھی کے پاس مانیکا کو اس کی حد میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سنجے مختلف

وقتوں میں مختلف لڑکیوں کو گھر لا چکا تھا۔ اس نے کبھی اپنے آپ اپنے بیٹے کو کسی ایسی لڑکی سے متعارف نہیں کرایا تھا جس کے بارے میں وہ سوچتی ہو کہ وہ موزوں بہو بن سکے گی۔ اپنے بڑے بیٹے کی طرح وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے موزوں بیوی کا انتخاب بھی اسی پر چھوڑنے پر راضی تھی۔

امتیشور آنند دعویٰ کرتی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو اس اقدام سے روکنے کی حوصلہ افزائی کی جو اس کے خیال میں ناموزوں شادی ہوگی اور اس نے مانیکا کو بھوپال اس کی نانی لیڈی داتر سنگھ کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے لیے بھیج دیا۔ جولائی 1974ء میں مانیکا بھوپال سے واپس آئی۔ اسی مہینے کی 29 تاریخ کو وزیراعظم ہاؤس 1 رصفدر جنگ روڈ میں منگنی کی ایک رسمی تقریب منعقد ہوئی جس کے بعد لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں دونوں خاندانوں کے افراد شریک ہوئے تھے۔ مسز گاندھی نے اپنی ہونے والی بہو کو سونے اور فیروزے کا ایک سیٹ اور تانچوئی ساڑھی دی۔ ایک ماد بعد مانیکا کے جنم دن (26 راگست 1974ء) پر اس نے اسے ایک اطالوی ریشمی ساڑھی دی۔

اس کے فوری بعد سنجے کو ہرنیا کے آپریشن سے گزرنا پڑا۔ صبح کے وقت کالج میں حاضر ہونے کے بعد مانیکا اپنی سہ پہریں اور شامیں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے پرائیویٹ وارڈ میں اپنے منگیتر کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔ اس کی صحت یابی اور ہسپتال سے فراغت کے چند ہفتوں کے بعد سنجے اور مانیکا کی شادی محمد یونس کے گھر ایک عوامی تقریب میں (23 رستمبر 1974ء) کو ہوگئی۔ مسز گاندھی نے اپنی نئی بہو کو فیاضی کے ساتھ تحفے دیئے: اکیس مہنگی ساڑھیاں' سونے کے زیورات کے دو سیٹ' ایک لہنگا اور شاید ان سب سے قیمتی سوت کی بنی ہوئی ایک کھڈی کی ساڑھی جو اس کے باپ جواہر لال نہرو نے تب بنی تھی جب وہ جیل میں تھا۔ مسز گاندھی نے اسی طرح مانیکا کو خوش آمدید کہا تھا جیسے کوئی بھی روایتی ہندوستانی ساس اپنی بہو کو کہتی ہے: اس نے حجلۂ عروسی سجایا' سنگھار کی میز (ڈریسنگ ٹیبل) پر دستکاری کی اشیاء سجائی اور مانیکا کے لیے چوڑیاں منتخب کیں جو وہ اپنی سہاگ رات کو پہنے۔

اگلے تین برسوں میں جو کچھ ہوا اسے گاندھیوں اور آنندوں کے لیے رولر کوسٹر پر سواری قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب سنجے اور مانیکا کی شادی ہوئی تو دونوں خاندان دنیا میں چوٹی پر تھے۔ ان کی بدبختی کا تب آغاز ہوا جب مسز گاندھی اور سنجے ماروتی کے حوالے سے مضحکہ خیز ناکامی سے دوچار ہوئے۔ ہنگامی حالات کے دوبارہ نفاذ نے انہیں دوبارہ چوٹی پر دیکھا۔ جب مسز گاندھی اور سنجے دونوں کو انتخابات میں شکست ہوئی اور ان کے خلاف مقدمہ چلا (مقدمہ چلنا زیادہ مناسب لفظ ہوگا) تو انہیں زوال آ گیا۔ یہ ڈراؤنا خواب دو برسوں پر محیط رہا۔ یہاں

تک کہ ماں بیٹا دونوں اقتدار میں واپس آ گئے۔ سنجے کے کریئر کا خاتمہ تب ہوا جب وہ ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ مانیکا اور اس کی ماں گاندھی گھرانے سے خارج ہو گئیں۔ مسز گاندھی کی زندگی کا خاتمہ 31/اکتوبر 1984ء کو اس کے قتل پر ہوا۔ مانیکا نے پارلیمنٹ کی رکن اور مختصر عرصے کے لیے وزیر بن کر اپنی شادی کے حوالے سے حاصل ہونے والے استحقاق کو حاصل کیا اور اس کی ماں امتیشو رگمنامی میں چلی گئی۔

اس سے پہلے کہ میں ان کے مقدروں میں رونما ہونے والے نشیب و فراز کی تفصیلات بیان کروں بہتر یہ ہے کہ میں ان دونوں خاندانوں کے معاملات میں اپنی شمولیت کی وضاحت کر دوں۔ جب میں ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی ادارت کر رہا تھا اور بمبئی میں قیام پذیر تھا تو سنجے نے ماروتی کے کارخانے کو قائم کرنے میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اسے اور اس کی وجہ سے اس کی ماں کو پارلیمنٹ اور پریس میں سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ الزام لگایا گیا تھا کہ گوڑگاؤں کے نزدیک پالم ائیر پورٹ کے رن وے کے اختتام پر سینکڑوں ایکڑ زرعی اراضی ہریانہ کے مکار وزیراعلیٰ بنسی لال نے کوڑیوں کے مول کار پراجیکٹ کے لیے فراہم کی ہے۔ اس نے دیہاتیوں کی سی سیدھی سادی منطق کے ساتھ کہا تھا: ''بچھڑا پکڑ لو تو گائے آپ چلی آئے گی۔'' سنجے کو مطلوبہ زمین فراہم کر کے بنسی لال نے سنجے اور اس کی ماں کو قابو کر لیا تھا۔

میں نے ماروتی پراجیکٹ کی تفتیش کرتے ہوئے دہلی میں تین دن صرف کیے۔ میں نے اپنے کزن اجیت سنگھ سے ماروتی فیکٹری کے اردگرد زمین کی قیمت معلوم کی تھی جس نے حال ہی میں اس کے نزدیک ایک فیکٹری اور گھر تعمیر کیا تھا۔ اس نے وہی قیمت ادا کی تھی جو سنجے ادا کر چکا تھا۔ میں نے ماروتی پلانٹ کا دورہ کیا۔ میں جنرل موٹرز یا فورڈ کی طرح کے موٹر سازی کے آلات کی توقع کر رہا تھا جبکہ سنجے نے لوہے کی نالی دار شیشوں کی چھت والے دو شیڈ اور ایک فاؤنڈری ہی تعمیر کی تھی۔ اس نے میرے آزمائش کرنے کے لیے ماروتی کا ایک نمونہ تیار کروا رکھا تھا۔ وہ شور بہت مچاتی تھی تاہم اس کی پک اپ اچھی تھی اور سڑک پر خوب چلتی تھی۔ سنجے مجھے تیز تر ڈرائیو کرنے پر اکساتا رہا۔ پھر اس نے کار کا وہیل خود سنبھال لیا اور اسے ہل چلے ہوئے کھیتوں میں اور کچے راستوں پر واقعتاً اڑانے لگا۔ بمبئی واپس آ کر میں نے سرورق پر سنجے کی تصویر کے ساتھ ''السٹریٹڈ ویکلی'' کا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اس کا عنوان رکھا گیا تھا: ''سنجے: کارہائے نمایاں انجام دینے والا انسان۔'' میں نے اسے حساس فوجی علاقے میں زمین سستے داموں فراہم کیے جانے کے الزامات کو مسترد کر دیا۔ سنجے اور اس کی ماں کے پاس میرا شکر گزار ہونے کا جواز تھا۔ مجھے ان کا چمچہ کہا جانے لگا۔

ماروتی سنجے کی زندگی میں کارخانے سے نہیں نکلی۔ میرے اس پراجیکٹ کے دفاع کی اشاعت کے فوراً بعد مسز گاندھی شدید سیاسی مشکلات سے دوچار ہوگئی۔ ایک موقع پر تو وہ استعفیٰ دینے پر غور کرنے لگی تھی۔ سیاسی منظر کے کئی مشاہدین کے مطابق' بشمول میرے' وہ ہر امکانی اعتبار سے سنجے (شاید اپنے بہتان باندھنے والوں کے ممکنہ اقدامات سے خوف زدہ) تھا جس نے اسے جوابی حملے پر قائل کیا— ہنگامی حالت کا اعلان' حزبِ اختلاف کے تمام لیڈروں کی گرفتاری' جمہوری حقوق کی معطلی اور پریس پر دباؤ۔ لہٰذا اس پر عمل درآمد کر دیا گیا: رات کے وقت ملک گیر پیمانے پر چھاپوں کے ذریعے جے پرکاش نارائن اور مرار جی ڈیسائی سمیت ہزاروں سیاسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور پریس پر سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ مسز گاندھی نے سنجے کو اپنے سب سے اہم مشیر کے طور پر مقرر کرتے ہوئے آمرانہ اختیارات حاصل کر لیے۔

بعدازاں 1975ء میں موسم گرما میں ایک اتوار کی سہ پہر میں نے اپنے دروازے کی گھنٹی کو بجتے ہوئے سنا۔ وہ سہ پہر میں نے تیل کی مالش کرنے' اس کے بعد گرم پانی سے نہانے' اپنے لمبے لمبے بالوں کو دھونے اور اپنی ڈاڑھی کو رنگنے کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ مجھے کسی کی آمد کی توقع نہیں تھی اور میں نے دروازے پر بورڈ لگا دیا تھا کہ: ''پلیز اس وقت تک دروازے کی گھنٹی مت بجایئے جب تک آپ کی آمد متوقع نہ ہو۔'' میں غیر متوقع ملاقاتیوں پر غصے بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی خلوت میں دخل اندازی کرنے والے شخص کو سیدھی سیدھی سنانے کے ارادے کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہاں مہنگی ساڑھیاں اور زیورات پہنے اور مہنگی فرانسیسی پرفیوم سے مہکتی ہوئیں دو ادھیڑ عمر عورتیں کھڑی تھیں۔ ''آپ کو اس طرح بغیر اطلاع کے پریشان کرنے پر معذرت'' کے رسمی الفاظ کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں امتیشور آنند ہوں اور یہ میری سہیلی اندرا ڈھوڈھی ہے۔'' میں شرمندہ تھا: میرے گیلے بال کھلے ہوئے تھے اور میرے شانوں پر جھول رہے تھے' میری ڈاڑھی ایک بند میں بندھی ہوئی تھی: ''ایک سردار کی اتواریں کیش اور ڈاڑھی کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔ امتیش مسکرائی اور جواب دیا: ''فکر مت کیجئے میں ایک سردار کی بیٹی اور ایک سردار ہی کی بیوی ہوں۔'' میں نے اسے سردار سنگھ کی بیٹی اور مانیکا کی ماں کے طور پر پہچان لیا۔ ''میں آپ کے والدین اور آپ کے ایک بھائی چنی کو جانتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے ہم پہلے نہیں ملے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! ہماری ملاقات پہلے ہو چکی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے پیرس میں ملی تھی جب آپ یونیسکو میں تھے۔ میں ایک وظیفے (سکالرشپ) پر امریکہ جا رہی تھی۔ ہم

آپ کی چچی سردارنی اجل سنگھ کے توسط سے آپ کے دور کے رشتہ دار بھی ہیں۔'' اس نے اپنی سہیلی کے بارے میں بتایا: ''اندرا اور میں گارمنٹ کو برآمد کرنے کے کاروبار میں ساجھے دار (پارٹنر) ہیں۔''

امتیش نے بتایا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنے آئی تھی۔ مانیکا ایک ماہنامہ رسالہ ''سوریہ'' جاری کرنے کی خواہش مند تھی۔ سنجے نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں مجھ سے ہدایت لیں کہ اسے کس طرح چلانا چاہیے۔ میں تعاون کرنے پر راضی ہو گیا' بشرطیکہ میرے آجر مجھے اجازت دے دیں۔

اگلی صبح میں نے جنرل منیجر کو نوٹ بھیجا کہ مجھے ''سوریہ'' کی معاونت کی اجازت دی جائے۔ وہ ہنگامی حالت کا زمانہ تھا اور لوگ جانتے تھے کہ کون کیا تھا۔ جنرل منیجر نے مجھے ضروری اجازت بھجوا دی اضافی طور پر یہ کہتے ہوئے کہ میں مانیکا گاندھی کے رسالے کی کامیابی کے لیے اپنی سی بہترین کاوش کروں۔

میں دہلی آیا اور مانیکا' سنجے اور امتیش کے ساتھ اس پراجیکٹ پر گفتگو کی۔ میں نے محسوس کیا کہ مانیکا سنجے سے بہت زیادہ مطالبات کرتی رہتی ہے اور وہ اسے کسی ایسی سرگرمی میں مصروف کرنا چاہتا ہے جو اس کے اوپر اس کا دباؤ کم کر دے۔ مجھے ''سوریہ'' کا مشاورتی مدیر بنا دیا گیا۔ رسالے کے ابتدائی آدھے درجن شمارے قریباً سارے کے سارے میرے لکھے یا اصلاح یافتہ یا ایڈٹ کیے ہوئے تھے۔ میں نے مزید کوئی مشاہرہ قبول کرنے سے انکار کر دیا: بلاشبہ میں مسز گاندھی' سنجے' مانیکا اور اس کی ماں کے قریب ہونے پر ہی پھولے نہیں سماتا تھا۔

''سوریہ'' کے کامیاب نہ ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اشتہار بغیر مانگے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ چند شماروں کے بعد سرکولیشن 50000 شماروں تک پہنچ گئی۔ میں پندرہ دنوں میں ایک مرتبہ دہلی جایا کرتا تھا' اپنی شامیں آنندوں کے ساتھ گزارتا' مانیکا اور سنجے سے وزیراعظم کے گھر میں ملاقاتیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں وہاں موجود تھا جب راجیو اور سونیا اپنے ایک بچے کا جنم دن منا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی اور ان کی بیویاں گھر کے مختلف گوشوں میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے بہت تھوڑا سروکار رکھے ہوئے تھے۔ ایک اور مرتبہ میں سنجے کے کمرے میں موجود تھا: اس نے مجھے ایک ہوا بھری سیٹی (نشست) بیٹھنے کے لیے دی' جس پر میں بیٹھا تو وہ زمین سے جا ملی تھی۔ اس نے مجھے چائے کا ایک کپ تھمایا اور کسی سے ملنے چلا گیا۔ دو بہت بڑے گدھے کی جسامت کے کتے' ایک آئرش وولف ہاؤنڈ اور دوسرا شاید گریٹ ڈین اندر داخل ہوئے اور میرے سر پر آ کھڑے ہوئے اور میرے کپ میں رال بہانے لگے۔ اگر میں حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے دانت نکالتے اور غرانے

لگتے۔ خوش قسمتی سے مسز گاندھی سنجے سے ملنے کے لیے آئی تو مجھے مصیبت میں دیکھا اور کتوں کو کمرے سے نکلنے کا حکم دیا۔

ہنگامی حالت کے دوران سنجے نے جو کچھ کیا اس نے اسے ایک عفریت کا تاثر عطا کیا۔ جب اس نے دہلی سے جھونپڑپٹیاں صاف کروائیں تو الزام لگایا گیا کہ اس نے معصوم لوگوں کے گھروں پر بلڈوزر چلوادیئے ہیں' جب اس نے خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا تو اس قسم کی وحشت انگیز کہانیاں پھیلنے لگیں کہ لوگوں کو سنیما گھروں اور بسوں کی قطاروں سے نکالا جاتا ہے اور زبردستی دوا پلا دی جاتی ہے۔ جلد ہی ہنگامی حالت کو ہندوستانی تاریخ کا تاریک دور قرار دیا جانے لگا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلیدی عہدوں پر فائز کئے گئے لوگوں کے جاری کردہ احکامات پر ہزاروں معصوم لوگوں کو گرفتاری اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ بہت سے واقعات میں انہوں نے مسز گاندھی یا اس کے بیٹے کی لاعلمی میں خود ہی کئی اقدامات اٹھائے۔

سب سے زیادہ ڈرامائی شخصیاتی تبدیلیاں آنند خاندان میں رونما ہوئیں۔ کرنل نے سیاسی اور معاشی طاقت حاصل کر لی۔ تاہم سب سے زیادہ حیران کن تبدیلی امتیشور آنند میں ظاہر ہوئی۔ ایک معمولی بے حیثیت عورت سے وہ ہندوستان کی ملکہ اندرا گاندھی کے لیے منتظر خاتون بن گئی۔ وہ ناقابل یقین حد تک متکبر ہوگئی۔ تاہم میں ادراک کر سکتا تھا کہ اقتدار کے ساتھ یہ بے لگام ہنی مون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں رہنے والا۔ جب میں نے اسے وحشیانہ ناانصافی کے واقعات کے بارے میں بتایا تو اس نے وہ اطلاع سنجے اور مسز گاندھی تک پہنچا دی۔ گاندھی آنند رشتے کے ساتھ جو کچھ بیتی وہ مکافات عمل کی کلاسیکی مثال ہے۔ مسز گاندھی کو خبریں پہنچائی گئی تھیں کہ ہنگامی حالات نے اس کی مقبولیت کو ہمیشہ سے زیادہ بلند تر کر دیا ہے اور وہ عام انتخابات کا انعقاد کروا کے اپنے آپ کو قانونی جواز دلوا سکتی ہے۔ سنجے سمجھ دار تھا اور اس نے اسے یہ خطرہ مول نہ لینے کا مشورہ دیا۔ مسز گاندھی نے اس کا مشورہ قبول نہ کیا۔ اس نے ہنگامی حالت اٹھا دی' تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور مارچ 1977ء میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

انتقام جس پیمانے پر لیا گیا اس کا اس نے اور اس کے حامیوں نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ مخالف لیڈروں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پیپلز جنتا پارٹی بنالی اور مسز گاندھی کی کانگرس پر جھاڑو پھیر کر اسے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ مسز گاندھی کو ایک مسخرے راج نارائن نے بری طرح شکست دی' سنجے کو ایک مقامی بندوق باز زمین دار اور پہلوان نے ہرا دیا۔ نوین چاؤلہ' امبیکا سونی اور رخسانہ سلطانہ۔۔۔ تینوں سنجے کے منظور نظر تھے اور لوگ ان سے خوف زدہ

رہا کرتے تھے — مضحکہ خیز اور تماشا بن کر رہ گئے۔ سب سے بڑی چوٹ تو آنند فیملی کے لیے مخصوص تھی — اور ان میں سے سب سے زیادہ سخت ضرب امتیشور اور اس کے خاوند کو لگی۔ مانیکا ہنوز سنجے اور گاندھی کے نام کی حامل تھی۔ تاہم اس کے اچھے دنوں کے ان گنت دوست دہلی کی ہلکی ہوا میں اڑ گئے۔

جنتا حکومت کی طرف سے مسز گاندھی اور اس کی ہنگامی حالت کے دوران ہونے والی زیادتیوں کے خلاف قائم کیے جانے والے مقدموں کے بارے میں بہت وسیع پیمانے پر لکھا جا چکا ہے' اس کے ''گناہوں'' کو شاہ کمیشن کی مرتب کی گئی رپورٹوں میں ریکارڈ کیا گیا ہے۔ گاندھی خاندان کی اندرونی دراڑیں وسیع تر ہو گئیں۔ راجیو کی اپنے کبھی اچھے کام نہ کرنے والے بھائی کے لیے حسد اب نفرت میں ڈھل گئی تھی۔ اس نے خاندان کے سب سے زیادہ سماجی اور سیاسی طور پر معزز مقام سے ذات باہر ہونے تک کے المناک زوال کا ذمہ دار' شاید درست طور پر' سنجے کو ٹھہرایا۔ نہ اس نے اور نہ اس کی اطالوی بیوی سونیا نے مسز گاندھی کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو بندھانے کی کوشش کی اور اپنے ایک خاندان والے خول میں سمٹ گئے۔ سنجے کے پاس لڑائی کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ بحرانی لمحات میں مانیکا نے زبردستی جرأت اور صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ امتیشور نے بھی ادراک کیا کہ اس کا اپنی مختصر دورانئے کی شان و شوکت کو کبھی دوبارہ حاصل کرنے کا موقع صرف اس کی سمدھن اور داماد کے اقتدار کی بحالی میں مضمر ہے۔

میں گاندھی خاندان کے انتہائی بحرانی دنوں میں ان کے شانہ بشانہ کھڑا رہا۔ میرے خاندان کے افراد مجھ پر سخت تنقید کر رہے تھے' اسی طرح میرے تمام دوست بھی۔ ادھر کچھ خوشگوار لمحے گزرے تھے۔ میں اپنے دہلی کے دوروں میں آنندوں اور گاندھیوں سے ملاقاتیں کرتا۔ ''سوریہ'' پر کام کرتا تھا۔ مجھے چند نہایت ندامت سے بھرے ہوئے لمحات سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ ایک صبح مانیکا سنجے کو میرے اپارٹمنٹ لے کر آئی۔ جب میں ان سے گفتگو کر رہا تھا میری تین سالہ پوتی نینا میری بیوی کا ہاتھ پکڑے داخل ہوئی۔ اس نے مانیکا کے پرجوش خیر مقدم ''ہائی نینا!'' کا جواب کشادہ مسکراہٹ سے دیا۔ مانیکا نے اس سے کہا: ''سنجے کو نمسکار کہو' نینا چند قدم بڑھی اور اپنا چہرے سنجے کے چہرے سے چند انچ دوری پر لا کر کہنے لگی ''نہیں — سنجے بہت برا آدمی ہے۔ اس کی ماں بھی بہت بری عورت ہے' لوگوں کو جیل میں ڈالتی ہے۔'' میں تو نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سنجے زرد پڑ گیا تھا' مانیکا کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا تھا: ''وہ ننھے بچوں کی برین واشنگ کر رہے ہیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔ میری بیوی نے صورتحال کو سنبھالا: ''بیٹا! ایسے نہیں بولتے کوئی کہے کہ تیری ماں بری عورت ہے تو تجھے کیسا لگے

گا؟'' نینا سنجے میں دلچسپی کھو بیٹھی اور اپنی نانی سے پوچھنے لگی کہ جیل کیا ہوتی ہے اور کیا یہ سچ ہے کہ اس میں دروازے اور کھڑکیاں نہیں ہوتے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ سنجے دوبارہ ہمارے گھر کبھی نہیں آئے گا۔ وہ اسی سہ پہر دوبارہ آ گیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور میں اپنے اپارٹمنٹ کے عقبی حصے میں لان میں دھوپ تاپ رہا تھا جب ہم گفتگو کر رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ باڑھ کی دوسری طرف کچھ گلی کے بچے جمع ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں ڈر گیا کہ کہیں ایک اور سنجے مخالف مظاہرہ نہ ہو۔ تاہم میری تسلی ہوئی' جب ہم کھڑے ہوئے تو لڑکوں نے نعرہ لگایا ''سنجے گاندھی! زندہ باد۔''

مصیبت دونوں خاندانوں کے کردار کے دوسرے پہلوؤں کو سامنے لے آئی۔ جیسے ہی مرارجی ڈیسائی کی حکومت نے اندرا گاندھی' سنجے اور دوسرے اہل کاروں کے خلاف' جنہوں نے ہنگامی حالت میں نمایاں کردار ادا کیا تھا' مہم شروع کی تو اندرا گاندھی نے اپنی مایوسی کی کیفیت سے جلد چھٹکارا پا لیا۔ اسے منظر سے ہٹنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی سنجے کو اجازت تھی۔ وہ لڑنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔

چونکہ سنجے ڈیسائی حکومت کا مرکزی ہدف تھا' اس لیے مسز گاندھی کی مادرانہ جبلتیں اس کو کسی نقصان سے بچانے کے لیے مرتکز ہو گئی تھی۔ سنجے (اور وی۔سی۔ شکلاً ہنگامی حالات کے دوران میں وزیر اطلاعات ونشریات) کے خلاف الزمات میں سے ایک الزام یہ تھا کہ انہوں نے مسز گاندھی کے اقتدار کی ہوس کی انتہائی اہانت آمیز تصویر کشی کرنے والی فلم ''قصہ کرسی کا'' کے نیگیٹو تباہ کر دیئے تھے۔ مقدمہ دونوں کے خلاف چلایا گیا اور انہیں مجرم ٹھہرائے جانے کا خوف لاحق ہو گیا سنجے نے محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے دفاع کے لیے نانی پالکھی والا کو حاصل کر لے تو اس کی جنگ آدھی سے زیادہ جیتی جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ نانی میرا دوست ہے اور اس نے مجھے اس تک رسائی کرنے کے لیے کہا۔ نانی' جو انتخابات کے مقدمے میں مسز گاندھی کا دفاع کر چکا تھا۔ تب اس سے پیچھے ہٹ گیا تھا جب اس نے ہنگامی حالت نافذ کی تھی۔ اس کے علاوہ سنجے اسے ستاتا بھی رہا تھا۔ تاہم میں نے نانی کو سنجے اور مانیکا کا استقبال کرنے پر قائل کر لیا۔ اس نے مہربانی کرتے ہوئے انہیں ناشتے پر مدعو کر لیا۔

سنجے اور مانیکا کا بمبئی کا دورہ بالکل ایک تجربہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بمبئی جانے کے لیے دہلی سے روانہ ہوؤں مسز گاندھی نے مجھے بلا بھیجا اور خوف ظاہر کیا کہ کہیں اس کے بیٹے پر تشدد نہ کیا جائے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں اس کا خیال رکھوں گا اور اسے اپنے ساتھ ٹھہراؤں گا۔ جس صبح ان دونوں نے پہنچنا تھا ایک ہجوم میرے اپارٹمنٹ کے باہر والی گلی

میں اکٹھا ہو گیا۔ میں نے سنجے کو فون کر کے اپنا دورہ ملتوی کرنے کا کہا۔ وہ آنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ میں جوڑے کا استقبال کرنے سانتا کروز ائیر پورٹ پہنچا۔ وہاں سنجے مخالف نعرے لگاتا ہوا ایک زیادہ بڑا ہجوم موجود تھا۔ ہم شور مچاتے ہوئے ہجوم میں سے یوں ڈرائیو کرتے گزرے کہ سیکورٹی اہل کاروں سے بھری ہوئی کار ہماری گاڑی کے عقبی فینڈر سے چند انچوں کے فاصلے پر چل رہی تھی۔ آرتھر بندر روڈ' جہاں میں رہتا تھا' ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ سنجے اور مانیکا اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے' میں اپنے دفتر چلا آیا اور انہیں فون کر کے کہا کہ سہ پہر میں جب سڑک کھل جائے تو وہ میرے گھر منتقل ہو جائیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ میرے فلیٹ کے گرد گھیرا میرے دوست سولی سوراب جی نے نانی پالکھی والا کے کہنے پر ڈلوایا تھا۔ وہ سنجے اور مانیکا کو اس وقت میرے ساتھ قیام نہیں کرنے دینا چاہتے تھے جو کہ ہجوم کے غیض و غضب سے مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔ شام کے وقت میں سنجے اور مانیکا کو اپنے اپارٹمنٹ لانے کے لیے گیا۔ ہجوم دوبارہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ جونہی سنجے بالکونی میں آیا ہجوم نے چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینا شروع کر دیا۔ سنجے ایک لفظ بھی بولے بغیر انہیں چمک دار آنکھوں کے ساتھ دیکھتا رہا۔ مانیکا نے اسے پکار کر واپس بلایا۔ میں دونوں کو اندر لے آیا اور جن لوگوں کو اس جوڑے سے ملنے کے لیے مدعو کر چکا تھا انہیں فون کرنے نہ آنے کا کہا۔ بااین ہمہ شوبھا دی نے کہا کہ اسے تو میرا پیغام ملا ہی نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ تاج گئی جہاں میں اپنے مہمانوں کو ڈنر کے لیے لے گیا تھا۔ پولیس کی ایک کار ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ڈنر کرتے ہوئے' شوبھا نے معذرت چاہتے ہوئے اجازت لی۔۔۔ میں سمجھا وہ رفع حاجت کے لیے گئی ہے۔ چند منٹ بعد فوٹو گرافر موقعے پر آن دھمکے۔ میں نے سنجے اور مانیکا سے معذرت چاہی۔ انہوں نے میری معذرت قبول کر لی کہ میرا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انہوں نے رات اپنے دوستوں کے ساتھ گزاری۔ اگلی صبح میں انہیں لے کر نانی پالکھی والا سے ملنے گیا۔ ناشتے پر سنجے نے نانی کو اپنا مقدمہ لینے کی بات چھیڑی۔ نانی نے مہذبانہ انداز میں معذرت کر لی۔ ''میں معذرت خواہ ہوں' میں آپ کے لیے حاضر نہیں ہو سکتا۔'' اس نے کہا تھا۔

اس سہ پہر میں دونوں کو لنچ کے لیے جم خانہ کلب لے گیا۔ بات پھیل گئی اور جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو دروازے پر فوٹو گرافروں کا ہجوم ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ایئر پورٹ واپسی میں بھی یہی صورتحال درپیش تھی۔ سنجے کے لیے ایئر لائنز کے صرف ایک اہلکار نے تعظیمی اقدام کیا' اس نے اس کا ٹکٹ لیا' اسے بورڈنگ پاس دیا اور اسے ہجوم سے نکال کر وی۔ آئی۔ پی لاؤنج میں۔۔۔ اور آگے ہوائی جہاز تک پہنچا آیا۔ میں سنجے کی بغیر کوئی ضرر پائے واپسی پر بہت خوش تھا۔ میں نے مسز گاندھی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اس کا بیٹا واپس روانہ ہو چکا ہے۔

میں سنجے اور مانیکا کے ہمراہ تھا جب اسے شاہ کمیشن کے سامنے پیش ہونا تھا۔ سنجے پریشانی کی توقع کررہا تھا اور اس نے اپنے پہلوان اپنے ساتھ لے لیے تھے۔ کمرہ سنجے مخالف غنڈوں سے بھرا ہوا تھا۔ جونہی وہ داخل ہوا غل غپاڑہ مچ گیا اور ہاتھا پائی ہونے لگی اور کرسیاں پھینکی جانے لگیں۔ سنجے کی قمیض پھٹ گئی تھی۔ وہ خالی مکوں کے ساتھ لڑتا رہا۔ وہ ایک طاقتور آدمی تھا' جس طرح اس نے اپنا دفاع کیا' میں اس سے متاثر ہوا۔ مانیکا بھی شور شرابا مچاتی رہی۔ میں نے پولیس کے کرن بیدی کے پیچھے پناہ لے لی اور منظر کو دیکھتا رہا۔ کمیشن کے لیے ان دونوں کے دل میں جو احترام تھا اس کا مظاہرہ مانیکا نے کیا۔ وہ ریلنگ پر چڑھ گئی' جسٹس شاہ کے قلمدان سے دو قلم (Pens) نکالے اور بطور یادگار مجھے دے دیئے۔

یہ ان دنوں کے دوران میں ہورہا تھا جب مجھے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا سے نکال دیا گیا تھا اور دہلی واپس آ گیا تھا۔ میں نے ''نیشنل ہیرالڈ'' کی ادارت سنبھالی ہوئی تھی جس کا مالک گاندھی خاندان تھا۔ ایک سہ پہر میں نے اپنی میز پر ایک پیکٹ پڑا ہوا پایا جس میں بابو جگ جیون رام کے بیٹے سریش کمار کی کالج کی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ مجامعت کرتے ہوئے درجن بھر تصویریں تھیں۔ تصویروں میں انہیں مختلف طریقوں سے دکھایا گیا تھا۔ مانیکا کو اپنے ''سوریہ'' والے دفتر میں ایسا ہی پیکٹ ملا۔ اس شام ایک آدمی اپنے آپ کو جگ جیون رام کا ایک نمائندہ قرار دیتے ہوئے مجھے ملنے آیا۔ اس نے کہا کہ بابو جی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کو دھوکا دینے اور مسز گاندھی کے ساتھ آ ملنے پر رضامند ہیں بشرطیکہ ان کے بیٹے کی تصویریں نیشنل ہیرالڈ یا سوریہ میں شائع نہیں کی جائیں۔ میں اس پیکٹ کو ساتھ لے کر مسز گاندھی کے گھر چلا گیا۔ جونہی میں نے اس موضوع پر بات چھیڑی اس نے مجھے باغ میں چلنے کا کہا: اسے شبہ تھا کہ اس کے گھر میں سراغرسانی کے آلات لگے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ سریش کمار اور اس کی دوست کی انتہائی فحش تصویریں دیکھ چکی ہے۔ ''ہاں''۔ اس نے جواب دیا۔ مانیکا نے وہ تصویریں اسے دکھائی تھیں۔ میں نے اسے اس پیشکش کا بتایا جسے مجھے آگے پہنچانے کا کہا گیا تھا۔ ''میں اس شخص پر بھروسہ نہیں کرتی۔'' اس نے جواب دیا: ''جگ جیون رام مجھے اور میرے خاندان کو ہر کسی سے زیادہ نقصان پہنچا چکا ہے۔ تم اسے بتا دو کہ میرے مانیکا کو تصویریں شائع نہ کرنے کا کہنے سے پہلے اسے میرے پاس آنا ہوگا۔''

اس کے بعد کچھ نہ ہوا۔ سوریہ اور نیشنل ہیرالڈ دونوں نے پورا سیٹ' فحاشی کے مقدمے سے بچنے کے لیے دونوں محبت کرنے والوں کے اعضائے تناسل پر سیاہ پٹی کے ساتھ شائع کر دیا۔

چند مہینوں بعد کرنل آنند کا جسم دہلی کے قریب واقع ان کے فارم کے پاس ایک

کچے راستے پر پڑا ہوا پایا گیا۔ ایک بھرا ہوا پستول اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا۔ امتیش اور مانیکا نے اسے قتل کا مقدمہ بنانے کی کوشش کی مگر فیصلہ خودکشی کا آیا۔

کرنل نے زندگی محبت حاصل کیے بغیر گزاری تھی اور ایک دن اس نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ خودکشی کا رجحان بھی رکھتا تھا۔ یہ رجحان خاندان میں سرایت کرگیا۔ ایک یا دو سال بعد اس کے بھائی نے اپنی بیوی سے جھگڑے کے بعد زہر کھالیا۔ اس کا جسم چنڈی گڑھ میں سکھنا جھیل کے کنارے پر اُتھلے پانی میں پڑا ہوا پایا گیا کرنل آنند کی رخصتی بہت زیادہ ماتم گساری کے بغیر ہی ہوئی۔ معمول کی ''بھوگ'' کی تقریب ہوئی جس میں اندرا گاندھی موجود تھی۔ اس کے بعد میں نے کسی کو اس کے بارے میں بات کرتے نہیں سنا۔

جنتا کے ڈھائی سالہ عہد اقتدار میں، جس کے دوران میں مسز گاندھی دو بار قید ہوئی (ایک مرتبہ رات بھر کے لیے، دوسری مرتبہ چھ دنوں کے لیے) اس کے بڑے حوصلہ افزائی کرنے والے سنجے اور مانیکا تھے (جس کے پس پشت امتیشور تھی)۔ مانیکا کے لیے یہ آزمائش کا وقت تھا: کالج میں جماعتوں میں حاضر ہوتے ہوئے، ''سوریہ'' شائع کرتے ہوئے، جیل میں اپنے شوہر سے ملتے ہوئے یا اس کے ہمراہ شاہ کمیشن کو جاتے ہوئے، عوامی مظاہرے منظم کرتے ہوئے اور معاندانہ ہجوموں کا سامنا کرتے ہوئے۔ خاندان کے چند ایک دوست ہی بچ گئے تھے۔ میں ان چند میں سے ایک تھا۔

گاندھیوں اور آنندوں کے لیے ڈراؤنا خواب جنوری 1980ء میں ختم ہوا جب مسز گاندھی جنتا پارٹی پر شاندار انتخابی فتح حاصل کرتے ہوئے اپنی وزارت عظمیٰ کو دوبارہ جیت گئی۔ سنجے (اور اس کے ساتھ مانیکا) ایک مرتبہ پھر دنیا میں چوٹی پر تھے۔ اور ان کے کندھوں پر سوار ہوتے ہوئے امتیشور آنند بھی۔ اس کی انا کا غبارہ حالیہ ادوار میں ایک سے زیادہ مرتبہ پچکنے کے بعد دوبارہ خودتوقیری سے پھٹ رہا تھا۔

مشکلات کا دورانیہ بہت ہی مختصر تھا۔ سوموار 23 جون 1980ء کی صبح سنجے نے دہلی میں جنوبی پہاڑی سلسلے پر اپنا دونشستوں والا جہاز گرا کر اپنے آپ کو (اور اپنے معاون پائیلٹ کو کیپٹن سکسینہ کو) مارلیا۔ اس وقت امتیشور اور اس کی دوسری بیٹی امبیکا انگلینڈ میں چھٹیاں منا رہی تھیں۔ انہیں یہ خبر سوراج پال نے پہنچائی، وہ ایک کاروباری (بزنس مین) تھا اور خود کو گاندھی۔ آنند خاندان کے لیے وقف کرچکا تھا۔ امتیشور اور امبیکا کو دہلی واپس لانے کے لیے خصوصی طور پر ایئر انڈیا کے چارٹرڈ جہاز میں سوار کرایا گیا۔

جہاز روم ایئرپورٹ پر راجیو اور سونیا کو لینے کے لیے اترا جو سونیا کے والدین کے ساتھ رہنے آئے ہوئے تھے۔ جہاز کے دوسرے مسافر ایک جہاز راں کمپنی کا مالک سمتی مرار جی

اور وی۔سی۔ شکلا تھے۔ وہ فرسٹ کلاس کے نچلے ڈیک پر تھے جبکہ دیگر فرسٹ کلاس لاؤنج میں بالائی ڈیک پر تھے۔ وقفے وقفے سے سمتی‘ وی۔سی۔ شکلا اور سوراج پال آنندوں کو رفاقت دینے کے لیے آتے تھے۔ وہ تینوں امتیشور کو تاکید کر رہے تھے کہ اسے دونوں خاندانوں کو یکجا رکھنے کے لیے اپنی سی بہترین کاوشیں کرنی چاہئیں۔ اور اب جبکہ سنجے چلا گیا تھا تو انہیں راجیو کے پیچھے صف بستہ ہو جانا چاہیے۔

سنجے کی موت ہر کسی کے لیے گہرا صدمہ بن کر آئی۔ میں تو شل ہو کر رہ گیا تھا۔ ''ایوننگ نیوز'' میں شائع ہونے والے اور اگلی صبح ''ہندوستان ٹائمز'' میں نقل ہونے والے اپنے انتہائی جذباتی اظہار عقیدت میں میں نے تجویز دی کہ سنجے کی ذمہ داری فطری طور پر اس کی نوجوان بیوہ کے کندھوں پر آ گئی ہے جو اس کے شانہ بشانہ کھڑی تھی اور اس کے ہندوستان کے خواب میں شریک تھی۔ راجیو نے کبھی سیاست میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی اور اس کی بیوی نے اس کے لیے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اس جذباتی صدمے پر اپنی محبتوں کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔ ایک جملہ جو میں نے مانیکا کو تشفی دینے کے لیے استعمال کیا یوں بن گیا جیسے مردہ البطروس میری گردن پر سوار ہو۔ میں نے لکھا کہ وہ کوئی کھوکھلا کردار نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ سوچتے ہیں ''جب ابھرے تو وہ چیتے پر سوار درگا بن سکتی ہے۔'' اس کو میرے مانیکا کو دیوی بنانے سے تعبیر کیا گیا۔ دوسروں کے درمیان جنہوں نے سوچا کہ میں شرارتاً مانیکا کو راجیو کے خلاف اکسا رہا ہوں‘ اندرا گاندھی بھی تھی۔

اگر مسز گاندھی مانیکا کے خلاف کوئی ناراضی رکھتی تھی تو جب تک سنجے زندہ تھا اس نے اس حوالے سے نہ تو کچھ کہا اور نہ کچھ کیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس یقین میں کچھ سچائی ہو کہ وہ اپنے دوسرے بیٹے سے محبت بھی کرتی تھی اور اس سے خوفزدہ بھی تھی۔ سنجے اپنی ماں کے گھر کی نسبت آنند کے گھر زیادہ پرسکون ہوا کرتا تھا۔ آنندوں کے گھر میں اسے ہر کوئی غیر معمولی اہمیت دیا کرتا تھا‘ بشمول گھر کے نوکروں کے جبکہ اپنی ماں کے گھر میں اس کا اپنا بڑا بھائی اس کا رقیب تھا۔ مسز گاندھی اپنے گھر پر سنجے کی آنند کے گھر کے لیے ترجیح کو ناپسند کرتی تھی۔ سنجے کی المناک موت کے بعد گاندھیوں نے مانیکا کو یہ باور کرانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا کہ وہ وزیراعظم کی رہائش گاہ میں غیر موزوں ہے۔ سنجے کی موت کے ایک ہفتے بعد مسز گاندھی نے مانیکا کو اپنی سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کی تجویز دی۔ چند دن بعد دھیریندر برہمچاری اس کے کمرے میں یہ اطلاع دینے آیا کہ مسز گاندھی اسے یہ بتاتے ہوئے بہت شرمندہ ہیں تاہم سونیا نے اس تجویز کو ناپسند کیا ہے اور اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر مسز گاندھی مانیکا کو کی ہوئی پیشکش واپس نہیں لیتی تو وہ اپنے خاندان سمیت اٹلی واپس چلی جائے گی۔ مجھے تھوڑا سا شبہ ہے کہ سونیا

سب سے زیادہ چہیتی بہو تھی جیسے کہ سنجے سب سے زیادہ چہیتا بیٹا تھا۔ اب جبکہ سنجے چلا گیا تھا تو مسز گاندھی کے پاس اپنے بچ جانے والے واحد بیٹے راجیو کی طرف مائل ہونے کے علاوہ اور کوئی انتخاب نہیں تھا۔ وہ مانیکا کے لیے کوئی زیادہ انسیت نہیں رکھتی تھی اور امتیشور کے احساس برتری پر خفا تھی۔ اس احساس کو کھلی معاندت میں تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

مسز گاندھی مانیکا کی موجودگی سے زیادہ سے زیادہ مشتعل ہونے لگی اور اس کے ہر کام میں غلطیاں ڈھونڈنے لگی۔ مسز مارگریٹ تھیچر کے اعزاز میں دیئے گئے ایک رسمی بینکوئٹ میں راجیو اور سونیا تو مہمان خصوصی کے ساتھ مرکزی میز پر فروکش تھے جبکہ مانیکا دھون اور اوشا بھگت کے ساتھ عملے کے لیے مخصوص میز پر پیچھے بٹھائی گئی تھی۔ مسز گاندھی نے مجھے بتایا کہ مانیکا لوگوں کے ساتھ غیر شائستہ ہوگئی تھی اور ایک روز اس نے مجھے بلوا بھیجا اور مجھے مانیکا سے رویہ بہتر کرنے کے لیے کہنے کا کہا۔

میں نے اسے ''ہندوستان ٹائمز'' کے عملے میں رکھ لینے کی پیشکش کی اور اس بارے میں کے۔ کے۔ برلا سے بات کی۔ وہ مسز گاندھی کی طرف سے اسے کہنے یا نوٹ لکھ بھیجنے پر ایسا کرنے کے لے راضی تھا۔ اس نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا۔ مانیکا کو ''سوریہ'' سے تعلقات سادہ کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ ''ایک چیتھڑا'' تھا۔ (جوکہ وہ ہمیشہ مسز گاندھی کی منظوری سے رہا تھا) مانیکا کو' جو جانوروں کی بے انتہا شوقین تھی اور تحفظ حیوانات کی سوسائٹی کی صدر منتخب ہوچکی تھی' مستعفی ہونے کا کہا گیا۔ اس نے اپنے خاوند کی ایک ذاتی سوانح عمری لکھی۔ مسز گاندھی کی منظوری کے بعد اس کے اجراء سے دو ایک دن پہلے مسز گاندھی نے اس میں سنگین غلطیاں پائیں۔ تمام طبع شدہ جلدوں کو واپس لینا پڑا اور اس کی جگہ ایک نیا نسخہ' دو جملوں سے زیادہ تبدیلیاں کیے بغیر' جاری کیا گیا۔ مسز گاندھی نے امتیشور سے اپنی بے رخی کو مانیکا پر عیاں کردیا: امتیشور نے 1۔ صفدر جنگ روڈ پر جانا بند کردیا۔

دونوں خاندان بہت ہی زیادہ توہم پرست تھے۔ سنجے کی موت کے چند دن بعد مجھے امتیشور سے اس کے جوڑ باغ میں واقع گھر میں ملنے کا موقع ملا۔ میں نے ایک پروہت کو دھوتی اور کھڑاؤں پہنے سنسکرت میں شلوک بدبداتے گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی پانی سے بھرا ہوا مٹی کا گھڑا لیے چل رہا تھا۔ اور اس آدمی کے پیچھے امتیشور آنند تھی۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے اس سے دریافت کیا تھا۔ وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکی جب اس نے مجھے بتایا: ''مسز سکسینہ' سنجے کے ساتھ ہلاک ہونے والے معاون پائلٹ کی بیوہ نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ اس کے خواب میں دولڑکے آئے اور انہوں نے شکایت کی ہے وہ جہاں ہیں وہاں وہ بہت پیاسے ہیں۔ میں نے اس پنڈت جی سے مشورہ کیا اور اس نے ہدایت کی کہ

مسز گاندھی کے گھر کے باہر ایک ''پیاؤ'' (سبیل) کا انتظام کیا جائے۔ میں یہی کرنے جا رہی ہوں۔'' مانیکا کو ایک آدھے چاند اور ستارے والا ہار تحفہ میں دیا گیا تھا۔ وجے راجی سکنڈیہ نے اسے بتایا کہ یہ لوگوں کو بیماری میں مبتلا کرنے والا تانتری ٹوٹکا ہے۔ مانیکا نے' جو بھلا محسوس نہیں کر رہی تھی' اسے اتار پھینکا اور دفعتاً بہتر محسوس کرنے لگی۔

مسز گاندھی اور مانیکا کے درمیان رشتہ تیزی سے ٹوٹ گیا۔ مانیکا کے مطابق اس نے مسز گاندھی کو ناراض کرنے والا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ امتیشور نے مسز گاندھی سے گویا قریباً انتقام لینے کے لیے — اس واضح جواز کے ساتھ کہ جب مسز گاندھی کو سودمند لگتا تھا تو وہ اس رسالے کو اپنے دشمنوں کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی — ''سوریہ'' کو آر۔ ایس۔ ایس کے سابقہ رکن ڈاکٹر جے۔ کے۔ جین کے توسط سے مسز گاندھی کے شدید مخالف وجے راجی سکنڈیہ کو فروخت کرنے کے لیے مذاکرات کیے۔ مسز گاندھی نے امتیش اور اس کی بیٹی کے لیے یہی موقع چھوڑا تھا کہ وہ یا تو ''سوریہ'' کو بند کر دیں یا اسے فروخت کر دیں۔ مودی جیسے صنعت کاروں کو' جو اس کے مدد کرتے تھے' راجیو نے بتا دیا تھا کہ مسز گاندھی اس رسالے کو ان کے اشتہارات دینے کو پسند نہیں کرتی ہے۔ چرن جی جیسے دوسروں نے اپنے بقایاجات ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ خفیہ طور پر انجام دیا گیا ایک بہت خاموش اقدام تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی' جسے مجھے اس رسالے کو لے لینے کے لیے قائل کرتا رہا تھا' اس سودے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ (اور آج تک نہیں جانتا کہ کتنا پیسہ کس صورت میں ادا کیا گیا تھا) یہ اس دن کی بات ہے جب سودا طے ہو گیا تھا' امتیش ڈاکٹر جین کو میرے اپارٹمنٹ لے کر آئی تا کہ اس کا اعلان اخباروں میں کروایا جائے۔ (فروری 1982ء)۔ یہ بات ہر کسی پر واضح ہو گئی تھی کہ مانیکا کے 1۔ صفدر جنگ روڈ میں دن گنے جا چکے ہیں۔ واحد امکان یہی تھا کہ وہ کسی بھی وقت رخصت ہو جائے گی۔ مسز گاندھی' جو قابل فیصلہ معاملات کے بارے میں اپنے علاوہ کسی کو بھی آگاہ نہیں رکھتی تھی' کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ مانیکا نے جب ایک مرتبہ اپنی ساس سے الگ ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے تہیہ کیا کہ اس مرتبہ علاحدگی کا وقت اور شرائط وہ خود طے کرے گی۔ اس نے درست دن سے ہفتوں پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ اسے کس دن ''نکال پھینکا'' جائے گا۔

مانیکا نے وقت کا انتخاب بہت احتیاط کے ساتھ کیا تھا۔ مسز گاندھی انڈیا فیسٹیول میں شرکت کے لیے سونیا کو ساتھ لے کر لندن گئی ہوئی تھی۔ راجیو اپنے آپ کو استوار کرنے میں بہت محو تھا اور گھر آ کر کھانوں پر مانیکا سے ملاقات ہونے سے گریز برت رہا تھا۔

مانیکا اور اکبر احمد نے سنجے وچار منچ کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ مسز گاندھی نہیں جانتی کہ اس کے بیٹے کے آدرشوں (آئیڈیلز) کی ترویج کا دعویٰ کرنے والی تنظیم کے لیے نامنظوری کیسے

دے۔ افتتاحی تقریب میں کی گئی مانیکا کی تقریر کا متن (جس کے بارے میں مانیکا کا دعویٰ تھا کہ وہ مسز گاندھی کا منظور شدہ تھا) راجیو نے لندن تار کے ذریعے بھیجا۔ مسز گاندھی نے فیصلہ کیا کہ اپنی بہو سے نجات پانے کے لیے جس موقع کا اسے ان تمام مہینوں میں انتظار تھا' وہ حاصل ہو گیا ہے۔

مسز گاندھی 28/مارچ 1982ء کی صبح لندن سے واپس آئی ___ فوری اقدام کا تہیہ کیے ہوئے۔ جب مانیکا اسے سلام کرنے آئی تو اس نے روکھے پن کے ساتھ اسے واپس بھیج دیا: ''میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔'' اسے پیغام بھجوا دیا گیا کہ دوپہر کے کھانے پر خاندان کے ساتھ اس کی توقع نہیں ہے اور اس کا کھانا اس کے کمرے میں بھیج دیا جائے گا۔ قریباً ایک بجے اسے ایک اور پیغام بھیجا گیا کہ وزیر اعظم اس سے ملاقات کرنا پسند کریں گی۔ مانیکا تحقیر و تذلیل کے لیے تیار تھی۔ وہ نشست گاہ (سٹنگ روم) میں تھی جب مسز گاندھی ننگے پاؤں داخل ہوئی۔ اس نے دھون اور دھیریندر برہمچاری کو ان باتوں کا عینی شاہد ہونے کے لیے اندر آنے کا کہا جو اس نے مانیکا سے کہنا تھیں۔ مانیکا کے مطابق وہ غصے سے کھول رہی تھی اور جب اس نے مانیکا کی طرف انگلی اٹھا کر چیختے ہوئے کہا تو بمشکل سمجھ میں آیا: ''تم فوراً اس گھر سے نکل جاؤ۔'' مانیکا نے معصومیت کا دکھاوا کیا اور پوچھا: ''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' مسز گاندھی نے چیخ کر کہا: ''میں نے تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ سن لیا ہے!'' مانیکا نے کہا: ''اسے تو آپ نے منظور کیا تھا۔'' یہ بات مزید اشتعال انگیز ثابت ہوئی۔ مسز گاندھی نے اس پر اپنی خواہشات کی خلاف ورزی کا الزام لگایا اور مزید کہا: ''تمہارے کہے ہوئے ہر لفظ میں زہر چھپا ہوا تھا۔ اسی لمحے نکل جاؤ۔ دفع ہو جاؤ!'' اس نے چیخ کر کہا تھا: ''تمہیں تمہاری ماں کے گھر تک لے جانے کے لیے کار منگوالی گئی ہے۔'' مانیکا اپنے مؤقف پر قائم تھی۔ وہ اپنی ماں کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی اور سامان باندھنے کے لیے مہلت چاہتی تھی۔ ''جہاں تمہیں کہا گیا ہے تم وہاں جاؤ گی۔ تمہاری چیزیں تمہیں بعد میں بھجوا دی جائیں گی۔'' مسز گاندھی نے کہا اور امتیشور کے بارے میں دوبارہ سخت الفاظ استعمال کیے۔ مانیکا نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیا اور یہ چلاتی ہوئی اپنے کمرے میں لوٹ گئی کہ وہ اپنی ماں کی بے عزتی کی اجازت نہیں دے گی۔ مسز گاندھی اس کے پیچھے پیچھے ننگے پاؤں اتنی بلند آواز میں چلاتی ہوئی آئی کہ باہر عملے اور سنتریوں نے بھی سنا: ''نکل جاؤ! دفع ہو جاؤ!'' اسی اثنا فیروز ورین کو مسز گاندھی کے کمرے میں لایا گیا۔

مانیکا کے دوست اخبارات میں خبریں چھپوانے میں مصروف تھے۔ وزیر اعظم کے گھر جانے سے پہلے امبیکا نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس کی بہن کے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے اور اس

اطلاع کو پھیلانے کا کہا۔ 9 بجے دروازوں کے باہر فوٹوگرافروں اور رپورٹروں کا ہجوم' بشمول غیر ملکی نامہ نگاروں کے اکٹھا ہونا شروع ہوگیا۔ مسز گاندھی ہمیشہ غیر ملکی پریس سے کافی خوف کھاتی اور نفرت کرتی تھی۔ پولیس کو جو گھر تک رسائی والے مختلف مقامات پر جمع تھی' مکمل طور پر ہدایات نہیں دی گئی تھیں کہ کس کو روکنا ہے اور کسے گزر جانے کی اجازت ہے۔

منٹوں بعد امبیکا اور اس کا بھائی گھر پر پہنچ گئے۔ آٹھ برسوں میں پہلی مرتبہ انہیں روک دیا گیا۔ ان کی آمد کے بارے میں مسز گاندھی کو اطلاع بھیجی گئی اور اسے بتایا گیا کہ امبیکا صحافیوں سے گفتگو کر رہی ہے۔ ان کی کار کو داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی اور وہ دونوں مانیکا کے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے مانیکا کو روتے ہوئے جو کچھ ممکن تھا اپنے صندوقوں میں رکھتے ہوئے پایا۔ دفعتاً مسز گاندھی اندر آئی اور مانیکا کو حکم دیا کہ وہ کوئی بھی چیز لیے بغیر وہاں سے رخصت ہو۔ امبیکا نے کہا: ''یہ نہیں جائے گی۔ یہ اس کا گھر ہے۔'' مسز گاندھی کی امبیکا کے لیے ناپسندیدگی میں لڑکی کی تیز زبان کے خوف کی جھلک ابھری۔ ''یہ اس کا گھر نہیں ہے'' مسز گاندھی چلائی ''یہ ہندوستان کی وزیراعظم کا گھر ہے۔ یہ لوگوں کو میری اجازت کے بغیر نہیں لاسکتی۔ امبیکا آنند میں تم سے کسی صورت بات نہیں کرنا چاہتی۔'' امبیکا دبنے والوں میں سے نہیں تھی۔ ''تمہیں میری بہن سے اس انداز سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سنجے کا گھر ہے اور وہ سنجے کی بیوی ہے۔ کوئی اسے یہاں سے نکلنے کا حکم نہیں دے سکتا۔'' مسز گاندھی کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ چلانے لگی: ''میں نے تو اسے نکل جانے کا نہیں کہا' یہ تو خود سے جارہی ہے۔'' اس نے ایک مرحلے پر کہا: ''میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' مسز گاندھی نے کہا: ''تم نے زندگی میں کبھی سچ نہیں بولا۔'' دونوں بہنوں نے جوابی حملہ کیا۔ جو ایک دوسرے کی موجودگی کی وجہ سے شیر ہوگئی تھیں۔ لڑائی مسز گاندھی ہار رہی تھی' اس نے ہسٹریائی انداز میں چلانا شروع کر دیا اور اسے دھیریندر برہمچاری کی معیت میں کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اس کے بعد بے یارومددگار دھون کے ذریعے پیغامات پہنچوانے پڑے' جس نے دونوں لڑکیوں کی زبان کے کوڑوں میں اپنا حصہ وصول کیا۔۔۔ اور اپنی اذیتوں کے مداوے کے طور پر مانیکا کے آئرش وولف ہاؤنڈ شیبا سے کٹوایا بھی گیا جو اس ہنگامے کی وجہ سے پریشان تھا۔

انہیں چھوڑ کر دونوں بہنوں نے اپنی روانگی کے نظام الاوقات اور حکمتِ عملی تیار کی۔ انہوں نے لنچ کا آرڈر دیا اور وی سی آر پر امیتابھ بچن کی فلم پوری آواز کے ساتھ دیکھنے لگیں تاکہ ساتھ والے کمرے میں موجود مسز گاندھی کو پتہ لگ سکے کہ وہ ڈری ہوئی نہیں ہیں۔ جب بھی دھون انہیں روانہ ہونے کا کہنے آتا وہ اس سے نیا مطالبہ کر دیتی تھیں۔ کتوں کو کھانا کھلانا پڑا۔ جب دھون لڑکیوں کو کوئی چیز لے جانے سے نہیں روک پایا تو مسز گاندھی برہمچاری

کے ساتھ اندر آئی اسے ہر اس چیز کی تلاشی کا حکم دیا جو انہوں نے باندھ لی ہوئی تھی۔ مانیکا کی ضد تھی کہ اگر اس کے سامان کی تلاشی ہوگی تو پھر وہ سڑک پر صحافیوں کے سامنے ہوگی۔ صندوقوں کو کمرے کے باہر کھول دیا گیا تاکہ صحافی دیکھ لیں اور دوربین لگے کیمروں سے فوٹوگرافر دروازوں کے باہر سے تصویریں کھینچ لیں۔ الزام اور جوابی الزام کا ایک اور دور (Round) چلا۔

اس کے بعد سے مسز گاندھی صورتحال پر مزید حاوی نہیں رہی' راجیو نے ارون نہرو کی ہمراہی میں صورتحال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے سکیورٹی افسر این۔ کے سنگھ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ دونوں بہنوں کو باہر نکال پھینکے۔ ایک سمجھ دار آدمی ہوتے ہوئے این۔ کے سنگھ نے کہا کہ اسے تحریری احکامات دیئے جائیں۔ نہ تو راجیو اور نہ ہی ارون نہرو اپنے آپ کو کاغذ پر لانا چاہتے تھے۔ این۔ کے سنگھ کی زبانی درخواستوں کو لڑکیوں نے رد کر دیا جو اپنے سامان' کتوں اور اب بخار میں مبتلا فیروز ورین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ مسز گاندھی جانتی تھی کہ وہ مار کھا چکی ہے۔ لڑکیوں اور ان کے بھائی نے پر تکلف لنچ کیا۔ سامان اور کتوں کو ایک ٹیکسی میں آگے بھیج دیا گیا۔ گہری نیند سویا ہوا فیروز ورین گیارہ بجے ان کے حوالے کیا گیا۔ ٹیکسی کی بجائے وزیراعظم کی کار کو مانیکا اور اس کے بیٹے کو جہاں وہ چاہے وہاں پہنچانے کے لیے منگوایا گیا۔ مسز گاندھی نے جو آخری کام کیا' جیسا کہ اس کی عادت تھی' وہ تھا مانیکا کے لیے ایک خط جس میں اس کی غلط کاریوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن کی وجہ سے اسے نکالا جانا ضروری ہوگیا تھا۔ مانیکا بیٹھ گئی اور اپنا جواب تحریر کیا جو اس نے پریس کو جاری کر دیا۔ گیارہ بجے سے چند منٹ بعد اشک آلود مانیکا' چندھائی ہوئی آنکھوں والے اور سراسیمہ فیروز ورین کے ساتھ اخباری کیمرہ مینوں کے فلیش بلبوں کے جھماکوں کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔ مانیکا نے وزیراعظم ہندوستان کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔

میرا امتیش اور مانیکا کے ساتھ تعلق چند ماہ بعد اچانک ختم ہوگیا۔ ایک جریدے نے مانیکا کے خلاف چند الزامات کے حوالے سے میرا انٹرویو لیا۔ واضح طور پر میرے تبصروں نے اسے ناخوش کر دیا تھا کیونکہ دو دن بعد وہ میرے اپارٹمنٹ میں تیزی سے داخل ہوئی' رسالے کی ایک جلد میرے منہ پر ماری اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ایک گھنٹے بعد مجھے امتیش کی طرف سے ایک رجسٹرڈ اے ڈی خط موصول ہوا جس میں میرے اوپر خاندان کے بارے میں جھوٹ بولنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ گاندھیوں اور آنندوں کے ساتھ میرا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری زندگی کا ایک اور باب ختم ہوگیا تھا۔

❀ ❀ ❀

تیرھواں باب:

1980-86ء: پارلیمینٹ اور ہندوستان ٹائمز

وقت میں تھوڑا سا پیچھے جاتے ہیں: دسمبر 1980ء کے عام انتخابات میں صفایا پھیرتے ہوئے مسز گاندھی اقتدار میں لوٹ آئی۔ میں ''اندرا گاندھی کی واپسی!'' کے عنوان سے ایک ''جلدی میں لکھی ہوئی رپورٹ'' میں اس کی فتح کی پیشگوئی کر چکا تھا' جو میں نے انتخابات سے چند ماہ پہلے تحریر کی تھی۔ میں نے اس کے اور اس کے خاندان کے لیے اپنے حصے کا کام انجام دے دیا تھا۔ میں نے تب اس کا دفاع کیا جب ہر شخص ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ میں واحد صحافی تھا جس نے سنجے گاندھی کے ماروتی کار پراجیکٹ کے خلاف پھیلائے جانے والے بے بنیاد بہتانوں کو رد کرتے ہوئے اس کا دفاع کیا تھا' میں نے مانیکا اور اس کی ماں امتیشور کی ادارت اور اشتہارات حاصل کرنے میں مدد کی جب ''سوریہ'' کا اجرا ہوا ہی تھا۔ میں نے چھ ماہ بغیر تنخواہ لیے ''نیشنل ہیرالڈ'' کی ادارت کی۔ میں تب سنجے کے ساتھ ساتھ تھا جب وہ شاہ کمیشن کے سامنے پیش ہوا اور جب وہ جیل گیا تو میں نے اس سے رابطہ رکھا۔ میں نے اس کے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام' اس کی جھونپڑ پٹیاں ہٹائے جانے کی مہم کی پرجوش حمایت کی اور اس میں شجرکاری کے لیے دلچسپی ابھارنے میں بنیادی طور پر ذمہ دار تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان کے لیے کیے گئے اپنے کاموں کے کسی قسم کے اعتراف یا اعزاز کا متوقع تھا۔

اگرچہ مسز گاندھی دوبارہ وزیراعظم بن گئی تھی تاہم ملک کا حقیقی حکمران سنجے تھا۔ چونکہ میں اسے اور مانیکا کو مشکلات کے زمانے میں بہت زیادہ ملا تھا اس لیے ہمارے درمیان ایک دوسرے کے لیے انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ باتیں تھوڑی مگر کام اچھے کرتا تھا۔ دوسرے سیاست دانوں کے برعکس' جو اپنے حامیوں کو خوش رکھنے کے لیے وعدے تو کر لیتے جنہیں پورا کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا' سنجے جس کام کا وعدہ کرتا تمہیں یقین ہوتا تھا کہ وہ اسے پورا بھی کرے گا۔ اگر وہ مطالبے کو نامناسب پاتا تو اس میں ''نہیں'' کہنے کی جرأت بھی تھی۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے مجھے گاندھی خاندان کی طرف سے نوازے جانے کی توقع

تھی۔ سنجے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کسی سفارتی ذمہ داری کو سنبھالنے میں دلچسپی لوں گا۔ اس کے ذہن میں لندن میں ہائی کمشنر کا عہدہ تھا۔ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ میں ہندوستان کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر اس نے مجھے راجیہ سبھا کے لیے نامزدگی اور ''ہندوستان ٹائمنز'' کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے متبادل قبول کرلیا۔ میں ''نئی دہلی'' میں تھا جب ایک سہ پہر گیانی ذیل سنگھ' اس وقت کے وزیر داخلہ' نے مجھے فون کیا اور مجھے بتایا کہ وہ راجیہ سبھا کے لیے نامزدگان کی فہرست لے کر صدر سے ملنے جا رہا ہے۔ میرا نام ان میں شامل تھا۔ میں نے اس بچے کی طرح رویہ اپنایا جسے جنم دن پر ایک بڑا بولتا ہوا تحفہ مل گیا ہو۔ میں نے اپنے ''نیو دہلی'' کے رفقائے کار کو پکار پکار کر بتایا: ''ہُرّے! میں پارلیمینٹ کا رکن بن گیا ہوں۔'' میں پی ٹی آئی بلڈنگ کی راہداری میں دوڑتا ہوا ہر شناسا چہرے کو چلا چلا کر یہ خبر سناتا رہا۔ میں اپنی ماں کے گھر گیا اور اسے اور اپنی بہن کو یہ خبر سنائی۔ میں شکریہ ادا کرنے کے لیے سنجے گاندھی کے گھر گیا اور جشن منانے کے لیے گھر آ گیا۔ اگلی صبح میں ہاروں کے ساتھ ملنے کے لیے آنے والوں اور مبارکباد کے خطوط اور تاروں کے سیلاب سے بچنے کے لیے کسولی چلا گیا۔

میں نے کسولی میں ایک ہفتہ اپنی تقدیر بدلنے پر خوشی مناتے ہوئے گزارا۔ میری قسمت ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' سے نکال دیئے جانے کے بعد سے خراب چلی آ رہی تھی۔ راجیہ سبھا کے لیے میری نامزدگی کے چند ہفتے بعد کے۔کے برلا نے مجھے کہا کہ میں اس سے ملاقات کروں۔ اس نے مجھے ''ہندوستان ٹائمنز'' کی ادارت کی پیشکش کی۔ مجھے پہلے ہی علم تھا کہ وہ ایسی پیشکش کرے گا مگر یقین نہیں تھا کہ وہ ہرن مے کارلیکر کے ساتھ کیا کرے گا جو اس وقت اخبار کی ادارت کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بہت مشکل صورتحال تھی۔ میں کارلیکر کے سسر اشوک چندا کے' جب وہ لندن میں ڈپٹی ہائی کمشنر تھا' ماتحت کام کر چکا تھا اور اس کا دوست رہا تھا۔ میں چندا کی بڑی بیٹی انجو کا' اس کے سکول کے آخری برس اور آکسفورڈ میں پہلے برس کے دوران میں' کا مقامی سرپرست رہا تھا۔ خاندان کے ساتھ میری قریبی دوستی کو جانتے ہوئے میرے باپ نے قاعدے سے ہٹ کر چندا خاندان کو سجان سنگھ پارک میں ایک فلیٹ دیا تھا۔ عین اسی شام جس شام برلا نے مجھے ملازمت کی پیشکش کی تھی مونیکا چندا گپ شپ لگانے کے لیے آئی۔ معمول کے مطابق اس نے بتایا کہ برلا اس کے داماد پر کتنا بھروسہ کرتا ہے اور ''ہندوستان ٹائمنز'' کے مدیر کے طور پر وہ کتنا اچھا کام کر رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت اس کو ناخوشگوار سچ سے آگاہ کرنے کا ہے۔ ''مونیکا! مجھے نہیں پتہ تم نے یہ سب کہانیاں کہاں سے سنی ہیں! برلا رونو سے خوش نہیں ہے اور اسے نکالنے کی نیت کیے ہوئے ہے۔''

''تم ایسی بات کس طرح کہہ سکتے ہو!'' اس نے حیرت سے کہا: ''تم کیسے جانتے ہو؟''
''میں اس لیے جانتا ہوں کیونکہ آج سہ پہر ہی مجھے اس ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے اور مجھے اگلے ہفتے ذمہ داریاں سنبھالنا ہوں گی۔'' میرے اپارٹمنٹ سے ایک بہت اداس مونیکا چندا اپنے اپارٹمنٹ واپس گئی۔

میں نے 1980ء میں ''ہندوستان ٹائمز'' کی ادارت سنبھالی۔ ہرن مے کار لیکر کچھ ارکان کی ترقی کے لیے سفارشی نوٹ چھوڑ گیا' جنہوں نے میرے ساتھ کام کرنا تھا۔ میں نے اس کی سفارشات کا احترام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے سنجے گاندھی کی طرف سے بھی اسسٹنٹ اور سب ایڈیٹروں کی طویل فہرست ملی جنہیں وہ کمیونسٹ کے طور پر جانتا تھا: مجھے ان سے جتنی جلد ممکن تھا چھٹکارا پانا تھا۔ میں نے اس کے نوٹ کو یہ جانچنے کے لیے جیب میں رکھ لیا کہ کیا اس کی ''اندرونی اطلاع'' قابل اعتماد تھی۔ میں اس کے سیاسی تصورات کے لیے کسی کو نشانہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ سنجے کی اطلاع درست تھی۔ اس کی فہرست پر موجود تین افراد نے رضا کارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لے لی' دوسروں نے اپنی ملازمتیں جاری رکھیں۔ ایک شخص جس نے اپنے کمیونسٹ پارٹی کا کارڈ ہولڈر ہونے کو راز نہیں رکھا چاند جوشی تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت یونین کی سرگرمیوں میں گزارتا تھا۔ وہ بہت زیادہ شراب پیتا تھا اور شاذ ہی تین چار ماہ بعد لباس تبدیل کرتا تھا۔ اس کا نام سنجے کی فہرست میں نہیں تھا' نہ ہی برلا یا انتظامیہ نے اسے فارغ کرنے یا تبادلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ چاند جوشی' جس کی دوسری بیوی مانینی چیٹر جی کو میں خوب جانتا تھا اور جسے میں نے پسند کے قابل پایا تھا' اپنی شامیں فائیو سٹار ہوٹلوں میں گزارنا کس طرح برداشت (افورڈ) کر سکتا تھا۔ اس کی تنخواہ تو اس کے دو خاندانوں کو ہی مشکل سے آرام میں رکھ سکتی تھی۔ میرے ''ہندوستان ٹائمز'' چھوڑنے کے چند سال بعد طبی ہدایت پر چاند کو مجبوراً الکوحل ترک کرنا پڑی تھی۔ کسی زمانے کا مارکسی دہریہ درگا دیوی کے سرگرم پجاری میں بھی تبدیل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''ہندوستان ٹائمز'' کو پہلی عالمی جنگ کے دوران میں کینیڈا اور امریکہ کی غدر پارٹی سے تعلق رکھنے والے سکھ انقلابیوں نے قوم پرستانہ نظریات کی ترویج کے لیے شروع کیا تھا۔ اس کا پہلا مدیر سردار منگل سنگھ تھا۔ اخبار مناسب سرکولیشن حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا اور برطانیہ مخالف ہونے کی وجہ سے اکثر پابندی لگا دیئے جانے سے دھمکایا جاتا تھا۔ اس کے مالکوں کو اسے جے۔ این ساہنی' جو اپنے بہنوئی کوہلی کے ساتھ' اسے دہلی کے بڑے روزنامہ اخبار کے طور پر مستحکم کرنے کا اہل تھا' کو بیچنے پر مجبور کر دیا گیا۔ انہوں نے بھی اسے جاری رکھنا

دشوار پایا اور اکثر حکومت کی ناخوشی کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ اخبار مشکل میں تھا جب پنڈت مدن موہن مالویہ نے صنعت کار جی۔ ڈی۔ برلا کو اسے خریدنے اور کاروباری خطوط پر چلانے کے لیے راضی کرلیا۔ انڈین نیشنل کانگریس اپنے نظریات کی ترویج کے لیے دارالحکومت میں کسی روزنامہ اخبار کی حامل ہونے کی بہت خواہشمند تھی۔ جی۔ ڈی۔ برلا نے اسے کاروباری نقطہ نظر سے زیادہ کانگرس کی مدد کے طور پر خرید لیا۔ مہاتما گاندھی کا بیٹا دیوداس اس کا مدیر مقرر کیا گیا۔ ادارتی دفاتر اور مطبع (پرنٹنگ پریس) کناٹ سرکس کے دائرے کے باہر چند کمروں میں قائم کیے گئے۔ چند ایک برسوں کے اندر اندر اخبار نے مؤقر سرکولیشن حاصل کرلی اور دلی والوں کی عادت بن گیا: ان کی آنتیں اس وقت تک حرکت نہیں کرتی تھیں جب تک رفع حاجت کے وقت وہ اپنے سامنے اس اخبار کو نہیں پھیلا لیتے تھے۔ یہ ایسا اخبار بن گیا جس میں عاق نامے اور عزیزوں کی جدائیوں کے اعلانات ''ان کی جنت مکانی کے لیے'' شائع ہوتے تھے۔ باوجودیکہ اس کی اشاعت دارالحکومت اور اس کے قرب و جوار تک محدود تھی تاہم اخبار کی اشتہارات سے ہونے والی آمدنی دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے زیادہ بڑی سرکولیشن کے حامل روزنامہ اخباروں سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

جی۔ ڈی۔ برلا کے اثاثوں کی اس کے بیٹوں کے درمیان تقسیم پر ''ہندوستان ٹائمز'' اس کے بڑے بیٹے کے۔ کے۔ برلا کے حصے میں آیا۔ یہ اس کے ورثوں میں سب سے کم اہم تھا۔ تاہم وہ سیاسی عزائم رکھتا تھا۔ اس نے اس کو جدت بخشنا اور وسعت دینا شروع کر دیا۔ اس نے کرزن روڈ (بعد ازاں کستربا گاندھی مارگ) پر زمین حاصل کی۔ اور سنگ مرمر اور شیشوں والی کثیر منزلہ عمارت تعمیر کروائی۔ پہلی تین منزلیں ''ہندوستان ٹائمز'' کے مطبع (پرنٹنگ پریس)' شعبہ اشتہارات' ادارتی اور انتظامی دفاتر کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ باقی منزلوں کو کرائے پر دے دیا گیا۔ کے۔ کے۔ برلا نے جس وقت سے اخبار کو سنبھالا تھا اس نے اسے حکومت کو اپنا طرف دار بنانے اور اپنے سیاسی اور کاروباری مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا۔ وہ اسے آزاد اخبار بنانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے وزیروں کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ملازمتیں دے کر یا ان کی سفارش کردہ جگہوں پر ٹرانسفر کر کے مرہون منت کیا۔ وہ حزب اختلاف کے سوا کسی کو ناراض کرنے کی جسارت گوارا نہیں کرسکتا تھا ــــ وہ بھی بہت معمولی' مبادا حزبِ اختلاف کسی روز حکومت میں ڈھل جائے۔ نتیجتاً نظریاتی طور پر اخبار کا دو تہائی سے زیادہ حصہ وائر سروسز سے موصول ہونے والے ادارتی مواد سے بھرا جاتا تھا' باقی ماندہ خالی جگہ (سپیس) کا ایک تہائی۔ یاستی نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی خبریں لے لیتی تھیں جو بلاتغیر ریاستی حکومت کی حمایت میں ہوا کرتی تھیں۔ اس میں وائر سروسز کی بھیجی گئیں بہت کم غیر ملکی خبریں ہوتی تھیں۔ اس کے

پاس صرف دو غیر ملکی نامہ نگار تھے' ایک لندن میں اور دوسرا واشنگٹن میں۔ ان خامیوں کے باوجود دارالحکومت میں ''ہندوستان ٹائمز'' کی اجارہ دارانہ سرکولیشن کو کوئی چیز نہیں ہلا سکی تھی۔ اس کے اتوار کے ایڈیشن میں پانچ سے چھ صفحات پر شادی کے اشتہارات ہوتے تھے' اس کا روزانہ ایڈیشن قریباً نصف صفحے کے تعزیت ناموں اور ''بیادگار'' کے اشتہارات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ پہلا اور شاید واحد اخبار تھا جس میں اٹھالا' انتم ارداس' بھوگ کی تقریبات اور مرنے والوں کے لیے کیرتن کے اعلانات شائع ہوا کرتے تھے۔ عمومی طور پر یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہندوستان ٹائمز دارالحکومت کا سب سے بڑی سرکولیشن والا سب سے بڑا اخبار تھا۔ بہت زیادہ مطالعہ کے قابل اخبار ''سٹیٹس مین'' کی سرکولیشن سب سے کم تھی۔ ''ایچ ٹی'' کو واحد مبارزت (چیلنج) ''ٹائمز آف انڈیا'' کی طرف سے آئی جو ہندوستان کے کسی بھی اخبار جتنا مکمل اخبار تھا۔ تاہم ''ہندوستان ٹائمز'' کو پسپا کرنے کی اس کی کوششیں زبردست ناکامی سے دوچار ہوئیں۔

''ہندوستان ٹائمز'' چند ممتاز مدیروں کا حامل رہ چکا تھا' قابل ذکر ہیں سری ملگاؤنکر اور بی۔ جی۔ ورگھنیر۔ سری ملگاؤنکر' اگرچہ کے۔ کے۔ برلا اس کا احترام کرتا تھا' بی۔ ڈی۔ گوئینکر کے ''انڈین ایکسپریس'' کے لیے لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ بی۔ جی۔ ورگھنیر زیادہ راست اور کے۔ کے برلا کی پسند کے سامنے نہ جھکنے والا ثابت ہوا لہٰذا اسے نکال دیا گیا۔ بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہرن مے کارلیکر' اس وقت ''سٹیٹس مین'' کا ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا' جب بنگال کے وزیراعلیٰ سدھارتھ شنکر رے نے کے۔ کے برلا پر دباؤ ڈال کر اسے ''ہندوستان ٹائمز'' کا مدیر بنوایا اور اس وقت تک مدیر رہا جب تک رے حکومت میں رہا۔ اس کی خدمات اس شخص کی خاطر معطل کر دی گئیں جس کے بارے میں مسز گاندھی اور اس کا بیٹا سنجے محسوس کرتے تھے کہ وہ ان کے مقاصد بہتر طور پر پورے کرے گا یعنی کہ میں۔

☆☆☆

مجھے اس ادارتی آزادی کے بارے میں کوئی وہم نہیں تھا جس سے کہ مجھے لطف اندوز ہونا تھا۔ جس روز میں نے ذمہ داریاں سنبھالیں' کے۔ کے۔ برلا نے مجھے ایک ٹائپ شدہ دستاویز دی جو کہ کارڈ بورڈ پر چسپاں کی گئی تھی' اس میں اخبار کی ادارتی پالیسی بیان کی گئی تھی۔ اس کو ہندوستانی آئین کے اس افتتاحی حصے کے مانند پڑھا جا سکتا تھا جو مقاصد سے معاملہ کرتا ہے۔ جس کی کوئی شخص جس انداز سے چاہے تعبیر کر سکتا تھا۔ میں نے اسے سرسری انداز میں پڑھا اور اپنا سر ہلایا۔ میں نے سٹنگ روم میں برلا جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی دیکھی۔ اس پر تین چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو بیشتر اسی سے تعلق رکھتی تھیں: ہدایات جاری کرنے اور خبریں وصول کرنے کے لیے اس کا نجی فون' فائدے

اور نقصان کا حساب لگانے کے لیے ایک جیبی کیلکولیٹر اور دولت کی دیوی لکشمی کی چاندی کے چوکھٹے (فریم) میں لگی ہوئی ایک تصویر۔ میں نے اس کے بارے میں جو تھوڑا بہت جانا میں نے اسے پسند کیا۔ وہ کمزور کاٹھی والا تھا' ہمیشہ ڈارک سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ہوتا تھا اور برلا خاندان کے دوسرے افراد کے مانند گفتگو اور رویئے میں انتہائی مہذب تھا۔ وہ ہر ملاقاتی کو اپنے ہاتھ سے چائے' کافی اور بسکٹ پیش کیا کرتا تھا اور جب وہ رخصت ہوتے تو دروازے تک چھوڑنے جایا کرتا تھا۔

میں نے اپنا پہلا دن اسسٹنٹ اور سب ایڈیٹروں کے ناموں پر مشتمل فہرستوں کو ملاحظہ کرتے ہوئے گزارا۔ میں نے ادارتی صفحے پر شائع ہونے کے لیے جانے والے اداریوں اور مضامین پر ایک نظر ڈالی۔ میں اخبار میں کیا بہتری لا سکتا تھا؟ مجھے جریدی صحافت (میگزین جرنلزم) کے بارے میں تو کچھ آگاہی تھی مگر سوائے ''نیشنل ہیرالڈ'' کے مختصر اور بے ثمر دورانئے کے میں کسی بڑے اخبار کو چلانے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ جس کا عملہ لگ بھگ پندرہ سو مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ شروعات کہاں سے کرنی ہے۔

میں نے عہد کیا کہ جو کچھ بہترین میرے لیے ممکن ہے کروں گا۔ جیسا کہ میری عادت تھی میں صبح سویرے اٹھتا' بی۔ بی۔ سی' ریڈیو پاکستان اور آل انڈیا ریڈیو سنتا اور جو کچھ انہیں کہنا ہوتا تھا اس کے نوٹس بنا لیتا تھا۔ میں ہر کسی سے ایک گھنٹہ پہلے دفتر آجاتا تھا اور جو مراسلات بغیر جواب دیئے بچ گئے ہوتے تھے انہیں نمٹاتا تھا۔ میں اپنے اسسٹنٹ ایڈیٹروں کے ساتھ ادارتی میٹنگ کرتا اور ان سے دریافت کرتا کہ وہ چیزیں ہم کس طرح نظر انداز کر گئے جو دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی تھیں اور تین اداریئے ان کے ذمے لگاتا اور سہ پہر کی ابتدا تک انہیں اپنی میز پر پہنچانے کا کہتا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے دفتر کے چکر لگایا کرتا تھا کہ ہر کوئی اپنی اپنی ڈیسک پر موجود ہے۔ ادھر ہمیشہ بہت ہی زیادہ ملنے والے آیا کرتے تھے' ان میں سے بیشتر وقت ضائع کرنے والے ہوتے تھے۔ پارلیمینٹ کے اجلاسوں کے دوران میں میں دو گھنٹے راجیہ سبھا میں گزارتا تھا۔ گھر پر دوپہر کا کھانا کھانے اور بہت مختصر سا قیلولہ کرنے کے بعد میں دفتر واپس آجاتا تھا۔ میں درمیانی صفحے کے لیے اداریوں اور مضامین کو دیکھتا —— اور اکثر متن کو دوبارہ لکھتا۔ اور ایک مرتبہ پھر میں دفتر کے چکر لگاتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ میں اندھیرا ہونے سے پہلے گھر لوٹتا۔ میں رات کا کھانا کھانے کے بعد دفتر واپس آتا اور تازہ ترین خبریں حاصل کرنے اور صفحہ اول کا مواد دیکھنے کے لیے ٹھہرتا۔ ایسے زمانے بھی آئے کہ میں نصف شب کے بعد گھر واپس آیا۔ میں نے کبھی کسی دوسری ملازمت میں اتنے طویل دورانئے تک کام نہیں کیا تھا یا اتنے چھوٹے مقصد کے لیے۔ میں نے جلد ہی پالیا کہ کسی روزنامہ اخبار کا مدیر

اس عملے کے ساتھ جسے اس نے خود منتخب نہ کیا ہو اخبار کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے بہت کم کام کرسکتا ہے۔ اس سے جس چیز کی توقع تھی وہ تھے متوازن مگر غیر مزاحیہ اداریئے۔ بہر صورت چند لوگ ہی اداریئے پڑھنے کا تردد کرتے تھے۔ میں نے انہیں زیادہ تر اپنے نائبین پر چھوڑ دیا تھا اور صرف اتنی تسلی کیا کرتا تھا کہ انہوں نے اس پالیسی سے تو تجاوز نہیں کیا تھا جو برلا نے مجھے دی تھی۔ ''ہندوستان ٹائمنز'' کے لیے میرا واحد حقیقی کنٹری بیوشن اتوار کو شائع ہونے والا میرا کالم ''سب سے کینے کے ساتھ'' تھا۔ جتنا زیادہ میرے ساتھی صحافی اور مدیر میرے طرزِ صحافت کا مذاق اڑاتے اتنا ہی یہ ملک کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم بن گیا۔ (اور آج تک ہے) اور ریاستوں کے دارالحکومتوں سے شائع ہونے والے درجن سے زیادہ انگریزی اخباروں میں نقل کیا جاتا تھا۔ اور ملک بھر میں علاقائی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ تھے جو صرف اتوار کو ''ہندوستان ٹائمنز'' اس کالم کو پڑھنے کے لیے خریدا کرتے تھے جسے وہ ''کینہ کالم'' کہا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں کے۔ کے۔ برلا بھی تھا جو اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ جب تک یہ اس کے ''ہندوستان ٹائمنز'' میں شائع نہ ہو جائے تب تک کسی دوسرے اخبار میں شائع نہیں ہو۔

مجھے عملے کے درمیان جاری سازش اور کرپشن کو بھانپنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ''ہندوستان ٹائمنز'' کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ برلا نے اس میں طاقت ور سیاست دانوں کو خوش کرنے کے لیے لوگ بھرتی کر کر کے عملے کو بہت بڑھا لیا تھا انہیں ملازمت پر رکھنا تو آسان تھا مگر ملازمت سے فارغ کرنا حقیقتاً ناممکن تھا۔ ریاستی نامہ نگار وزرائے اعلیٰ کی پسند کی خبریں بھیجتے تھے اور بدلے میں فوائد حاصل کرتے تھے۔ بعض اوقات خبریں میرے نصف شب کے بعد دفتر سے چلے جانے کے بعد شامل کردی جاتی تھیں۔ میں ان سے وضاحت طلب کرنے کے علاوہ اور بہت کم کرسکتا تھا۔ میں چند معاملات میں غلط کار نامہ نگاروں کے تبادلے غیر موافق علاقوں میں کرنے پر برلا کو راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انہوں نے برلا سے کہنے کے لیے وزرائے اعلیٰ اور کابینہ وزیروں تک رسائی حاصل کی۔ جس نے تب اپنی سوچ تبدیل کرلی اور مجھے کہا کہ میں انہیں ایک اور موقعہ دوں۔ مجھ پر انتظامی کام کا بھی اضافی بوجھ تھا اور میرے پاس میری غیر موجودگی میں کام کرنے کے لیے کوئی ڈپٹی بھی نہیں تھا یا کوئی ایسا نہیں تھا جس کو تربیت دے کر میری ریٹائر کے بعد میری جگہ سنبھالنے کے قابل بنایا جا سکتا۔ میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں برلا سے کہا کہ وہ مجھے ہمارے واشنگٹن کے نامہ نگار این۔ سی۔ مینن کو واپس بلانے اور اپنا ڈپٹی بنانے کی اجازت دے۔ وہ پہلے یہ کام کر چکا تھا اور اپنے ٹائپ رائٹر پر چند منٹوں میں اداریئے لکھنا جانتا تھا۔ برلا راضی

ہو گیا۔ مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا۔۔۔اسی طرح، تسلیم کیے بغیر برلا بھی پچھتاوے کا شکار تھا۔ شاید میں مینجائٹس (Menongitis) کا شکار ہو سکتا ہوں۔ میں کرشنا مینن کو دلی طور پر ناپسند کرتا تھا، مجھے این۔سی۔مینن سے بھی دلی طوپر شدید نفرت ہو گئی۔

جونہی میں نے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں افواہیں پھیل گئیں کہ میں سکھوں کو خالی نشستوں پر بھرتی کروں گا۔ جب ایسا ہوا تو میں نے صرف چار مرد اور ایک عورت کو بھرتی کیا اوران میں سے کوئی ایک بھی سکھ نہیں تھا۔ دفتر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی وجہ سے میں صرف ایک شخص پر اعتماد کرتا تھا، اپنے ذاتی سیکرٹری لچھمن داس پر۔ وہ اہلیت، دیانت داری، وفاداری اور زیرکی کا کمیاب مرقع تھا۔ میرے ساتھ اس کا تعلق اخبار سے میرے ریٹائر ہونے کے بہت مدت بعد تک جاری رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے ''ہندوستان ٹائمز'' میں آخری دنوں کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے چند برس پیچھے جانے کی اجازت دیجئے۔ میرا معاہدہ تین برس کے لیے تھا۔ مجھے توقع تھی کہ جب وقت آیا تو معاہدہ دوبارہ ہو جائے گا۔ کے۔کے۔ برلا کے ساتھ میرے قلبی مراسم تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بارے میں اچھا سوچتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے پوچھا: ''سردار صاحب آپ کا ریٹائر ہونے کا کوئی آئیڈیا نہیں ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''برلا جی! ریٹائر تو میں نگم بودھ گھاٹ میں ہوں گا۔'' وہ مسکرایا اور اس نے میری جسمانی اور ذہنی صحت مندی کے بارے میں، دفتر میں گزارے جانے والے میرے وقت کے حوالے سے تعریفی کلمات ادا کیے۔

اپنے معاہدے کے ختم ہونے سے تین ماہ پہلے میں نے اس سے پوچھا کیا وہ مجھے توسیع دینا چاہتا ہے۔ وہ حیران ہو گیا: ''مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تمہارے صرف تین ماہ رہ گئے ہیں۔ ذرا مجھے اس معاملے پر غور کرنے دو۔ میں تمہیں چند ایک دنوں میں بلاؤں گا۔''

میں برلا کو پہلے ہی اپنے ڈپٹی این۔سی۔مینن کے حوالے سے اپنے خیالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں اس کے اپنے سمیت لوگوں کے ساتھ برتاؤ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ تاہم مجھے سب سے زیادہ اس کی یہ عادت پریشان کرتی تھی کہ وہ وزیروں، بشمول وزیراعظم کے گھروں میں جاتا تھا اور انہیں مبینہ طور پر ''ہندوستان ٹائمز'' میں ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا تھا۔ دھر اور عملے کے دوسرے افراد نے مجھے اس بارے آگاہ کیا تھا۔ میں نے اس وقت تک اس بات پر یقین نہیں کیا تھا جب تک اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ نہیں کر لیا تھا۔ اس نے ایک اداریہ لکھا جس میں اس نے مانیکا اور اس کی ماں کی سرزنش کی تھی۔ میں نے ان سطروں کو نشان زد کیا اور حاشیے پر لکھا کہ یہ تبصرے بلا جواز تھے۔ اس نے اطلاع وزیراعظم کے دفتر پہنچا

دی۔ اس وقت تک مانیکا کا دوست جانا جانے والا ہر شخص مسز گاندھی کا دشمن تصور ہوتا تھا۔ دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے انتخابات چند ماہ بعد ہونے والے تھے۔ کانگرس پارٹی شہر کے سب سے زیادہ اہم اخبار کے مدیر کے طور پر کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتی تھی' جسے اس کے نقاد کے طور پر جانا جاتا ہو۔

جب اگلی مرتبہ میں برلا سے ملنے کے لیے گیا تو وہ کچھ کچھ اداس نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ''ہندوستان ٹائمز'' میں ایک تبدیلی لانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور این۔سی مینن کو میرا جانشین تصور کر رہا تھا۔ ''میرے پاس اس کے پیسے کے معاملات اور اس کے اخلاق کے خلاف ڈھیر ساری رپورٹیں ہیں۔ تاہم میں اسے ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا تھا: ''تاہم میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنا ''کینہ کالم'' لکھنا جاری رکھو گے۔ تم جو چاہتے ہو مانگ سکتے ہو اور مجھے امید ہے کہ ہم دوست رہیں گے۔''

میں ناامید تھا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ مسز گاندھی کے ڈالے گئے دباؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ وقت بعد رسالے ''پروب'' نے میرا انٹرویو لیا۔ میں نے ''ہندوستان ٹائمز'' کے بارے میں اپنا نہ بخشنے والا تبصرہ دہرایا کہ یہ دہلی کا سب سے زیادہ سرکولیشن والا سب سے برا اخبار ہے اور کس طرح اس کا عملہ جاہل صحافیوں سے بھرا ہوا ہے کہ برلا اقتدار والے لوگوں کو نہیں نہیں کہہ سکتا۔ انٹرویو نے ہندوستانی ذرائع ابلاغ (میڈیا) میں ہلچل سی مچا دی۔ مینن نے ایک اداریہ مجھے واضح طور پر گالیاں دیتے ہوئے لکھا کہ میں ایسا مدیر تھا جو کوئی کام نہیں کرتا تھا' اپنے جانشینوں کو نیچا دکھانے کی عادت میں مبتلا ایک مفت خورا اور طفیلی تھا اور یہ کہ میں درست انگریزی لکھنا نہیں جانتا تھا۔ اس کی آواز میں آواز ملائی تھی پامیلا کالہن نے جسے میں نے مینن کو پیسے ادھار دینے سے بچایا تھا اور جو میرے ساتھ برتاؤ میں پہلے ہی بہت زیادہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھی۔ میں نے ''ہندوستان ٹائمز'' کو ایک نوٹس بھجوا دیا کہ میں ان کے لیے مزید ''کینہ کالم'' نہیں لکھوں گا۔

میرے کالم کے شائع ہونا بند ہونے کے ایک مہینے بعد کے۔کے۔ برلا کا ایک نمائندہ اس درخواست کے ساتھ میرے گھر مجھے ملنے آیا کہ میں ''ہندوستان ٹائمز'' کے لیے اپنا کالم دوبارہ لکھنا شروع کروں۔ میں نے اس شرط پر لکھنے کی حامی بھری کہ صفحۂ اول پر یہ اعلان شائع کیا جائے کہ مینن کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور میرا معاوضہ بڑھایا جائے۔ میری ساری شرائط منظور کر لی گئیں۔ سو میں اس اخبار میں دوبارہ شائع ہونے لگ گیا جس کا مدیر نہیں چاہتا تھا کہ میرے نام کا کسی بھی جگہ ذکر کیا جائے۔

☆☆☆

قریباً جس زمانے میں میں نے ''ہندوستان ٹائمز'' کے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں میں نے 1980ء میں راجیہ سبھا کے رکن کے طور پر حلف اٹھایا۔ ایک دہریہ ہونے کے ناطے میں نے بھگوان کے نام پر حلف نہیں اٹھایا بلکہ اس کی بجائے میں نے اپنے ضمیر کے نام پر عہد لیا تھا۔ مجھے نرگس دت کے ساتھ والی نشست دی گئی تھی۔ دوسرے ارکان ہمیں ملنے کے بہت طالب رہتے تھے: اسے اس کی خوبصورتی کی وجہ سے' مجھے اس لیے چونکہ میں دارالحکومت میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والے اخبار کا مدیر تھا۔ میں اپنی پہلی تقریر کرنے کا منتظر تھا۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں اپنے آپ کو منوالوں گا۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔

دوسرے دن میں پارلیمینٹ گیا تو مسز گاندھی نے مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز جب میں ایوان سے چلا گیا تھا تب کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر بھوپیش گپتا نے میری نامزدگی کے حوالے سے سخت باتیں کی تھیں اور مجھے مسز گاندھی کا چمچہ قرار دیا تھا۔ اس نے مجھے ضابطوں کی کتاب دی جس میں اس نے ایک شق پر نشان لگا دیا تھا جس میں ارکان کو حق دیا گیا تھا کہ اگر ان پر کوئی دوسرا رکن ذاتی حملہ کرے تو وہ جوابی تقریر کر سکتے ہیں۔ ''چیئرمین کو اس شق کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی درخواست تحریری طور پر بھیجو۔ وہ تمہیں اپنی معروضات پیش کرنے کی اجازت دے دے گا۔ ہم اس قسم کی الزام بازی کو چیلنج کیے بغیر نہیں جانے دیں گے۔'' اس نے مجھے کہا تھا۔ ہدایت کے مطابق میں نے ٹھیک اسی روز چیئرمین ہدایت اللہ کو اپنی درخواست تحریری طور پر جمع کروا دی۔ مجھے آگاہ کیا گیا کہ مجھے اگلے دن وقفہ سوالات کے بعد تقریر کا موقع دیا جائے گا۔

میں نے وہ سہ پہر اپنے دفاع کے لیے نکات کی تیاری میں گزاری۔ میں اپنی تعریف اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں یا اپنے ادارت کردہ اخباروں اور جن کے لیے میں نے لکھا تھا ان کے بارے میں تعریف کرنے میں بہت زیادہ رطب اللسان نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس بات پر زور دینا بہتر تصور کیا کہ اگرچہ میں نے ہنگامی حالت کی حمایت کی تھی' جب اسے پہلی بار نافذ کیا گیا تھا' تاہم میں حقیقت میں اس کی منسوخی' حزبِ اختلاف کے لیڈروں کی رہائی اور پریس پر عائد سنسرشپ کے اٹھائے جانے کے لیے مقدمہ لڑنے والا واحد صحافی تھا۔ ایل۔ کے۔ ایڈوانی نے اپنی کتاب میں میری ان جہتوں میں کوششوں کے حوالے سے تعریفی آرا کا اظہار کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میری تقریر کے بعد بھوپیش گپتا ایک مہذب انسان ہونے کے ناطے اپنے توہین آمیز جملے واپس لے لے گا۔

اگلی صبح وقفہ سوالات کے بعد ہدایت اللہ نے مجھے اپنا بیان دینے کے لیے بلایا۔ میں نے مدھم' نپے تلے لہجے اور جس قدر ہو سکتا تھا باوقار انداز میں تقریر کی اور بھوپیش گپتا سے

اس کے میری غیر موجودگی میں میرے خلاف جارحانہ تبصرے کرنے کے حوالے سے درخواست کی کہ اسے چاہیے کہ ایک برگزیدہ پارلیمنٹیرین اور ایک شریف آدمی ہونے کے ناطے انہیں واپس لے لے۔ حزب موافق نے میری بلند آہنگ تحسین و ستائش کی۔ ہدایت اللہ نے بھوپیش گپتا سے پوچھا کہ اسے کچھ کہنا ہے۔ وہ کھڑا ہوگیا اور بولا: ''میں اپنے کہے ہوئے ہر لفظ پر قائم ہوں۔'' میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا اور چلایا: ''تم شریف آدمی نہیں ہو' تم حرامی ہو۔''

''حرامی غیر پارلیمانی لفظ ہے۔'' ہدایت اللہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''اسے ریکارڈ سے حذف کردیا جائے گا۔ ''شریف آدمی نہیں'' ریکارڈ پر رہ سکتا ہے۔''

اگلی صبح کے اخبارات نے ''چٹپٹی'' کہانی کو اپنے صفحاتِ اول پر شائع کیا تھا۔ یہ ویسے نہیں ہوا تھا جیسے میں ایوان بزرگاں (ہاؤس آف ایلڈرز) کے ایک رکن کے طور پر اپنا کیریئر شروع کرنا چاہتا تھا۔ میرا باپ مجھ سے کئی برس پہلے اسی ایوان میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس میں سفید پگڑی' سیاہ کوٹ' پٹیاں لگے ٹراؤزرز اور چمک دار پالش کیے ہوئے جوتوں میں آیا کرتا تھا۔ اس نے رکن کی حیثیت سے اپنے زمانے میں دو سے زیادہ تقریریں نہیں کی تھیں مگر انہیں احتیاط سے تیار اور ادا کیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے شدید غصے میں اور غیر پارلیمانی زبان استعمال کرتے ہوئے اس کی توہین کی تھی۔

☆☆☆

راجیہ سبھا میں میرے برسوں کے ساتھ ساتھ پنجاب میں اکالی ایجی ٹیشن شروع ہوئی جو گولڈن ٹیمپل پر فوج کے دھاوا بولنے (خفیہ نام ''آپریشن بلیوسٹار'') کے بعد نقطۂ عروج کو پہنچ گئی' جس کی وجہ سے مقدس مقامات کی تباہی و بربادی ہوئی' ہزاروں معصوم جانوں اور جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ جو اتنا معصوم نہیں تھا' کی جان کا نقصان ہوا۔ چھ ماہ بعد مسز اندرا گاندھی کو قتل کردیا گیا اور اس کے آتشیں نتیجے میں پورے جنوبی ہندوستان میں پانچ ہزار سے زیادہ سکھوں کو خنجر گھونپ کر یا زندہ جلا کر ہلاک کردیا گیا۔ پنجاب کی صورتِ حال دونوں ایوانوں میں متلی پیدا کردینے والی باقاعدگی کے ساتھ زیر بحث آنے لگی۔ راجیہ سبھا میں تین اکالی رکن تھے۔ ایس۔جی۔پی۔سی کا صدر گورچرن سنگھ ٹوہرہ' جگدیو سنگھ تلونڈی اور ماسٹر تارا سنگھ کی بیٹی بی بی راجندر کور۔ دو سکھ ایچ۔ایس ہنس پال اور امرجیت کور کانگرس کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ٹوہرہ اور تلونڈی ایوان میں کبھی کبھار آیا کرتے تھے اور دو ایک مرتبہ ہی ایسا ہوا کہ ٹوہرہ پنجابی میں تقریر کرنے کھڑا ہوا جو ترجمے کے بعد بھی سمجھ نہیں آسکی۔ راجندر کور معاملات یا عقلی دلائل کے بارے میں کبھی تردد نہیں کرتی تھی۔ وہ صرف چیخ چلا اور حکومت پر سکھ مخالف تعصب کا الزام ہی لگا سکتی تھی۔

حالات نے مجبور کر کے مجھے سکھ اور پنجابی نقطۂ نظر کا ترجمان بنا دیا تھا۔ پہلے پہل تو مجھے امرجیت کور' جو کانونٹ کے لہجے میں اپنی تقریریں کیا کرتی تھی اور ہنس پال کی بے لہو' بمشکل سنائی دینے والی گڑگڑاہٹ پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ پھر کانگرس کی بنچیں دوبارہ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ دربارا سنگھ اور کپورتھلہ خاندان سے تعلق رکھنے والے کلین شیو' زرافے کی گردن جتنے لمبے نام کے مالک' قوی الجثہ نوجوان وشوجیت پرتھوی جیت سنگھ سے آباد ہوگئیں۔ وہ خطاب میں راجیہ سبھا میں ہر کسی سے مقابلہ کرسکتا تھا۔ وہ تیاری کر کے آتا تھا۔ خواہی نخواہی میں نے اپنے آپ کو حکومت کے خلاف ہوتا ہوا پایا' جس کی وجہ سے مجبوراً میں اکالیوں کا ترجمان بن گیا۔

اکالی تنگ ذہن کے متعصبوں کا ایک ٹولہ تھے' جو پنجاب میں اقتدار کے حصول کے لیے یک ذہن تھے۔ میں نے ان کی پنجابی بولنے والوں کی ریاست کے مطالبے کی حمایت کی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ دوسری علاقائی زبانوں کو دی جانے والی مراعات پنجابی کو نہ دینا اخلاقی طور پر غلط ہے اور خطرناک نتائج پیدا کرنے والا اقدام ہے۔ چونکہ پنجابی سبا کی منظوری دے دی گئی تھی (1966ء میں) آبادی کا ساٹھ فیصد سکھوں پر مشتمل ہوتے ہوئے' اس لیے میں نے محسوس کیا کہ سکھ سرحدوں کے معمولی بندوبست' دریائی پانیوں کی مساویانہ تقسیم اور مزید خودمختاری کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ میں آنندپور صاحب قرارداد کی مخالفت کرتا تھا جس میں سکھوں کو دوسرے ہندوستانیوں سے الگ قوم قرار دیا گیا تھا اور اس بنیاد پر الگ سکھ ریاست ـــــ خالصتان کے مطالبے کے بیج بوئے جارہے تھے۔ میں نے جذباتی انداز میں محسوس کیا کہ خالصتان سکھوں اور ہندوستان کے مفادات کے لیے مہلک ہوگا۔

واحد اکالی لیڈر جسے میں مناسب حد تک جانتا تھا ماسٹر تارا سنگھ تھا۔ اس نے میری پہلی سکھوں کی مختصر تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر عوامی سطح پر اس کی مذمت کی تھی۔ مطالعہ کر لینے کے بعد وہ میرے اس خیال کا حامی بن گیا جو میری پیشگوئی تھی کہ اگر نوجوان سکھ غالب تناسب کے ساتھ خالصہ روایتوں سے دوری اختیار کرتے رہے تو اس صدی کے ختم ہونے تک سکھ اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور سکھ مت کو ماننے والے ہندوؤں میں تبدیل ہوجائیں گے۔ ماسٹر جی جب بھی دہلی آتا تو مجھے ضرور بلوا بھیجتا تھا۔ میں اس کے ساتھ گردوارہ رکب گنج کے کچے صحن میں واقع چھوٹے سے کمرے میں کئی کئی گھنٹے گزارا کرتا تھا۔ اس کے اکالی ساتھی جو کچھ چاہتے تھے مجھے اس کا علم بہت پہلے ہوچکا تھا۔ ایک بند میٹنگ میں جس میں ماسٹر تارا سنگھ اور میرے علاوہ صرف تین مزید شرکاء تھے۔ ان میں سے ایک سابق ایم پی' سابق آئی۔سی۔ایس افسر کپور سنگھ بھی تھا جسے وہ اپنا سیاسی ناصح مانتے تھے۔ ہم نے پنجابی سبا کے مطالبے پر مبنی قرارداد کا

خاکہ تیار کیا۔ جب میں گھر گیا تو پولیس نے میری کار کا نمبر لکھ لیا' یہ ایک معمول کا معاملہ تھا' جس پر میں زیادہ متردد نہیں ہوا۔ اس شام میرا چچا اجل سنگھ جو اس وقت پنجاب کا گورنر تھا' میرے باپ کے ساتھ ڈنر کرنے کے لیے آیا۔ چندی گڑھ سے روانہ ہونے سے پہلے اسے سی آئی ڈی کا بھیجا ہوا ایک طویل ٹیلی گرام موصول ہوا تھا جس میں ماسٹر تارا سنگھ کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کی تفصیلات اور جو کچھ دیگر چاروں نے کہا تھا درج کیا گیا تھا۔ یہ ایک خفیہ اطلاع تھی تاہم میرے چچا نے اکالیوں کے ساتھ میل جول کے نتائج کے بارے میں مجھے انتباہ کرنے کے لیے اس اطلاع کو عیاں کر دیا تھا۔ اگلے روز جب میں نے ماسٹر جی کو اس بارے میں بتایا تو اس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا ادھر کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس پر میں بھروسہ کرسکوں وہ سب پولیس سے پیسہ لیتے ہیں۔

میں پنجاب کی سیاست سے بہتر شناسائی چاہتا تھا اور میں نے اس روز امرتسر جانے کا فیصلہ کیا جس روز اکالیوں نے اپنے دھرم یدھ مورچہ کا آغاز کرنا تھا۔ میں اس کے بارے میں مضبوط تحفظات رکھتا تھا۔ صبح کے وقت میں نے کانگریس اور بی جی پی گروپوں کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ سہ پہر کے وقت میں گولڈن ٹیمپل سے متصل مان جی صاحب گوردوارہ گیا تاکہ اکالیوں کے رہنماؤں کو سنوں۔

وہاں بیس ہزار سکھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور پانچ سے دس ہزار سکھ ارد گرد کھڑے ہوئے تھے۔ ڈائس پر گرنتھ صاحب کے علاوہ اکالی پارٹی کے اعلیٰ لیڈر فروکش تھے: سنت ہرچرن سنگھ لونگووال' جتھے دار ٹوہرہ' سابق وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل' سابق وزیر مالیات بلونت سنگھ' سابق رکن پارلیمینٹ بلونت سنگھ راموو الیہ اور نرلپ کور کے علاوہ موجودہ ایم پی راجندر کور۔ اس کہکشاں کا درخشندہ ستارا جرنیل سنگھ' بھنڈرانوالہ تھا۔ ٹوہرہ نے مجھے ہجوم میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے لانے کے لیے دو آدمی بھیجے۔ بہت ہچکچاتے ہوئے میں نے انہیں خود کو گھسیٹنے کی اجازت دے دی اور اپنے آپ کو گرنتھ صاحب اور مائیکروفون کے درمیان پہلی صف میں پایا۔ اس کے بعد ہونے والی بیشتر تقریروں کا رخ میری جانب ہی رہا۔ بھنڈرانوالہ کبھی مجھ سے نہیں ملا تھا۔ میں نے اسے اپنے جاں نثاروں کی طرف رخ کرتے اور پوچھتے ہوئے سنا: ''ایہہ کون ہے؟'' میں نے سنا کہ میرا نام بتایا گیا۔ وہ میرے بارے میں جانتا تھا اور جو کچھ میں نے اس کے خلاف لکھا تھا اس سے واقف تھا۔ میں جس اخبار کی ادارت کرتا تھا وہاں میں نے ہدایات جاری کی ہوئی تھیں کہ اس کے نام کے ساتھ کسی صورت میں سنت (صوفی) کا سابقہ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایک آسٹریلوی صحافی بھی اسے بتا چکا تھا کہ میرا خیال تھا کہ بھنڈرانوالہ سکھوں کا گیارہواں گروہ بننے کا مقصد رکھتا تھا۔ ''اگر اس شخص نے حقیقتاً ایسا کہا تھا''

''بھنڈرانوالہ نے جواب دیا تھا''تو میں اسے اور اس کے خاندان کو مٹا دوں گا۔'' آسٹریلوی ہماری جانیں بچانے کے لیے فوراً اپنے بیان سے مکر گیا تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھے رہنے کو بہت تکلیف دہ پایا اور مجھے اپنے دکھتے ہوئے کولہوں اور گھٹنوں کو آرام دینے کے لیے پہلو بدلنا پڑے تھے۔ ایک کے بعد ایک شعلہ فشاں تقریر کی جارہی تھی۔ ہجوم بے قرار ہو چکا تھا اور بھنڈرانوالہ کے لیے شور مچا رہا تھا۔ آخر کار وہ ''بولے سو نہال ......ست سری اکال'' کے فلک شگاف نعروں کے درمیان مائیکروفون پر آیا۔ وہ ایک طویل قامت، دبلا پتلا، طوطے کی سی ناک، آتش بار آنکھوں اور لمبی لہراتی ہوئی ڈاڑھی والا شخص تھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ میں چاندی کا ایک تیر تھامے رکھتا تھا، جیسے گرو گوبند سنگھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ کارتوسوں سے بھری ہوئی ایک بیلٹ اس کے سینے پر بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہولسٹر میں رکھا ہوا پستول ہوا کرتا تھا اور دائیں ہاتھ میں چار فٹ لمبی کرپان ہوتی تھی۔ اس نے بھی تقریر مجھ سے مخاطب ہو کر کی۔ ''میں اپنے قدموں کے قریب بیٹھے ہوئے اس سردار صاحب کو نہیں جانتا ہوں۔'' اس نے آغاز کیا: ''انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ کسی ''ہندوستان ٹائمز'' کہلائے جانے والے انگریزی اخبار کا مدیر ہے۔ میں انگریزی نہیں بول سکتا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ لکھتا ہے کہ میں نے سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت پیدا کی ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں تو ایک مبلغ ہوں۔ میں تو بستی بستی جا کر سکھوں سے کہتا ہوں کہ وہ دسویں گرو کے راستے پر واپس آجائیں۔ میں انہیں اپنی ڈاڑھیوں کو کاٹنے سے روکتا ہوں، افیم کھانے اور تمباکو نوشی سے منع کرتا ہوں، میں تو انہیں خالصہ پنتھی بنانا چاہتا ہوں۔'' اس کی تائید کرنے کے لیے ست سری اکال کے فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔ وہ اپنے موضوع کے حوالے سے پرجوش تھا۔ ''اگر مجھے اختیار ہو تو تم جانتے ہو کہ میں ان سرداروں کے ساتھ کیا کروں جو ہر شام وسکی شسکی پیتے ہیں؟ میں ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر ان کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' اس بات کو ''بولے سو نہال ......ست سری اکال'' کے لمبے لمبے نعروں کے ساتھ سراہا گیا۔ یہ کتنی ستم ظریفی تھی کہ اس کو سراہنے والے سامعین کی اکثریت سکھ جاٹوں پر مشتمل تھی جو اپنی شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے بدنام تھے۔ میں بادل اور بلونت سنگھ کی طرف مڑا، جو دونوں ہی میرے گھر سکاچ پی چکے تھے اور کہا: ''وزیراعلیٰ دربارا سنگھ اپنی ساری پولیس کے ساتھ جو کچھ نہیں کر سکتا وہ کام یہ ہیرو ایک ماچس کے ذریعے کرے گا۔'' وہ چپکے چپکے ہنسنے لگے۔

میں نے ریٹائرڈ جنرل شاہ بیگ سنگھ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ وہ بھی طویل قامت، دبلا پتلا خاکستری ڈاڑھی والا آدمی تھا۔ اس نے تب کلین شیو کروا دی تھی جب اس نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے مکتی باہنی کو تربیت دی تھی اور ان کی رہنمائی کی تھی۔ کرپشن

الزامات کے تحت اس کا محاسبہ کیا گیا تھا اور وہ حکومت سے ناخوش تھا۔ میں نے دیکھا کہ' صرف ایک استثنٰی کے علاوہ' اکالیوں میں شامل ہونے والے تمام فوجی افسر اور جوان فوج سے نکال دیئے گئے ہوئے تھے یا انہیں ملازمت میں ترقی نہیں دی گئی تھی اور وہ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کے حوالے سے ذاتی معاندت رکھتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ اکالیوں کے ساتھ ایسے دس ہزار افراد شامل تھے۔

میں ان اکالیوں کے جلوس کے پیچھے پیچھے امرتسر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا پولیس سٹیشن پہنچا جہاں بسوں کا ایک بیڑا قطاروں میں کھڑا تھا جو ان لوگوں کو پنجاب کی مختلف جیلوں میں لے جاتا جنھوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ ٹوہرہ' بادل اور جنرل شاہ بیگ سنگھ ان میں شامل تھے۔ یہ ایک بہت منظم معاملہ تھا۔ لوگ پولیس سٹیشن کے صحن میں گوردوارے سے لایا گیا شام کا پرتکلف کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہیں بسوں میں بٹھا کر وہاں سے لے جایا گیا۔ یہ ''قربانی'' 1920ء کی دہائی کے مورچوں کی یاد میں تھی جب اکالی رضا کاروں کو لوہے کے سروں والے ڈنڈوں سے مارا اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالنے کے لیے ان کے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جاتا تھا۔

میں شام میں دیر گئے اپنے ہوٹل واپس آیا۔ مجھ پر افسردگی طاری ہو چکی تھی۔ میں جتنا زیادہ اپنے آپ کو اپنی کمیونٹی میں جذباتی طور پر شامل محسوس کرتا تھا اتنا میں اس احتجاج' اس دھرم یدھ کے نام پر سراسر ریاست میں کانگرسی حکومت کو ہٹانے اور اس کی جگہ بادل' بلونت اینڈ کمپنی کو اقتدار میں لانے کی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اکالیوں کی خودغرضانہ ہوس اقتدار اور ریاستی حکومت کے خلاف عام سکھوں کے جذبات کا استحصال تھا۔ میں افسردگی پر قابو پانے کے صرف ایک ہی طریقے سے واقف تھا یعنی سکاچ کے دوسخت جام۔

بھنڈرانوالہ واحد شخص نہیں تھا میں نے جس کے غیظ وغضب کو ابھارا تھا۔ میرا ٹکراؤ ایس۔ ایل۔ کھرانہ سے بھی ہوا تھا جو ''ہندوستان ٹائمز'' کے جنرل منیجر کے طور پر خدمات انجام دینے کے بعد دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا تھا۔ اس کے میرے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات رہے تھے اور جب کبھی میرا کوئی حسین ملاقاتی آتا تو میں اسے اس پر ایک نظر ڈالنے کے لیے فون کر کے بلا لیا کرتا تھا۔ یہ واقعہ اس کے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نامزد ہو جانے کے بعد کا ہے کہ میرے سب سے زیادہ قابل اعتماد رپورٹروں میں سے ایک پر بھادت میرے پاس آئی اور مجھے کہا: ''میرے پاس ایک اہم ترین خبر (سکوپ) ہے' میں اسے صرف آپ کو بتاؤں گی مگر آپ وعدہ کریں کہ اس کو دبائیں گے نہیں۔'' میں نے اس سے وعدہ کیا۔ اس کی سٹوری (خبر) یہ تھی کہ کھرانہ غیر قانونی طریقے استعمال کرتے ہوئے میڈیکل کالج میں کسی غیر ملکی طالب علم

کے لیے مخصوص نشست کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کروا کر اور پرنسپل پر دباؤ ڈال کر اس کی بجائے اپنے بیٹے کو داخل کروانا چاہتا ہے۔ مجھے سٹوری کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اسی شام کھرانہ نے مجھے فون کیا اور کہا کہ وہ چند معززین کا استقبال کرنے کے لیے ایئرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں چند منٹ میرے پاس رکے گا۔ اس نے مجھ سے اپنے بیٹے کے داخلے کے بارے میں سٹوری کو استعمال نہ کرنے کی درخواست کی۔ میں نے اپنی سی بہترین کاوشوں کا وعدہ کیا۔ جب میں رات کے کھانے کے بعد دفتر واپس گیا تو میں خبر دبا چکا تھا۔ تاہم اسے دہلی کے ایک دوسرے اخبار نے شائع کر دیا۔ اگلی صبح مجھے ایک بہت مشتعل اور آنسو بہاتی ہوئی پربھادت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے مجھ پر اپنا وعدہ توڑنے اور دباؤ کے سامنے جھک جانے کا الزام لگایا۔ میں نے اس کو دلاسہ دینے کی بہت کوشش کی او چونکہ سٹوری پہلے ہی شائع ہو چکی تھی اس لیے اگلے روز اسے ''ہندوستان ٹائمز'' میں اپنی زیادہ تفصیلی سٹوری شائع کروانے کی اجازت دے دی۔ کھرانہ میرے اوپر انتہائی مشتعل تھا کیونکہ ''ہندوستان ٹائمز'' کی سرکولیشن اس اخبار سے کافی زیادہ تھی اور وہ ایک زمانے میں اسی اخبار کا ایگزیکٹو پریذیڈنٹ ہونے کی وجہ سے بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ مجھ سے غصے ہونے کے علاوہ وہ برلا کے خلاف انتقامی ہو گیا۔ اس نے اپنی حدود سے ماورا ہو کر برلا کے کچھ ایسے کاروباری منصوبے مسترد کر دیئے جو اس کا پیشرو منظور کر گیا تھا۔ پھر کھرانہ کو تامل ناڈو کے گورنر کی حیثیت سے ٹرانسفر کر دیا گیا۔ میں نے اپنے ''کینہ'' کالم میں لکھا کہ دہلی کا فائدہ تامل ناڈو کا نقصان تھا اور اس کی توضیح کرتے ہوئے اس کا لیفٹیننٹ گورنر کی حیثیت میں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے کسی مستحق طالب علم کو اس کے استحقاقی موقعے سے محروم کر کے اپنے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخل کروانے کا واقعہ بیان کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی اپنے سابقہ آجر کے خلاف دکھائی گئی کینہ جوئی اور انتقام پروری کا حوالہ بھی دیا۔ کھرانہ ریاست کے اٹارنی جنرل کی خدمات حاصل کرتے ہوئے اس معاملے کو پریس کونسل میں لے گیا اور اس نے حکومت کے خرچ پر مدراس کے سینئر وکیلوں کی ایک لمبی قطار کو یہ مقدمہ لڑنے کے لیے حاصل کر لیا۔ میری وکالت سدھارتھ شنکر رے نے کی جو کہ برلاؤں کا مستقل وکیل تھا۔ یہ مقدمہ کئی مہینے گھسٹتا رہا۔ آخر کار پریس کونسل کے سامنے پیش کیے گئے بیشتر مقدموں کی طرح یہ بھی ایک تصفیے پر منتج ہوا یعنی ''ہندوستان ٹائمز'' نے اس مضمون کی چند سطریں شائع کر دیں کہ اس خبر کو گورنر کھرانہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی نیت سے شائع نہیں کیا گیا تھا۔

گوپال سنگھ ڈارڈی کا میرے خلاف مقدمہ بھی اس کے گوا کا لیفٹیننٹ گورنر متعین ہونے پر میرے تبصرے کی وجہ سے قائم کیا گیا۔ ڈارڈی اس قسم کا شخص تھا جس کے ساتھ میں

کوئی مراسم استوار نہیں کرسکتا تھا۔ پہلے پہل میں نے اس کے بارے میں ایک ہفتہ وار اخبار ''لبریٹر'' کے مدیر کے طور پر سنا تھا' جس میں اس نے سکھوں کے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ پھر وہ اور اس کا اس وقت کا قریبی دوست کپور سنگھ ایک آٹو موبائل سے متعلق رسالے کے یک چشم انگریز مدیر کی طرف سے کیے گئے طلاق کے مقدمے میں جواب دہ ہوئے۔ ڈارڈی نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور اس انگریز کی سکھ بیوی سے شادی کر لی تھی اور اس کی بیٹی کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ سکھوں کے خدشات پر تحقیق کرنے کے لیے قائم کیے گئے داس کمیشن کے سامنے پیش ہونے سے میرے انکار کے بعد (ماسٹر تارا سنگھ نے سکھوں کو اس کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا کہا تھا) ڈارڈی یہ ثابت کرنے کے لیے شہادت دینے پر راضی ہو گیا کہ سکھوں کے خلاف امتیاز نہیں برتا جا رہا ہے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ پرتاپ سنگھ کائروں نے اسے راجیہ سبھا کے لیے نامزد کرتے ہوئے انعام سے نوازا تھا۔ اس نے اس کی کارروائیوں میں تو بہت تھوڑا حصہ لیا مگر گرنتھ صاحب کا ترجمہ کر کے اسے چار جلدوں میں شائع کیا اور ریاستی لائبریریوں اور یونیورسٹیوں کو فروخت کیا۔ مجھے آل انڈیا ریڈیو نے اس کے کام پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا۔ قریباً چھ ہزار مناجاتوں کو ترجمہ کرنے کے لیے جتنی محنت ہوئی ہو گی اس کو تسلیم کرتے ہوئے میں نے گفتگو کا اختتام یہ کہتے ہوئے کیا کہ اب وقت ہے کہ کوئی شخص انہیں انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سنبھالے۔ اے آئی آر کے افسر نے آخری طنزیہ جملے پر توجہ نہیں دی اور اسے نشر ہونے دیا۔ ڈارڈی مشتعل ہو گیا۔ تاہم مخالفانہ تنقید سے بے نیاز اس نے اپنا ترجمہ نوبل پرائز کمیٹی اور سویڈن کے بادشاہ کو بھجوا دیا۔ ہز میجسٹی نے آداب کے مطابق ان جلدوں کے موصول ہونے کی رسید بھجوا دی۔ ڈارڈی کے لیے آل انڈیا ریڈیو اور پی ٹی آئی کو یہ اطلاع دینے کے لیے کہ اسے ادب کا نوبل پرائز دیا جا رہا ہے' اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اس اعلان کو نو بجے والی خبروں میں سنا۔ چند منٹ بعد کسی شخص نے مجھے ریڈیو سٹیشن سے فون کیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ڈارڈی کو خراج عقیدت پیش کرنا گوارا کروں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ خبر بے بنیاد ہے کیونکہ نوبل پرائز کبھی کسی ترجمے کے کام پر نہیں دیا جاتا ہے۔ پی ٹی آئی کی جاری کردہ خبر کو کسی اخبار نے سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن بایں ہمہ اس کو افتتاحی جملے ''باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے'' کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ڈارڈی کی ادیب کے طور پر ساکھ فزوں تر ہو گئی: ہر طرف یہ بات پھیل گئی کہ اس نے نوبل پرائز قریباً ''جیت'' لیا ہے۔

راجیہ سبھا میں اپنی چھ سال کی مدت کے پورے ہونے پر ڈارڈی نے ایک مشرقی یورپی ملک میں سفیر بننے کا بندوبست کیا۔ اس تقرر کے دوران میں وہ پوپ سے ملا اور اسے عیسیٰ کے بارے میں اپنی کہی ہوئی نظم پیش کی۔ اس نے پوپ کے ساتھ اپنی تصویر کی وسیع پیمانے پر

تشہیر کی۔ میں واحد شخص تھا جس نے ڈارڈی کو سنجیدگی سے نہیں لیا! تاہم میں نے اس کے حوالے سے جو کچھ کہا اس کو ایک ایسے شخص سے میرا حسد تصور کیا گیا جس نے زندگی میں مجھ سے بہتر کام کیے تھے۔ اپنی خارجہ ذمہ داریوں سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈارڈی نے چندی گڑھ میں کافی زیادہ زمینیں خریدیں' جہاں اس نے ایک مطبع (پرنٹنگ پریس) لگایا اور دہلی میں ایک بڑا گھر خریدا۔ اس نے اپنے لیے بہتر کیا تھا۔ اس نے تقسیم کے وقت مسٹر جناح' کانگرسی لیڈروں اور اکالیوں کے درمیان مذاکرات میں اپنے ادا کیے ہوئے اہم کردار کے حوالے سے مضامین کا ایک سلسلہ (سیریز) تحریر کیا۔ یہ اس کے تخیل کا کرشمہ تھا۔ کیونکہ تقسیم کے مباحثوں کے ریکارڈ میں اس کے حوالے سے کوئی بات موجود نہیں ہے۔ اس نے خود کو گورنر مقرر کروانے کے لیے گیانی ذیل سنگھ اور مسز گاندھی تک رسائی حاصل کی۔ گیانی اس کے خلاف مضبوط تحفظات رکھتا تھا۔ مسز گاندھی راضی ہوگئی۔ اس نے گیانی جی کو کہا کہ اگرچہ اس کے پاس ڈارڈی کے بارے میں مخالفانہ رپورٹیں ہیں تاہم اسے گورنر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ کوئی گورنر سکھ نہیں ہے۔ سو ڈارڈی نے خود کو گوا کے ساحل سمندر پر خوب صورت راج بھون میں پایا۔ میں نے اپنے ''کینہ'' کالم میں ڈارڈی کے کیریئر کی تفصیل بیان کی تھی اور اضافہ کیا تھا کہ صرف کسی ہندوستان جیسے بیمار معاشرے میں ہی کوئی فریبی اس طرح سے فریب کر کے اہمیت والا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے شیخ سعدی کے یادگار شعر درج کیے تھے:

ثنائے خودبخود گفتن

نہ زیبد مردِ دانا را

چوں زن پستانِ خود مالد

کجا لذت شود باقی؟

(کسی عقل مند انسان کو اپنی تعریف خود کرنا زیب نہیں دیتا۔
اگر کوئی عورت اپنی چھاتیاں اپنے ہاتھوں سے
مسلے تو اسے کیا لذت محسوس ہوگی؟)

ڈارڈی نے برلا کو فون کیا۔ برلا بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ ڈارڈی نے مجھے اپنی کردار کشی کرنے پر ڈیڑھ کروڑ روپے کا قانونی نوٹس بھجوا دیا اور مجھے عدالت میں لے جانے کی دھمکی دی۔ اس کی بجائے وہ مجھے پریس کونسل میں لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نوبل پرائز جیتنے کی من گھڑت خبر کو سچ ثابت نہیں کر سکتا۔ کھرانہ مقدمے کی طرح ڈارڈی کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا۔ کئی سماعتوں کے بعد پریس کونسل کے چیئرمین جسٹس گروور نے ایک مصالحتی فارمولہ تیار کیا اور مقدمہ واپس ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ ڈارڈی مجھے مردہ دیکھنا پسند کرے گا۔ میں اس شخص کو جانتا نہیں تھا۔ مجھے اور رینٹ لانگ مین کے ڈائریکٹروں کے بورڈ کے اجلاس کے لیے گوا جانے کا موقع ملا۔ دو ڈائریکٹروں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے وہاں کی معزز شخصیات سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے' وہ ڈارڈی سے بھی ملے اور اس نے انہیں ڈنر پر مدعو کیا۔ اسے ان سے پتا چلا کہ میں گوا میں ہوں۔ میں اگلی صبح ایئرپورٹ لے جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ راج بھون سے میرے لیے ایک کال موصول ہوئی۔ میں نے استقبالیہ کلرک سے کہا کہ وہ کہہ دے کہ میں جاچکا ہوں۔ جب میں ایئرپورٹ پہنچا تو ایئرپورٹ منیجر نے میرے لیے وی آئی پی لاؤنج کھولا ہوا تھا اور اس نے مجھے گورنر کو فون کرنے کا کہا۔ میں نے کہا کہ میں عوامی لاؤنج میں بیٹھ کر زیادہ خوشی محسوس کروں گا اور جتنی جلدی ہوسکا فون کرلوں گا۔ چند منٹ بعد گورنر کا اے ڈی سی پہنچ گیا اور مجھ سے وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھنے کی اور گورنر سے بات کرنے کی التجا کی۔ ''دوسری صورت میں میں نوکری کھو بیٹھوں گا۔'' وہ گڑگڑایا۔ میں نے ڈارڈی سے بات کی۔ اس نے پوچھا کہ جب راج بھون میرے گھر ہی کی طرح تھا تو میں نے ہوٹل میں قیام کیوں کیا وغیرہ وغیرہ۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسے آدمی کو کس طرح جواب دیا جائے جو ایک ایسے شخص کے ساتھ میٹھا بن گیا ہو جو اس پر بے رحمی کے ساتھ تنقید کرتا رہا ہو۔

ایسا اس سے بھی زیادہ تب ہوا تھا جب اسے تبدیل کرکے ناگالینڈ کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ میری بیوی کو اور مجھے وزیراعلیٰ جمیر نے کرسمس ان کے ساتھ کوہیما میں گزارنے کی دعوت دی۔ اس نے ہمارے لیے کرسمس ڈنر کی بڑی تقریب کا اہتمام کیا۔ ہمیں امید تھی کہ ڈارڈی وہاں نہیں ہوگا۔ تاہم وہ اور اس کی بیوی وہاں پہنچنے والے اولین مہمان تھے۔ دونوں ہم سے گلے ملے۔ مسز ڈارڈی میرے ساتھ ہی بیٹھی اور مجھ سے کہنے لگی کہ وہ مجھ سے ملنے کی کتنی زیادہ مشتاق تھی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم دہلی واپس جانے کے لیے دیماپور کو روانہ ہونے سے پہلے ان کے ساتھ کافی ضرور پئیں۔ ہم نے ان کے ساتھ کافی پی۔ وہ بہت زیادہ پرجوش تھے۔ اس نے دیماپور تک ہمارے سفر کے لیے ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ فوج کے لیے مخصوص سڑک اور دیماپور میں ہمارے قیام کا بندوبست کیا۔ میں ڈارڈی سے آخری مرتبہ ایک تقریب میں ملا تھا' جس کا اہتمام فاؤنڈیشن فار فریڈم آف انفارمیشن نے کیا تھا' جس میں وزیراعظم وی۔ پی۔ سنگھ نے مجھ سمیت پانچ صحافیوں کو پچیس ہزار روپے کے چیک دیئے تھے۔ ڈارڈی آیا اور مجھے کہنے لگا کہ وہاں وہ صرف مجھے ایوارڈ حاصل کرتا ہوا دیکھنے کے لیے آیا ہے۔ چند ہفتوں بعد میں نے ڈارڈی کی دل کا دورہ پڑنے سے اچانک موت کا پڑھا۔ میں اس وقت چنڈی گڑھ کے اخبار ''ٹریبیون'' میں ہر ہفتے شائع ہونے والے اپنے کالم ''سب سے بڑھ کر یہ'' کے حوالے سے

بدحواس سا ہو رہا تھا کہ کیا لکھا جائے۔ میں نے ڈاکٹر گوپال سنگھ ڈارڈی پر ایک طویل تعزیت نامہ لکھا۔ وہ اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو ہمیشہ فاتحین کے طور پر ابھرتے تھے۔

جس مضمون نے مجھے حقیقتاً ''ہندوستان ٹائمز'' کے مدیر کے طور پر ایک مقام دلوایا وہ میرا نہیں بلکہ میرے رفیق کار بی۔ ایم سنہا کا تحریر کردہ تھا۔ یہ عدلیہ میں کرپشن پر لکھا گیا تھا۔ یہ ایک بہت مصدقہ مضمون تھا کہ کس طرح مختلف ہائی کورٹوں کے جج چند وکیلوں کی سرپرستی کرتے ہیں' دوسروں کے خلاف امتیاز برتتے ہیں' اپنے رشتہ داروں کو وکالت چمکانے میں مدد دیتے ہیں اور خود اپنے اوسط اہلیت کے حامل بیٹوں کو بنچ تک اٹھا لاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری عدلیہ جس طرح اپنے آپ کو باور کرواتی ہے اس اعتبار سے وہ مضمون توہین آمیز تھا۔ مجھے ممتاز وکیلوں مثلاً نانی پالکھی والا' سولی سوراب جی' اور ریٹائرڈ چیف جسٹس آر۔ ایس۔ نرولا سمیت ہر کسی نے تسلی دی کہ معاملات اس سے بھی بدتر ہیں جتنے کہ مضمون میں بیان کیے گئے ہیں اور یہ کہ یہی وقت ہے کہ کوئی شخص انہیں عیاں کرے۔ مجھے ایک نوٹس دیا گیا کہ میں پنجاب اور ہریانہ ہائیکورٹ کے روبرو پیش ہوؤں۔ مجھے درجنوں وکیلوں نے اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کیں۔ مجھ سے چیف جسٹس نے سوال کیا کہ کیا میں جانتا تھا کہ عدالت کی توہین کے مقدموں میں سچ کوئی دفاع نہیں ہوتا ہے۔ میں نے کہا میں جانتا تھا تاہم وسیع تر عوامی مفاد نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس مضمون کو شائع کر دوں۔ میں نے معافی مانگ کر خود کو توہین سے بری کروانے کو مسترد کر دیا اور عدالت سے کہا کہ وہ سماعت کی کوئی اور تاریخ دے تاکہ نانی پالکھی والا میری طرف سے پیش ہو۔ ایک اور تاریخ مقرر کر دی گئی۔ نانی کے نام نے ججوں کو مجھے مجرم قرار دینے پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے چند تیکنیکی بنیادوں پر میرے خلاف مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ کیا۔

پھر الٰہ آباد ہائیکورٹ نے مجھے بی۔ ایم۔ سنہا اور ''ہندوستان ٹائمز'' کے عبوری جنرل منیجر ڈاکٹر راج ہنس (بعدازاں لوک سبھا کا رکن) کے ہمراہ حاضر ہونے کا نوٹس بھیجا۔ ہمارے پاس اپنے دفاع کے لیے سدھارتھ شنکر رے تھا۔ عدالت کا کمرہ وکیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ جسٹس کاتجو (بی۔ ایم سنہا کا مضمون اس کی طرف اشارہ کر چکا تھا) اور حال ہی میں متعین ہونے والا ایک جج بنچ میں شامل تھے۔ کاتجو نے پورے تیقن کے ساتھ رے کو بتایا کہ اگر ہم غیر مشروط معافی نہیں مانگیں گے تو وہ ہمیں جیل بھیج دے گا۔ میرے پیچھے کھڑے وکیلوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں جھکوں نہیں۔ رے نے ہمیں اس معاملے پر غور کرنے کے لیے مہلت دینے کا کہا۔ ہمیں اگلی صبح حاضر ہونے کا کہا گیا: یا تو غیر مشروط معافی مانگنا پڑتی یا پھر چند دن نینی جیل میں گزارنے پڑتے۔ جب تک رے ہمیں سپریم کورٹ سے ضمانت دلا پاتا۔ یہ موسم گرما کا وسط تھا

اور کسی مچھروں اور چوہوں سے بھری ہوئی کوٹھڑی میں وقت گزارنے کا تصور بھی مجھے بھلا نہیں لگتا تھا۔ بی۔ ایم۔ سنہا اپنے مؤقف پر ڈٹا ہوا تھا اور اس نے کہا کہ وہ معافی مانگنے کی بجائے جیل چلا جائے گا۔ رے نے ہمیں بتایا کہ عدالت ایک شخص کی معافی قبول نہیں کرے گی اور یہ کہ ہم تینوں کو متفقہ طور پر قدم اٹھانا ہوگا۔ راج ہنس اور میں سنہا پر مسلط ہو گئے کہ وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی شہید نہیں کروائے۔ اگلے دن ہم نے ایک غیر مشروط معافی پیش کر دی' تاہم اس یقین کے ساتھ کہ عدلیہ کرپشن سے سڑ چکی ہے اور اس کو عیاں کیا جانا ضروری ہے۔

☆☆☆

ذرا مجھے راجیہ سبھا کی طرف لوٹنے دیجئے کیونکہ یہ ان تین برسوں (3-1980ء) جب میں ''ہندوستان ٹائمز'' کا مدیر تھا اور اس کے بعد کے مزید تین برسوں پر محیط تھی۔ ان چھ برسوں نے پنجاب میں ابھرتی ہوئی داخلی بے چینی کا مشاہدہ کیا اور میرا حصہ کسی نامزد رکن کے لیے متوقع تقریر کے عمومی حصے سے زیادہ تھا۔

میں یہ دیکھ کر مایوس ہوا تھا کہ بیشتر رکن اپنی ذمہ داریوں کو کس قدر ہلکا پھلکا لیتے تھے۔ جب 11 بجے وقفہ سوالات کے ساتھ اجلاس شروع ہوتا تو ایوان عمومی طور پر بھرا ہوا ہوتا تھا۔ کچھ سوالات یک آہنگ باقاعدگی کے ساتھ ظاہر ہوا کرتے تھے۔ ایک سوال جو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی اجلاس میں نہ پوچھا گیا ہو' مشروبات کے حوالے سے تھا: رمیش چوہان کا لمکا بمقابلہ چرن جیت سنگھ کا کمپا کولا۔ کسی کو شک نہیں تھا کون سا رکن کسی ایک یا دوسرے کو کیسے دیکھتا ہے۔ کچھ رکن پیدائشی ضمنی سوالات اٹھانے والے تھے اور اگر انہیں اجازت نہیں دی جاتی تھی تو وہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھاتے جو کہ لازماً نظرانداز کر دیئے جاتے تھے۔ نیز وہاں باوقار پیلومودی جیسے رکن بھی تھے جو کارروائی پر رواں تبصرہ کرتا رہتا تھا۔ تاہم وہ برجستہ مذاق کرنے والا انسان تھا اور سب سے زیادہ قہقہے لگواتا تھا۔ وہ روایت پسندانہ' امریکہ حامی تصورات کا حامل تھا اور حکمران کانگرس پارٹی کے ارکان اسے اکثر ''واشنگٹن کا محب وطن'' کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایک بلے کارڈ آویزاں کیے ایوان میں آ گیا' جس پر لکھا تھا ''میں سی آئی اے کا ایجنٹ ہوں۔'' چیئرمین نے اسے اس بلے کارڈ کو اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ایسا کیا ''میں مزید سی آئی اے کا ایجنٹ نہیں رہا۔'' ایک رکن جس نے پیلومودی کا منہ بند کروانے کو اپنا وطیرہ بنا لیا تھا جے۔ سی۔ جین تھا جو کانگرس کا ایک بہت بلند بانگ رکن تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اسے تنگ کر رہا تھا تو پیلو کو غصہ آ گیا او وہ چلایا: ''بھونکنا بند کرو!'' جین کھڑا ہو کر چیخا: ''سر! وہ مجھے کتا کہہ رہا ہے۔ یہ غیر پارلیمانی زبان ہے۔'' چیئرمین ہدایت اللہ نے اس بات سے اتفاق کیا اور حکم دیا: ''یہ ریکارڈ پر نہیں جائے گا۔'' پسپا ہونے کی بجائے پیلومودی نے

کہا: ''ٹھیک ہے' (گدھے کی طرح) رینکنا بند کرو!'' جین کو اس لفظ کے معنی کا پتہ نہیں تھا۔ یہ ریکارڈ پر آ گیا۔ جب ہندوستان نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ (سیٹلائٹ) مدار میں بھیجا تو وزیرِاعظم اندرا گاندھی اور ہندوستانی سائنس دانوں کو مبارک دینے کے لیے تقریروں پر تقریریں کی گئیں۔ پیلو مودی نے بھی دونوں کو بھرپور طور پر سراہا۔ پھر وہ مسز گاندھی کی طرف مڑا اور بولا: ''میڈم پرائم منسٹر! ہم جانتے ہیں کہ ہمارے سائنس دان ٹیکنالوجی میں تیز رفتاری سے عظیم ترقی کر چکے ہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اب ہمیں بتا سکیں کہ ہمارے ٹیلی فون کیوں کام نہیں کرتے؟''

پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والے چند رکن بلند ترین آوازوں میں چلانے اور ناشائستہ اشارے کرنے کو اپنی پارلیمانی ذمہ داریوں کا جوہری حصہ تصور کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شور مچانے والی خاتون اراکین ہوتی تھیں جو اپنی صنف (Sex) کے خلاف بعید ترین اشارے پر بھی فوری طور پر ناراضی کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ دہلی پولیس کو ایک گروہ بند کی لڑکی مایا تیاگی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کے معاملے پر شکنجے میں کس لیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی ایک خاتون رکن نے' جو پست قامت' موٹی تھی اور موٹے موٹے شیشوں کی عینک پہنتی تھی' حکومت کے لتے لیے' ''ہم ہر روز کسی نہ کسی جگہ زیادتی کی خبر سنتے ہیں۔ ہر وقت زیادتی' زیادتی' زیادتی ہوتی ہے۔ حکومت کیا کر رہی ہے؟''

نرگس دت جو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اپنی نشست سے تیزی سے اٹھی اور چلائی: ''تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ کبھی کوئی تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا۔'' یہ ایک غیر معمولی حد تک سادہ نظر آنے والی عورت کے حوالے سے بہت سخت تبصرہ تھا۔ کسی نے احتجاج نہیں کیا۔

وقفہ سوالات ہمیشہ جان دار ہوتا تھا اور موضوعات کے وسیع سلسلے پر محیط ہوتا تھا' جو کہ اگرچہ ہمیشہ قومی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد ساعتِ صفر (زیرو آور) آتا تھا جو ہندوستانی جمہوری روایت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں ہر کوئی آزاد ہوتا ہے۔ درجن بھر ارکان کھڑے ہو کر جو کچھ ان کے ذہنوں میں سب سے اوپر ہوتا اسی پر چیخ رہے ہوتے تھے۔ سب چیئرمین اپنے اپنے چیمبروں میں چلے جاتے تھے اور اس غل غپاڑے سے اپنے نائبوں کو نمٹنے دیتے تھے۔ جب چیخ پکار جاری ہوتی تو وہ مرد یا عورت وزیروں کو ایوان کی میز پر استعفیٰ رکھنے کا کہا کرتے تھے۔ جس وقت یہ ہنگامہ فرو ہوتا ہے ارکان کو خصوصی توجہ کے لیے معاملات کو اٹھانے کی اجازت ہوتی ہے۔ انہیں سننے کے لیے چند رکن ہی ٹھہرتے ہیں۔ ایوان تیزی سے خالی ہو جاتا ہے۔ اتنی طرح صحافیوں کی گیلری بھی تیزی سے خالی ہو جاتی ہے۔ ہر وہ

رکن جس کے نام کے خلاف کوئی شے اس روز کی کارروائی میں نہیں ہوتی مرکزی ہال میں چائے یا کافی پینے کے لیے چلا جاتا ہے۔ یہاں سیاسی اختلافات کو زیادہ اہم کاموں ...... گپ شپ اور سکینڈل پھیلانے ...... کے لیے الگ دھر دیا جاتا ہے۔ وزیروں اور ایوان کی خاتون اراکین کی نجی زندگی پر سے پردے ہٹائے جاتے ہیں۔ مسز گاندھی نے' جو کبھی مرکزی ہال میں نہیں آئی تھی' مخبر رکھے ہوئے تھے جو اسے آگاہ رکھتے تھے کہ ارکان اس کی پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔

☆☆☆

پنجاب میں دربارا سنگھ کی حکومت ہٹائے جانے اور ریاست پر صدر راج قائم ہو جانے کے بعد پنجاب پر بحثیں پارلیمنٹ کا معمول بن گئیں۔ دہشت گردی نے ریاست اور اس کی سرحدوں کے باہر اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے تھے۔ بھنڈرانوالہ کی تقریریں ہندوؤں کے لیے زیادہ زہریلی اور توہین آمیز ہو گئیں۔ وہ مسز گاندھی کو ''پنڈتن دی دھی یا باہمنی'' کے نام سے پکارنے لگا۔ ہندو ''دھوتیاں' ٹوپیاں والے'' تھے۔ ایک تقریر میں اس نے ہر سکھ کو بتیس ہندوؤں کو قتل کرنے کی تاکید کی' اس نے کہا نہ اکتیس' نہ تینتیس ...... صرف بتیس۔ (اس طرح ہندوؤں کی کل آبادی برابر برابر حصے میں آ جاتی تھی) مجھے پتا نہیں ہے کہ زیادہ سکھ اسے جنونی قاتل کیوں نہیں مانتے۔ جن دنوں وہ اس قسم کی نفرت انگیز تقریریں کر رہا تھا میں سنت لونگووال سے' جو ''دھرم یدھ مورچہ'' کا نام کا سربراہ تھا' ایس جی پی سی کے دفتروں میں اس کے کمرے میں ملا۔ لونگووال سے ہونے والی یہ ملاقات زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھنڈرانوالہ سے خوش نہیں تھا لیکن اس کے حوالے سے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ بھنڈرانوالہ اکال تخت میں چھپا ہوا تھا' اس کے مسلح محافظ گولڈن ٹیمپل کمپلیکس کو چلا رہے تھے اور جس کسی کو ان کا لیڈر راستے سے ہٹانا چاہتا اس کو قتل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ میں نے لونگووال سے پوچھا کہ اس نے بھنڈرانوالہ کو اکال تخت جیسے مقدس مقام سے ہندوؤں کے خلاف ایسی اشتعال انگیز باتیں کرنے کی اجازت کیوں دی ہوئی ہے؟ لونگووال نے جواب دیا: ''اوتے ساڈا ڈنڈا ہے۔''

جونہی بھنڈرانوالہ کے حکم کی تعمیل میں پنجاب میں تناؤ اور دہشت گردوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کا قتل عام بڑھا تو حکومت کو ادراک ہوا کہ اس کے راستے بند ہو گئے ہیں' اسے بھنڈرانوالہ کو دوبارہ گرفتار کرنا پڑے گا (اسے پہلے بھی قتل کے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا تھا مگر اس کی منتخب کردہ جگہ اور وقت پر اسے رہا کرنا پڑا تھا۔) اب تک بھنڈرانوالہ اور اس کا عسکری مشیر جنرل شاہ بیگ سنگھ اکال تخت کو ایک قلعہ بنا چکے تھے اور انہوں نے گردوارے کے

باورچی خانے کے لیے لائی جانے والی اشیائے خوردونوش کے ٹرکوں کے ذریعے کئی اقسام کا اسلحہ ذخیرہ کرلیا تھا۔ حکومت نے اسے بہت زیادہ چھوٹ دے دی تھی اور ایک پرتشدد تصادم ناگزیر تھا۔ کئی مواقع پر میں نے حکومت کو گولڈن ٹیمپل میں فوج بھیجنے کے خلاف متنبہ کیا کیونکہ اس سے پوری سکھ کمیونٹی میں قہروغضب ابھر آئے گا' جوکہ بیشتر بھنڈرانوالہ اور اکالیوں سے غیر متعلق تھے۔ ''تم سکھوں کو نہیں جانتے ہو'' میں نے وزیرداخلہ پی۔سی۔ سیٹھی' ایک امن پسند جین کو کہا'' وہ بھڑوں کے جھنڈ جیسے ہو سکتے ہیں۔ تم ان کے چھتے میں ہاتھ ڈالو گے تو وہ تمہارے چہرے پر ڈنک ماریں گے۔'' اس نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت ٹیمپل میں فوج بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ مسز گاندھی نے ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا ہی کہا۔

یہ امر نامعلوم ہے کہ مسز گاندھی کب اس تصور کی قائل ہوئی کہ اس کے پاس گولڈن ٹیمپل پر فوج کشی کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور نہیں معلوم کہ اس وقت اس کے مشیر کون تھے۔ راجیو گاندھی' ارون نہرو' ارون سنگھ اور ڈگ وجے سنگھ کے نام لیے گئے تھے۔ یہ امر بھی غیر معمولی ہے کہ آپریشن کے عمل میں آنے کی تاریخ کس نے چنی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صدر ذیل سنگھ کو اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ جب مسز گاندھی نے اسے پنجاب میں فوجی حکمرانی قائم کرنے کے لیے قائل کیا تو اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس نے فوج کو بھنڈرانوالہ کے ٹیمپل اور اس کے مسلح پیروکاروں کا صفایا کرنے کا حکم دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جب پنجاب یا سکھوں کے معاملات آتے تھے تو وہ گیانی جی پر بھروسہ نہیں کرتی تھی جبکہ اس کے کسی مشیر کو سکھ روایات کے بارے میں معمولی سی بھی آگاہی نہیں تھی۔ انہوں نے آپریشن کے آغاز کے لیے 5 جون 1984ء کا دن چنا تھا۔ وہ ہری مندر کے بانی گروارجن کی برسی کا دن تھا' وہ دن جب دور دراز کے علاقوں سے ہزاروں سکھوں کی زیارت کے لیے آمد متوقع تھی۔ نہ ہی بھنڈرانوالہ سے نمٹنے کے متبادل طریقوں پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اسے سادہ کپڑوں میں ملبوس کمانڈوز کے دستے کے ذریعے بے دست و پا کیا جا سکتا تھا' ٹیمپل کی عمارت کو محاصرے میں لیا جا سکتا تھا' اندر موجود لوگوں کو کھانے کی اشیاء اور پینے کے پانی سے محروم کیا جا سکتا تھا اور انہیں ہتھیار ڈالنے یا بندوقچیوں کا نشانہ بننے کے لیے کھلے میں آنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس میں دو ایک دن لگ جاتے مگر مقابلتاً خونریزی سے خالی ہوتے۔

تاہم فوج نے ٹینکوں' آرمرڈ کاروں اور بحری فوجیوں کے ساتھ جن کے اوپر ہدایات دینے کے لیے ہیلی کاپٹر پرواز کررہے تھے گولڈن ٹیمپل پر دھاوا بول دیا۔ جنگ دو دن اور دو راتوں تک جاری رہی۔ کراس فائر میں قریباً پانچ ہزار مرد' عورتیں اور بچے ہلاک ہوگئے۔ اکال تخت کو ٹینکوں کے گولوں نے ملبے کا ڈھیر بنادیا' مرکزی مزار پر جسے دونوں فریقوں نے ''جنگ

سے پاک'' علاقہ قرار دیا تھا' ستر گولیاں چلائی گئیں۔ ڈیوڑھی کا بیشتر حصہ دھماکے سے اڑا دیا گیا' گرنتھ صاحب کی ہاتھ کی لکھی ہوئی سینکڑوں جلدیں اور گروؤں کے دستخطوں سے جاری ہونے والے سینکڑوں حکم نامے راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ یہاں تک کہ مسز گاندھی بھی' جسے یقین دلایا گیا تھا کہ آپریشن دو گھنٹے سے زیادہ نہیں چلے گا' مقدس مقامات کو پہنچنے والے نقصانات اور جانوں کے ہولناک ضیاع پر دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ تسلیم کرتی کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے اس نے سارے معاملے کو جھوٹ کے ذریعے چھپانے کا فیصلہ کیا۔

مذہب سے میری لاتعلقی اور حتیٰ کہ معاندت کے باوجود میرا خیال تھا کہ مجھے اپنی کمیونٹی کے ساتھ اپنی شناخت کا اثبات کرنا چاہیے۔ میں بھنڈرانوالہ کو ایک برا آدمی تصور کرتا تھا جو اپنی تقدیر کا سزاوار تھا۔ تاہم ''آپریشن بلیوسٹار'' بھنڈرانوالہ کے قتل سے بہت آگے چلا گیا: یہ پوری کمیونٹی کے چہرے پر ایک خوب سوچا سمجھا اور دیدہ دانستہ تھپڑ تھا۔ میں نے بھرپور طور پر محسوس کیا کہ مجھے ضرور احتجاج کرنا چاہیے۔ میں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا: میری بیوی کسولی گئی ہوئی تھی' میری بیٹی دفتر میں تھی' میرا بیٹا بمبئی میں تھا۔ میں نے صدر ذیل سنگھ کے پریس ایڈوائزر ترلوچن سنگھ کو فون کیا اور صدر سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ مجھے فوری طور پر چلے آنے کا کہا گیا۔ میں نے خود کو صدر وی۔وی۔گری کے دستخطوں سے جاری ہونے والے پدم بھوشن اعزاز کا فریم شدہ اعلامیہ ساتھ لیا۔ ترلوچن کو توقع تھی کہ میں اسے حکومت کو واپس کرنے کے لیے آیا تھا۔ گیانی ذیل سنگھ شدید افسردگی کی کیفیت میں تھا۔ ''مجھے پتا ہے کہ تم کیا محسوس کررہے ہو'' اس نے مجھے کہا: '' تاہم جلدی مت کرو۔ اس معاملے پر چند دن غور کرو اور پھر فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔'' میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ ''نہیں گیانی جی۔ میں خود کو اپنی سوچ تبدیل کرنے کے لیے مہلت نہیں دینا چاہتا۔ میں سوگند اٹھا چکا تھا کہ اگر فوج ٹیمپل میں داخل ہوئی تو میں اس حکومت کے عطا کردہ اعزازت واپس کردوں گا۔'' اس نے ترلوچن سے کہا کہ وہ اعلان کو ایک طرف رکھ دے اور مجھ سے گفتگو جاری رکھی۔ ''میرا خیال ہے میری قوم مجھے کبھی اس بات پر معاف نہیں کرے گی۔'' اس نے کہا۔ وہ کسی طرح کی تسلی کا خواہاں تھا۔ ''گیانی جی! میرا خیال ہے سکھ آپ کو کبھی بلیوسٹار کے لیے معاف نہیں کریں گے۔'' وہ گہری مایوسی و افسردگی کا شکار تھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میرا استعفیٰ بامعنی ثابت ہوگا؟'' میں نے کہا بہت دیر ہوگئی ہے: چاہے وہ استعفیٰ دے یا نہ دے سکھ اسے اپنے مقدس ترین مزار کی بے حرمتی کا ذمہ دار ٹھہراتے رہیں گے۔

میں جانتا تھا کہ گیانی جی میرے پدم بھوشن کو واپس کرنے کے اقدام کو اپنے تک محدود رکھے گا۔ میں نے اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ میں راشٹر پتی بھون سے سیدھا پارلیمنٹ

سٹریٹ پر واقع پی ٹی آئی کے دفتر گیا اور اپنے احتجاج اور اعزاز کی واپسی کا مراسلہ دے آیا۔ ''ایک چوہے کو مارنے کے لیے تمہیں اپنا گھر نہیں گرا دینا چاہیے۔'' اس میں درج تھا۔ شام کے اخبارات میں خبریں آ گئیں' صبح کے اخبارات نے اسے اپنے صفحات اول پر شائع کیا۔

اس کے بعد جو ہوا وہ میرے لیے ایک دردناک انکشاف تھا۔ میں راتوں رات سکھوں کا لوک ہیرو بن گیا' حکومت کی کھلم کھلا مذمت کرنے والا پہلا شخص۔ جبکہ ہندوؤں کے لیے ایک ولن بن گیا۔ وہ کہتے کہ میں' جس نے ہمیشہ سیکولر نظریات کی تبلیغ اور بھنڈرانوالہ کی مذمت کی تھی' اپنے ''حقیقی رنگ روپ'' میں آ گیا تھا۔ میرے لیے خطوں اور ٹیلی گراموں کا سیلاب سا اُمڈ آیا: سکھ مجھے اس اقدام پر سراہتے تھے جو کہ ایک سکھ کو اٹھانا چاہیے تھا' ہندو مجھے ملک کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے تھے۔ حتیٰ کہ گری لال جین نے' وہ آدمی جس کی میں فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہونے کی وجہ سے عزت کرتا تھا' میرے خلاف ایک اداریہ لکھا۔ ہر صحافی جو مجھ سے انٹرویو لینے آیا یہی سوال کرتا تھا کہ میں اسی طرح راجیہ سبھا سے بھی استعفیٰ کیوں نہیں دے دیتا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے آپ کو ایک ایسے فورم سے محروم نہیں کرنا چاہتا جہاں سے میں حکومت اور عوام کو سکھوں اور ملک کے خلاف اس کے غلط اقدامات سے آگاہ کر سکوں۔

چند دنوں بعد میں نے امرتسر کا دورہ کیا۔ گولڈن ٹیمپل میں داخلہ ہنوز بند تھا۔ تاہم وہ مجھے باہر روکے رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ریلوے سٹیشن پر مجھے ایک فوجی افسر ملا جس نے مجھے بتایا کہ اسے جنرل کے۔ ایس۔ برار نے' جس نے آپریشن بلیوسٹار میں ایک رہنما کردار ادا کیا تھا' میری حفاظت کے خیال سے میرے ساتھ ساتھ رہنے کے لیے بھیجا ہے۔ درحقیقت اسے میری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میں نے ''پری کرما'' کا چکر لگایا اور فوج کی طرف سے ہونے والی تباہی و بربادی کا نظارہ کیا۔ (مزدور تیزی سے گلیوں کے سوراخوں کو بھر رہے تھے اور سنگ مرمر کے فرش پر پڑے ہوئے خون کے دھبے دھو رہے تھے) اب بھی قابل لحاظ تعداد میں فوجی موجود تھے۔ ملبے کے' جو کبھی اکال تخت ہوا کرتا تھا' نزدیک ایک سائن بورڈ نصب تھا جس پر انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا تھا: ''ان مقامات پر سگریٹ اور شراب نوشی ممنوع ہے۔'' یہی کچھ ہمارے جوان گولڈن ٹیمپل پر قبضے کے بعد کرتے رہے تھے۔ جب میں نے اپنے ساتھ موجود فوجی افسر کی توجہ اس طرف دلائی تو اس نے بورڈ کو ہٹانے کا حکم دیا۔ میں نے کسانوں کے جتھوں کو اکال تخت کے کھنڈرات کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھتے ہوئے دیکھا۔ دوردرشن نے ایک بہت ڈرے سہمے بڑے پروہت کرپال سنگھ کو بلوایا اور اس سے ایک بیان پڑھوایا کہ عمارتوں کو بہت معمولی نقصان

پہنچا تھا: ''اوکر پالا انھا سی'' ......لوگوں نے کہا تھا۔ میں نے مرکزی مزار میں گولیوں کے تازہ نشانات کو شمار کیا۔ ہر نشان کے سامنے کسان عورتیں غصے کے آنسوؤں سے بھری کھڑی تھیں' ان کے ہونٹوں پر بددعائیں تھیں ''اینھاں دا بیج ناس ہوئے' کتیاں دی اولاد'' وغیرہ۔ بالکونی کے نیچے گوربانی کے اشعار ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل ہٹے ہوئے تھے۔

سکھ مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں کئی دنوں تک بغیر ملاقات کا وقت لیے میرے ساتھ افسوس کا اظہار کرنے کے لیے آتے رہے۔ ان میں انگریزی بولنے والی خوش لباس عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ ایک دن پیشتر وزیر داخلہ بوٹا سنگھ کے کہنے پر جتھے دار رچپال سنگھ نے ہوٹل امپیریل میں ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے حکومت کا نقطۂ نظر واضح کیا تھا۔ غیر ملکی صحافیوں سمیت پریس نے بھرپور شرکت کی تھی۔ جتھے دار نے ایک بیان پڑھا اور سوالات کی اجازت دینے سے پہلے مہمانوں کو کانفرنس کے بعد ٹھہرے رہنے اور لنچ کرنے کا کہا۔ ایک عورت پلیٹ فارم پر چڑھ گئی اور اس کے چہرے پر تھپڑ مارا' اس کی پگڑی گر گئی۔ ''تم بے شرم انسان! ہمارا ٹیمپل تباہ کر دیا گیا ہے اور تم لنچ پارٹی منعقد کر کے اس کی خوشی منانا چاہتے ہو؟'' پریس کانفرنس کو عجلت میں ختم کر دیا گیا۔ یہ عورت' جو سکول کی استانی تھی' ان میں سے ایک تھی جنہوں نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔

تغلق روڈ پولیس سٹیشن' جس میں گردوارہ بنگلہ صاحب شامل تھا' کے سٹیشن ہاؤس آفیسر اسد فاروقی نے مجھے فون کر کے پوچھا کہ کیا وہ مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے؟ جب وہ ملا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ گردوارے میں ہونے والی تقریریں سننے کے لیے ہر سہ پہر جاتا ہے۔ میرا نام اکثر لیا جاتا ہے اور اکثر اعلان کیا جاتا ہے کہ میں مذہبی اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے گردوارے آؤں گا۔ ہم نے کچھ دیر گفتگو کی اور میں نے اسے امرتسر میں ہونے والی ہلاکتوں اور تباہی کے بارے میں بتایا۔ ''ذرا سی بات پر آپ سرکار سے اتنے خفا ہو گئے۔'' اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''ذرا سی بات! کیا تمہیں پتہ ہے اس ایک آپریشن میں پانچ ہزار سے زیادہ سکھوں کو قتل کر دیا گیا تھا؟ تم اسے ''ذرا سی بات'' کہتے ہو!'' میں نے جواب دیا تھا۔

''اتنے مسلمان یہ ہر سال مار دیتے ہیں'' اس نے کہا۔

میں خود کو جواب دینے سے روک نہیں سکا:

''آپ مسلمانوں کو تو مار کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

اس نے کہا:

''انشاء اللہ سکھوں کو بھی پڑ جائے گی۔''

میں نے اپنے مضمون اور تقریروں میں مسز گاندھی سے منت کی کہ وہ زیارت کے لیے گولڈن ٹیمپل جائے اور معافی مانگے۔ میں نے اسے یقین دہانی کرائی کہ سکھ جذباتی لوگ ہیں اور یہ اقدام ان کے مجروح جذبات کو ٹھنڈا کرے گا۔ وہ اپنے وزیر داخلہ بوٹا سنگھ سے رہنمائی لیا کرتی تھی۔ انہوں نے اکال تخت کو جتنا ممکن ہو اتنے مختصر وقت میں بالکل ویسے ہی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ وہ تھا' تا کہ گولڈن ٹیمپل کو ایس جی پی سی کو واپس کیا جا سکے۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سکھ ٹھیکیداروں کی ایک فرم سکپر اینڈ کو' جس کا مالک تیجونت سنگھ تھا' کو یہ کام کرنے کے لیے بلینک چیک دے دیا گیا...... بشمول گنبدوں کی مرمت کے لیے سونے کے حصول کے۔

بوٹا سنگھ رضا کارانہ مزدوری ''کار سیوا'' کے ذریعے معبدوں کی تعمیر کی سکھ روایت سے آگاہ تھا۔ کسی معزز شخص کو اس کام کی رہنمائی کے لیے حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد اس نے ایک موٹے نہنگ' جو خود کو'' سلطان القوم'' قرار دیتا تھا' کی خدمات اس کام کے لیے حاصل کیں۔

فالسٹاف کی جسامت رکھنے والا شخص' جو حشیش کا نشئی مشہور تھا' اپنے پیروکاروں کے ایک بچر نگے جتھے کے ساتھ پہنچا جنہوں نے عمارت کے مقام پر اینٹیں اور چونا گارا ڈھونے کا کام کیا۔ دوردرشن ہر شام انہیں سکرین پر دکھایا کرتا تھا۔ جب یہ معاملہ راجیہ سبھا میں اٹھایا گیا تو مجھے کانگرس کے ساتھ بیٹھنے والے تین سکھ اراکین کے غصے کا سامنا کرنا پڑا: امر جیت کور' ہنس پال اور نو وارد دربارا سنگھ سابق وزیر اعلیٰ۔ جب میں نے سنتا سنگھ نہنگ کو'' موٹا مسخرا'' قرار دیا تو وہ کھڑے ہو کر احتجاج کرنے لگے کہ میری زبان غیر پارلیمانی ہے اور اسے ریکارڈ سے ہٹا دیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد دربارا سنگھ نے کہا: ''مسٹر خوش ونت سنگھ! بابا سنتا سنگھ آپ سے کہیں زیادہ بہتر سکھ ہیں!'' میں نے تسلیم کیا کہ اس کا تبصرہ درست ہے اور مزید کہا: ''میں نے کبھی اچھا سکھ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ تاہم مجھے تم تینوں سے' جو اتنے مخلص سکھ ہونے کے دعوے دار ہو' یہ کہنے دو کہ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سکھوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے' تمہارے جیسے سکھ تو غیر متعلق ہو چکے ہیں۔''

آپریشن بلیوسٹار پر بڑے مباحثے کے لیے قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) کی اشاعت کا انتظار تھا۔ میں کتاب کی پہلی جلدوں کے اجراء تک اس پر بار بار بحث کے طویل دورانیوں میں ایوان میں رہا۔ میں جانتا تھا کہ میں اس کے خلاف بولنے والا واحد شخص ہوں کیونکہ اس وقت تک اکالی رکن مستعفی ہو چکے تھے۔ کانگرس پارٹی کے وہپ نے مجھے ٹوکنے اور سرکاری نقطۂ نگاہ بیان کرنے کے لیے اپنے حواریوں کو متعین کر دیا تھا۔ جب مجھے تقریر کے لیے بلایا گیا تو

ایوان بھرا ہوا تھا۔ عین ابتدا ہی سے کانگرس کے بندوں نے مجھے محدود کرنے کی کوششیں کیں۔ جے للیتا' جو حال میں ایوان کے لیے منتخب ہوئی تھی' میرے دفاع کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور چیئر مین سے کہا کہ مجھے مداخلت کے بغیر اپنی بات کہنے دی جائے۔ مجھے خطابت پر جتنا کچھ بھی عبور تھا' میں وہ سب گنوا بیٹھا اور حکومت نے جو کچھ کیا تھا اس پر سیدھا سیدھا اس کی مذمت کی۔ جس انداز سے فوج نے اس کام کو انجام دیا تھا اس پر میں نے تنقید کی اور انصاف کی سنگین غلطیوں کے نتائج کی صورت گری کرنے کے لیے ایک اردو شعر کا حوالہ دیا ۔

وہ وقت بھی دیکھا تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

فقط حزبِ اختلاف کے اراکین نے مجھے داد دی۔ مسز گاندھی کو جو لوک سبھا میں بیٹھی تھی' آ گاہ رکھا گیا کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ نرسمہا راؤ نے' جسے پی۔ سی۔ سیٹھی کی جگہ وزیر داخلہ بنا دیا گیا تھا' مجھے تضحیک کا نشانہ بنایا کہ میں خود کو عسکری ماہر کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' جو عسکری قیادت کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے مشورے دے سکتا ہو۔

☆☆☆

میں نے حکومتی خبر ناموں (ہینڈ آؤٹس) کے ذریعے پاکستان کے خلاف متعصبانہ اور غیر مصدقہ پراپیگنڈا اخباروں کو فراہم کرنے پر پاکستان کا جتنا ممکن تھا بہترین دفاع بھی کیا۔ خواہ یہ پاکستان پر سکھ دہشت گردوں کے لیے تربیتی کیمپ لگانے کا الزام ہو' یا اسلحہ کی سپلائی کا یا فرقہ وارانہ فسادات بھڑکانے کا' یہ فقط مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ میں حکومت سے دلیل اور ثبوت طلب کروں۔ ایک معاملہ جو وقفہ سوالات میں زیر بحث آیا بمبئی کے جناح ہاؤس کا تھا۔ جب جناح پاکستان چلے گئے تو مالا بار ہل میں واقع ان کا مینشن (حویلی) برطانیہ کو اس کے ڈپٹی ہائی کمشنر کی رہائش گاہ کے طور پر پٹے پر دے دیا گیا تھا۔ جب پٹے کی مدت قریب الاختتام ہوئی تو ہماری حکومت نے اسے پاکستان کو اس کے قونصلیٹ کے طور پر واپس کر دینے سے اتفاق کیا۔ وہ ایک باضابطہ معاہدہ تھا جو ہندوستان کی حکومت نے تحریری طور پر کیا تھا۔ پاکستان کا قونصل جنرل پہنچ چکا تھا اور اس دن کے انتظار میں ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا جب وہ اس میں منتقل ہو سکے۔

اچانک ہندوستان کی حکومت نے اپنے معاہدے سے پھرنے اور پٹہ منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مسز گاندھی کا ذاتی فیصلہ تھا اور اس خوف پر استوار تھا کہ وہ مکان پاکستانیوں کی زیارت گاہ بن جائے گا۔ مجھ پر واضح نہیں تھا کہ اس نے پہلے اس پر غور کیوں نہیں کیا یا اس میں کیا خرابی ہوتی اگر پاکستانی اس کو حقیقت میں ایک نیم مقدس یادگار کے طور پر تصور کرتے۔

مسلمان ایم پی (MPs) قابل فہم انداز میں کچھ کہنے سے جھجک رہے تھے کیونکہ اس طرح ان پر پاکستان کی ہمدردی کا تاثر پڑتا۔ میں ایک تحریری معاہدہ توڑ دینے پر پورا ایک دن اپنی حکومت کی مذمت کرتا رہا۔ جب وزیر داخلہ نرسمہا راؤ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا تو وہ الزام تراشی پر اتر آیا: ''تم پاکستان سے متعلق ہر معاملے پر اتنے جذباتی اور پر جوش کیوں ہو جاتے ہو؟''

ایک مشہور ادیب ہونے کے ناطے مجھے راجیہ سبھا میں کتابوں کی اشاعت اور حکومت کی امداد یافتہ تین ثقافتی اکادمیوں کے بارے میں اپنی بات کہنے کی اجازت دے دی گئی۔ مجھے ایک مرتبہ ساہتیہ اکیڈمی کی اعزازات کمیٹی کا ایک رکن رہنے کی وجہ سے علم تھا کہ وہ کس طرح کام کرتی ہے۔ سالانہ اعزازات دیا جانا ایک مجرمانہ گروہ (مافیا) کا سا کام بن چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے ایک پروفیسر کے خلاف رپورٹ کردی تھی جس نے خود کو انعام دیئے جانے کے لیے مجھ تک رسائی حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے' جو اس وقت ساہتیہ اکیڈمی کا صدر تھا' اس کی فہمائش کی تھی۔ چند برس بعد صدر کے گھرانے کے آفیسر انچارج کی بیوی راشٹر پتی بھون کی کار میں میرے گھر آئی اور مجھے اپنا نام انعام کے لیے تجویز کرنے کا کہا۔ اس نے بتایا کہ صدر رادھا کرشنن نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر میرے لیے تجویز آئی تو وہ اسے منظور کرلے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ کنویسنگ ممنوع ہے اور یہ کہ سال پہلے میں نے پروفیسر کے ساتھ کیا کیا تھا۔ وہ بولی: ''ایہہ تے گلاں کرن دیاں نے...... ہر شخص کو سفارش سے ہر چیز حاصل کرنی پڑتی ہے۔'' میں نے اس خاتون کی شاعری کو اعلیٰ تر پایا اور اسے انعام کا حقدار محسوس کیا مگر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ کنویسنگ کرنے کی وجہ سے بلیک لسٹ کیے جانے کی مستحق ہے۔ میں نے اکیڈمی کے سیکرٹری کرشنا کرپلانی کو لکھ بھیجا۔ اسی رادھا کرشنن نے جس نے بے چارے پروفیسر کو اخلاقی وعظ دیا تھا اس خاتون کو اسی سال انعام دیا اور اس کے خاوند کو اگلے سال انعام سے نوازا۔ میں نے اکیڈمی کی کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔

جب ساہتیہ اکیڈمی پر راجیہ سبھا میں بحث ہوئی تو میں نے اس کی کارکردگی کے حوالے سے کھوسلہ کمیٹی کی رپورٹ کا حوالہ دیا۔ اس میں نشان دہی کی گئی تھی کہ پنجابی کے لیے ایوارڈ دیتے ہوئے بدترین قسم کی بددیانتی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی کے ہر رکن کو ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ایک اجلاس میں ایک خاتون رکن نے خود اپنے حق میں فیصلہ کن ووٹ دیا تھا۔ سارا ایوان قہقہوں سے بھر گیا۔ میں نے حکومت سے کہا کہ ایوارڈز کو ختم کردیا جائے اور ادب کی ریاستی سرپرستی ترک کردی جائے۔ ادیبوں اور شاعروں کو پیسہ دینا گھاس پھونس کے قطعے پر کھاد چھڑکنے کے مترادف ہے۔ تخلیقی ادیبوں کو اپنا دفاع خود کرنا چاہیے اور جو برقرار نہیں رہ سکتے انہیں گمنامی میں ہی فنا ہو جانے دیا جانا چاہیے۔ حکومت کے خرچ پر ان کی کتابوں کی

اشاعت اور حکومت کی ملکیتی لائبریریوں میں ڈھیر کرنے کے لیے ان کی خریداری سے صرف دوسرے درجے کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو میں نے کہنا تھا وہ انہوں نے سنا' وہ میری دی گئی مثالوں سے لطف اندوز ہوئے پھر انہوں نے اکیڈمی کے لیے دی جانے والی گرانٹ منظور کر لی۔

اسی طرح میرے ان الزامات کا بے دلی سے جواب دیا گیا جو میں نے ایک شخص رام سوارپ کی دعوت پر تائیوان اور جنوبی کوریا کی مفت سیریں کرنے والے ایم پی (MPs) کے اوپر عائد کیے تھے۔ رام سوارپ تائیوانیوں اور اسرائیلیوں کا ایک ایجنٹ تھا اور کمیونسٹ مخالف نظریات پھیلایا کرتا تھا۔ رام سوارپ کو جاسوسی کے الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میں اسے ان دنوں سے جانتا تھا جب میں نے ''اسرائیل کے ہندوستانی دوست'' کو تشکیل دیا تھا۔ میں نے اسے ایک گنوار اور اشتعال انگیز کردار پایا تھا جس نے تنظیم کو مسلمانوں کے خلاف تعصب رکھنے والی ایک دائیں بازو کی ہندو تنظیم بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں کئی سال سے اسے نہیں ملا تھا جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کی حکومت کے مہمان کے طور پر تائیوان کی سیر کرنا پسند کروں گا' میرے سفر اور مہمان نوازی کا خیال رکھا جائے گا۔ میں متفق ہو گیا اور میں نے اپنے خرچ پر اپنی بیوی کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے پریڈیں دیکھتے ہوئے' مقاماتِ حسن و جمال (بیوٹی سپاٹس) اور ایٹمی تنصیبات کی سیریں کرتے ہوئے زبردست وقت گزارا اور ایک سہ پہر چین کے سامنے واقع ایک جزیرے پر زیرِ زمین مورچوں میں گزاری۔ ایک ایسی حکومت کی طرف سے' جسے ہندوستان کی حکومت نے تسلیم نہیں کیا تھا اور ایک ایسے شخص کے توسط سے اراکین پارلیمینٹ کا مہمان نوازی قبول کرنے کا مسئلہ کمیونسٹوں نے اٹھایا۔ دو وزیروں نے' جنہوں نے تائیوان کا دورہ کیا تھا' استعفیٰ دے دیا۔ دوسروں کو بیان دینے کی اجازت دے دی گئی۔ انہوں نے غصے سے بھری ہوئی تقریروں میں ان لوگوں کی مذمت کی جو ان کی حب الوطنی پر تہمتیں باندھ رہے تھے اور رام سوارپ کے ماضی (بیک گراؤنڈ) سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے تسلیم کیا کہ میں رام سوارپ کو جانتا تھا اور اس کے جنوبی کوریا' تائیوان اور اسرائیل کے ساتھ روابط سے واقف تھا' اور یہ کہ میں تائیوان کی سیر کر کے خوش ہوا تھا: وہ حسین عورتوں والا خوب صورت ملک تھا۔ مزید یہ کہ میں نے تائیوانی حکومت اور سی آئی اے کو خفیہ معلومات فراہم کی تھیں جن تک وہ کوئی رسائی نہیں رکھتے تھے مثلاً قطب مینار اور لال قلعے' دہلی کی خوب صورت مسجدوں اور مقبروں کا درست محل وقوع۔ ایوان اس شگفتہ اعتراف سے لطف اندوز ہوا اور کمیونسٹوں کو شرمندگی اٹھانا پڑی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں حکومت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ میں

جن برسوں میں پارلیمینٹ کے ایک رکن کی حیثیت میں حاصل ہونے والی مراعات (ایک وسیع بنگلہ' مفت ٹیلی فون' مفت سفر اور بہت کچھ) سے لطف اندوز ہوتا رہا میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سے حاصل بہت کم ہوتا ہے کیونکہ اراکین اپنی ذمہ داریوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ میں نے برطانوی پارلیمنٹیریز پر لکھا گیا آبرن وا کا مضمون ''سپیکٹیٹر'' میں پڑھا تھا۔ اس نے انہیں نیم تعلیم یافتہ اور بے کار ''کتا تنظیم'' قرار دیا...... اس کے ساتھ کچھ وقوع پذیر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے ''کینہ'' کالم میں وا کے کاندھوں پر بندوق رکھی اور راجیہ سبھا کے اراکین پر اسی قسم کا کارتوس داغ دیا اور ہر پیراگراف کے آخر پر یہ اضافہ کرتا گیا ''کیا میں اپنی پارلیمینٹ کے اراکین کے بارے میں اس طرح لکھنے کی جسارت کر سکتا ہوں جس طرح وا نے اپنی پارلیمینٹ کے اراکین کے بارے میں لکھا ہے؟''

میری بے خبری میں کانگرس کے ستپال متل نے جس نے ایک مرتبہ میرے لیے برادرانہ محبت کا اعتراف کیا تھا' اکہتر اراکین کے ہمراہ میرے خلاف ایوان کی توہین کرنے کے الزام میں تحریک پیش کر دی۔ جب میں نے اس کے بارے میں سنا تو مجھے غیر ضروری پریشانی نہیں ہوئی۔ اگر معاملہ ایوان میں لایا گیا تھا تو مجھے پارلیمینٹ کے اپنے ساتھی اراکین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر پانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ موقع نہیں آیا۔ ایک صبح جب میں سوالات کے وقفے کے دوران میں ایوان میں بیٹھا ہوا تھا تو مجھے سیکرٹری کی طرف سے ایک نوٹ موصول ہوا کہ چیئرمین چاہتا ہے کہ موجود رہوں کیونکہ اس کے پاس مجھ سے متعلق ایک اہم اعلان ہے۔

سوالات کے وقفے کے بعد چیئرمین ہدایت اللہ میرے خلاف ایک تحریک استحقاق پر توجہ دینے کے لیے اٹھا۔ اس نے میرا مضمون اور متل اور دیگر اکہتر ارکان کی طرف سے توہین کا الزام پڑھ کر سنایا۔ اس نے میرے لاطینی کے علم پر تنقید کی (میں نے کچھ لفظوں کو توڑ مروڑ دیا تھا) اور برطانوی پارلیمینٹ کی نظیروں کو پڑھ کر سنایا۔ پھر اس نے تحریک استحقاق کو خارج کر دیا۔ نائب صدارت اور راجیہ سبھا کی چیئرمین شپ سے ریٹائر ہونے کے بعد اس نے بمبئی میں کی گئی ایک تقریر میں کہا کہ وہ راجیہ سبھا کی چیئرمین شپ کے دوران جس لمحے سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہوا تھا وہ میرے خلاف تحریک استحقاق کو نمٹانا تھا۔

اپنے پارلیمینٹ کے ساتھی اراکین کے بارے میں میرے پاس بہت کچھ ہے جو میں لکھ اور کہہ سکتا تھا مگر اس سے وہ خوش نہیں ہوتے۔ بہت سے اراکین صرف اپنی ماہانہ تنخواہیں وصول کرنے کے لیے دستخط کرتے تھے جبکہ وہ ایوان میں آیا بھی نہیں کرتے تھے۔ بہت سے اس لیے آیا کرتے تھے کیونکہ موسم گرما کی گرمی میں یہ سب سے زیادہ ٹھنڈی جگہ تھی'

ایک مشہور ہندی ناول نگار جو کچھ مدت میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھا کرتا تھا' اپنی نشست پر بیٹھنے کے پانچ منٹ کے اندر اندر گہری نیند سو جایا کرتا تھا۔ وہ وہاں کئی سال سے موجود تھا۔ جب کبھی میں نے اس سے ان اراکین کے نام پوچھے جو تقریر کر رہے ہوتے تھے تو وہ ایک خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا: ''نام وام تو میں کسی کا نہیں جانتا۔'' اس کی موت کے بعد اس کی جگہ ایک بوڑھے مسلمان کو دے دی گئی جو ہمیشہ معدے کی خرابی کا شکار رہتا تھا۔ اس کے خاموش پاد تو تعفن پھیلا دیا کرتے تھے۔ جب بھی وہ اپنی نشست سنبھالتا میں اس کے رخصت ہونے تک کسی اور نشست پر چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں آسام کا ایک شاندار جسم والا رکن بھی تھا' اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ جب کبھی اس کے پیٹ میں بہت زیادہ ہوا ہوتی وہ اتنے زور سے پاد مارتا جو پورے ہال میں گونج جایا کرتا تھا۔ میرا اکثر جی چاہتا تھا کہ اس کے زوردار پادوں کے خلاف تحریک استحقاق پیش کروں۔

خراٹوں یا پادوں سے زیادہ غصہ دلانے والی چیز اراکین کی وزیراعظم اور کابینہ میں شامل لوگوں کے لیے دکھائی جانے والے قے آور چاپلوسی اور خوشامد تھی۔ ہر جمعرات' جب مسز گاندھی راجیہ سبھا آیا کرتی تھی' کانگرس کی بنچیں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ جونہی وہ جانے کے لیے اٹھتی کانگرس کے نصف درجن اراکین پارلیمینٹ اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں دوڑ پڑتے تھے۔ سینئر وزیروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ رتبے میں تبدیلی ان کے رویے میں سمندری تبدیلی لے آیا کرتی تھی۔ فحاشی کی حد تک موٹا کلپناتھ رائے' جو اکثر اپنے برے آداب (خراٹے مارنے' اخبار پڑھنے' بحثوں کے دوران میں اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ باتیں کرنے) کی وجہ سے بے عزت ہوتا تھا' جب اسے وزیر بنایا گیا تھا تو وہ مغرور ہو گیا تھا اور خاتون اراکین کی طرف مڑی ہوئی انگلی سے اشارے کرتا تھا۔ جب میں پہلے پہل پارلیمینٹ کا رکن بنا تو عمومی طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ مسز گاندھی کے بہت قریب ہوں (جو کہ سچ نہیں تھا) نیز اس کے بیٹے سنجے کے۔ وزیر اور پارلیمینٹ کے رکن ہمیشہ مجھ سے گپ شپ کرنے آیا کرتے تھے۔ جب یہ پتا چل گیا کہ میں اب مزید اس کا پسندیدہ شخص نہیں رہا ہوں' تو وہ مجھ سے فاصلے پر رہنے لگے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مجھ سے آگے بیٹھنے والے تین اراکین یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ پہلی تھی خوب صورت نرگس دت' پھر ہندی ناول نگار' پھر بوڑھا مسلمان۔ میرے آخری اجلاس میں ان کی جگہ پرندوں کے علم کے ممتاز ماہر' بہت عمر رسیدہ سلیم علی کو دی گئی۔ چند ماہ بعد وہ بھی فوت ہو گیا۔ شاید اس نشست میں فنا کے بیج تھے یا مجھ سے آگے ہونے کی وجہ سے ان کی رخصتی تیزی سے ہو جاتی ہے۔

میں ہنوز پارلیمینٹ کا رکن تھا جب مسز گاندھی کو 31 اکتوبر 1984ء کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ اپنے اختلافات کے باوجود میں اس کے اپنے دو سکھ محافظوں کے ہاتھوں اس کے بزدلانہ قتل کا سن کر بہت افسردہ ہوگیا تھا۔ اگر حالات اجازت دیتے تو جب اس کی چتا کو جلایا جارہا تھا تب میں اس کے خاندان سے تعزیت کرنے اور اس کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جاتا۔ میں اس کا وزیراعظم کی حیثیت میں کوئی زیادہ مداح نہیں ہوں اور اس امر کا قائل ہوں کہ ملک کے ساتھ جو کچھ غلط ہوا اس کی وجہ وہ تھی۔ وہ پست اور منتقم ہوسکتی تھی جس طرح کہ اس نے اپنی بیوہ بہو مانیکا کے ساتھ برتاؤ کر کے اپنے آپ کو عیاں کر دیا تھا۔ وہ سینئر افسروں کے ساتھ بہت غیر مہذب ہوسکتی تھی مثلاً کیول سنگھ (ریٹائرڈ سفیر برائے امریکہ) اور جگت مہتہ (ریٹائرڈ سیکرٹری خارجہ' جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ وہ اسے نیچا دکھا رہا ہے) وہ خاص طور پر ان لوگوں کی بے عزتی کر کے لطف اندوز ہوتی تھی جو سمجھتے تھے کہ وہ ان کی دوست تھی۔ وہ ڈوم موریاس کے لیے' اپنی سوانح عمری لکھنے کے بعد سے کینہ جو ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے گھر باقاعدگی سے آنے والے اکبر احمد (ڈمپی) پر اپنے قتل کی سازش کرنے کا الزام لگا دیا اور احکامات جاری کر دیئے کہ اس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ میں اس سے کئی مواقع پر ملا' جیسے سنجے کی بیوی کی لکھی ہوئی اس کی سوانح عمری کے اجرا پر' جس کو ایڈٹ کرنے میں میں نے مدد دی تھی۔ وہ اس موقع پر میرے موجود ہونے کی متوقع تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ درشت ہوگی۔ میں نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔ اس نے مانیکا کو نہیں بخشا۔ ایسا ہی اس کی آپ بیتی کے فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمے کے اجرا پر ہوا جس کا دیباچہ میں نے لکھا تھا۔ مسز گاندھی اس کے پبلشرز وژن بکس کے ساتھ متفق تھی کہ اس کا اجرا اس کے اپنے گھر پر ہو۔ اسے توقع تھی کہ میں وہاں موجود ہوں گا۔ اس مرتبہ بھی میں نے محسوس کر لیا کہ وہ میرے ساتھ بدطینتی کے ایک موقعے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اجرا کے لیے نہیں گیا۔ اسے اپنا غصہ پبلشر پر اتارنا پڑا۔ اس نے مجتمع ہونے والے لوگوں کے سامنے اسے کہہ دیا کہ کچھ بھی ہو اس کا کتاب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کا نام کتاب کے گردپوش پر موجود تھا۔ میں ذاتی طور پر اندرا گاندھی کو خراج عقیدت پیش نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی پارٹی کے مقامی لیڈروں کی شہ پر سکھوں کے خلاف تشدد سارے شہر میں بھڑک اٹھا تھا۔ انہوں نے مسز گاندھی کے قتل پر سکھوں کے خوشیاں منانے' مٹھائیاں بانٹنے' گھروں میں چراغاں کرنے' دہلی کی واٹر سپلائی میں سکھوں کی طرف سے زہر ملانے اور سکھوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ہندوؤں کی لاشوں سے بھری ٹرینوں کی دہلی کی طرف آمد کے بارے میں جھوٹی کہانیاں پھیلا دیں۔ کرائے کے غنڈے لوہے کی سلاخوں اور

مٹی کے تیل سے مسلح ہو کر گردواروں، سکھوں کے گھروں، دکانوں، ٹیکسیوں اور سکھوں کو زندہ جلانے کے لیے لائے گئے۔ میں ایک نشان زد شخص تھا۔ اگلی صبح مجھے مطلع کیا گیا کہ ایک ہجوم مجھے مارنے کے لیے آ رہا ہے۔ عین وقت پر سویڈش سفارت خانے کا رولف گوفن، جس سے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا مگر جو رومیش تھاپر کا قریبی دوست تھا، اپنی سفارت خانے کی کار میں آیا اور میری بیوی اور مجھے سفارت خانے کے احاطے میں واقع اپنے گھر لے گیا۔ میں نے ٹی وی پر مسز گاندھی کا جنازہ دیکھا۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہو جاتی تو وہ اپنے باپ کی طرح شہر کا دورہ کرتی اور ہزاروں معصوم لوگوں کے قتل عام کو رکوا دیتی۔ اس کا بیٹا راجیو گاندھی اپنی ماں کے جسم کے قریب کھڑا وی آئی پیز کو مل رہا تھا۔ اگر وہ ''سکھوں کو سبق سکھا دو'' کا حکم دینے والا نہ ہوتا تو وہ اسے منسوخ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا۔

اگلے پارلیمانی اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے نائب صدر وینکٹارامن نے (جو ہدایت اللہ کا جانشین تھا) مجھ سے ملاقات کی، اس درخواست کے ساتھ کہ مجھے مسز گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی اجازت ہے۔ پہلا دن تمام پارٹیوں کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ میں بلائے جانے والوں میں آخر پر تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے ہمارے عہد کی ایک سب سے زیادہ اہم خاتون کو غیر مشروط خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی بہترین تقریر کی تھی۔ اخبارات میں اس کے بہت مختصر حوالے دیئے گئے کیونکہ جس وقت میں نے تقریر کی پریس گیلری خالی تھی۔

پارلیمینٹ کے رکن کی حیثیت سے میں نے جو آخری اہم کام کیا وہ نومبر 1984ء کے منظم قتل عام کا نشانہ بننے والے خاندان کی مدد کے لیے بیرون ملک رہنے والی سکھ کمیونٹیوں کے بھیجے ہوئے پیسے اور سردیوں کے کپڑوں سے متعلق تھا۔ میں نے پیسہ (قریباً آٹھ لاکھ روپے) جارج فرنانڈس کے تحت کام کرنے والی پیپلز ریلیف کمیٹی کو دے دیا تھا جبکہ تحفوں کے بیشتر پارسلوں پر میرا پتہ درج تھا اس لیے مجھے ہی انہیں کسٹم سے چھڑوانا تھا۔ جیا جیٹلے، جو فرنانڈس کے ساتھ کام کر رہی تھی، ایک ایک سرکاری در پر گئی مگر دہلی انتظامیہ سے کلیئرنس حاصل کرنے میں ناکام ہو گئی۔ ساری سردیاں اونی کمبل اور سویٹر کسٹمز کے شیڈز میں پڑے رہے اور بدنصیب سکھ اپنے جھونپڑوں میں سردی سے کانپتے رہے۔ دوسری طرف مجھے بروقت اپنی اشیاء کلیئر نہ کروانے کے ہرجانے کے طور پر 75000 روپے ادا کرنے کا نوٹس بھیج دیا گیا۔ کسی نے ان پارسلوں کی قسمت کے بارے میں سوال اٹھایا۔ میں نے ایک ضمنی سوال پوچھنے کے لیے ہاتھ کھڑا کیا۔ میں نے خود پر عائد کردہ ہرجانے کے مطالبے پر مبنی کاغذ لہرایا اور حکومت کی بے حسی پر گالیاں دینے لگ گیا۔ خوش قسمتی سے کانگرس کے بہت سے اراکین پارلیمینٹ خصوصاً

پرتھوی جیت سنگھ میرے ساتھ مل گئے اور ''شرم! شرم!'' کے نعرے لگانے لگے اور خوش قسمتی سے جمعرات ہونے کی وجہ سے وزیراعظم راجیو گاندھی اور وزیر خزانہ وی۔ پی۔ سنگھ دونوں ایوان میں موجود تھے۔ میں نے وی۔ پی سنگھ کو راجیو کے ساتھ سرگوشیوں میں مشورہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ڈپٹی کو بیٹھ جانے کا کہا اور اعلان کیا کپڑوں کا ذخیرہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دے دیا جائے گا۔ اس نے تاخیر پر اپنی حکومت کی شرمندگی کا اظہار کیا۔ چند دن بعد میں چرن جیت سنگھ کی بلوائیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جانے والی مشینری کی جگہ آنے والی نئی مشینری کو بھی بمبئی کسٹمز سے چھڑوا سکتا تھا۔

مجھے امید تھی کہ میں راجیہ سبھا میں دوسری ٹرم حاصل کرلوں گا۔ بہت سے نامزد اراکین پارلیمینٹ ایک سے زیادہ ٹرم کے حامل تھے اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میں ایوان میں اپنے حصے سے زیادہ تقریریں کر چکا تھا۔ میں نے راجیو کو اپنی دوبارہ نامزدگی پر غور کرنے کا لکھ بھیجا۔ جب نرسمہاراؤ نئی نامزد ہونے والوں کے ناموں کی فہرست لے کر صدر ذیل سنگھ کے پاس گیا تو اس نے میرا نام اس میں شامل کرنے کا کہتے ہوئے فہرست واپس بھجوا دی۔ وزیراعظم راجیو گاندھی راضی نہیں ہوا۔ ذیل سنگھ نے دوسری مرتبہ میرا نام شامل کرنے کا کہا۔ اسے دوبارہ قبول نہیں کیا گیا مگر اس مرتبہ اس یقین دہانی کے ساتھ کہ مجھے زیادہ قیمتی چیز پیش کی جائے گی۔ ایچ وائی شاردا پرساد جسے میں ایک نجی تقریب میں ملا تھا اور سدھارتھ شنکر رے نے بھی مجھے یہی بتایا۔ مجھے نیشنل بک ٹرسٹ کی چیئر مین شپ کی پیشکش کی گئی۔ بغیر دوبارہ غور کیے میں نے اسے رد کر دیا۔

میں مایوس تھا کہ میں راجیہ سبھا کی دوسری ٹرم کے لیے نامزد نہیں ہو پایا تھا۔ میری الوداعی تقریر حکایات سے مزین تھی جنہوں نے بہت قہقہے بلند کروائے۔ مجھے اب بھی امید تھی کہ پنجاب کے ایم ایل ایز مجھے اس ریاست سے رکن منتخب کرلیں گے۔ میں اس تجربے کے حوالے سے بعد میں لکھوں گا۔

☆☆☆

ذرا مجھے اپنے سیاسی عزائم کے بیان ایک ذاتی المیے...... اپنی ماں کی موت...... کے بارے میں لکھنے کے لیے انحراف کرنے کے لیے تھوڑی دیر وقفہ کرنے دیجئے۔ اپنے والدین میں سے مجھے اپنے باپ کی نسبت اپنی ماں کے ساتھ زیادہ سکون محسوس ہوتا تھا۔ اس کے بچوں میں سے کوئی بھی ہمارے باپ سے میرے جتنا ہراساں نہیں تھا۔ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو وہ اکثر ہمیں تھپڑ مارنے کی دھمکی دیا کرتی تھی تاہم ایسا کبھی اس کے ہاتھ اٹھانے اور یہ دھمکی دینے سے آگے نہیں ہوا۔ ''ماراں چاٹ؟'' اس کے بعد کچھ نہ ہوتا۔ وہ کمزور، پست قامت اور

اپنے اوپر کم اعتماد رکھنے والی تھی۔ ایک چھوٹی لڑکی ہوتے ہوئے وہ جس کسی شے کی بھی حامل ہوسکتی تھی' اس کے دبا دینے والے شوہر نے دبا دیا تھا' جو گھر چلانے کے لیے اس پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی پارٹیوں (تقریبات) کے لیے طعام نامے (مینیوز) بھی خود تیار کیا کرتے تھے...... جو ٹماٹر کے سوپ' مچھلی' مرغی' پلاؤ' اس کے بعد پڈنگ سے بمشکل ہی مختلف ہوا کرتا تھا___ اور دھوبی کے علاوہ تمام حساب کتاب وہی رکھا کرتا تھا۔ اس کی اپنے خاوند کے لیے رضامندانہ اطاعت گزاری کی دوسری وجوہات بھی تھیں___ اس کا باپ اور دو بھائی ہماری ملازمت میں تھے' اس کی تین بہنوں کے شوہروں میں سے دو میرے باپ کی سرپرستی پر انحصار کرتے تھے۔ وہ کبھی سکول نہیں گئی تھی اور اس نے فقط اتنی گورمکھی سیکھی تھی کہ خط لکھنے اور پنجابی اخباروں کی سرخیاں پڑھنے پر قادر ہو سکے۔ وہ اپنا وقت کتابوں میں ضائع نہیں کرتی تھی اور اپنی بہنوں اور نوکرانی بھانجو سے گپیں لگانے کو ترجیح دیتی تھی جس کے پاس اپنے بیٹوں کی بیویوں کے خلاف بہت کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ تاہم جب میں بیرون ملک تھا تو اپنے باپ کی طرف سے اپنے سیکرٹری کو املا کروا کر ٹائپ کروائے ہوئے دو صفحات کی نسبت اس کی گورمکھی میں لکھی ہوئی چند سطروں سے زیادہ خبریں حاصل کر لیا کرتا تھا۔ وہ حکومت' سیاسی کشاکش اور بجٹ کے بارے میں لکھا کرتا تھا جبکہ وہ پیدائشوں' رشتوں' شادیوں اور اموات کے بارے میں لکھا کرتی تھی۔ وہ اکثر شکایت کرتی تھی کہ وہ انگریزی لکھ یا پڑھ نہیں سکتی۔ اسے یہ زبان پڑھانے کے لیے میرے باپ کے استاد رکھنے کے باوجود اس نے لیس' نو' گڈ مارننگ' گڈ نائٹ' گڈ بائی اور تھینک یو سے آگے پڑھنے سے ہٹ دھرمی کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔

جب میرے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' کا پنجابی ترجمہ شائع ہوا تھا تو میں نے پہلی جلد اسے دی تھی۔ مجھے اس سے اس کے مطالعے کی توقع نہیں تھی۔ جب اگلی صبح میں اس سے ملنے گیا تو میرے باپ نے بتایا کہ وہ رات دیر گئے تک ناول پڑھتی رہی تھی اور اب شدید سر درد میں مبتلا پڑی تھی۔ میں اس کی خواب گاہ میں گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک اپنی شال اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کندھے سے ہلایا اور پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہی ہے۔ اس نے ایک آنکھ سے شال میں سے باہر جھانکا اور ایک لفظی تبصرہ کیا: ''بے شرم!''

میری ماں کسی حد تک مراقی تھی۔ وہ حقیقت میں صرف سر کے دردوں میں مبتلا ہوتی تھی۔ دورے اتنے شدید ہو سکتے تھے کہ اسے دو دو دن بستر میں پڑے رہنا پڑتا اور وہ فقط تب بہتر محسوس کرتی جب چند ایک مرتبہ قے کر لیتی۔ وہ جب کبھی اپنے جسم کے کسی حصہ میں درد محسوس کرتی' تو اس کو یقین ہوتا تھا کہ یہ کینسر ہے۔ جب میرا باپ نوے برس کی عمر میں فوت ہوا تو وہ 80 کے پیٹے کی شروعات میں تھی اور اچھی صحت کی حامل تھی۔ سوائے اس کی رخصتی پر

صدمہ زدہ ہونے کے' جیسا کہ ہر کسی کو توقع تھی' وہ اپنے آپ میں آ گئی۔ کوئی شخص اسے لیڈی سوبھا سنگھ کے علاوہ کسی اور انداز سے مخاطب کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ ملکہ وکٹوریا کے مانند وہ روزانہ اپنا دربار منعقد کرتی تھی۔ گیارہ بجے وہ وسط صبح کے کافی سیشن کی صدارت کرتی' شام میں مے نوشی اور ڈنر کی۔ میں نے ہی اسے شام کو تھوڑی سی الکوحل پینے پر قائل کیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے اسے چوری چھپے پیا۔ جب پارٹیوں میں بیرے سافٹ ڈرنکس ٹرے میں رکھ کر پیش کرتے تو وہ انہیں بتایا کرتی تھی کہ اس کا بیٹا اس کے لیے مالٹے کا جوس لا رہا ہے۔ میں ابتدا میں اس کا گلاس ''جن'' سے بھرا کرتا تھا اور پھر میں نے اسے سکاچ سے متعارف کروایا۔ دوبارہ اس نے ہلکا سا احتجاج کیا: ''لوگ کیا کہیں گے! دیہات کی ایک بوڑھی ان پڑھ عورت وسکی پی رہی ہے؟'' اس نے اپنے شام کے جام کو پسند کرنا شروع کر دیا اور بری ''دیسی'' اور اچھی سکاچ میں فرق کرنے لگی۔

نوے برس کی عمر میں وہ محسوس کرنے لگی کہ وہ زیادہ عرصہ نہیں جئے گی۔ اس نے اس حوالے سے کبھی کچھ نہیں کہا تاہم چیزیں بانٹنا شروع کر دیں۔ میرے باپ کا سویٹر' اس کی چاندی کی مٹھ والی آبنوسی چھڑی اور اس کی سونے کی گھڑی مجھے ملیں' زیورات اور ایک سونے کی گھڑی میری بہن کو ملیں' زیورات' گھڑیاں' سونے کے پین' سونے کے بٹن اور سونے کے پونڈ بیٹوں' بہوؤں اور ان کے بچوں میں تقسیم ہوئے۔ ایسی کوئی صبح نہیں ہوتی تھی کہ جب میں اسے ملنے جاؤں اور وہ مجھے کوئی ایسی قمیض' جرابوں کا جوڑا یا جوتے نہ دیتی جو میرا باپ استعمال کیا کرتا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں ہی سے دینا چاہتی ہے۔

اس کے ساتھ خاص طور پر کوئی غلط شے نہ ہونے کے باوجود وہ مرجھانے لگی۔ ڈاکٹر آئی پی ایس کرلا' جس کی شادی میری کزن' جو خود بھی ڈاکٹر تھی' سے ہوئی تھی' اس کا بلڈ پریشر اور درجۂ حرارت لینے کے لیے دن میں دو مرتبہ اسے دیکھنے آتا تھا۔ وہ بستر میں زیادہ وقت گزارنے لگی۔ میری بہن غسل خانے جانے کے لیے اس کی مدد کرنے کی خاطر اس کی خواب گاہ میں سوتی تھی۔ پھر ایک ملازمۂ شب (Night Maid) اس کی صفائی ستھرائی اور کپڑے تبدیل کرنے میں اس کی مدد کے واسطے رکھ لی گئی۔ کافی پینے کے لیے اس کی آمد کم سے کم تر ہوتی گئی۔ تاہم ادھورے ہوش میں بھی وہ اپنے ملازم ہریا کو بلا بھیجا کرتی تھی اور بڑبڑاتی تھی ''کافی''۔ کئی مرتبہ میرا ٹیلی فون مجھے یہ بتانے کے لیے بجا کہ وہ بجھ رہی ہے۔ ہم جلدی سے پہنچتے۔ ڈاکٹر کرلا اسے کوئی نہ کوئی دوا دے رہا ہوتا۔ وہ بحال ہو جاتی اور ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ ایک شام جب اس کے سارے بچے' پوتے' پوتیاں اور کافی تعداد میں پڑپوتے وہاں موجود تھے' وہ کوما میں چلی گئی اور اس سے کبھی نہیں نکلی۔

ہم کئی دنوں تک کئی کئی گھنٹے اس کے چت پڑے ہوئے جسم کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اس کی چادر کے اوپر نیچے ہونے سے اس تسلی کے ساتھ کہ وہ ہنوز زندہ ہے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ہم نے ڈاکٹر کرلا سے کہا کہ وہ اسے زندگی بچانے والی ادویات کے ٹیکے ہی نہیں لگاتا رہے اور اسے شانت ہونے دے۔ اس نے ہماری بات سننے سے انکار کردیا اور کہا کہ اس نے جہاں تک ہوسکتا ہے اسے زندہ رکھنے کا تہیہ کررکھا ہے۔ اپنے فلیٹ واپس آ کر میں بجتے ہوئے ٹیلی فون سے ڈرتا رہا۔ آخری کال 9 مارچ 1985ء کی سہ پہر آئی۔ وہ میری دکھیا بہن کی روتی ہوئی آواز تھی: ''وہ چلی گئی۔''

جس وقت ہم پہنچے تو یوں دکھائی دیتا تھا گویا وہ سکون سے سو رہی ہے۔ اس کے تکئے کے ساتھ سلگتے ہوئے بخورات کا دھواں مرغولوں کی صورت چھت کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میرا بڑا بھائی اس کے بستر کے ساتھ بیٹھا ہوا مناجات کی ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ دوسرے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رو رہے تھے اور باغ میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے' فقط تعزیت کرنے کے لیے آنے والے لوگوں کی آمد کے ساتھ ساتھ بار بار رونے کے لیے۔ خاندان میں پہلے رونما ہونے والے واقعات کے مانند اس مرتبہ بھی میرے چھوٹے بھائی بریگیڈیئر گوربخش سنگھ نے صورتحال کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس نے مجھ سے تعزیتی نوٹس لکھوایا' اس میں درستی کی اور دہلی کے تمام اخبارات کو بھجوا دیا۔ اس نے چتاسوزی کا وقت اور اکھنڈ پاٹھ کا دن طے کردیا' جو بھوگ اور کیرتن سے شروع اور ختم ہونا تھا۔ اس نے ہمیں رات بھر کے لیے اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ' اس کی بیوی اور میری بہن جسم کے ساتھ رہیں گے۔ میرا بڑا بھائی اس کے ساتھ بیٹھ کر ساری رات بار بار ''جاپ'' کرتا رہا' جیسا کہ چند سال پہلے اس نے ہمارے باپ کے جسم پر کیا تھا۔

اگلی صبح ہم اپنی ماں کے جسم کو اسی برقی چتا سوز میں لے گئے جہاں پہلے ہم اپنے باپ اور چچا کو لے کر گئے تھے۔ میرا بھائی گوربخش اس کی راکھ کو ہردوار لے گیا جیسے وہ میرے باپ اور دادی کی راکھ گنگا میں بہانے کے لیے لے گیا تھا۔ یوں ویرن بائی' لیڈی شوبھا سنگھ' ہماری ماں کے دن پورے ہوگئے۔

☆☆☆

راجیہ سبھا کی دوسری ٹرم کے لیے نامزدگی حاصل کرنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے میں پنجاب سے اس کا انتخاب لڑنے کے نظریے پر غور کرنے لگا۔ پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ میرے تعلقات اچھے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ اکالی اور بی جے پی میری حمایت کریں گے اور مجھے امید تھی کہ میں کانگرس کے چند ایم ایل اے ووٹ بھی چرا لوں گا۔

تاہم میری بنیادی حمایت اکالیوں کی طرف سے ہوئی تھی جو چھ سال تک پارلیمنٹ اور پریس میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہنے پر میرے احسان مند تھے۔ میں ان کی پارٹی میں شامل ہونے کا خواہش مند نہیں تھا اور جن جن سے میں ملا وہ اس امر پر متفق تھے کہ میں ایک آزاد رکن کے طور پر زیادہ مؤثر رہوں گا۔ جن دو اکالیوں نے میری بھرپور حمایت کی یقین دہانی کروائی وہ تھے بلونت سنگھ پنجاب کا وزیر خزانہ اور پی ایس رومووالیہ ایم پی۔ میرے دوست چرن جیت سنگھ نے بلونت سنگھ کو لی میریڈین میں لنچ پر مدعو کیا اور اس سے صاف صاف پوچھا کہ کیا وہ میری حمایت کریں گے یا نہیں۔ اگر کوئی پیسہ مطلوب ہے تو وہ اس کا خیال کرے گا۔ بلونت سنگھ جو اکالی پارٹی کا بہت زیادہ تیز طرار شخص تھا۔ وہ بلاک ڈویلپمنٹ آفیسر سے ترقی کر کے ریاست کا ایک امیر ترین شخص بن گیا تھا۔ ''جہاں تک میرا تعلق ہے'' بلونت سنگھ نے جواب دیا ''تو تم اس کے لیے مجھ سے سوگند لے سکتے ہو کہ میں اس کی بھرپور حمایت کروں گا۔ تاہم اسے چنڈی گڑھ آنا اور دوسرے اکالی لیڈروں سے ملنا پڑے گا۔''

رومووالیہ کی یقین دہانی کہیں زیادہ زوردار تھی۔ وہ میرے گھر آیا اور جب چرن جیت نے پوچھا کہ ہم اس پر بھروسہ کر سکتے تو اس نے جیسا کہ پنجابی عہد کرتے ہیں اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: ''جب رومووالیہ قول دے دیتا ہے تو وہ کبھی اسے نہیں توڑتا۔''

میں نے اپنے بیٹے کو' جو اس وقت چنڈی گڑھ میں تھا' لیا اور پنجاب میں ووٹر کے طور پر اپنا نام درج کروانے گیا۔ جیسا کہ بلونت سنگھ نے ہدایت کی تھی میں چنڈی گڑھ گیا اور اس کے گھر میں اس کی دی ہوئی لنچ کی بہت بڑی تقریب میں شرکت کی۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ اکالی ٹکٹ کا ایک اور امیدوار بھی ہے' ایک نیم تعلیم یافتہ جتھے دار جس کا نام ناقابل یقین تھا یعنی طوطا سنگھ۔ میں اسے سنجیدہ حریف کے طور پر نہیں سوچ سکتا تھا۔ بلونت سنگھ نے مجھے انتباہ کیا کہ مجھے اس کو ہلکا نہیں لینا چاہیے کیونکہ ان کا معاشرہ قبائلی نوعیت کا ہے جہاں قبائلی وفاداریاں تعلیم یا اہلیت سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ ہر اکالی لیڈر نے جس سے میں نے بات کی' مجھے یقین دلایا کہ ان کے لیے مجھے اپنا امیدوار بنانا ایک اعزاز ہوگا۔

میں اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرانے والا پہلا شخص تھا۔ بلونت سنگھ نے کہا کہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے تجویز کرے یا اپنا نام میرے متبادل کے طور پر دے۔ تاہم اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ میں پنجاب اسمبلی میں بی جے پی کے لیڈر سے ملا اور اس نے یقین دلایا کہ اگر مرکزی لیڈروں مثلاً ایل۔ کے۔ ایڈوانی کی یہی خواہش ہوئی تو وہ اپنی پارٹی کے ایم ایل ایز کو میری حمایت کرنے کی ہدایت کرے گا۔ ایڈوانی مجھے پہلے ہی حمایت کا یقین دلا چکا تھا۔ میں نے سٹیٹ کانگرس کمیٹی تک بھی رسائی کی۔ اس نے

مجھے بتایا کہ اگر کانگرس کے ووٹ اضافی ہوئے تو انہیں میرے حق میں ڈلوایا جائے گا۔

مجھے گرمیوں کے موسم میں اپنی تسلی کے لیے کہ کوئی شے غلط نہیں جائے گی' تین مرتبہ چندی گڑھ جانا پڑا۔ میں نے سہ پہریں کرسٹوفر فرائی کے ڈرامے پڑھتے اور پپیہوں کی لامتناہی صدائیں سنتے ہوئے گزاریں۔ وہ جگہ ان سے بھری ہوئی تھی۔ مجھے سمجھ میں آیا کہ انگریز اس پرندے سے نفرت کیوں کرتے ہیں اور اسے ''دماغ کا بخار'' کیوں کہتے ہیں۔ بلونت سنگھ زیادہ طرح دینے والا بن گیا تھا۔ کاغذات واپس لینے کا دن آ گیا۔ میں چندی گڑھ واپس آ گیا تھا۔ اب تک مجھے کافی یقین تھا کہ چاہے اکالی منہ موڑ لیں میں جیتنے کے لیے کافی ووٹ حاصل کر سکتا ہوں۔ بلونت سنگھ نے بھی اس امکان کو تسلیم کیا۔

اکالی لیڈروں نے اس صبح ایک خاص میٹنگ کی۔ سہ پہر میں بلونت سنگھ مجھے ملنے کے لیے میرے ہوٹل آیا۔ اس نے شرمندگی ظاہر کی کہ وہ میرے لیے اکالیوں کی حمایت حاصل کرنے سے قاصر رہا ہے اور مجھے اپنا نام واپس لے لینا چاہیے۔ اس نے میری بہت خوشامد کی کہ کمیونٹی کو مجھ پر کتنا فخر ہے اور اکالی مجھے ذمہ داریاں سونپنا اعزاز سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں تو وہ مجھے مقابلے سے باہر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کا امیدوار جیت سکے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ جتھے دار طوطا سنگھ ہے۔ میں کافی احمق تھا کہ اپنا نام واپس لے لیا۔ جس شخص کو انہوں نے منتخب کیا تھا میرے لیے ایک بہت بڑی حیرانی ثابت ہوا۔ وہ تھا لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ۔ چند سال بعد ایک اکالی لیڈر نے' جو اس خاص میٹنگ میں موجود تھا' مجھے بتایا کہ برنالا اور بادل جیسے چوٹی کے لیڈروں نے میری حمایت کی تھی۔ وہ بلونت سنگھ تھا جس نے اروڑہ کے بخت جگائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بہت بڑی رقم بلونت سنگھ کی جیب میں گئی تھی۔

مجھے ''سنڈے'' نے راجیہ سبھا میں گزرے اپنے برسوں کے بارے میں لکھنے کو کہا۔ میں نے اکالیوں کے ساتھ اپنے تجربات بیان کر دیئے۔ چند دن بعد بلونت سنگھ نے مجھے لکھا کہ میں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ مجھے بتاتا رہا تھا کہ دوسرا امیدوار بھی ہے۔ ایک ماہ بعد جب میں چندی گڑھ میں ریاست کی رابطہ کمیٹی کی میٹنگ کے لیے موجود تھا' اس نے میری توجہ حاصل کرنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی۔ میں اس کی نظروں سے بہت احتیاط کے ساتھ بچتا رہا۔ میری بدقسمتی سے' چائے کے وقفے کے دوران میں میں نے اسے پیشاب خانے میں اپنے ساتھ کھڑے پایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح شرمسار تھا اور اس نے مجھے ڈنر کے لیے مدعو کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گورنر کے ساتھ قیام پذیر ہوں اور نہیں جانتا کہ

شام کے لیے اس نے کیا طے کیا ہے۔ میں نے گورنر کی بیوی مایارے کو بتایا کہ میں اس شخص کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا اور اگر وہ مجھے دعوت سے خارج کر دے تو اس کا ممنون رہوں گا۔ جب ہم روانہ ہونے والے تھے تو بلونت سنگھ رے کی کار کے پاس آ گیا اور اس کو دعوت دوبارہ دی' جب وہ بولا تو اس کی ایک آنکھ نروس ہونے کی وجہ سے جھپک رہی تھی۔ جب وہ مایارے سے بات کر رہا تھا تو اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ''سردار صاحب! آپ تمباکو نوشی بہت زیادہ کرتے ہیں۔'' گورنر کی بیوی نے ہمارے گرد کھڑے درجن بھر سننے والے لوگوں کے سامنے کہا۔ اس نے معصومیت کے ساتھ یہ تبصرہ کیا تھا میں نے محسوس کیا کہ اس نے میری طرف سے وزیر کو تھپڑ رسید کیا ہے۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے بلونت سنگھ کو دیکھا۔ چند ماہ بعد جب وہ کسی جگہ سے اپنے گھر جا رہا تھا تو اسے دن دہاڑے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جس گروپ نے اس جرم کی ذمہ داری قبول کی اس نے بیان دیا کہ وہ کمیونٹی کو تمام کرپٹ لیڈروں سے نجات دلوانا چاہتے ہیں اور بلونت سنگھ سب سے زیادہ کرپٹ مشہور تھا۔

روموو الیہ کا بدل جانا بھی مساوی طور پر ڈرامائی تھا۔ مجھے دھوکا دینے کے باوجود اس نے میری کھلم کھلا خوشامد کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ وہ چاہتا ہے میں ہر ہفتے اس کے لیے کچھ وقت نکالا کروں تا کہ وہ مجھ سے کچھ فیض حاصل کرے! پارلیمینٹ میں اس کی مدت ختم ہو جانے کے بعد اس نے اقلیتی کمیشن کے رکن کے طور پر ایک زیادہ محفوظ اسائن منٹ حاصل کر لی۔ ایک مرتبہ وہ ذاتی طور پر آیا اور اپنے گھر پر ڈنر کے لیے آنے کے واسطے میری منتیں کرتا رہا اور اسی طرح چرن جیت اور اس کی بیوی کو بھی آنے کے لیے قائل کرتا رہا۔ ہم سب چلے گئے۔

بیشتر لوگوں کی طرح میں سیاست دانوں کے وعدوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتا۔ پنجاب میں قربانیوں کے ان کے سابقہ ریکارڈ کی وجہ سے مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ اکالی مختلف ہیں۔ تاہم گردواروں اور ان کی آمدنیوں کو نصف صدی سے زیادہ مدت سے کنٹرول کرتے ہوئے ان کے ضمیر بے حس ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کمیونٹی کے ترجمانوں کے طور پر قبولیت کے لیے یہی سب کرتے ہیں کہ گہری نیلی پگڑیاں باندھ لیں اور لمبی لمبی ڈاڑھیاں لہرا لیں۔ طفیلیت کا ایک مرتبہ نشئی ہونے کے بعد وہ اس عادت کو ترک کرنے سے قاصر ہیں۔ مورچوں کے تسلسل کے ساتھ اجرا کے ذریعے ان کا مقصد گردواروں پر اپنا ہی تسلط قائم رکھنا اور سیاسی طاقت کا حصول ہے۔ وہ بہت تھوڑی تکلیف یا قربانی دیتے ہیں۔ رضا کاروں کو

'جب وہ جیل میں ہوتے ہیں باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ جیل جانے میں کوئی مشکل نہیں ہے' وہ ایسے ہیرو کے طور پر باہر آتے ہیں' جو کاز کے لیے لڑ چکا ہو۔ حتمی طور پر کسان عقل مند نہیں ہوئے بلکہ دہشت گردوں کو عقل آئی کہ پنتھ تو بہت لمبی مدت سے سواری کرتا چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے تلونڈی اور ٹوہرہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تاہم صرف انہیں زخمی کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ بلونت سنگھ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چند ایک معصوم مرد اور عورتیں بھی مثلاً آسان شکار سنت لونگووال اور بی بی راجندر کور گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ پارٹی نام کے سوا باقی نہیں رہی۔ حقیقی طاقت اور اختیار عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مین چلا گیا جو اپنے بھاگوان سمرنجیت سنگھ مان کو اوپر لے آئے' چوٹی کی پوزیشن پر۔ کوئی صرف اتنا سنے کہ مان سنگھ کیا کہتا اور کن سرگرمیوں میں ملوث تھا تو اسے پتہ چل جائے گا کہ اکالی جو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی تاریخ میں روایت (لیجنڈ) کا درجہ رکھتے تھے' ان کی جانشینی عقل وخرد سے عاری ڈاڑھی والے مسخروں کا ایک جتھا کر رہا ہے۔ گیانی ذیل سنگھ ان کے نام کے حوالے سے طنز کیا کرتے تھے۔ ''اکالی عقل تے خالی۔''

چودھواں باب

پاکستان

میں ان چند خوش قسمت ہندوستانیوں میں سے ایک ہوں جو کئی مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ فقط ایک مرتبہ میں نے اپنے لیے معاندت محسوس کی۔ ایسا تقسیم کے فوری بعد ہوا تھا جب ہندوستانیوں خصوصاً سکھوں کے خلاف جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے۔

میں لندن جاتے ہوئے کراچی سے گزر رہا تھا۔ میرے پاس چند گھنٹے فالتو تھے اور میں نے اس شہر کو دیکھنے کے لیے ٹیکسی کرائے پر لی جس کی میں نے پہلے کبھی سیر نہیں کی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے مسٹر جناح کی قبر پر لے چلے۔ جونہی میں نے ٹیکسی سے قدم باہر رکھا ایک ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ میں نے کسی کو چیختے ہوئے سنا: ''پاکستان آنے کا ان لوگوں کا کیا کام؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بازو سے پکڑا ٹیکسی میں بٹھایا اور گاڑی چلا دی۔

سکھ مخالف جذبات ساری مسلم دنیا میں پھیل گئے تھے' جہاں سکھوں کے مسلمانوں کے قتل عام کی وحشت ناک کہانیاں مبالغہ آمیزی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کا اندازہ تب ہوا جب میں قاہرہ میں چہل قدمی کرنے کے لیے اپنے ہوٹل سے باہر نکلا۔ میں نے لوگوں کو چیختے ہوئے سنا: ''سکھ'' اور ادراک کیا کہ وہ دوستانہ انداز نہیں تھا سو الٹے قدموں واپس ہوٹل آ گیا۔

مجھے پاکستان میں سکھوں کے خلاف اس عداوت کا دوبارہ کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ میرے لگاتار دوروں میں خصوصی طور پر میرا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ تانگے والے اور ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیتے تھے' دکاندار چیزیں مفت دے دیتے تھے۔ مجھے چائے اور ٹھنڈے مشروبات پلائے جاتے تھے۔ میں منظور قادر' جو اس وقت پاکستان کا وزیر خارجہ تھا' کے ساتھ اپنی مری کی سیر کو یاد کرتا ہوں۔ ہم ایک دکان کے سامنے سے گزرے جہاں چھڑیاں

(واکنگ سٹکس) فروخت ہورہی تھیں۔ منظور اپنے لیے ایک چھڑی خریدنا چاہتا تھا' میں نے سوچا میں یادگار کے طور پر ایک چھڑی خریدلوں۔ اپنی خواہش کے مطابق انتخاب کرنے کے بعد منظور نے ان کی قیمتیں پوچھیں۔ قیمتیں بتائے جانے پر میں نے منظور کو انگریزی میں کہا کہ تم شملہ میں انہیں زیادہ سستا خرید سکتے ہو۔ منظور نے میرا تبصرہ ترجمہ کرکے دکاندار کو سنا دیا۔ ''آپ درست کہتے ہیں...... یہ ایک تو میری طرف سے ہمارے سکھ مہمان کے لیے ہے' دوسری کے لیے آپ آدھی قیمت ادا کردیجئے۔'' میں نے اس سے پوچھا کیا وہ جانتا ہے کہ میرے ساتھ والا شخص کون ہے؟ ''میں جانتا ہوں'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اخباروں میں اس کی تصویریں دیکھتا ہوں۔ یہ ہمارا وزیرخارجہ ہے۔ وہ جو کچھ خریدے اسے اس کی قیمت ادا کرنی ہے' آپ نے پاکستان میں کسی چیز کی قیمت ادا نہیں کرنی۔''

سکھوں کے لیے عمومی خیرخواہی کے علاوہ' جن سے وہ ایک مرتبہ نفرت کرچکے ہیں' تعلیم یافتہ پاکستانی یہ بھی جانتے ہیں کہ میں کس طرح اکثر ان کی حمایت میں اپنی گردن پھنسوا بیٹھتا ہوں۔ جناح کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے لیے انہوں نے اپنے سیمینار میں مقالے پڑھنے کے لیے دو ہی ہندوستانیوں کو دعوت دی تھی۔ دوسرا مندوب آنے میں ناکام رہا تھا۔ میں ہندوپاک معاملات پر یورپی اور امریکی عالموں (سکالرز) کی کہکشاں کے درمیان واحد ہندوستانی تھا۔ جب میری تقریر کرنے کی باری آئی تو میں نے ان کے قائد کی اپنے باپ کے ساتھ دوستی اور اپنی شادی ان کے میں مہمان خصوصی ہونے کا حوالہ دیا۔ میں نے گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح کی پہلی تقریر کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے ہندو اور سکھ اقلیتوں کو مساویانہ برتاؤ کا یقین دلایا تھا اور انہیں پاکستان کو اپنی مادر وطن سمجھنے کی نصیحت کی تھی۔ وہ مذہبی اقلیتوں کا دوطرفہ ترک وطن (مائیگریشن) نہیں چاہتے تھے۔ میں نے صاف صاف کہا کہ ہندوستانی پاکستان کا ایک خودمختار' آزاد ریاست ہونے کا حق تسلیم کرتے ہیں' ہم جو تسلیم نہیں کرتے تھے نہ کبھی کریں گے وہ ہے مسلمانوں کا ہندوؤں اور سکھوں سے الگ قوم ہونے کے ناطے دوقومی نظریہ۔ میری تقریر کو سراہا گیا۔ تاہم جلد ہی پاکستانی مندوبین نے مجھے ٹوکنا شروع کردیا: ''اگر تم دوقومی نظریے کو نہیں مانتے تو پاکستان کو نہیں مانتے۔'' انہوں نے بیان کیا۔ میں اپنے مؤقف پر قائم رہا' دلیل دی کہ ہم پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ متعلقہ علاقوں کی آبادی کی اکثریت اپنی آزاد ریاستوں کی حامل ہونا چاہتی تھی' اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمان تھے۔ اگر ہم دوقومی نظریے کو تسلیم کریں تو پھر ہندوستان میں بچ رہنے والے نو

کروڑ مسلمانوں کا کیا کیا جائے؟ مجھے سامعین میں موجود کالج کے طلبہ کی طرف سے دوبارہ سراہا گیا۔ انہوں نے مجھے منتخب طلبہ کے سامنے ہندو پاک معاملات پر تقریر کرنے کے لیے کیمپس میں مدعو کیا۔ ''آپ پاکستان کے بارے میں اچھی باتیں کرتے رہیں ہیں' اب ہمیں سچ بتائیں۔ آپ کیا حقیقتاً یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کی طرح درست راستے پر جارہا ہے اور درست کررہا ہے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ان سے کہا: ''پاکستان کا معیاری وقت ہندوستان سے تیس منٹ پیچھے ہے۔ تم ترقی میں ہم سے تیس برس پیچھے ہو۔'' میں نے سڑک پر خوب صورت کاروں کی بہت بڑی تعداد دیکھی تھی سب کی سب جاپان' جرمنی' انگلینڈ یا امریکہ سے درآمد شدہ تھیں ...... کوئی ایک بھی پاکستان کی بنی ہوئی نہیں تھی۔ ہندوستان میں غیر ملکی گاڑیاں شاذونادر ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ''ہماری کاریں ''رٹ کھٹیا'' ہوسکتی ہیں تاہم وہ ہندوستان میں بنی ہوئی ہیں۔'' میں نے ''رٹ کھٹیا'' فخر کے ساتھ کہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے ہوٹل کے کمرے میں ماچس اور بیت الخلا کے کاغذ چین سے درآمد شدہ تھے۔ وہ رنگین ٹی وی رکھنے کی باتیں کررہے تھے جبکہ وہ اپنے ملک میں سائیکل جیسی سادہ اشیاء بھی نہیں تیار کرسکتے تھے۔

ایک مرتبہ میں کراچی انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ڈنر پر دیر ہوجانے کی وجہ سے بمبئی کے لیے صبح کی پرواز پکڑنے سے پہلے تھوڑی دیر سولینا چاہتا تھا۔ ایلیویٹر میں ایک لمبا' کالا نوجوان مجھ سے ہم کلام ہوا۔ ''ایک سردار جی کسی نامعلوم مقام سے'' اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے خوش مزاجی کے ساتھ کہا ''چلو میرے ساتھ ایک جام پیو۔'' میں نے احتجاج کیا کہ میں پہلے ہی کافی مقدار میں پی چکا ہوں اور مزید نہیں پینا چاہتا۔ ''تمہیں جانے سے پہلے ایک جام میرے ساتھ پینا ہوگا۔'' وہ مجھے مے خانے (بار) کی طرف گھسیٹتا ہوا بولا تھا۔ وہ ایک طاقت ور آدمی تھا۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ میں نے ایک ڈرمی کا آرڈر دیا۔ ''کیا تم کسی قسم کے کاروباری ہو؟ تم ایران یا افغانستان سے آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے واضح کیا کہ میں بمبئی سے آیا ہوں اور ایک اخبار کا مدیر ہوں۔ ''اس صورت میں تمہیں ایک اور جام لینا ہوگا۔'' اس نے اصرار کیا اور ایک مزید ڈرمی کا آرڈر دے دیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ اس کے شکنجے سے کس طرح نکلا جاسکتا ہے۔ ہر مرتبہ جب میں اٹھنے کی کوشش کرتا وہ مجھے میری کرسی میں دھکیل دیتا۔ ''ہوسکتا ہے تم کوئی مدیر یا اس سے بھی بڑی کوئی شے ہو۔'' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''میں تمہارے جیسوں کے نام اپنے ...... پر لکھتا ہوں۔'' میں اس سے پوچھنے سے رہ

نہیں سکا: ''کیا تم بال پوائنٹ پین سے لکھتے ہو؟'' وہ میرا مذاق نہیں سمجھا۔ میری خوش قسمتی سے اس کا مثانہ بھر گیا تھا اور اسے پیشاب کرنے کے لیے جانا پڑا تھا۔ ''جب میں اپنا مثانہ خالی کر رہا ہوں تو تم بھاگ مت جانا۔'' اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے باہر جاتے ہوئے تنبیہ کی۔ میں نے بالکل ایسا ہی کیا۔ بجائے ایلیویٹر لینے کے میں اپنے کمرے میں پناہ لینے کے لیے سیڑھیوں پر دوڑ کر چڑھ گیا۔

میں گزشتہ کئی برسوں سے قریباً ہر دوسرے برس پاکستان کا دورہ کر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ میں خاص طور پر اپنے دوست ایم۔ اے رحمٰن کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے گیا اور ایک دوسرے موقعے پر منظور قادر یادگاری لیکچر دینے کے لیے گیا۔ میں لاہور کی گلیوں میں آزادی کے ساتھ اور بغیر کسی محافظ کے گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں منظور قادر، اس کے چچا سلیم اور محمد انور کی قبروں پر خراج عقیدت پیش کرنا معمول بنا لیا۔ میرا تعلق چند ہی لوگوں تک محدود نہیں تھا: ہر مرتبہ جب میں گیا میں نے نئے دوست بنائے، ان کے گھروں میں مدعو کیا گیا، جب وہ دہلی آئے تو مجھ سے آ کر ملے۔ میرے تازہ ترین شناساؤں میں پبلشر، بک سیلر نجم سیٹھی اور اس کی چاند چہرہ بیوی جو ''فرائیڈے'' کی ادارت کرتی ہے، اس کی شاعرہ کزن حنا فیصل امام اور اس کی بہن کا شوہر حکیم خاندان کا اعجاز الدین، حکیم خاندان کے تین افراد مہاراجا رنجیت سنگھ کے قریب ترین مشیروں میں شامل تھے۔

کئی برس پہلے مجھے ہندو پاک تعلقات پر ایک میڈیا سیمینار میں اسلام آباد مدعو کیا گیا تھا۔ دیگر مدعوئین میں ''ٹریبیون'' کا پریم بھاٹیہ اور کلدیپ نیر تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان چھائے ہوئے تناؤ کے باوجود سیمینار کا ماحول گرمجوشی سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے نواب زادہ یعقوب کی میزبانی میں دیئے گئے لنچ تک خیال بھی نہیں تھا کہ مجھے ہندوستانی وفد کا سربراہ تصور کیا جا رہا ہے، میں نے خود کو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا۔ لنچ کے بعد اس نے ایک لمبی اور دلپذیر تقریر میں ہندو پاک تعلقات کا تجزیہ کیا اور ایک جام (سادہ پانی کا) مزید اچھے تعلقات کے لیے تجویز کیا۔ مجھ سے جوابی تقریر کی توقع کی جا رہی تھی۔ میں نے اصرار کیا کہ ہمارے درمیان سینئر موسٹ ہونے کی وجہ سے پریم بھاٹیہ کو جواب دینا چاہیے۔ میں نے فقط اپنا پانی کا گلاس بلند کیا اور پاکستان کی خوشحالی کی دعا کی۔ بھاٹیہ نے ایک مختصر، خشک تقریر کی۔

اسی شام اس ہوٹل میں جس میں ہم قیام پذیر تھے ہمارے لیے ایک الوداعی بینکویٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمارا میزبان پاکستان کا وزیر اطلاعات ونشریات تھا۔ ایک شام پہلے میں

نے اسے ٹی وی پر ایک پینل ڈسکشن میں دیکھا۔ تین مولوی نما اشخاص اور برقعے میں ملبوس لڑکی' جس کا نقاب اس کا دلکش چہرہ عیاں کرنے کے لیے الٹا ہوا تھا' اس پر مسلسل سوالات کر رہے تھے۔ انہوں نے شکوہ کیا تھا کہ پاکستانی الیکٹرانک میڈیا لوگوں کو اسلام کے محاسن اور دوقومی نظریے کی حقانیت سے کافی آگاہ نہیں کر رہا تھا۔ اسے انہیں قائل کرنے میں کافی مشکل پیش آئی تھی کہ وہ اپنی سی بہترین کاوشیں انجام دے رہا ہے۔ میں بینکویٹ میں خوب سکاچ پیے ہوئے آیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں سخت ممانعت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر میں نے اپنے آپ کو میزبان کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے پایا۔ بھاٹیہ نے مجھے کہا ''بچو اس مرتبہ تمہیں خود تقریر کرنا ہوگی۔'' ہمیں وزیر کی تقریر کی ایک ایک طبع شدہ نقل تھما دی گئی۔ میرے ذہن میں دھندلا سا تصور بھی نہیں تھا کہ کس طرح جواب دینا ہے۔ یہ میری بھوک کو برباد اور میرے اندر موجود وسکی کو کھٹا کر دیتا۔ جب میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو میں نے وزیر کے گزشتہ شام ٹی وی پر شکنجے میں کسے جانے کا حوالہ دیا۔ میں نے سامعین کو بتایا کہ ممانعت کے باوجود میں سکاچ کا اپنا کوٹا پی چکا ہوں اور اگر وہ اس حوالے سے کچھ کرنا چاہتے ہوں تو جلدی سے کرلیں کیونکہ میں چند گھنٹوں میں ہندوستان واپس پرواز کر جانے والا ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ پاکستانی پریس نے میری تقریر کی رپورٹنگ کس طرح کی کیونکہ میں صبح سویرے دہلی جانے کے لیے اسلام آباد سے لاہور چلا گیا تھا۔ میں پاکستانیوں کے خرچے پر آخری مرتبہ لاہور ایئرپورٹ پر ہنسا۔ کسٹمز اور امیگریشن سے گزرنے کے بعد مجھے سکیورٹی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شخص نے میری پگڑی اور بدن پر میٹل ڈیٹکٹر پھیرا۔ جونہی وہ اسے میرے وسط کے اوپر لایا ایک بلند آواز آنے لگی۔ وہ رک گیا۔ میں اپنے وسط میں کیا چھپائے ہوئے ہوسکتا تھا؟ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ دوبارہ ایک بلند آواز نکلی۔ ''جناب فولادی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ وہ میری زپ تھی جو سٹیل کی بنی ہوئی تھی۔ تاہم میں نے جس طرف اشارہ کیا تھا وہ سمجھ گیا اور اپنے ساتھی سکیورٹی افسروں کو میں نے جو کہا تھا بتانے دوڑا۔ وہ مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے آئے۔

اپریل 1984ء میں مجھے پاکستان فورم نے کشمیر پر ایک سیمینار کے لیے مدعو کیا۔ میرے پاس اس موضوع پر کہنے کو کوئی زیادہ نئی بات نہیں تھی تاہم میں نے دعوت قبول کرلی۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے پاکستان کا دورہ کرنے اور میرے لیے اپنے رشتہ داروں سے زیادہ پیارے دوستوں سے ملاقات کرنے کا آخری موقع ہو۔ اسلام آباد میں اصغری قادر (منظور کی

بیوہ) پچاسی کے قریب تھی۔ اس کے دو بڑے آپریشن ہو چکے تھے۔ اور وہاں اس کے دو بیٹے بشارت اور اصغرا اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ تھے۔ لاہور میں ایم اے رحمٰن تھا جس سے میری دوستی وہاں سے شروع ہوئی تھی جہاں منظور چند سال پہلے لندن میں مرتے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔ وہاں جمیلہ انور اور اس کی حال ہی میں بیاہی ہوئی بیٹی ناہید بھی تھیں۔ لاہور میں دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً نون خاندان جو میری بیوی کے والدین کے قریبی دوست رہے تھے۔

سو میں نے پی آئی اے کی دہلی سے لاہور جانے والی پرواز لی۔ میرے پاس لاہور ایئرپورٹ پر اسلام آباد کے لیے پرواز لینے کے لیے بمشکل ایک گھنٹہ تھا جس وقت تک میں صحت' کسٹمز اور امیگریشن سے کلیئر ہوا میری اگلی پرواز کی پکار ہوگئی۔ میرے پاس رحمٰن اور بپسی سدھوا سے سلام دعا کرنے کے لیے صرف چند سیکنڈ رہ گئے تھے۔ دونوں نے قلی کو دینے کے لیے میرے ہاتھوں میں کرنسی نوٹ ٹھونس دیئے۔ ایک ہی سانس میں خوش آمدید اور خدا حافظ کہا گیا تھا۔ مینو بھنڈارا (بپسی کا بھائی) مری بروری کا مالک اور بشارت (منظور کا بڑا بیٹا) وہاں میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مینو کے تاخیری ڈنر کے بعد میں شب بسری کے لیے چلا گیا۔ میں نے اگلا دن قادر خاندان کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

اگلی صبح مینو کے ڈرائیور نے مجھے اسلام آباد میں اصغر قادر کے گھر اتار دیا۔ اصغر' جسے میں اس کی لاہور میں پیدائش کے دن سے جانتا تھا' پاکستان کا چوٹی کا طبیعیات کا ماہر اور ریاضی دان بن چکا تھا۔ مجھے سلادیش مہاجن' جو یونیورسٹی آف آسٹن (ٹیکساس) میں طبیعیات (فزکس) پڑھاتا تھا' نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے بعد اسے توقع ہے کہ نوبل پرائز جیتنے والا اگلا پاکستانی اصغر قادر ہوگا۔ اصغر آج کل یونیورسٹی آف اسلام آباد میں شعبے کا سربراہ ہے۔ اپنے علمی شوق کے علاوہ اسے پھولوں کا بھی جنون ہے۔ میں نے اتنے بڑے اور اتنے زیادہ خوشبودار گلاب دہلی میں نہیں دیکھے۔ اس کا باغ سفید' گلابی اور سرخ گلابوں کی مختلف قسموں سے دمک رہا تھا اور اس کے کمرے خوشبو سے بھرے ہوئے تھے۔ پروفیسر اور اس کی بیوی اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے بچے سکول گئے ہوئے تھے۔ میرے پاس اصغری کے ہمراہ گزارنے کے لیے تین گھنٹے تھے۔ وہ ایک بہت جذباتی چھپی تھی' جس میں یوں لگتا تھا کہ ہمارے ایک دوسرے کو جاننے کی آدھی صدی ایک نظر میں گزر گئی ہو۔ جذبات سے میرا گلا بھر آیا اور میں چند منٹ تک کچھ بولنے سے قاصر رہا۔ میں ایسی صورت حالات میں خود کو احمق بنانے کی طرف بہت مائل ہوں۔

بشارت ہمارے ساتھ چائے پینے میں شریک ہوا اور پھر مجھے خریداری (شاپنگ) کے لیے باہر لے گیا۔ سوائے اونیکس کے تحفہ کے طور پر خریدنے کے لیے پاکستان میں خریدنے کو ایسا کچھ بہت زیادہ نہیں جو ہندوستان میں زیادہ بہتر مہارت کے ساتھ تیار نہیں کیا جا سکتا ہو۔ میں نے قرآنی آیات کی نقاشی والی کچھ پلیٹیں اور کپ خریدے اور ہاتھ کی بنی ہوئی ٹیکسٹائل مصنوعات خریدیں جن پر نباتی رنگوں سے نمونے بنے ہوئے تھے اور اونیکس کے بنے ہوئے دو کٹورے خریدے۔ بشارت نے مجھے قیمت ادا نہیں کرنے دی۔ وہ مجھے شہر کی سب سے بہترین مشہور دو کتابوں کی دکانوں لندن بک شاپ اور مسٹر بک شاپ پر لے گیا۔ وہ دونوں ہماری دہلی، بمبئی اور کلکتہ کی کتابوں کی دکانوں سے زیادہ بڑی اور زیادہ کتابوں کے ذخیرے کی حامل تھیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ بشارت نے انہیں اشارہ دے دیا تھا یا وہ اخبارات میں میرا نام دیکھ چکے تھے تاہم میری کتابیں دونوں دکانوں کے داخلی دروازے کے قریب ہی نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی مطبوعات پاکستانی مطبوعات پر سبقت لے گئی تھیں۔ میں نے اسلام آباد کے خریداری مراکز (شاپنگ سنٹرز) میں جو دو گھنٹے گزارے ان میں میں نے ایک بھی عورت کو برقعے میں نہیں دیکھا۔

میں نے پاکستان کی عورتوں کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات محسوس کی۔ ان کے بالائی طبقے میں طلاقیں اور شادیاں ہندوستان کی نسبت زیادہ عام ہیں۔ دوسرے شخص کی بیوی کو پھانسنا یا اس کے ساتھ ہم بستری کرنا خطرناک ہے اس لیے اسے اپنے خاوند کو چھوڑنے اور تمہاری بیوی بن جانے کی ترغیب دینا مزید ایک شاذ مظہر (فینومینن) نہیں رہا۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں، جہاں شراب نوشی تمہیں کوڑے پڑوا سکتی ہے، میرے ماضی کے تخلیقی دوست مثلاً شاعر فیض احمد فیض اور مصور صادقین عادی مے نوش تھے۔ اسی طرح میرے آج کے دوست شاعر احمد فراز اور قتیل شفائی ہیں۔ جب انہیں لاہور میں اپنے ذخیرے دوبارہ بھرنے میں مسائل ہوں تو وہ چند دنوں کے لیے ہندوستان چلے آتے ہیں اور ان اونٹوں کی طرح شراب پیتے ہیں جنہوں نے ایک طویل، خشک صحرائی سفر پر روانہ ہونا ہو۔ وہ اپنی انسانی ٹینکیاں اتنی بھر لیتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کے وطن میں عارضی قیام کے دوران چلتی رہتی ہیں۔

پاکستان فورم کے کشمیر پر منعقد کردہ سیمینار میں میرا واحد حصہ (کنٹری بیوشن)، ہندوستان کا سرکاری نقطۂ نگاہ پیش کرنے یا پاکستانیوں سے اختلاف رائے کرنے کی بجائے، یہ تھا کہ میں نے کشمیری مسلمانوں کا مؤقف بیان کیا، جن کا مستقبل ہندوستان اور پاکستان کے

درمیان حقیقی وجہ نزاع ہے۔ پاکستان پریس نے میری تقریر کو بھرپور کوریج دی اور ایک اخبار نے تو میری تائید میں اداریہ تک لکھا۔ پاکستان ٹی وی نے مجھے ایک پرامن حل کے لیے اپنی تجاویز پیش کرنے کے لیے آدھا گھنٹہ دیا۔ ہندوستانی پریس نے مجھے بالکل بھی کوریج نہیں دی۔

اپنے قریب ترین پاکستانی خاندان سے رخصت ہونے کے بعد میں نے رحمٰن خاندان کے ساتھ تین دن گزارنے کے لیے لاہور جانے والی سہ پہر کی پرواز لی۔ رحمٰن کو چند ماہ پہلے دل کا دورہ پڑا تھا اس کے باوجود وہ مجھے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر آیا ہوا تھا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو رحمٰن نے مجھے خواب گاہ دکھائی جو اس کے بیٹے نے میرے لیے خالی کی تھی۔ بستر پر تازہ سلے ہوئے چار عوامی سوٹ پڑے ہوئے تھے اور قالین پر نئی پشاوری چپلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ''تمہارا اور میرا ماپ ایک ہی ہے' میں نے سوچا ہمارے پاؤں بھی ایک ہی ماپ کے ہوں گے'' رحمٰن نے کہا: ''میں نے انہیں تمہارے لیے بنوایا ہے۔ چپل کو پہن کر دیکھو اور غسل خانے میں لٹکا ہوا عوامی سوٹ زیب تن کرو۔ ہم میری بیٹی ثمینہ اور اس کے شوہر اورنگ زیب کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔'' میں تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ جو کچھ میں رحمٰن خاندان کے لیے لایا تھا وہ سب تو فقط اخروٹوں کے پیکٹ' ایک پیکٹ چائے اور دو میری کتابوں کے پیکٹ تھے۔ اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا اس نے مجھے خاندان کے تازہ ترین واقعات سے آگاہ کرنے کے لیے موضوع بدل دیا۔ میری آمد سے پندرہ روز پہلے اس کے گھر میں مسلح ڈکیتی ہوئی تھی۔ رحمٰن اور اس کے گھر والے گیارہ بجے ڈنر سے واپس آ رہے تھے۔ جب ان کا بوڑھا چوکیدار اس کی بیوی کے کار اندر لے جانے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا' رحمٰن کار سے اتر آیا۔ ایک آدمی اس کے پاس آیا اور ڈرائیور کے طور پر ملازمت مانگنے لگا۔ ''میرے پاس ڈرائیور ہے۔'' رحمٰن نے جواب دیا۔ ''اور یہ وقت لوگوں کے گھروں میں جا کر نوکریاں مانگنے کا نہیں ہے۔'' آدمی نے ایک گن نکال لی اور اس کو رحمان کے سر کی طرف تان لیا۔ تین دوسرے آدمی' سب کے سب مسلح' ان کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مدد کے لیے چیخنے کی کوشش کی تو انہیں گولی مار دی جائے گی۔ ''اب جو کچھ گھر میں ہے ہمارے حوالے کر دو۔'' گینگ لیڈر نے کہا تھا۔ رحمٰن نے اسی صبح دس ہزار روپے کا ایک چیک کیش کروایا تھا۔ اس نے کرنسی نوٹوں کا بنڈل اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس کی بیوی سے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں نکالنے اور ان کے حوالے کرنے کا کہا۔ گروہ باز اپنے شکار سے مطمئن نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے رحمٰن کو گھر کے دروازے کھول دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے دروازے کھول

دیئے۔ گروہ بازوں نے ان کے دو بیٹوں اور بہوؤں کو جگا دیا۔ انہوں نے اپنی ساری نقدی اور زیورات ان کے حوالے کر دیئے۔ رحمٰن کے بنگلہ دیشی نوکر نے' جو گھر کے باہر رہتا تھا' محسوس کیا کہ گھر کے اندر کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ ایک قریبی گھر کی طرف دوڑا جہاں ایک پولیس گارڈ ہوا کرتا تھا۔ رحمٰن کے گھر کی طرف چار بندوق بردار آدمی آئے۔ گروہ بازوں نے محسوس کیا کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ گروہ کے سرغنہ نے دوسری طرف جانے کے لیے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تک اسے پکڑنے کے لیے نہر کی دوسری طرف لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ گروہ کا سرغنہ دھر لیا گیا اور اسے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے خوب مارا پیٹا گیا۔ نقدی اور زیورات اس سے برآمد کر لیے گئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے نام اگل دیئے۔ تینوں کو گوجرانوالہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ چوتھا ہنوز مفرور تھا۔

ثمینہ اور اورنگ زیب کے ساتھ ڈنر کرتے وقت واحد گفتگو لاہور میں بڑھتے ہوئے پرتشدد جرائم پر ہوتی رہی۔ ہر رات اوسطاً چھ یا سات ڈکیتیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں تو صورتحال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ مجھے اس کی مثال تب ملی جب میں اگلی صبح نون خاندان کے ہاں ملاقات کے لیے گیا۔

اکبر حیات نون سر فیروز خان نون کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ لمبا' کسی فلمی ستارے کی طرح خوبصورت تھا اور تقسیم سے پہلے ایک کل ہند (آل انڈیا) ایتھلیٹ رہا تھا۔ انگلینڈ سے انجینئرنگ کی ایک ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے سنٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ اس نے اصغری کی چھوٹی بہن اختری سے شادی کی (دونوں میاں سر فضل حسین کی بیٹیاں تھیں) اور دہلی میں آباد ہو گیا۔ وہ میرے سسر سر تیجا سنگھ کے منظورِ نظر بن گئے۔ پنجاب میں ہمارے علاقے سے ہونے کے ناطے انہیں میرے والدین اکثر کھانے پر مدعو کرتے رہتے تھے۔ اپنے زمانے میں اکبر اور اختری دہلی کا خوب صورت جوڑا ہوا کرتے تھے۔

تقسیم نونوں کو پاکستان لے گئی۔ جب اکبر پی ڈبلیو ڈی سے ریٹائر ہوا تو جوڑا کراچی میں آباد ہو گیا۔ ایک رات مسلح ڈاکو ان کے گھر میں گھس آئے۔ جو کچھ وہ لوٹ سکتے تھے لوٹنے کے بعد انہوں نے اکبر کو اس کی کار کی چابیاں ان کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اس نے انہیں چابیاں دے دیں۔ وہ دروازہ غیر مقفل نہیں کر سکے اور انہیں شبہ ہوا کہ اکبر نے جان بوجھ کر انہیں غلط چابیاں دی ہیں۔ انہوں نے اسے کار کو غیر مقفل کرنے کا حکم دیا۔ اکبر کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور چابیاں چابیوں کے سوراخ میں داخل نہیں کر سکے۔ ایک گروہ بازہ نے

اس کے بازو میں گولی ماردی۔اس کے بازو کی ہڈیاں پاش پاش ہوگئیں۔گروہ بازہ کبھی نہیں پکڑے جاسکے۔ہسپتال میں چند ماہ گزارنے کے بعد نون لاہور آ گئے۔جب میں خاندان کے تمام ارکان سے سلام دعا کر چکا تو اختری مجھے ایک طرف لے گئی اور اس نے التجا کی کہ میں نہ تو ان کے گھر اور نہ ہی رحمٰن کے گھر ڈکیتی کا موضوع چھیڑوں۔''وہ خوف سے مراقی ہو چکا ہے۔'' اس نے مجھے بتایا ''جونہی اندھیرا چھاتا ہے اسے دبے پاؤں پھرتے ہوئے ڈکیتوں کے ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں۔وہ ساری ساری رات ٹی وی چلائے ٹینس' کرکٹ یا ہاکی دیکھتا رہتا ہے۔اس کے ساتھ کسی نہ کسی کو ہر وقت رہنا پڑتا ہے۔''

میرے جانے سے پہلے اختری نے اپنے بیٹے کی بنائی ہوئی بڑی سی پینٹنگ مجھے دی۔تب اکبر کا ایک کزن عطا محمد نون' جو گورنمنٹ کالج میں میری ہی کلاس میں ہوا کرتا تھا' اندر آیا۔وہ پولیس میں ملازمت کر چکا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور ہی میں رہ رہا تھا۔اگرچہ اس کی صحت خراب تھی تاہم وہ ویسا ہی دبلا پتلا نیم جان دکھائی دینے والا آدمی تھا جو اب چھوٹی سی خاکستری ڈاڑھی رکھے ہوئے تھا۔ہم قریباً اکسٹھ برس بعد مل رہے تھے۔

صبح کے وقت ایک اور سماجی ملاقات بچ رہی تھی۔جمیلہ انور اور اس کی نئی بیاہی ہوئی بیٹی۔جمیلہ کا شوہر تقسیم سے پہلے میرا دوست اور مے نوشی کا ساتھی رہا تھا۔جب بھی میں منظور کے ساتھ چند دن گزارنے لاہور آتا وہ شامیں ہمارے ساتھ گزارتا تھا۔تقسیم کے بعد اس نے اور جمیلہ اور میں نے ایک ہی پولش جہاز بیٹوری پر لندن سے کراچی تک سفر کیا تھا۔ہم سارا وقت اکٹھے رہے تھے۔انور زیڈ اے بھٹو سے الجھ پڑا تھا اور اس کے ہاتھوں سزاؤں کا شکار ہوا تھا۔وہ اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا تھا۔پھر وہ اچانک مر گیا۔وہ صرف اپنی عمر کی پانچویں دہائی میں تھا۔ایک پہلے دورے میں جمیلہ مجھے اس کی قبر پر لے گئی تھی اور فاتحہ پڑھی تھی۔ان کی کوئی اپنی اولاد نہیں تھی اور انہوں نے انور کی بھتیجی کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔وہ عمر میں اپنے سے بہت زیادہ بڑے شادی شدہ شخص کے ساتھ شادی پر راضی ہوگئی تھی' وہ ایک وڈیرہ تھا اور سندھی سیاست میں عمل دخل رکھتا تھا۔جمیلہ نے مجھے گرمجوشی کے ساتھ جپھی ڈالی' اسی طرح اس کی بیٹی نے بھی۔چند منٹ بعد اس کا داماد غسل خانے سے نکلا جہاں وہ میرے ساتھ موجود پولیس والوں کے جانے تک چھپا ہوا تھا۔وہ اغوا کے چند مقدمات میں مطلوب تھا اور سندھ پولیس سے بھاگا ہوا تھا۔

ایک فرماں بردار داماد کی طرح اس نے میری دعائیں حاصل کرنے کے لیے

میرے پاؤں چھوئے۔ میرے رخصت ہونے سے پہلے جمیلہ نے سبز اونیکس کا بنا ہوا ایک بھاری قلم اور روشنائی دان (پین اینڈ انک ہولڈر) میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ''انور نے ساری زندگی اسے استعمال کیا۔ میں جانتی ہوں اگر یہ تمہارے پاس ہوگا تو وہ خوش ہوگا۔'' اس نے کہا تھا۔ انور سے میری آخری ملاقات کے دوران میں اس نے مجھے درحقیقت مہنگی قسم کے اونیکس کا بنا ہوا ایک پیالہ دیا تھا۔

سہ پہر میں رحمٰن کی بیٹی سبینا خریداری (شاپنگ) کے لیے مجھے باہر لے گئی۔ میں نے بہت سی کتابیں، موسیقی کی ٹیپیں اور پرانے سوتی کپڑے لیے۔ اس نے مجھے ان کی ادائیگی نہیں کرنے دی۔ شام کے وقت میں رحمٰن کے ساتھ ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور گیا جہاں سے اس نے ڈنر کے لیے اشیاء خریدنا تھیں۔ سٹور ہمارے بڑے شہروں کے کسی بھی سٹور سے زیادہ بڑا تھا اور غیر ملکی پنیروں، بسکٹوں، چٹنیوں، جاموں (Jams)، آرائش کے سامان (کاسمیٹکس) اور ادویات سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے سوچا میں اپنی پوتی کے لیے کچھ برطانوی اور سوئس چاکلیٹیں لوں۔ میں نے انہیں کاؤنٹر پر رکھ دیا اور ان کی قیمت پوچھی۔ ایک نوجوان آیا، کاغذ کا وہ ٹکڑا اٹھایا جس پر سیلز مین میرے لیے بل بنا رہا تھا اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''انہیں سردار صاحب کے لیے پیک کر دو۔'' اس نے سیلز مین کو حکم دیا۔ وہ سٹور کا مالک تھا۔ وہ مجھے جانتا نہیں تھا۔ میں واضح طور پر ایک ہندوستانی مہمان تھا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس کا خاندان، چودھری خاندان، 1947ء میں انبالہ سے ہجرت کر آیا تھا۔ اس سے مجھے گلاسگو کا سپورٹس سٹور یاد آیا جہاں میں نے 35 پونڈ قیمت کا سنیکرز کا ایک جوڑا لیا تھا۔ دکاندار نے میرا ان کی قیمت ادا کرنے کو مسترد کر دیا۔ میں مکمل طور پر اجنبی تھا تاہم واضح طور پر ہندوستان سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک پاکستانی پنجابی تھا۔

میں اپنی پوری زندگی میں پنجابی مسلمانوں سے زیادہ فیاضی برتنے والے لوگوں سے نہیں ملا۔ یہ وصف پنجابی ہندوؤں اور سکھوں میں نہیں پایا جاتا تھا نہ ہی سرحدی صوبے اور سندھ کے پاکستانیوں میں۔ یہ سندھ اور ستلج کے درمیان پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم تک کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کی ہی انفرادیت ہے۔ ان میں دوسرے منفرد وصف بھی ہیں۔ وہ عاجز لوگ نہیں ہیں اور پنجابیوں میں عام طور پر پائے جانے والے فخر سے متصف ہیں۔ مسلمان ہونا ان کی خودداری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ان کی منطق سادہ سی ہے: پنجابی دنیا کی اشرافیہ ہیں، اسلام تمام مذاہب میں بہترین ہے۔ ان دونوں کو ملا دو اور تم دنیا کے بہترین

لوگ حاصل کرلو گے۔ جبکہ وہ روایت پسند تھے تو وہ انتہائی تنگ ذہن اور جنونی تھے۔ جہاں کی صرف ایک پکار پر ان کا عسکری جوش و جذبہ ابل پڑتا ہے یعنی مار دیا مر جاؤ۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔

☆☆☆

رحمٰن ایک زبردست مے نوش ہوا کرتا تھا: دل کی تکلیف لاحق ہو جانے کے بعد وہ کبھی کبھار دوسروں کی رفاقت کے لیے وسکی کا آدھا پیگ لے لیتا ہے۔ ہمارا مشترکہ دوست اعجاز بٹالوی کبھی زیادہ مے نوش نہیں رہا ہے اور وہ سکاچ کا اپنا پہلا گلاس ساری شام دھیرے دھیرے پیتا رہے گا۔ ان کے مذہب کی طرف رجحانات بھی مختلف ہیں۔ رحمٰن' گو کہ ویسے تو بہت آزاد ذہن والا شخص ہے' وہابیوں کی سخت گیر روایتوں کو مانتا ہے اور تصوف سے لگاؤ نہیں رکھتا اور صوفیا کے مزاروں پر جا کر خراج عقیدت بھی پیش نہیں کرتا۔ دوسری طرف بٹالوی کا عقیدہ ہے کہ اسلامی تحمل و رواداری کی سچی روح صوفیا کی تعلیمات میں جھلکتی ہے۔ لاہور میں میری آخری سہ پہر حضرت میاں میرؒ کی درگاہ' جن کے بارے میں سکھوں کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے امرتسر میں ہری مندر کی بنیاد رکھی تھی اور شالا مار باغ کے نزدیک باغبان پورہ میں واقع مادھولال حسینؒ کے مزار کے دورے کے لیے مخصوص تھی۔ جب میں طالب علم اور وکیل کے طور پر لاہور میں رہتا تھا تو میں نے کبھی ان مقامات کا دورہ نہیں کیا تھا۔

میاں میرؒ کے درمیانے رقبے والے مزار کے اردگرد وسیع و عریض احاطے میں ایک انوکھا' غیرارضی سکون چھایا رہتا ہے۔ جس وقت میں وہاں گیا وہ قریب قریب سنسان تھا۔ چبوترے کے ایک کونے میں عورتوں اور بچوں کا ایک گروہ اکٹھا بیٹھا ہوا تھا۔

دو فقیر ایک دوسرے سے دور دور بیٹھے ہوئے کوئی شے پڑھ رہے تھے جو میں سن نہیں سکا۔ اعجاز نے پیر کے مزار پر نچھاور کرنے کے لیے گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوا پتوں کا بنا ہوا پیالہ خریدا۔ دو بوڑھے نماز پڑھ رہے تھے۔ اعجاز نے فاتحہ پڑھا' باہر نکلا اور فقیروں کو پیسے دیئے۔ ہم باغبانپورہ کے بازاروں سے گزرے اور مادھولال حسینؒ کے مزار سے کافی فاصلے پر کاروں کو ٹھہرا دیا۔ گلیاں تنگ' پیچیدہ اور بدبودار تھیں۔ ایک بار پھر میں نے بمشکل ہی کسی عورت کو برقعہ پہنے ہوئے دیکھا۔ ہم مزار پر پہنچے ایک آدمی ہاتھوں پیروں میں گھنگھرو باندھے گانا گا اور رقص کر رہا تھا۔ بچوں کی ایک ٹولی اس کے اردگرد دائرہ بنائے ناچ رہی تھی۔ ان کی مائیں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ مزار بہت زیادہ متاثر کرنے والا نہیں تھا: فقط دو گنبد ساتھ ساتھ' ایک مسلمان حسین کا' دوسرا ہندو مادھولال کا۔ وہ شاعر تھے جنہوں نے ایک مشترکہ شخصیت بنا لی تھی'

مادھولال حسین۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ہر بسنت پنچمی کے دن پیلا ریشمی لباس پہنے اور اپنی طرح پیلے ریشمی کپڑوں میں ملبوس اپنی محافظ کشمیری عورتوں کے ساتھ ان کے مزار پر خراج عقیدت پیش کرنے آیا کرتا تھا۔ میرے لیے مزار سے زیادہ دلچسپ اس کے اردگرد کا قبرستان تھا۔ قبروں کے درمیان ایک قبر پنجابی شاعر چراغ دین کی تھی' جو استاد دامن کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اسے یہ نظم سنانے پر مارشل لاحکومت نے جیل میں ڈال دیا تھا:

پاکستان دیا موجاں ای موجاں
چارے پاسے فوجاں ای فوجاں
(پاکستان مزے کر رہا ہے' جدھر دیکھو فوج نظر آتی ہے۔)

دہلی کے ایک دورے میں اس نے ملک کی تقسیم پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے نظم سنائی تھی:

اکھیاں دی لالی پئی دسدی
تسی وی روئے ہو' روئے اسی وی ہاں
(آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے روئے تم بھی ہو' روئے ہم بھی ہیں)

دامن قریباً دس سال پہلے فوت ہوا تھا اور اس نے اپنی لوح مزار خود ہی تحریر کی تھی جو اس کی قبر پر سنگ مرمر کے کتبے پر کندہ کی گئی ہے۔ اعجاز نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اسے میرے لیے نقل کر دیا:

سرسری نظر ماری جہان اندر
زندگی ورگ اتھلیا میں
دامن کوئی نہ ملیا رفیق مینوں
مار کفن دی بکل تے چلیا میں
(میں نے دنیا پر سرسری نظر ڈالی' میں نے اپنی زندگی کی کتاب کے چند ایک ورق ہی الٹے۔ دامن! مجھے کوئی دوست نہ ملا میں کفن اوڑھ کر جا رہا ہوں)

پندرھواں باب

دیوانے اور سر پھرے

جو شخص بھی عوام کی نگاہوں میں ہوتا ہے اس کی طرف مختلف قسم کے عجیب و غریب لوگ مائل ہوتے ہیں۔ میں انہیں اپنے حصے سے زیادہ رکھتا ہوں کیونکہ میں سننے کا مریض ہوں۔ مجھ میں کچھ ہے جو اجنبیوں کو مجھ پر اپنی نجی زندگیوں کو کھولنے اور واشگاف کرنے پر مائل کرتا ہے' اس پختہ یقین کے ساتھ کہ میں ان کے اعترافات کو اپنے تک ہی رکھوں گا۔ اگرچہ میں ایک عظیم ناصح ہوں تاہم میں کبھی لوگوں کے راز رکھنے کا اہل نہیں رہا۔

اس کے برعکس میں عموماً خود پر کیے گئے بھروسوں کو انہیں سننے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو سنا کر توڑ دیتا ہوں۔ میں اپنے اوپر بھروسا کرنے والے لوگوں کا تماشا بنا دیتا ہوں اور جب جھگڑا ہوتا ہے تو ایسا کرنے سے بالکل انکار کر دیتا ہوں۔ نتیجتاً میں بہت سے لوگوں کو دکھی کر چکا ہوں۔

جو دیوانے میری زندگی میں آئے ہیں ان کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے: باتیں کرنے پر مجبور لوگ' عورتیں جو اپنے معصوم رازوں کو منکشف کرنا چاہتی ہیں اور وہ جو ہوش مندی اور ذہنی پراگندگی کو تقسیم کرنے والی سرحد پر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے ایک سننے کا مریض ہونے کے ناطے مجھے بہت بڑی تعداد میں باتیں کرنے پر مجبور لوگوں کو بھگتنا پڑا ہے۔ میں انہیں سنتے ہوئے لطف اندوز نہیں ہوتا ہوں اور اکثر اپنے ذہن کو زیادہ دلچسپ چیزوں کی طرف آوارگی کرنے دیتا ہوں تاہم جو کچھ کہا جا رہا ہو ایک کان اس پر بھی رکھتا ہوں مبادا ان کی گفتگو ایسے سوالات پر مبنی ہو جن کے جوابات کی مجھ سے توقع ہو۔ میں زیادہ تر تو وقفے وقفے سے ایک لفظی آوازوں مثلاً ''ہاں'' یا ''نہیں'' یا فقط سر ہلاتے ہوئے اپنے آپ کو گہری دلچسپی لیتا ہوا ظاہر کرتا ہوں۔ میں اکتا دینے والی حد تک طویل گفتگو کرنے والے لوگوں کو کبھی مختصر گوئی اختیار کرنے کا کہنے کے قابل نہیں ہو پایا۔ جو

بہترین کام میں کر سکتا ہوں وہ ہے ایسے لوگوں سے گریز۔ بعض اوقات ایسا کرنے کے لیے میں شدید مشکل برداشت کر چکا ہوں۔ لاہور میں موسم گرما کی ایک بہت گرم شام جب میں اپنے پہلی منزل والے اپارٹمنٹ کی طرف واپس آ رہا تھا میں نے اپنے کزن کو مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی خاطر سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا۔ میں باروچی خانے میں چھپ گیا اور باورچی سے کہا کہ وہ اسے بتائے کہ میں کلب سے واپس نہیں آیا ہوں۔ پھر میں نے خود کو پاخانے میں بند کر لیا' اس امید میں کہ وہ رخصت ہو جائے گا۔ اس کے بجائے میں نے اسے اپنے باورچی کو کہتے ہوئے سنا کہ وہ میری واپسی تک انتظار کرے گا۔ وہ میرے سٹنگ روم میں بیٹھ کر صبح کا اخبار پڑھنے لگا جبکہ میں پاخانے میں کوئی پڑھنے یا کرنے والی چیز کے بغیر بیٹھا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا مگر میں بتی نہیں جلا سکتا تھا مبادا اس کا نوٹس لے لیا جائے۔ مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک پسینہ بہانا پڑا آخر میرے باورچی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اسے بتایا کہ میں اکثر بہت دیر سے آتا ہوں۔

میرا کمیونسٹ دوست دانیال لطیفی' جس کو میں پسند کرتا تھا اور جس کا احترام کرتا تھا' ایک اور مجبور' طویل اکتا دینے والی باتیں کرنے والا تھا۔ وہ کبھی اپنی آواز میں تبدیلی نہیں لاتا تھا اور بھنبھناتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک مجھے قریب قریب نیند آ جاتی۔ وہ حس مزاح بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اسے بمبئی میں چوپاٹی پر چہل قدمی کے دوران میں اس کی بیوی سارما کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنائی۔ ساحل سمندر پر گائے کے تحفظ کی کل ہند سوسائٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے کہا کہ بیسویں صدی میں یہ سب کتنا لایعنی لگتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ امریکہ کی گوشت کی صنعت گائے کے تحفظ کو مالی مدد دے رہی ہے تاکہ وہ ہندوستان میں ڈبوں میں بند گوشت بیچ سکے۔ اپنی بیوی کی معصومیت پر ہنسنے کی بجائے دانیال نے بڑی دیانت داری کے ساتھ کہا: ''تم جانتے ہو' اس میں کچھ سچ ہے۔ میں تیز طرار امریکی سرمایہ داروں سے کچھ بعید نہیں سمجھتا ہوں۔''

دانیال اور سارما کچھ وقت کے لیے سجان سنگھ پارک میں ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ حیلہ جو دانیال ایک مسئلہ بن گیا۔ ایسا بہت آسان ہوتا تھا جب میں کھڑکی سے اسے اپنے فلیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھتا تو میں پردے کھینچ دیتا اور اپنے باورچی یا بیرے سے کہتا کہ عقبی دروازے سے جا کر صاحب کو بتا دے کہ میں گھر میں نہیں ہوں اور کئی گھنٹوں تک میری واپسی متوقع نہیں ہے۔ مگر اس وقت فرار کی کوئی راہ نہیں ہوتی تھی جب دروازے کی گھنٹی پر میں

خود جواب دیتا اور وہاں دانیال کو کھڑا ہوا پاتا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے بہت سے ایسے ملاقاتی ہیں جن سے میں ملنا نہیں چاہتا ہوں اور نہیں جانتا کہ ان کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ ''تم اپنے دروازے میں سپائی گلاس کیوں نہیں لگوا لیتے؟'' اس نے پوچھا ''بمبئی کے سارے فلیٹوں میں یہ لگے ہوئے ہیں۔ تم اپنے ملاقاتی کو اپنی سمت سے دیکھ سکتے ہو جبکہ وہ تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔'' اس نے واضح کیا تھا۔ وہ مہربان دانیال تھا جو میرے لیے بمبئی سے ایک لے آیا۔ ہم نے اسے اپنے دروازے میں نصب کروالیا۔ اس انوکھے آلے کا پہلا شکار دانیال کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ جب دروازے کی گھنٹی بجی' میں نے شیشے میں سے دیکھا' اسے باہر کھڑا دیکھ کر پنجوں کے بل لوٹ آیا اور بیرے سے کہا کہ وہ صاحب کو بتائے کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ دانیال نے محسوس کرلیا تھا کہ میں گھر میں تھا مگر اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دوبارہ کبھی مجھے پہلے فون کیے بغیر ملنے نہیں آیا۔ تاہم اس سے پارٹیوں میں اس کی مجھے آ لینے کی اور روہانسا کر دینے کی حد تک بے کیف کر دینے کی خواہش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے اسے آخری مرتبہ فرانسیسی سفارت خانے میں منعقدہ استقبالیے میں دیکھا۔ اپنی پلیٹ بھرنے کے بعد میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ڈھونڈ رہا تھا (وہ ایک کھڑے ہو کر کی کھانے والی تقریب تھی) اور باہر' کیممبرٹ اور ایک گلاس وائن سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں وسکی کا گلاس تھامے دانیال سے ٹکرا گیا۔ میں کبھی نہیں جانتا تھا کہ وہ الکوحل بھی پیتا ہے اور کافی احمق تھا کہ اس سے پوچھ بیٹھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے ممنوع شے کو کیونکر استعمال کر رہا ہے۔ دانیال قرآن اور حدیث کے حوالے دے دے کر ثابت کرنے لگا کہ شراب منع تو ہے لیکن حرام کے طور پر منع نہیں ہے۔ جب وہ مقدس قانون تفصیل سے سمجھا رہا تھا تو لوگ مجھ سے اپنے آپ کو متعارف کروانے' مجھ سے مصافحہ کرنے اور سوال پوچھنے کے لیے آئے۔ ان مداخلتوں کی وجہ سے رکے بغیر دانیال خلیفوں کے جاری کیے ہوئے فتووں اور الٰہیات دانوں اور مسلمان فقہا کی شراب نوشی کو جائز قرار دینے والی آرا کو بیان کرتا رہا۔

میں جس سب سے زیادہ طویل اکتا دینے والی باتیں کرنے پر مجبور باتونی شخص سے ملا وہ تھا ڈنگر پور کا لیفٹیننٹ جنرل نتھو سنگھ۔ وہ اکثر میرے والدین کے ساتھ قیام کیا کرتا تھا۔ چونکہ میرے والدین کے ملنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہوتی تھی اس لیے اسے اپنی خود کلامیوں کے شکار ڈھونڈنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ اور اگر کوئی اردگرد نہ ہوتا تو وہ فون پر دہلی یا دور واقع دوسرے شہروں میں لوگوں سے رابطہ کر لیتا تھا۔ جب وہ وہاں ہوتا تھا تو لائن ہمیشہ مصروف ہوتی

تھی' دفتری کام (ادھر صرف ایک ہی لائن تھی) درہم برہم ہو جاتا تھا اور لمبے فاصلے والی کالوں کا بل بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ چند دوروں کے بعد جب کبھی جنرل ڈنگر پور سے خط لکھ کر پوچھتا کہ کیا وہ اس کے ساتھ قیام کر سکتا ہے میرا باپ اسی وقت آنے والے متوقع مہمانوں کے نام گھڑ کراسے آنے سے روک دیتا۔ میرے والدین کے فوت ہو جانے کے بعد نھو سنگھ نے میرے بڑے بھائی کے گھر کو اپنا گھر تصور کرتے ہوئے عزت بخشنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں بہانے بنا کر اور اپنا ٹیلی فون اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جانا پڑتا تھا۔ وہ فون پر مجھ سے رابطہ کرتا اور پوچھتا کہ کیا وہ آ سکتا ہے۔ باقی خاندان کی طرح میں بھی اس سائیکل کے ہینڈل جیسی مونچھوں اور عسکری رعب داب والے بہادر بوڑھے راجپوت جنگجو کی محبت اور احترام رکھتا تھا۔ میں اس وقت راجیہ سبھا کا رکن تھا اور صبحوں میں پارلیمانی دستاویزات کا مطالعہ کرتا تھا۔ نھو سنگھ پوری توجہ چاہتا تھا۔ اس کی خود کلامیاں بہت سے شعبوں پر محیط ہوتی تھی: سینڈھرسٹ میں گزرے اس کے ایام' برطانوی رجمنٹوں میں اس کے تقرر' جنگیں جو وہ لڑ چکا تھا' عورتیں جن کے ساتھ وہ ہم بستری کر چکا تھا' قوم کی حالت پر اس کی آراء' سیاست اور سیاست دانوں سے اس کی نفرت اور اگر وہ ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تو کیا کیا کام کرتا۔ اس کے خطاب میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا تھا جو مجھے اتنا کہنے کا وقفہ دے کہ مجھے دوسرے ملاقاتیوں سے بھی ملنا ہے۔ اس کی پہلی آمد کے بعد میں نے اپنے بھائی کی بیوی امر جیت کو فون کر کے احتجاج کیا کہ میں ان کے گھریلو مہمان کی باتیں مہذبانہ طور پر سننے میں دو گھنٹے ضائع کر چکا ہوں۔ ''پورا پورا حصہ بٹاؤ'' اس نے جھکتے ہوئے کہا ''وہ ہمارا خاندانی دوست ہے اور ہمیں بوجھ لازماً مساوی طور پر برداشت کرنا ہوگا۔'' تاہم بعد میں وہ اتنی مہربان ضرور تھی کہ مجھے انتباہ کر دیا کرتی تھی: ''جنرل شہر میں ہے لہٰذا دھیان رکھنا۔''

میرا بھائی بھی جلد ہی بہانے بنانے لگ گیا کہ وہ جنرل کا اپنے ساتھ قیام کیوں نہیں کروا سکتا۔ بوڑھے نھو کو مجبوراً اپنے بیٹے (یا شاید اپنے داماد) کے ساتھ رہنا پڑا۔ وہ سجان سنگھ پارک کے قریب ہی رہا کرتے تھے۔ جنرل بظاہر چند منٹ کے لیے میرے اپارٹمنٹ چلا آتا۔ منٹ گھنٹوں میں پھیل جاتے۔ میں اس کی متواتر آمد سے اکتا چکا تھا اور یہاں تک کہ میں نے اس کے رشتہ داروں کو اسے گھر پر ہی رکھنے کے لیے خط لکھنے کا سوچا۔ ایک صبح اس نے مجھے پارلیمنٹ جاتے ہوئے راستے میں آ لیا۔ مجھے اس سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں ایک سوال پیش کر چکا ہوں اس لیے مجھے بروقت پہنچنا پڑے گا۔ ''تم کسی روز مجھے راجیہ سبھا کیوں نہ لے چلتے۔

میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ تم جونی سارا سارا دن کیا باتیں کرتے ہو۔'' اس نے کہا میں نے کہا کہ میں اگلے دن کے لیے اس کا پاس حاصل کرلوں گا اور اسے گھر سے لے لینے پر اصرار کیا کیونکہ میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ وہ وقت سے پہلے آ جائے۔ اس نے وزیٹرز گیلری میں ایک گھنٹہ گزارا۔ اسے اردگرد موجود دوسرے لوگوں کے ساتھ بولنے کی اجازت نہیں تھی اور اسے ایم پیز کی باتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ جب میں طے شدہ وقت پر لابی میں اس سے ملا تو وہ بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ ''یہ تم لوگ کیا اتنی بک بک لگائے رکھتے ہو!'' اس نے کہا تھا ''اس ساری بکواس کی بجائے تم کوئی مثبت کام کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے بولنے پر مجبور لوگوں اور شدید اکتاہٹ پیدا کرنے والوں کے حوالے سے اپنے ''کینہ'' کالم میں ایک مختصر سا سخت مضمون لکھا۔ جنرل نقو نے پیغام پا لیا اور مجھے مزید پریشان نہیں کیا۔

میرے بولنے پر مجبور لوگوں کی ذاتی فہرست میں شاید سب سے اوپر جو شخص تھا وہ تھا تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے سب سے زیادہ دولت مند زمیندار اور کسی زمانے کے پنجاب کے وزیراعلیٰ سر خضر حیات ٹوانہ کا بیٹا نذر حیات ٹوانہ۔ نذر اپنے باپ سے الگ ہو گیا' اس نے ایک ہندو عورت سے شادی کی اور امریکہ ہجرت کر گیا۔ اس نے شکاگو یونیورسٹی کی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی ملازمت حاصل کر لی اور پرکشش پنشن کے ساتھ ریٹائر ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور ہندوستان کی مختلف مذہبی کمیونٹیوں کے مابین پرامن تعلقات اس کا خبط تھے۔ جب وہ پہلی مرتبہ مجھ سے ملنے کے لیے دہلی آیا تو میں نے اس کا اور اس کے خاندان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ میں نے فوری طور پر محسوس کرلیا کہ نذر کو باتوں کے کیڑے نے کاٹا ہوا ہے۔ ''میری بیوی مجھے بتاتی ہے کہ میں بہت زیادہ بولتا ہوں'' اس نے اپنی نہ ختم ہونے والی خود کلامی کے دوران میں کئی مرتبہ کہا۔ اور وہ جملے ادھورے چھوڑ چھوڑ کر دوسری باتیں شروع کر دیتا تھا اور بار بار ایک ہندو پاک دوستی کی تنظیم قائم کرنے کا ذکر کرتا ہے جس کے نتیجے میں ہندوستان میں فرقوں کے مابین ہم آہنگی کو فروغ بھی ملتا۔ یہ سب وہ اپنے باپ کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے کرتا تھا جس نے ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ خوش قسمتی سے دہلی اور لاہور میں (جہاں وہ میرے دیئے گئے منظور قادر یادگاری لیکچر کو سننے آیا تھا) ہر شخص نے محسوس کیا کہ نذر اپنے باتونی پن پر قابو نہیں پا سکتا اور ''بس وی کرا!'' کہہ کر ٹوک دیئے جانے کی پروا بھی نہیں کرتا۔

جیسے ہی محسوس کرو کہ وہ اکیلا ہے تو باتوں پر مجبور شخص سے بچنا ہی بہترین حکمت عملی ہوتی ہے۔ اگر تم اس سے کنی نہیں کترا سکتے تو پھر دیانت داری سے اس کا سامنا کرو۔ میں ماڈرن سکول کے پرنسپل مہندر کپور کے ساتھ کئی برس ایسا ہی کرتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے امریکی طلبا کے دہلی اور ہر دوار کے دوروں میں اور ان کے لیے لیکچرز کا بندوبست کرنے میں مصروف کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو بات دو منٹ میں کہی جا سکتی ہے کپور اسی بات کو بیس منٹ میں بیان کرتا ہے۔ جب وہ فون پر مجھے پا لیتا تو غیر متعلقہ موضوعات پر ادھر ادھر کی ہانکتا رہتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اپنا سکول کس طرح چلا رہا ہے: اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سکول کو بڑی مہارت سے چلا رہا ہے۔ اس سے نمٹنا آسان تھا۔ جب بھی وہ فون کرتا میں اسے بتاتا کہ میرے پاس صرف پانچ منٹ فالتو ہیں اور کیا وہ جتنا ممکن ہو مختصر بات کر سکتا ہے؟ وہ میرا مدعا پا لیا کرتا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ بولنے پر مجبوری کوئی نفسیاتی' پیدائشی' وراثتی یا لگ جانے والی بیماری ہے۔ یہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے اور سٹھیا جانے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بیماری کی شروعات ہوتی ہے جسے بغیر علاج کے بڑھنے دیا جاتا ہے۔ اس کو زیادہ سنجیدگی سے لیے جانے کی ضرورت ہے۔

وہ عورتیں جنہوں نے مجھ پر بھروسے کیے ان کے حوالے سے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اس چیز نے مجھے چکرا دیا ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ تعلق رکھنے کی تھوڑی سی خواہش کے بغیر ایسا کیوں کیا۔ مجھے قطعی طور پر اجنبی عورتوں نے فون کر کے کہا کہ وہ اپنے ذاتی مسائل پر گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ وہ مجھے اپنے ناآسودہ جذبوں' اپنے محبت کے معاملوں' اپنے شادی سے ماورا تعلقات کے بارے میں بتاتی ہیں۔ جب معاملہ عورتوں کا ہو تو میں ایک دلچسپی لینے والے سامع کے ساتھ ساتھ ایک مریض بھی ہوتا ہوں کیونکہ میں ازدواجی عدم موافقت' شادی شدہ جوڑوں کے جنس کرنے کی تعداد' کہاں اور کس طرح وہ ملے' ان کے شادی شدہ آشناؤں اور حاملہ ہو جانے کے بعد اور اس کا علم ہو جانے کے بعد حفاظتی تدبیر اختیار کیے جانے کی کہانیاں سننے کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ انکشافات کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ میں نوجوان غیر شادی شدہ لڑکیوں سے ان کے شادی شدہ مردوں کے ساتھ معاشقوں اور جب ان کی بیویاں گئی ہوتی ہیں تب ان کے ساتھ گزاری ہوئی راتوں کے احوال سن چکا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک غیر شادی شدہ عورت جس سے میں کبھی واقف

نہیں رہا تھا سامان سمیت میرے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے مجھے ایک نوٹ بھجوایا کہ اسے توقع ہے کہ اگلے تین دنوں کے اندر اندر اس کا بچہ پیدا ہونے والا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ پیدائش میرے اپارٹمنٹ میں ہو تاکہ بچہ میری ''مہربان و مشفق موجودگی'' میں اس دنیا میں پہلی مرتبہ آنکھیں کھولے۔

مجھے پاگل اور نیم پاگل لوگ ہمیشہ مسحور کر دیتے ہیں۔ جب کبھی مجھے موقع ملا میں نے لاہور' رانچی' آگرہ اور پونا کے پاگل خانوں کی سیر کی۔ میں کافی تعداد میں اپنے لوگوں کو زیرعلاج پا کر حیران ہوا جنہیں میں پہلے سے جانتا تھا۔ ان سے گفتگو کرنا دشوار تھا۔ تاہم نیم پاگل کچھ وقت کے لیے ہوش مندی سے باتیں کر سکتے تھے اور پھر ایک ایسے زاویے پر مڑ جاتے تھے کہ جہاں میں ان کی پیروی کرنے سے قاصر ہوتا تھا۔

''السٹریٹڈ ویکلی'' کے مدیر کے طور پر میں بعض اوقات ایسے مضامین شائع کر دیتا تھا' جو میری لاعلمی میں' کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچاتے تھے۔ میں نے پارسیوں کے حوالے سے کوئی شے شائع کی تھی جو عموماً ایسی چیزوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ تاہم ان میں سے سبھی نہیں۔ ایک روز ایک پارسی نے مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ بھجوایا اور کسی فوری کام سے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وزٹنگ کارڈ پر ''ایٹم بم'' درج تھا مع ملاقاتی کے نام' عہدے' پتے اور ٹیلی فون نمبر کے۔ میں نے اسے بلا بھیجا وہ پھٹ پڑنے والے مزاج کا حامل چھوٹا سا مضحکہ خیز آدمی تھا۔ ''تم نے پارسیوں کا مذاق اڑانے کی جرأت کسی طرح کی؟'' وہ گرجا۔ ''تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں ایٹم بم ہوں۔ میری ایک نظر ڈالتے ہی تم بھسم ہو جاؤ گے۔'' میں نے معافی مانگ کر اپنے آپ کو یقینی موت سے بچالینا بہترین تصور کیا۔

ریچا نامی شخص سے میری ملاقات زیادہ دلچسپ ہے۔ اپنے فصاحت کے ساتھ لکھے ہوئے خطوں میں اس نے اپنے بارے میں بیان کیا تھا کہ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہے جو ہریانہ میں کسی جگہ ایک گیس سٹیشن چلا رہا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک باطنی ٹی وی ایجاد کیا ہے جس کے ذریعے کوئی شخص ماضی اور مستقبل کے واقعات دیکھ سکتا ہے۔ مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ موجدوں کی حوصلہ افزائی کرنے والا شخص ہونے کے ناطے میں نے اسے جوابی خط لکھا کہ وہ مجھ سے ملے اور اپنی ایجاد ساتھ لے کر آئے۔

ریچا نرم' دھیمی آواز والا چھوٹا سا بےضرر آدمی نکلا۔ میں اس کا داخلی ٹی وی نہیں دیکھ سکا کیونکہ دراصل وہ تو اس کے اندر تھا۔ اس نے خراب صحت کی وجہ سے اپنی قبل از وقت

ریٹائرمنٹ اور اپنی ایجاد کے حوالے سے اس کو تسلیم کیے جانے کی ضرورت کا ذکر کیا۔ ''میں کوئی ''ایرا غیرا'' کام قبول نہیں کروں گا'' اس نے کہا۔ ''کم سے کم ہریانہ کی چیف منسٹرشپ یا مرکزی کابینہ میں سنیئر وزیر بنایا جانا میرا استحقاق ہے۔''

''تم کس طرح ہریانہ اسمبلی یا لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے بغیر ان میں سے کسی عہدے کو حاصل کر سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا اس نے مجھے ایک بلیغ مسکراہٹ سے نوازا یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ میں تقدیر کی پراسرار کارکردگی کو نہیں جانتا۔ ''میں نے پنڈت جی (نہرو) سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے مجھے تم سے ملنے کی ہدایت کی کیونکہ تم واحد ایسے شخص ہو جو مجھے وزیراعلیٰ یا مرکزی کابینہ کا وزیر بنوا سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''پنڈت جی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''مگر پنڈت جی کو تو مرے ہوئے بیس برس ہو چلے ہیں۔''

رہیجا نے مجھے ایک قابل فہم مسکراہٹ سے نوازا اور تبصرہ کیا: ''تو کیا ہوا؟ میں نے اپنے داخلی ٹی وی کے ذریعے اس سے گفتگو کی تھی۔''

''تم نے پنڈت جی سے کب اور کہاں رابطہ کیا تھا؟'' میں نے پوچھا ''آج سہ پہر ہی رابطہ کیا تھا' جونہی میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے نفسیاتی وارڈ سے رخصت ہوا۔''

میں نے محسوس کیا کہ مجھے رہیجا کے ساتھ نرم اور مصالحانہ ہونا پڑے گا۔ میں نے ایک گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ دیر تک اسے بولنے دیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اسے ہریانہ کا وزیراعلیٰ یا مرکزی حکومت میں وزیر اطلاعات ونشریات بنوانے کے لیے اپنی سی بہترین کوشش کروں گا۔

میں دروازے تک اسے چھوڑنے گیا اور اسے سفر بخیر کہہ کر روانہ کر دیا۔ میں نے اپنے سیکورٹی گارڈ کو کہہ دیا کہ اگر وہ دوبارہ آئے تو اسے کہہ دیا جائے کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔

میں رہیجا کو فراموش کر بیٹھا تھا حتیٰ کہ اس کا نام بھی میرے حافظے سے محو ہو گیا تھا جب چھ ماہ بعد اس نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اس کے پاس ایسی معلومات ہیں جو پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیں گی۔ ایک صحافی کسی سکوپ (خاص الخاص خبر) کے لیے اتنا ہی بھوکا ہوتا ہے جتنی کہ کوئی آدم خور شارک مچھلی انسانی گوشت کے مزیدار ٹکڑے کے لیے۔ میں نے اسے فوراً

آ جانے کا کہا۔ جب وہ میرے سامنے بیٹھا تھا فقط تب ہی میں نے جانا کہ یہ تو وہی ریجا ہے' داخلی ٹی وی کا موجد۔ اس مرتبہ میں نے اس کے ساتھ تحمل سے تھوڑا کام لیا اور اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیا بتانا چاہتا ہے۔

''تم سنجے گاندھی کے قریبی دوست تھے' کیا ایسا نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا

''میں اس سے کئی مرتبہ ملا تھا مگر میں اسے اپنا قریبی دوست قرار نہیں دے سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''گھبراؤ نہیں!'' اس نے مجھے تسلی دی ''آج تک کسی کو نہیں پتا کہ وہ کس طرح مرا تھا۔''

''وہ ایک ہوائی حادثے میں مرا تھا اور اس کے ساتھ کیپٹن سکسینہ تھا۔''

''یہ تو ہر کسی کو پتا ہے! وہ دونوں جہاز کے پہاڑیوں میں گرنے سے مر گئے تھے مگر طیارہ گرانے والا کون تھا؟''

''میں نہیں جانتا۔ پائلٹ کی غلطی یا مشین میں کوئی خرابی ہوگی۔''

''ناں'' اس نے شدومد سے کہا ''حادثہ سوچی سمجھی سازش تھا۔''

''مگر کون تھا یہ سازش کرنے والا؟''

''چرچل''

''چرچل؟ وہ تو سنجے سے بہت پہلے مر چکا تھا بھلا چرچل سنجے کو کیوں مارنے چاہے گا؟''

''میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیوں'' اس نے ایک بردبار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''تم جانتے ہو کہ سنجے عورتوں کو پسند کرتا تھا۔ وہ خاص طور پر سفید فام عورتوں کا رسیا تھا۔ چرچل نے اس بات کا بہت زیادہ برا نہیں منایا مگر جب سنجے کی نظریں انگلینڈ کی ملکہ پر پڑنے لگیں تو چرچل بہت پریشان ہوگیا۔ اس نے اسے کہا: ''سنجے! مجھے کوئی پروا نہیں کہ تم کتنی انگریز لڑکیوں کے ساتھ سوتے ہو تاہم تمہیں ہماری ملکہ سے دور لازماً رہنا ہوگا۔ یہ مناسب نہیں ہے۔'' مگر سنجے نے چرچل کی بات پر کان نہیں دھرے اور ملکہ کو ورغلانے ہی والا تھا کہ چرچل نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے سنجے کے جہاز میں گڑبڑ کروا دی تاکہ وہ گر کر تباہ ہو جائے۔''

ریجا دیر تک اس امید میں مجھے تکتا رہا کہ میں اس کے باطنی علم سے بہت متاثر دکھائی دوں گا۔ میں نے معاملے پر غور کرنے کی اداکاری کی اور وعدہ کیا کہ اس بارے میں

اپنے کالم میں لکھوں گا۔ اس مرتبہ رہیجا کا نام میرے ذہن پر نقش رہا۔ میں نے اس کے خطوں اور ٹیلی فون کالوں کا جواب دینا بند کر دیا۔ اسی سال میں نے ''ہندوستان ٹائمز'' میں پڑھا کہ رہیجا ''سورگ کو سدھار گیا'' جیسا کہ ہندوستان میں موت کا عمومی طور پر بیان ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح دلچسپ اور چکرا دینے والا معاملہ ایک نوجوان سکھ کا تھا۔ اس نے مجھے انگریزی میں خط لکھا کہ میں ایک جرمن بینک میں اس کے جمع کروائے ہوئے پیسے ریزرو بینک آف انڈیا کے ذریعے حاصل کرنے میں اس کی مدد کروں۔ اس نے کہا کہ وہ ایران میں پیدا ہونے والا ایک سکھ ہے اور مغربی جرمنی کے ساتھ بہت بڑا درآمد برآمد کا کاروبار کرتا ہے۔ جب عراق ایران جنگ چھڑی تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ہندوستان ہجرت کر آیا۔ اس نے تاکیداً کہا کہ جرمن بینکوں میں اس کے لاکھوں جرمن مارک پڑے ہیں' مگر وہ پیسہ ہندوستان منتقل نہیں کروا پا رہا۔ مجھے یہ بات قائل نہیں کر سکی کیونکہ ہندوستان تو جرمن مارکوں کی آمد کو خوش آمدید کہتا' شاید جرمنوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو۔ میں نے ملاقات کے لیے بلا لیا۔

وہ ایک طویل القامت' دبلا پتلا نوجوان نکلا جسے انگریزی پر عبور تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ اسے اس کا پیسہ نکلوانے سے کون روک رہا ہے تو اس نے میرے سوال کو ٹال دیا اور اپنے گھریلو مسائل بیان کرنے لگا۔ ''میری بیوی جالندھر میں ایک کاروباری (بزنس مین) کے ہاں سٹینوگرافر کی ملازمت کر چکی ہے'' اس نے کہا ''کیا میرے رتبے کے کسی آدمی کی بیوی کا ایک سٹینوگرافر کے طور پر کام کرنا درست ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں'' میں نے تسلیم کیا ''مگر کیا تم اسے اس کی ضرورت کے پیسے فراہم کر رہے ہو؟'' ''میں کس طرح کر سکتا ہوں؟ وہ تو جرمنی میں پھنسا ہوا ہے۔''

''وہ کس طرح اپنے لیے کچھ کمائے بغیر جی سکتی ہے؟''

وہ اپنی بیوی کے مسئلے کو کچھ سمجھتا ہوا دکھائی دیا۔ ''ٹھیک ہے اگر وہ کچھ کما رہی ہے لیکن وہ اپنے آجر کے ساتھ سو بھی رہی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان جرمنی کے بینکوں میں اس کے تصور کے مطابق پھنسے ہوئے پیسے سے زیادہ اپنی بیوی کی بے وفائی سے پریشان ہے۔ ''کیا تم اتفاق نہیں کرتے کہ یہ ایک نہرو کی بیوی کی توہین ہے کہ وہ محض ایک سٹینو کے طور پر کام کرے اور اپنے باس کے ساتھ سوئے۔''

''نہرو؟ وہ نہرو کس طرح ہو گئی؟''

''تم نے میرا خط غور سے نہیں پڑھا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''شاید تم نے خط کے آخر پر میرا نام نہیں دیکھا۔''

میں نے خط پر تیزی سے نگاہ ڈالی۔ اس نے اپنے دستخط کیے تھے فلاں سنگھ نہرو۔

''کیا تمہارا نہرو خاندان سے کوئی رشتہ ہے؟ میں تو نہیں جانتا کہ ادھر کوئی سکھ نہرو ہیں۔''

''میں پنڈت جواہر لال نہرو کا بیٹا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اوہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا بھی تھا'' میں نے جواب دیا ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ تمہارا باپ تھا؟''

''میں نے گولڈن ٹیمپل میں قدیم دستاویزات کو دیکھا تھا۔ وہاں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ میں پنڈت جی کا بیٹا ہوں۔''

''کیا اندرا گاندھی کو اس بات کا علم ہے؟ کیا تم اس سے ملے ہو؟''

''ہاں'' اس نے تسلیم کیا ''میں اس سے ملنے گیا تھا۔ وہ مان گئی تھی کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ تاہم اس نے مجھے کہا تھا کہ جب تک درست وقت نہیں آ جائے میں کسی کو اس بارے میں نہیں بتاؤں۔''

میں نے اس نوجوان سے وعدہ کیا کہ میں جرمنی میں اس کے بینک کھاتے (اکاؤنٹ) کے بارے میں جرمن سفیر سے بات کروں گا۔ ''ہاں' مہربانی کر کے ایسا کرو۔ میں آج سہ پہر گیانی ذیل سنگھ اور چرن جیت سنگھ سے ان کی مدد مانگنے کے لیے مل رہا ہوں۔''

میں نہیں جانتا کہ گیانی ذیل اس نوجون سے کس طرح نمٹا۔ میں نے چرن جیت سے پوچھا جو اس شام مے نوشی کے لیے آیا تھا۔ ''وہ ایک پاگل ہے۔ میں نے تو اسے دو منٹوں کے اندر اندر دفتر سے باہر پھنکوا دیا۔ میرے پاس تمہاری طرح ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔''

میں نے چرن جیت کو انتباہ کیا کہ ظاہری طور پر جو اکثر بے ضرر سنکی دکھائی دیتا ہے وہ شیزوفرینیا کا مریض نکل سکتا ہے جو آسانی سے تشدد پر اتر سکتا ہے۔ آدمی کو دیوانوں اور سر پھروں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے نرم اور مہربان رہنا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

سولھواں باب:

پرماتما سے کُشتی

جب ہم بچے ہوتے تھے تو مذہب کے بارے میں بہت زیادہ سوالات پوچھنے کے حوالے سے ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ آخری گرو نے طے کر دیا تھا کہ سکھوں کو اپنے جسموں کے کسی بھی حصے کے بال نہیں کٹوانے چاہئیں' کوشر (حلال) گوشت نہیں کھانا چاہیے' تمباکو نوشی یا تمباکو کا کسی بھی صورت استعمال نہیں کرنا چاہیے اور یہ اور وہ۔ جو آدمی اپنی ڈاڑھی یا مونچھوں کو تراشتے تھے وہ خود بخود ''پتیت'' کے طور پر ذات سے باہر ہو جاتے تھے۔ رسومات بجا لانا اور عبادت کرنے کا بھی قطعی حکم ہے۔ اگر تم دن میں پانچ مرتبہ تجویز کردہ عبادتیں (نتینم) ادا کرتے ہو تو تم اچھے لڑے ہو' اگر تم ایسا نہیں کرتے ہو تو تم شریر لڑکے ہو۔ چونکہ میں صبح اور شام کی عبادات زبانی کر سکتا تھا اور کبھی گردوارے میں ایک آدھ ''شبد'' بھی گا لیا کرتا تھا اس لیے میں اپنی دادی کا پسندیدہ پوتا تھا۔

جب تک میں پندرہ برس کا تھا مجھے لمبے بال رکھنا پسند تھا۔ اس میں نامردوں والی یا زنانہ سی بات کوئی نہیں تھی۔ ہم جنگ پسند خالصہ مسلک کے ماننے والے تھے اور ہمارے جنگجو گرو قرار دے گئے تھے کہ لمبے بال مقدس ہوتے ہیں۔ جب بال میرے چہرے اور اعضائے تناسل کے اردگرد اگنے لگے تو میں نے ان کی تقدیس کے حوالے سے سوال اٹھانا شروع کر دیا۔ میں اپنے ناف کے نیچے کے بالوں کو صاف کرنے کے لیے بال صفا کریم استعمال کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ ان کے اور بغلوں کے بالوں کے بغیر عورتیں' جیسا کہ سنگ مرمر کے مجسموں میں صورت گری کی گئی تھی' ان عورتوں سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی ہیں' غلیظ تصویری پوسٹ کارڈوں میں جن کی رانوں کے درمیان میں بال جھاڑیوں کی طرح اُگے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا سکھوں کے امتیاز کی یہ خارجی علامات وہ پہلے پکے اصول تھے جن پر میں نے سوال اٹھانے شروع کیے: وہ مجھے اتنے ہی سطحی دکھائی پڑتے تھے جتنے کہ بال جسم پر سطحی ہوتے ہیں' ان میں کوئی روحانی معنویت نہیں ہوتی ہے۔ میں نے خالصہ کی خارجی علامتوں کو اس لیے

برقرار نہیں رہنے دیا کیونکہ وہ میرا ایمان تھیں بلکہ خالصہ برادری کا ایک حصہ رہنے کی خواہش کی وجہ سے رہنے دیا۔ تعلق کے احساس نے مجھے سماجی تحفظ کا احساس دیا تھا' جیسا کہ وہ آج تک دے رہا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں مسلمان مخالف تعصبات بھی ہماری مذہبی پرورش کا ایک حصہ تھے۔ مختلف قسموں کے گوشت کھانے' ختنہ کے مختلف رجحانات وغیرہ کے علاوہ ہمیں سکھوں پر کیے گئے مسلمانوں کے ظلم وستم کی کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ مثلاً ہمارے دو گرو اسلام قبول کرنے کی بجائے اپنی جانیں قربان کر چکے تھے' ہمارے آخری گرو کے چار بیٹوں کو مسلمانوں نے قتل کر دیا تھا' دو کو لڑائی کے دوران' دو کو زندہ دفن کر کے۔ ان کے باپ اپنے پیروکاروں کو نصیحت کر چکے تھے کہ مسلمانوں پر کبھی بھروسہ مت کرنا:

''ترک میت تب کیجئے جب اور جات مرجائے۔۔۔ مسلمانوں کو فقط تب دوست بناؤ جب دوسری ذاتیں فنا ہو جائیں۔۔۔ نتیجتاً خواہ جتنا زیادہ اپنی بستی کے بوڑھے مسلمانوں کو چاچا اور ان کی عورتوں کو چاچی کہتے ہم اپنے اندر بوئے گئے گہرے تعصب سے اپنے آپ کو نجات نہیں دلا پائے تھے۔ میں نے بہت سے مسلمانوں کو دوست بنایا مگر ان میں سب سے زیادہ گہرا دوست منظور قادر تھا' جس کا احترام اور جس کی تعریف میں ہر انسان سے زیادہ کرتا ہوں' اس نے مجھے مسلمانوں سے محبت کرنے والا بنا دیا۔ جس وقت میں نے بمبئی میں زکریا خاندان کو دوست بنایا تو میرے اندر مسلمان مخالف تعصبات مکمل طور پر صاف ہو چکے تھے اور میں اس معصومانہ یقین کا حامل ہو چکا تھا کہ مسلمان کوئی غلط کام نہیں کر سکتے ہیں۔

تعصبات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا رسم اور عبادت کی عادت پر غالب آنے سے زیادہ آسان تھا۔ میں مؤخر الذکر کو کبھی کبھار ترک کر دیتا تھا مگر جسمانی تکلیف میں' خوف میں' جذباتی دباؤ میں یا سہارے کی طلب میں ان کی طرف لوٹ جایا کرتا تھا۔ جب میرے تعلقات میری بیوی کے ساتھ ٹوٹنے کے نزدیک پہنچ گئے تھے اور اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کی نیت مجھے چھوڑ دینے کی ہے تو میں نے ساری رات گردوارہ بنگلہ صاحب میں اس بحران کا سامنا کرنے کے لیے طاقت مانگتے ہوئے گزار دی تھی۔ ٹوکیو میں کئی مرتبہ' جب میں صبح تین بجے اٹھ کر گرو نانک کی مناجاتوں کے تراجم کیا کرتا تھا' میں نے اپنے کندھے پر گرو کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرا وہم تھا تاہم میں نے اس کو بہت سکون عطا کرنے والا پایا۔ جس چیز نے بالآخر مجھے رسومات سے دور کر دیا وہ تھے اکھنڈ پاٹھ۔۔۔ مختلف شرحوں پر لائے گئے

گرنتھیوں کی چوکیوں کا باری باری گرنتھ صاحب کو بغیر رکے پڑھتے چلے جانا۔ یہ پڑھائی رات رات بھر جاری رہتی جبکہ اس خاندان کے افراد جنہوں نے پاٹھ کا اہتمام کیا ہوتا تھا سو گئے ہوتے تھے۔ میرے لیے زیادہ پریشان کر دینے والی بات اس مقدس کتاب سے ایک بت کے طور پر برتاؤ کرنا تھی۔ وہ صبحوں میں ''بیدار کرنے والی'' (پرکاش) اور راتوں کو بستر میں لے جانے والی (سنتوکھ) تھی۔ میری بیوی کے ماں باپ کے گھروں میں، جو کہ غیر عقلی حد تک مذہب سے جڑے ہوئے تھے، عبادت کے کمرے میں جہاں گرنتھ صاحب رکھی ہوئی تھی گرمیوں میں پورے موسم میں ائیر کنڈیشنر چلتا رہتا تھا۔ ایک سکھ جو اچانک دولت مند بن گیا تھا مزید آگے گیا: اپنے عبادت کے کمرے (بابا جی دا کمرہ) کے ساتھ اس نے سنگ مرمر کا پاخانہ تعمیر کروایا۔۔۔ ہندوستانی یا یورپی انداز کا، یہ میں نہیں جانتا۔

کیرتن بھی، جو کہ مجھے بے حد پسند ہے، تجارت بن گیا ہے: راگی مختلف شرحوں سے فی گھنٹہ معاوضہ طلب کرتے ہیں جو ان کی مقبولیت کے حساب سے چند سو بھی ہو سکتا ہے اور چند ہزار بھی۔ گرنتھی، راگی اور جتھے دار عبادت کے ''ٹھیکیدار'' بن چکے ہیں، ان کے قائم دائم رہنے میں اپنے پیوستہ مفادات کے ساتھ۔ ہندو مندروں کی صورتحال اس سے بہتر نہیں تھی جہاں دیویوں کے ''درشن'' کی فیسوں کے درجے ہوتے تھے۔ میں نے ہندوؤں کی زیارت گاہوں مثلاً ہردوار، درناسی، جگن ناتھ پوری، گوہاٹی کا کامکھیا مندر، مدرائی اور جنوبی ہند میں ہر جگہ جو کچھ دیکھا اور تجربہ کیا وہ کسی کو بھی ان کے خلاف کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم سکھ بھی ان کی طرح مذہب کو تجارت بنانے کے راستے پر گامزن ہو چکے ہیں۔

رسومات کو ترک کرنا بہت تکلیف دہ نہیں تھا، مذہب کی بنیادوں کو رد کرنا زیادہ مشکل ثابت ہوا کیونکہ اس کے لیے مجھے اپنے اندر تلاش کرنی پڑی اور ان عقائد پر سوال اٹھانے پڑے جن پر میری پرورش ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا پرماتما حقیقت میں وجود رکھتا ہے؟ کیا اس کے اوتار پرماتما کے مساوی ہونے اور پرستش کیے جانے لائق ہیں؟ کیا پستکوں کا متن حقیقت میں الوہی ہے؟ کیا پرستش گاہیں ان سے ہماری منسوب کردہ پوترتا کی مستحق ہیں؟ کیا پوجا حقیقتاً انسان کو بہتر بناتی ہے؟ اگر میں نے مذہب کے ان پانچ ستونوں کو رد کر دیا تو خلا کو میں کس طرح پر کروں گا؟ کائنات، زمین، زندگی اور فطرت کے قوانین کی وضاحت کس طرح ہو گی؟ عقل اور منطق نے اس سب کو تہس نہس کرنے میں تو میری مدد کی جو میں ساتھ پروان چڑھا لایا تھا مگر انہوں نے وہ سارے جواب جنہیں میں

ڈھونڈ رہا تھا مجھے فراہم نہیں کیے۔ لہٰذا ایک ذاتی مذہب کی تلاش شروع ہوئی۔ اقبال میرے جذبات کو بیان کر گیا تھا ۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر' آپ ہی منزل ہوں میں

یہ عمل منظور قادر کے ساتھ لمبی لمبی بحثوں میں شروع ہوا۔ ہم نے یہ تسلیم کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں' زمین پر ہماری موجودگی کا کیا مقصد ہے اور ہمارے مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا بیتے گی۔ ہمارے پاس پرماتما کی موجودگی کو ماننے کی کوئی معقول دلیل نہیں تھی۔ تاہم منظور نے کائنات کو چلانے والی ایک الوہی طاقت کے امکان کو قطعی طور پر مسترد نہیں کیا۔ یہ انہی بحثوں کے دوران کی بات ہے کہ سرخ گیند والا واقعہ رونما ہوا۔ میں نے اسے ''لاادری'' کے عنوان سے ایک افسانے میں ڈھال دیا تھا۔ ہم لاہور میں بچوں کے ساتھ لارنس گارڈن (اب باغ جناح) میں کھیل رہے تھے جب میری بیٹی کی ایک درخت کی طرف اچھالی ہوئی ایک سرخ گیند اس کی شاخوں میں پھنس گئی۔ میں نے پتھروں اور چھڑیوں سے اسے نیچے گرانے کی ناکام کوششیں کیں۔ ہم نے اسے گمشدہ قرار دے کر چھوڑ دیا اور اپنے بچوں کو آئس کریم کھلانے کے لیے کلب کی طرف بڑھ گئے واپس آتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ گیند وہیں پھنسی ہوئی ہے جہاں پر کہ پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے کسی حد تک غصے سے کہا: اگر یہ گیند نیچے آ گئی تو میں یقین کر لوں گا کہ پرماتما ہے۔'' ہلکی سی ہوا نے شاخوں کو ہلایا اور گیند سیدھی ہمارے ہاتھوں میں آ گری۔ ''اس سے تمہیں سبق سیکھنا چاہیے!'' منظور نے کہا۔ ''تمہیں پرماتما کی موجودگی کے موضوع کو اتنا ہلکا پھلکا نہیں لینا چاہیے۔'' اگرچہ اس واقعے نے مجھے ہلا دیا تھا تاہم اس نے مجھے کوئی سبق نہیں سکھایا۔ میرے لیے یہ خالصتاً ایک اتفاق تھا۔ کسی نے پرماتما کو نہیں دیکھا ہے۔ کوئی بھی سوائے ان گنت اوصاف گنوانے کے پرماتما کی تعریف نہیں کر سکا۔ اسے خالق' تحفظ دینے اور فنا کرنے والے کے طور پر دیکھا جاتا ہے' مہربان اور مددگار' پتا' ماتا وغیرہ وغیرہ۔ انصاف کرنے والے کے ساتھ ساتھ انتقام لینے والا بھی۔ اپنشد نیتی نیتی — یہ نہیں' یہ نہیں کا کلیہ (فارمولا) دہرا کر کوئی مثبت بیان فراہم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک اردو شاعر نے شکست تسلیم کی تھی ۔

تو دل میں تو آتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا تیری پہچان یہی ہے!

میں والٹیئر کی اس دلیل سے زیادہ متاثر نہیں ہوں کہ اگر گھڑی ہے تو کوئی گھڑی بنانے والا بھی ضرور ہے۔ میں چند گھڑی بنانے والوں کو تو جانتا ہوں مگر کسی دنیا بنانے والے کو نہیں جانتا۔ ایک سادہ سے سوال کا سادہ سا جواب کیوں نہیں ہے ــــ اگر پرماتما نے دنیا کو تخلیق کیا تو پرماتما کو کس نے تخلیق کیا؟ جب تک تخلیق کا بنیادی سبب غیر معلوم رہتا ہے تو اس وقت تک پرماتما کی دنیا کو چھ دنوں میں تخلیق کرنے کی پریوں کی کہانیوں کو تسلیم کرنے کے یا جنم، مرگ اور پھر جنم کے خودکار، نہ ختم ہونے والے دائرے کو تسلیم کرنے کی بجائے یہ تسلیم کر لینا زیادہ دیانت دارانہ ہے کہ ہم نہیں جانتے۔ شاد عظیم آبادی نے اس مخمصے کو ایک شعر میں باندھا تھا۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

مجھے دھرم شالہ میں دلائی لاما کے ساتھ تناسخ پر بحث کرنے کا موقع ملا۔ جب اس نے تسلیم کیا، بدھ مت کے ایک پیروکار ہونے کے ناطے، کہ پرماتما کی موجودگی کے حوالے سے اس نے اپنا ذہن کشادہ رکھا ہے تاہم وہ موت کے بعد دوبارہ جنم لینے پر ایمان رکھتا ہے۔ جب میں نے اس سے اس کے عقیدے کا ثبوت مانگا تو اس نے مجھے ان بچوں کی مثالیں دیں جنہیں اپنے پچھلے جنموں کے واقعات یاد تھے۔ میں نے احتجاج کیا: ''یقینی طور پر عزت مآب ان بچگانہ تخیلات کو یقین دلانے والے ثبوت کے طور پر قبول نہیں کر سکتے! ایسا کیوں ہے کہ پچھلے جنموں کی کہانیاں صرف ہندوؤں، جینوں، بدھ مت کے پیروکاروں اور سکھوں کے ہاں ملتی ہیں جو انہیں تصورات کے تحت پروان چڑھتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی کسی مسلمان بچے کو پچھلے جیون کی بات کرتے سنا ہے؟ حتیٰ کہ ہمارے ہاں بھی یہ بارہ برس سے پہلی عمر کے بچے ہوتی ہیں جو اپنے ماں باپ کو پچھلے جنموں میں پہچاننے کی مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو سب فراموش ہو جاتا ہے۔

دلائی لاما بہت اونچی آواز میں ہنسنے لگا تھا ــــ وہ ہنستے ہوئے بدھ کی تجسیم ہے ــــ اور صاف صاف جواب دیا: ''اگر میں تناسخ میں ایمان نہیں رکھتا تو پھر میں اس کام سے خارج ہو جاؤں گا۔''

پرماتما کی موجودگی کے حوالے سے میرے سوالوں کا ایک دلچسپ جواب راج موہن گاندھی کی بارہ سالہ بیٹی سپریا نے دیا تھا۔ میں نے پرماتما اور مذہبی عقیدوں کے حوالے

سے اپنے نظریات و آراء پر مشتمل ایک مضمون لکھا۔ وہ 13/دسمبر 1987ء کو ''انڈین ایکسپریس'' میں شائع ہوا۔ تب سپریا کا باپ مدراس میں اس کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر تھا۔ میں واشنگٹن میں تھا۔ سپریا نے مجھے خط لکھا: ''ڈیئر انکل! میں نے ڈیڈی کے اخبار میں آپ کا مضمون پڑھا۔ تو آپ پرماتما کو نہیں مانتے؟ آپ غلطی پر ہیں! مجھے بتانے دیجیے کہ پرماتما وجود رکھتا ہے۔ وہ ہر روز ہمارے باغ میں آتا ہے۔ وہ میری ممی اور میرے ڈیڈی سے باتیں کرتا ہے وہ مجھ سے اور میرے چھوٹے بھائی سے بھی باتیں کرتا ہے۔ پس وہ ہے!'' میں بچی کی باتوں سے مسحور ہو گیا' میں نے اسے جوابی خط لکھا: ''ڈیئر سپریا! میں یہ جان کر خوش ہوا ہوں کہ پرماتما ہر روز تمہارے گھر آتا ہے۔ اور یہ کہ تمہارے ممی ڈیڈی' کے ساتھ' تمہارے بھائی کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ مگر وہ میرے ساتھ باتیں نہیں کرتا۔ پلیز اس کا ٹیلیفون نمبر تو مجھے بھیج دو۔'' سپریا نے جوابی خط نہیں لکھا۔ تین سال بعد میں اس کے والدین سے دہلی میں ملا۔ انہوں نے مجھے مغموم انداز میں بتایا: ''سپریا پرماتما کو نہیں مانتی۔'' میں خوش تھا کہ میں پرماتما کے دو عظیم ماننے والوں مہاتما گاندھی اور سی۔ راجا گوپال اچاری کی پڑپوتی کو تبدیل کر چکا ہوں۔

ادھر ایسے لوگ ہیں جو ''ان دیکھے ہاتھ'' کے طور پر بیان کیے جانے والے واقعات کو پرماتما کی موجودگی کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بیشتر لوگ معجزانہ بچاؤ کے واقعات سے واقف ہوں گے — تباہ ہو جانے والے جہازوں میں بال بال بچتے ہوئے' زلزلہ آنے سے گھر کی چھت گرنے کی وجہ سے دیگر افراد کی ہلاکت جبکہ ان کے عین اسی وقت گھر سے باہر ہوتے ہوئے۔ ایسے اتفاقات ضرور آدمی کو چکرا دیتے ہیں تاہم انہیں ان دیکھے ہاتھ کو پرماتما قرار دینے کے لیے مثبت شواہد کے طور پر بمشکل ہی لیا جا سکتا ہے۔

پرماتما کے بارے میں بحث کو ختم کرنے والی دلیل یہ ہے کہ اس کی موجودگی پر یقین یقین کرنے والے کو بہتر انسان نہیں بناتا ہے یا یقین نہ کرنے والے کو شیطان نہیں بناتا ہے۔ اسے اعداد و شمار سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ذخیرہ اندوزوں' ٹیکس چوروں' جھوٹ بولنے والوں اور ٹھگوں کی اکثریت پرماتما کو مانتی ہے جبکہ اسے نہ ماننے والا کا ایک عمدہ تناسب متصوفانہ ہے' دوسرے کو تکلیف دینے سے بچنے والوں کا ہے اور جھوٹ نہ بولنے اور فریب نہ کرنے والوں کا ہے۔

کبھی پوٹھوہار میں (اب پاکستان میں واقع ہے) آباد تجارت پیشہ سکھ کمیونٹی سے ایک دلچسپ قول منسوب ہے' یہ کمیونٹی اپنی عیارانہ تاجرانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی رسومات سے اپنی کٹر وابستگی کی وجہ سے مشہور تھی:

جوٹھ وی اسیں بولنے آں
گھٹ وی اسیں تولنے آں
پر سچے پادشاہ
تیرا نام وی اسی لینے آں

(ہم مانتے ہیں کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں ہم کم بھی تولتے ہیں)
تاہم اے بادشاہوں کے حقیقی بادشاہ ہم تیرے نام لیوا ہیں)

میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ پرماتما کا تصور گیس کے ایک غبارے کی طرح ہے جو سچ کی سوئی کے چھونے سے ہی پھٹ جاتا ہے۔ یا شاید یہ مختلف مذہبوں کے مختلف رنگوں والے گیس کے غباروں کا گچھا ہے اور انہیں الگ الگ نام دے دیئے گئے ہیں۔ ان رنگین غباروں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ان میں سوائے گرم ہوا کے کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے اپنے لیے وضع کیے ہوئے مذہب میں اور جسے میں اپنے قارئین کو تجویز کرتا ہوں' پرماتما کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ جو پرماتما کو مانتے ہیں ان کے پاس بھی اسے قادر مطلق اور منصف ثابت کرنے والے جواز تھوڑے ہیں۔ جو ثبوت بھی ہم رکھتے ہیں اس کا الٹ موجود ہوتا ہے۔ کچھ بچے پیدائشی اندھے' یا ذہنی خرابی کا شکار ہوتے ہیں' پرماتما سے ڈرنے والے ماں باپ جنہوں نے زندگی بھر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہوتا اپنے معصوم بچوں کے نقصان کے ذریعے سزا پاتے ہیں۔

پڑھے لکھے ہندوستانیوں کا نیا خبط مراقبہ (میڈی ٹیشن) ہے۔ وہ تمہیں برتری کے اک احساس کے ساتھ بتائیں گے ''میں مندر وندر نہیں جاتا' میڈی ٹیشن کرتا ہوں۔'' اس سرگرمی میں شامل ہے کنول کے آسن میں بیٹھے ہوئے اپنی سانسوں پر قابو پانا' ذہن کو 'بندر کی طرح ایک خیال سے دوسرے کی طرف چھلانگ لگانے'' سے روکنے کے لیے خالی کرنا۔ ''چکروں'' کے ذریعے ''کنڈالنی'' کو ریڑھ کی ہڈی کی جڑ سے ابھار کر کھوپڑی تک کھڑا کرنے کے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی شخص کے اندر کی ناگن پوری طرح تن جائے اور عمل کرنے والا اپنی پہچان کا مقصد حاصل کر لے۔ وہ کہتے ہیں یہ انہیں قلبی سکون (پیس آف مائنڈ) دیتی ہے۔ اگر تم ان سے پوچھو' اور قلبی سکون تمہیں کیا دیتا ہے؟'' تو تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا کیونکہ کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ قلبی سکون تو ایک بانجھ تصور ہے جس میں سوائے قلبی سکون کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے اور اس کا جواز صرف یوں پیش کیا جا

سکتا ہے کہ یہ شدید تناؤ اور منتشر ذہنوں کے لیے ایک تھیراپی ہے۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ تخلیقیت کو بڑھاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ فن اور ادب کے عظیم ترین کارنامے، سائنس کی تمام عظیم دریافتیں انتہائی تحرک زدہ ذہنوں نے کی ہیں۔ علامہ اقبال نے دعا کی تھی ۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

علامہ اقبال ایک لفظ جو اکثر استعمال کرتے تھے ''تلاطم'' تھا، ذہن کی بے قراری، تخلیقیت کی بنیادی شرط۔

☆☆☆

زبردست ارادی کوشش کے بعد میں پوجا پاٹھ کو ترک کر سکا تھا۔ میں نے یہ نعرہ گھڑا تھا: ''کام پوجا ہے مگر پوجا کام نہیں ہے۔''

واحد مذہبی اصول جو میں تجویز کرتا ہوں، وہ ہے ''اہمسا'' —— عدم تشدد۔ درحقیقت یہی پرَمودھرم —— سب سے اعلیٰ دھرم ہے۔ باقی کی اہمیت ثانوی ہے۔

بہت سے ایسے غیر عقلی عقائد ہیں جو کہ مذہبی سرپرستی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ میری فہرست میں سب سے اوپر ہیں علم نجوم، دست شناسی، علم الاعداد اور قدیم متنوں مثلاً بھرگو سمہیتا کے ذریعے مستقبل کی پیش گوئی کرنا۔ تمام ہندو بچوں کے زائچے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ شادیاں زائچوں کو ملانے کے بعد ہوتی ہیں۔ صدیوں کے تجربوں کے باوجود کہ دنیاوی واقعات کو ستاروں کی حرکات سے مساوی کرنے کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے ہمارا علم نجوم میں یقین جوں کا توں ہے۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری جنگ ہار گئے تھے حالانکہ افغانوں سے تعداد میں وہ ایک کی نسبت دس تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سپہ سالار نے اپنی عقل سلیم کو استعمال کرنے کی بجائے راجا جیوتشی کی بات پر کان دھرے تھے۔ 1962ء میں جب آٹھ ستاروں کا سنگم ہوا (اشت گرہ) تو نجومیوں نے اعلان کیا کہ دنیا 3 فروری کو ساڑھے پانچ بجے فنا ہو جائے گی۔ ٹرینیں، جہاز اور بسیں خالی ہو گئیں۔ لوگ اپنے خاندانوں کے ساتھ اپنے گھروں ہی میں رہے۔ ٹنوں کے حساب سے گھی دیوتاؤں کی رضا کے حصول کے لیے ''ہونوں'' میں جلا دیا گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تاہم دنیا کی نظروں میں ہندوستان احمق اور پسماندہ بن گیا۔ کسی ایک نجومی نے بھی اندرا گاندھی یا اس کے بیٹے راجیو کے قتل کی پیشگوئی نہیں کی تھی۔ بہت سوں نے جیسا کہ ان کا معمول ہے، بہت بعد میں دعویٰ کیا۔ میرے دوست چرن جیت سنگھ نے اپنے جتنے بھی زائچے

بنوائے سب اس کی زندگی اکہتر برس سے بتاتے تھے۔ وہ اکیاون برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔ ایک مشہور نجومی، جس کی پیش گوئیاں میں نے "ہندوستان ٹائمز" میں شائع کی تھیں اور وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان جس سے مشورہ کرتے تھے، کی بیٹی کی شادی اس کے ہونے والے شوہر کے زائچے سے اس کا زائچہ ملانے کے بعد ہوئی۔ شادی ایک ماہ کے اندر اندر ٹوٹ گئی۔

پراسرار پجاریوں میں یقین۔ مسز گاندھی شیطانی قوتوں سے لڑنے کے لیے اپنے گھر میں تانتری رسومات ادا کرواتی تھی، راجیو گاندھی کو وزیرداخلہ بوٹا سنگھ اور سپیکر بل رام جاکھر نے ایک درخت تلے ننگا بیٹھنے والے دیوراہا بابا سے آشیرواد حاصل کرنے کے لیے قائل کیا۔ اس نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ان کی پیشانیاں چھوئی تھیں! چند ہفتوں بعد راجیو وزارت عظمیٰ سے ہاتھ دھو بیٹھا، بوٹا سنگھ اور جاکھر کو پارلیمانی انتخابات میں شکست ہوگئی۔ بہت سے وزرائے اعلیٰ بشمول اڑیسہ کا جانکی بلبھ پٹنائک اور آندھرا پردیش کا این۔ ٹی۔ راماراؤ کالا جادو کرواتے ہیں۔ تامل ناڈو کی جے للتا نے روزانہ مشورہ دینے کے لیے نجومی رکھا ہوا ہے۔ بیشتر ہندوستانی سیاستداں بشمول وزیراعظم نرسمھا راؤ "راہوکلم" —— نامبارک ساعت —— خریدتے ہیں۔ نجومیوں کے رسالوں کی سرکولیشن بہت وسیع ہوتی ہے اور چوٹی کے نجومی بے پناہ پیسہ کماتے ہیں۔ "حرام کی کمائی" کے زیادہ قریب ترین سادہ لوح لوگوں کے لالچ سے بنائی ہوئی کمائی ہے۔

صدر گری کے سولہ بچے تھے، وزیراعظم نرسمھا راؤ کے آٹھ، بہار کے وزیراعلیٰ لالو پرشاد یادو، جو ہمیشہ کی طرح ہنوز پرشباب ہے، کے نو بچے ہیں۔ میں نہ صرف ایک بچے کا اصول شادی کے عہد کا اٹوٹ انگ بنادوں گا بلکہ دلہن کے والدین کی حوصلہ افزائی کروں گا کہ وہ اس کے جہیز میں اسے کنڈوم فراہم کریں اور اسے شادی کی رسومات ادا کرنے والا پروہت دعا دے۔

ایک اور روایت جسے مذہبی تقدس حاصل ہو چکا ہے وہ ہے ہندوؤں، سکھوں، جینوں اور بدھ مت کے ماننے والوں میں اپنے مرے ہوؤں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ۔ قدیم زمانوں میں دو طریقوں پر عمل کیا جاتا تھا: لکڑیوں پر رکھ کر مردہ جسموں کو جلانا اور دریا میں بہا دینا (جل پرواہ) آدھی جلی ہوئی لاشوں کو توہم پرستانہ انداز میں دریاؤں میں پھینک دینا آج تک مروج ہے۔ تاہم سب سے عام طریقہ ہے انہیں چتا پر جلانا۔ فقط چند بڑے شہروں میں گیس یا بجلی کے چتا سوز ہیں۔ انہیں قریب قریب مکمل طور پر امیر اور تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے ہیں یا فقیروں

کی لاوارث لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر مردہ جسم کو جلانے کے لیے اوسطاً فی چتا دو کوئنٹل لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دہلی میں روزانہ سو سے زیادہ ہندو' سکھ' جین یا بدھ مت کے پیروکار مرتے ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ جیسے دوسرے بڑے شہروں میں اموات زیادہ ہوتی ہیں۔ حساب لگایا گیا ہے کہ انسانی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے دو کروڑ کوئنٹل لکڑی سالانہ برباد ہو جاتی ہے۔ پہلے سے جنگلات کی کمی کے شکار ملک میں روزانہ پورا پورا جنگل شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں زمین کا کٹاؤ عمل میں آ رہا ہے' ڈیموں میں مٹی بھر رہی ہے۔ مزید گیس یا بجلی کے چتا سوز حل نہیں ہیں۔۔۔ ہمارے پاس انہیں بنانے کے وسائل نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ ہر بستی' قصبے اور شہر کے قریب ہندوؤں' سکھوں' جینوں اور بدھ مت کے پیروکاروں کے قبرستان مسئلے کا حل ہیں۔ ان مذاہب میں لکڑی کے ذریعے لاشیں جلانا کوئی لازمی نہیں ہے۔ جنوبی ہندوستان کی بہت سے ہندو کمیونٹیاں اپنے مرے ہوؤں کو دفناتی ہیں۔ انادورائے اور سی۔ رام چندرن دفنائے گئے تھے۔ سوامی چن مایا آنند رکن پارلیمنٹ اور گیتا کے عظیم فلم ساز کو ان کی کرسی پر بیٹھے ہوئے دفن کیا گیا۔ بہت سے جین مُنی دفنائے گئے ہیں۔ ان کے قبرستانوں کو مسلمانوں یا عیسائیوں کی طرح ''پکا'' نہیں ہونا چاہیے۔ مردے کو جگہ بچانے کے لیے زمین میں کھڑا کرنا چاہیے اور ان کے اوپر کوئی یادگاری ابھار نہیں بنانا چاہیے۔ اس کی بجائے اس مقام پر ایک درخت لگا کر نشانی لگانی چاہیے یا زمین پر ہر پانچ سال بعد زراعت کے لیے ہل چلا دیا جانا چاہیے۔ ساحلوں کے ساتھ ساتھ رہنے والے لوگوں کو اپنے مردے ساحل سے کچھ فاصلے پر ڈبو دینے چاہئیں۔

میں نے اپنی وصیت میں بیان کر رکھا ہے کہ مجھے بغیر کسی مذہبی تقریب کے بہائی قبرستان میں دفن کیا جائے۔ بہائی میری درخواست قبول کر چکے ہیں' اس وعدے کے ساتھ کہ وہ میری روح کی نجات کے لیے اپنی عبادتیں کریں گے۔ چونکہ میں روح کو نہیں مانتا اس لیے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔

ہمیں درختوں کی پرستش کا احیا کرنا پڑے گا۔۔۔ مذہبی عقیدت کے مظاہر کے طور پر نہیں بلکہ ایسی اشیا کے طور پر جنہیں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھنا ہے۔ چپکو تحریک کو مذہبی پشت پناہی دی جانی چاہیے اور فرنیچر یا تعمیری مقاصد کے لیے لکڑی کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے اور اس کی جگہ سنتھیٹک مواد کو دی جانی چاہیے جو وافر دستیاب ہے۔ ہریانہ اور راجستھان کی بشنوئی کمیونٹیوں جیسی کمیونٹیاں موجود ہیں جو درختوں کو کاٹنا اور جانوروں کو ہلاک کرنا ممنوع قرار

دیتی ہیں۔ ان کے معمول کو ہمہ گیر بنا دینا چاہیے۔ جانوروں کو تفریحاً ہلاک نہ کرنے کو مذہبی تقدیس دے دی جانی چاہیے۔ جانور تو ایک دوسرے پر زندہ رہتے ہیں مگر انسانوں کے پاس تو خوراک کے دیگر ذرائع موجود ہیں اور ان کا اپنے جسموں کو جانوروں کے مقبرے بنانے کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

شجرکاری کو ہماری مذہبی رسومات اور تعلیمی نظام کا اٹوٹ انگ بنا دیا جانا چاہیے۔ ہر مونڈن' مقدس دھاگے یا شادی کی تقریب پر درختوں کی ایک مخصوص تعداد کا اگایا جانا لازمی ہونا چاہیے۔ طلبا کو اس وقت تک ڈگریاں یا ڈپلومے نہیں دیئے جانے چاہئیں جب تو وہ درختوں کی ایک خاص تعداد کو اگانے اور نشوونما دینے کے ثبوت مہیا نہ کر دیں۔ مرے ہوؤں کے چھوڑے عطیوں سے شجرکاری کو ترجیح دی جانی چاہیے ــــ مندر' مساجد' سکول یا ہسپتال بنانے پر۔ شجرکاری کو قومی سطح پر ایک عوامی تحریک لازماً بنا دینا چاہیے۔ فقط اس وقت ہی ہم اپنے ملک کو اپنے آباؤاجداد کے زمانوں کی طرح سرسبزوشاداب' صحت بخش اور صحت مند بنا پائیں گے۔ تنہا ریاست اسے نہیں کر سکتی ہے۔ اگر مذہب نے آج کوئی معنویت حاصل کرنی ہے تو اسے اپنی اخلاقی سند ایسی تحریکوں کو فراہم کرنا پڑے گی۔

اس باب میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے وہ میں اپنے بہت سے مضامین اور عوامی تقریروں میں لکھ اور کہہ چکا ہوں۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اگر میں اپنے عقائد پوری تفصیل سے بیان نہیں کرتا تو میری جیون کتھا مکمل نہیں ہوگی۔

سترہواں باب:

ادب اور ادیبوں کے بارے میں

میں پہلے ہی ان حالات پر بات کر آیا ہوں جنہوں نے مجھے قانون سے تعلقات عامہ، تدریس، اور آخر کار صحافت اور ادب کی طرف موڑ دیا۔ مجھے قائل کیا جاتا رہا ہے کہ میں جن ادیبوں کو جانتا ہوں، جنہوں نے مجھے متاثر کیا، ادیب بننے میں کیا صرف ہوتا ہے، کیا لکھنا تفریح ہے اور کیا کوئی اس سے روزی رزق کما سکتا ہے جیسے موضوعات پر لکھوں۔

سکول اور کالج میں اپنی معمولی کارکردگی کے باوجود میں بچپن ہی سے ادیب بننے کا عزم رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں جونیئر سکول میں تھا تو میں نے ایک ناول لکھنے کے لیے ایک نوٹ بک خریدی تھی۔ اس کے پہلے صفحے پر میں نے اس کا عنوان بڑے حروف میں لکھا تھا: ''شیلا از خوش ونت سنگھ'' اس زمانے میں نام شیلا(Sheilla) صرف ایک ایل (L) کے ساتھ لکھے جانے والے عام نام شیلا(Sheila) کی نسبت الٹرا ماڈرن لگتا تھا۔ میں ایتھلیٹ لڑکیوں کا دیوانہ تھا جو اپنے بالوں کو لال ربنوں میں باندھتی تھیں اور لڑکوں کے ساتھ فقرے بازی کرتی تھیں۔ میں نے اس نوٹ بک کو چند روز اپنے پاس رکھا اور شاید اپنی ہیروئن پر چند سطریں بھی لکھی تھیں۔ ''شیلا'' کبھی نہیں لکھا گیا۔

کالج اور انگلینڈ میں انز آف کورٹ میں گزرنے والے پانچ برسوں کے دوران میں لکھنے کی کوشش کرنے کی خواہش زیادہ ٹھوس صورت اختیار کر گئی۔ قانون کی کتابیں مجھے بیزار کر دیتی تھیں مگر فکشن اور شاعری مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ خوش قسمتی سے حافظہ اچھا ہونے کی وجہ سے میں ہندوستان میں یاد کی گئی نظموں میں اضافے کیا کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ شاعری کچھ ایسی شے ہے جو شاعر کے اندر سے پھوٹتی ہے جبکہ نثر نگاری کے لیے وسیع مطالعے اور ذخیرۂ الفاظ کا پس منظر ضروری ہوتا ہے۔ میں نے لغت (ڈکشنری) اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دی اور جو لفظ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا اس کو دیکھا کرتا تھا۔ میں نے دوبارہ بائبل کا مطالعہ

کیا جس سے کہ میں سینٹ سٹیفنز کالج میں متعارف ہو چکا تھا۔ میں نے عہد نامۂ جدید کو کسی حد تک عالمانہ پایا جبکہ عہد نامۂ قدیم کو زیادہ شاعرانہ پایا۔ نغمۂ سلیمانی' زبور' حکایات اور کتابِ ایوبؑ کو میں نے بار بار پڑھا اور ان کے ٹکڑے یاد کر لیے' جن میں کچھ مجھے آج تک یاد ہیں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈھیروں فضول شاعری پڑھ ڈالی: مخمسیں' نرسری کی نظمیں' لیوس کیرول نیز گلبرٹ اور سلیوان کے اوپیرا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک پنجابی گنوار سے درمیانے طبقے (مڈل کلاس) کا ایک انگریز جینٹل مین بنانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ میں ''ٹائمز'' کا کراس ورڈ (لفظی معمہ) بھی حل کیا کرتا تھا' یہ ایک نشہ تھا جس میں مَیں اپنی زندگی کے کئی قیمتی گھنٹے برباد کر چکا ہوں۔ میرے مطالعہ کیے ہوئے بہت سے ناول نگاروں میں دو ناول نگاروں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا: آلڈس ہکسلے اور سمرسٹ ماہم۔ میری خواہش تھی کہ کاش میں ہکسلے کی طرح لفظوں کو ڈھالنا اور ماہم کی طرح قاری کو مسحور کر دینے والی مزاح کی اہلیت حاصل کر لوں۔ تاہم بالکل دیانت داری سے کہتا ہوں کہ مجھے عظیم ادیبوں نے لکھنے کی تحریک نہیں دی تھی بلکہ انگلینڈ اور امریکہ میں شائع ہونے والے دوسرے درجے کے ادیبوں خصوصاً ہندوستانیوں نے تحریک دی تھی۔ میں نے ملک راج آنند' راجا راؤ اور آر۔ کے۔ نارائن کو پڑھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں انہی کے جیسے لکھ سکتا ہوں اور اگر وہ بیرون ملک مشہور ہو سکتے ہیں تو میں نے بھی ہو جاؤں گا۔ میں اپنے بارے میں اندازہ لگانے میں غلط نہیں تھا۔

میں نے انگلینڈ میں اپنے دوسرے تقرر کے دوران میں ادب کو کریئر بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ بہت سے اونچا سوچنے والے ادیبوں کے مانند میں نے مشہور ادیب مرد و خواتین کو دوست بنانے کی کوشش کی اور ان کی کتابوں پر اپنے لیے آٹوگراف حاصل کیے۔ میں نے فرانکوئیس ماریس کے ناولوں کے ساتھ ساتھ اس کی تصویر پر بھی آٹوگراف حاصل کیا تھا۔ میں نے آندرے ژید کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ اس کی خاتون سیکرٹری سے حاصل کیا' میں نے سٹیفن سپینڈر' میری میکارتھی' نارمن میلر' کامپٹن میکنزی' سکیوریل سٹویل' ڈلن ٹامس' روزامنڈ لیہمان' سیموئیل بیکٹ اور کئی دوسروں سے مصافحہ کیا۔ ادیبوں کی یہ پرستش میرے اس ادراک سے چند سال پہلے ہی برقرار رہی کہ ادیبوں کو جاننے سے کسی کو ادیب بننے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ ادب واحد پیشہ ہے جس میں تمہاری مدد تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ادب کی دنیا میں ''گرو چیلا'' کے سمبندھ جیسا کوئی ادارہ وجود نہیں رکھتا۔ ایک ادیب ہی اپنا گرو' چیلا اور حتمی رہنما ہوتا ہے۔

انگلینڈ میں میرے دوسرے تقرر کے دوران میں میری ''سکھوں کی مختصر تاریخ'' اور گرونانک کی صبح کی پرارتھنا کا منظوم ترجمہ شائع ہوا۔ جس وقت میں دہلی واپس آیا تو میرے سامان میں ناول ''مانوماجرا'' (ٹرین ٹو پاکستان) نصف موجود تھا۔ بھوپال میں اسے مکمل کرنے میں مجھے مزید ایک مہینہ لگا۔ میں یہ سب ایک گزشتہ باب میں پہلے ہی بیان کر آیا ہوں۔

میں آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی سروس میں کام کرنے کے دو برسوں میں نرادسی چوہدری، رتھ جھبولا اور منوہر ملگاؤنکر سے واقف ہوا۔ تینوں میرے قریبی دوست بن گئے۔ نراد بابو کی ''ایک غیر معلوم ہندوستانی کی آپ بیتی'' ابھی شائع ہوئی ہی تھی۔ اس نے حکومتی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی کیونکہ اس کو برطانوی سلطنت کے نام معنون کیا گیا تھا، جس سے نراد بابو نے ہندوستان میں موجود ہر قابل قدر شے منسوب کیا تھا۔ میں انگریزی زبان پر اس کے عبور، بنگال دیہاتوں کے اس کے بیان اور ملک کے مسائل کے غیر معمولی تجزیے سے مسحور تھا۔ میں نے تب اس سے دوستی کی جب اسے سماجی طور پر ذات باہر قرار دیا جا چکا تھا۔ اسے دوستوں کی ضرورت تھی اور اس سے دوستی کے لیے بڑھا ہوا میرا ہاتھ تھام لیا۔

نراد بابو جسامت میں بہت چھوٹا تھا، وہ سوٹ اور ٹائی اور اپنے ماپ سے بڑی ایک ناقابل یقین خاکی سولا ٹوپی پہنتا تھا۔ وہ ایک مزاحیہ کردار دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو گلی کے شرارتی بچے ''جانی واکر، جانی واکر'' کہتے ہوئے اس کے پیچھے لگ جاتے تھے۔ وہ بے حد غصیلے مزاج کا بھی حامل تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دفتر کے ساتھی نے اس کو برطانویوں کا بوٹ پالش کرنے والا کہہ کر اس پر ناقابل معافی جملہ کسا تھا۔ نراد بابو ناراض ہو گیا اور اس پر چلایا: ''کتے، کمینے! اپنا جملہ واپس لے ورنہ میں تیرا سر توڑ دوں گا۔'' اس شخص نے جملہ واپس لینے سے انکار کر دیا۔ نراد بابو اس کی میز تک پہنچا اور شیشے کے بھاری پیپر ویٹ سے اس کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ دونوں شکایت کرنے شعبے کے سربراہ مہرا مسانی کے پاس گئے۔ بے چاری مہرا دونوں کو بچوں جیسا سلوک کرنے پر جھاڑنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ نراد چوہدری کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی اور دوسرے کشادہ ذہن ہندوستانیوں کی طرح اس کی صلاحیت اور علمیت کو سراہتی تھی۔ سوزیر اطلاعات ونشریات کیسکر ان میں نہیں تھا۔ جب اس کی توجہ انتساب کی طرف مبذول کروائی گئی تو اس نے نراد چوہدری کو نوکر سے نکال دیئے جانے کے احکامات جاری کر دیئے اور ان اخبارات کو بلیک لسٹ کر دینے کی دھمکی دی جو نراد کے مضامین شائع کیا کرتے تھے۔ نراد جس کے کوئی ذاتی وسائل نہیں تھے اور خاندان کا سہارا تھا،

سخت مشکل حالات سے دوچار ہو گیا۔ مہرا مسانی، رتھ جھبولا اس کے خاوند اور میں نے اس کی دل دہی شروع کر دی۔ ہم نے اسے اور اس کی بیوی کو اپنے اپنے گھر مدعو کرنا معمول بنا لیا۔ وہاں وہ بہت سے غیر ملکی مداحوں سے ملتا۔ ایک ہی کتاب نے اسے مشہور شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے مداحوں میں میرا باپ سوبھا سنگھ بھی تھا جس نے اسے پڑھا نہیں تھا بلکہ مجھ سے اس کے بارے میں سنا تھا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر آتا میرا باپ اسے اپنے باغ میں گلابوں کی دلکش اقسام دکھانے لے جایا کرتا تھا۔ نراد برطانوی خطابات والے افراد کی بہت زیادہ عزت کیا کرتا تھا اور میرا باپ ایک نائٹ تھا۔ اسی طرح میرے باپ نے محسوس کیا کہ اس کے انگریز دوست نراد بابو کے بہت خواہاں تھے اور وہ ہر پارٹی میں توجہ کا مرکز ہوتا تھا۔ ان کی گاڑھی چھننے لگی۔

نراد بہت اشتعال انگیز بھی ہو سکتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ جھبولا خاندان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو اس نے جھب کی ماں بتایا کہ ہندوستانی پارسیوں کو ہم وطن سمجھ کر عزت نہیں دیتے ہیں۔ مما جھبولا، جس کا شوہر میرٹھ سازش کیس میں جیل میں رہا تھا، ضبط کھو بیٹھی اور پھٹ پڑی: ''تم برطانوی خوشامدی تمہیں ہماری حب الوطنی پر انگلی اٹھانے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' وہ پارٹی چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نراد پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنا الزام دہراتا رہا۔

نراد بابو کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ ہر اس آدمی سے زیادہ جانتا تھا جس سے میں کبھی ملا۔ اس کا علم قاموسی تھا۔ خواہ ادب، تاریخ، سائنس، قدرتی مظاہر یا کچھ بھی ہو وہ اس کا علم رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس وقت کے برٹش کونسل کے سربراہ ہنری کروم جانسن کے گھر ایک پارٹی میں مَیں نے ہنری کی بیوی جین کو بتایا کہ میں آج صبح کسی وٹگنسٹائن کہلانے والے عالم کا لیکچر اس کے نظریے ہائیڈرو فلاں فلاں پر سنتا رہا ہوں۔ ''میرا خیال ہے سامعین میں سے کسی نے وٹگنسٹائن کے بارے میں نہیں سنا ہوگا۔'' میں نے یہ ادراک کیے بغیر کہ وٹگنسٹائن فلسفیانہ حلقوں میں ایک لیجنڈ ہے، کہا: ''میں شرط لگاتا ہوں کہ شاید چوہدری کے علاوہ اس کمرے میں کوئی اسے جانتا ہو۔'' میری شرط قبول کر لی گئی۔

جین نے اپنے مہمانوں کے سامنے اعلان کر دیا، وہ سب کے سب علما (سکالرز) تھے۔ کسی نے بھی وٹگنسٹائن کے بارے میں نہیں سنا تھا تاہم نراد بابو نے وٹگنسٹائن کے نظریے پر گفتگو کی۔ اس نے ایک اور ناقابل یقین کارنامہ میرے گھر انجام دیا۔ میں نے آئس لینڈ کے

نوبل انعام یافتہ سلان پائی کو اپنے گھر ڈنر پر بلایا اور چند ہندوستانی ادیبوں کو اس سے ملنے کے لیے مدعو کیا۔ نراد چوہدری پوری شام آئس لینڈ کے نوبل انعام یافتہ ادیب پر لیکچر دیتا رہا۔

نراد بابو اپنی سی عجیب وغریب عادات کا حامل تھا۔ اپنے باغ میں اس نے کیکٹس کی ایک قسم لگا رکھی تھی جو سورج طلوع ہونے پر ایک یا دو گھنٹے کے لیے کھلتی تھی۔ وہ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے لوگوں کو اپنے دور کے علاقے موری گیٹ میں واقع فلیٹ پر مدعو کیا کرتا تھا۔ کاروں کے بیڑے اس جادوئی وقت پر موجود ہونے کے لیے شہر بھر میں اپنے راستے پر اڑ رہے ہوتے تھے۔ وہ لوگوں کو شاذونادر ہی کھانے پر مدعو کرتا تھا کیونکہ اس کی بیوی کو کھانا پکانا پڑتا تھا۔ جب وہ دعوت دیتا تو وہ ایک ناقابل فراموش تجربہ بن جاتی تھی۔ گھر پر وہ ہمیشہ اپنا بنگالی کرتے دھوتی میں ہوتا تھا اور فرش پر پلتھی مار کر بیٹھے ہوئے لکھا کرتا تھا۔ ہر ڈنر پر وہ انگور کی شرابوں کا انتخاب کرتا تھا۔ پہلے تو وہ مہمانوں کو اس خاص شراب کے علاقے' شرابوں اور اس کے خصوصی گلاستوں پر لیکچر دیتا۔ پھر چھوٹے چھوٹے جاموں میں گھونٹ بھر شراب انڈیلتا' یورپ کی جاموں کی صنعت پر معلومات فراہم کرتے ہوئے۔ وہاں کبھی جاموں کو دوبارہ بھرنے کے لیے شراب نہیں ہوا کرتی تھی۔ کھانا بنگالی پیش کیا جاتا تھا۔ چوہدری بڑا گوشت یا سور کھانے کے شوقین تو تھے لیکن ''مچھر جھول'' ـــــ مچھلی کی کڑھی کو ترجیح دیتے تھے۔

نراد بابو سے میری دوستی یک طرف معاملہ تھا۔ وہ گرو تھا' میں اس کا حقیر وعاجز چیلا۔ جب کبھی وہ مجھ سے غیر متفق ہوتا وہ مجھے بے وقوف کہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی اکثر احتجاج کرتی تھی: ''اگر تم اسی طرح کا برتاؤ کرو گے تو تم اپنا واحد دوست کھو بیٹھو گے۔'' میرا اسے کھونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ تھی کہ وہ بھی ایسا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کی کئی کتابوں میں میرے اور اس کے دیگر ہندوستانی مداحوں کے حوالے موجود ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اسے ہندوستان سے محبت ہے مگر وہ ہندوستانیوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جب وہ میکس ملر کی سوانح عمری لکھنے کے لیے انگلینڈ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ ساری زندگی آکسفورڈ میں ہی رہتا رہا۔

رتھ پروار جھبولا کے ساتھ دوستی پہلے پہل بہت دھیرے دھیرے چلی۔ وہ ایک شرمیلی نوجوان یہودی پولش لڑکی تھی۔ جب وہ دلہن بن کر ہندوستان آئی تو ہر ہندوستانی چیز پر فریفتہ تھی' بشمول اپنے ہندوستانی آرکیٹیکٹ شوہر کے۔ اس کی ماں اس کی شادی کے سخت خلاف تھی۔ جب رتھ نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا اعلان کیا تو کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں

نے تبصرہ کیا تھا: ''مگر وہ تو ایک گوئے بھی نہیں ہے!'' وہ ایک دوسرے سے گہری محبت کرتے تھے۔اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ رتھ ہر دوسرے سال حاملہ ہو جاتی تھی: ان کی تین پیاری پیاری بیٹیاں تھیں۔

میں رتھ سے تب واقف ہوا جب میں آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی سروسز کے انگریزی کے شعبے کا انچارج تھا۔ میں نے اسے تقریریں ریکارڈ کروانے کی دعوت دی۔اس نے اچھے سکریٹ لکھے اور کبھی کبھار ہی ایسا ہوا کہ اس کے ریکارڈ کیے ہوئے ٹکڑے دہرانے پڑے۔ان چند منٹوں میں جب وہ سٹوڈیو تک لے جائے جانے اور کافی کا ایک کپ پینے کے لیے میرے کمرے میں آئی تھی تو میں نے اس کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔وہ انتہائی کم گو تھی۔میرا خیال تھا کہ شاید وہ میرے اسرائیل کی حمایت والے مضبوط جذبات تھے (میں انڈو اسرائیل فرینڈشپ سوسائٹی قائم کر چکا تھا) کہ میرے لیے اس کی سرد مہری ختم ہو گئی تھی۔ وہ زبردست صیہونیت پرست(Zionist) تھی۔

جب پہلی مرتبہ وہ اور اس کا خاوند' چودھریوں اور مہر امسانی کے ساتھ میرے گھر ڈنر کے لیے آئے تو وہ دونوں بیشتر شام ایک دوسرے سے چمٹے رہے تھے۔ وہ ایک لیے دیئے رہنے والا شخص تھا اور انہی لوگوں میں سکون محسوس کرتا تھا جن کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔اس کے بعد جب کبھی ہم انہیں ڈنر پر بلاتے ہمیں دوسرے مہمانوں کے حوالے سے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ رتھ کے پہلے دو ناولوں نے اس کے بہت سے غیر ملکی مداحوں کو جنم دیا تھا اور دہلی میں واقع سفارت خانوں کے لوگ اس سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ رتھ کسی جرمن مرد یا عورت سے گفتگو کو دشوار پاتی ہے خواہ وہ نازی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ جب جھبولا موجود ہوتی تو ہماری بیشتر پارٹیاں فقط قریبی دوستوں کے چھوٹے سے حلقے تک محدود ہوتی تھیں۔یعنی مہر امسانی' نراد چوہدری اور بعد میں برطانوی سفیر کی بیوی کیتھرین فری مین۔

رتھ بہت نزدیک بین تھی اور دہلی میں اتنے برسوں سے رہتے ہوئے بھی اسے ہندوستانی بہت تھوڑی آتی تھی۔ اس کے قاری حیرت کرتے تھے کہ وہ اپنے ہندوستانی کرداروں کی اتنی درست صورت گری کرنے اور ان کے مکالموں کو درست لکھنے میں کس طرح کامیاب ہوتی ہے۔ وہ ذاتی طور پر بہت سے نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کو نہیں جانتی تھی' وہ لوگ جن کے بارے میں وہ لکھتی تھی۔ اس کا خاوند ایک اچھا مشاہدہ کرنے والا اور ایک زبردست نقال تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے ذریعے ہندوستانیوں کو دیکھتی اور اس کے کانوں کے

ذریعے سنتی تھی۔

جھبولا گرمیوں میں کئی مرتبہ کسولی آئی اور ہمارے بنگلے راج ولا سے تھوڑی سی دوری پر واقع ایلیسیا ہوٹل میں قیام پذیر ہوئی۔ وہ ہر دوسرے روز ہمارے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کی بڑی سٹیشن ویگن میں دہلی گیا تھا۔ زیادہ تر راستے میں ان کی ایک بچی بیمار رہی اور کار خراب ہوگئی۔ جھب نے پانی پت کے ایک بازار میں اس کی مرمت کروانے کے لیے ایک میکینک کی دکان پر ٹھہرا دیا۔ جلد ہی ہمیں متجسس تماش بینوں نے گھیر لیا۔ جھب ایک خوبصورت اور خوش مزاج دکھائی دینے والا نوجوان آدمی تھا۔ اس کی میم اور اس کی تین پیاری پیاری بیٹیاں ایک عمدہ فیملی پکچر پوسٹ کارڈ بناتے تھے۔ مجھے ان کا ڈرائیور سمجھا جا رہا تھا۔ جھب ہجوم دیکھ کر مشتعل ہونے لگا اور بولا: ''بھائی! یہ کوئی تماشا ہے؟'' کچھ واپس چلے گئے' کچھ وہیں کھڑے رہے۔ جھب کی آواز زیادہ بلند ہوگئی۔ تب کسی نے تبصرہ کیا: ''کوئی ایکٹر معلوم ہوتا ہے۔'' اس بات نے جھب کو تو سخت اشتعال دلا دیا: ''ایکٹر تیرا باپ' ایکٹر تیری ماں' ایکٹر تیری بہن' ایکٹر تری بیٹی۔'' اس کا اثر ہوا ہجوم چھٹ گیا۔

جھبولا کے ناولوں کو زمانی اعتبار سے ترتیب وار پڑھتے ہوئے قاری ہندوستان اور ہندوستانیوں میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو محسوس کرے گا۔ یہ عمل اس کے بہترین ناول ''ہیٹ اینڈ ڈسٹ'' (Heat and Dust) کے ساتھ مکمل ہوگیا' جس کو بُکر ایوارڈ ملا تھا میں نے محسوس کیا کہ ایک وقت تھا کہ جب وہ بھی نراد چوہدری کی طرح انڈیا چھوڑ کر یورپ یا امریکہ میں آباد ہو جانا چاہتی تھی۔ جس وقت اس کے لیے فیصلہ کرنے کا وقت آیا' اس کے چند ناولوں پر مرچنٹ آئیوری ٹیم فلمیں بنا رہی تھی۔ زیادہ تر سیٹ پر تھیں۔ اس کے فلم ساز نیویارک میں رہتے تھے۔ لہٰذا رتھ نے نیویارک کا انتخاب کیا۔ اس وقت تک اس کا شوہر جان چکا تھا کہ وہ عمارتوں کے ڈیزائن بنا سکتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے دہلی کی قدیم یادگاروں کے خاکے فوری کامیابی حاصل کر چکے تھے۔

رتھ نے مجھے نصف یہودی' نصف عیسائی بنگالی انیتا ڈیسائی سے متعارف کروایا جو ایک کاروباری منتظم کی بیوی تھی۔ وہ دو بچوں والی کمزور سی' اچھی دکھائی دینے والی لڑکی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ رتھ سے متاثر تھی اور ان کا یہودی ہونا انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔ دونوں کی تحریروں میں خاص یکسانیت تھی اور انیتا کو بھی اپنے ہم وطنوں سے زیادہ غیر ملکیوں کی طرف سے عزت ملی تھی۔ اس نے ایک گرمیاں کسولی میں گزاریں۔ اس سال وہاں جنگل میں

ایک خوفناک آگ لگی جس نے آگ پکڑ لینے والے چیڑوں سے ڈھکی ہوئی ایک پوری پہاڑی کو بھسم کر دیا۔ کچھ گھر بھی جل گئے تھے۔ انیتا کا ناول ''فائر ان دا ماؤنٹین'' (Fire on the Mountain) اسی تجربے کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ رتھ کی طرح انیتا اپنے یہودی ورثے پر فخر کرتی تھی۔ اس کا ناول ''بام گارٹنرز بمبئے'' (Baumgarter's Bombay) ایک یہودی خاندان کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو میں اپنے دو برسوں کے دوران میں میرے اندر ''ون مین'' لکھنے کا شوق بیدار ہوا جو بعد میں ہندوستان کے جان ماسٹرز کے طور پر مشہور ہوا۔ ماسٹرز کی طرح منوہر (میک) ملگاؤنکر فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ وہ ایک بہت اچھا شکاری تھا اور ٹریول ایجنسیوں سے سیاحوں کو چیتوں کے علاقوں کی سیر کرانے کی اسائنمنٹس لیا کرتا تھا۔ اسے جلد ہی ان خوبصورت جانوروں کو ہلاک کیے جانے پر دکھ ہونے لگا اور اس نے یہ کام چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے ایک افسانہ دکھایا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے کس طرح ایک بہت بڑے خوبصورت مگر احمق نوجوان چیتے کی زندگی بچائی تھی جسے سڑک کے درمیان میں لیٹ جانے کی عادت تھی۔ وہ کسی بھی رائفل سے مسلح آدمی کے لیے بیٹھی ہوئی بطخ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے خبردار کرنے کے لیے اس کے قریب قریب فائر کیے کہ انسان خطرناک جانور ہوتے ہیں اور ان سے فاصلے پر رہنا چاہیے۔ چیتے نے دکھائی دینا بند کر دیا۔ میں نے کہانی کو نشر کر دیا۔ اس کے بعد میک ملگاؤنکر کا کوئی انت نہیں تھا۔ اس کے قلم سے ناولوں کا جھرنا پھوٹ بہا — تیز، جنگجویانہ اور زبردست ڈرامائی۔ انہیں انگلینڈ اور امریتہ میں اچھی پذیرائی ملی۔ مہاراشٹری ہونے کے ناطے اس نے مرہٹہ ہیروز پر کئی تاریخی ناول بھی لکھے۔ کتابیں لکھتے لکھتے میک نے جانا کہ وہ تو ایک سونے کی کان پر بیٹھا ہوا ہے' گو اسے قریب اس کی آبائی زمین میں مینگنیز دریافت ہو گئی تھی۔ اب وہ ایک بڑے باغ اور بڑے نہانے کے تالاب والے وسیع و عریض مکان میں کسی انگریز دیہاتی جنٹل مین کی طرح رہنے لگا۔ اس کے پاس اپنی سکاچ' فینی اور وائن ہوا کرتی تھی جب وہ کتابیں اور اخباروں کے لیے کالم لکھا کرتا تھا۔

میں ہنوز اپنی زندگی کے اسی مرحلے میں تھا جس میں مجھے یقین تھا کہ جو کوئی اچھا لکھتا ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے۔ سو میں ساتھی بریتا کو دوست بنانے گیا۔ وہ اس کا اصل نام نہیں تھا بلکہ بنگالی برہمن نام بھٹا چاریہ کا مخفف تھا۔ میں نے اس کا آٹوبائیوگرافیکل ناول ''ایک ہندوستانی عورت خور کے اعترافات'' (Confessions of an Indian

(Woman Eater) پڑھا' جو کہ انگلینڈ میں چھپا تھا۔ میں نے اتنی زیادہ شہوانی اور اچھی لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں پڑھی تھی جتنی کہ ایک کاسانووا کے جوش جنون کی یہ مہمات تھیں۔ میں نے اپنے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کے کالموں میں اس کی تعریف کی۔ میں نے موقر انگریزی رسالوں مثلاً ''سپیکٹیٹر'' اور ''نیوسٹیٹسمین'' میں بھی اس کی نہایت شگفتہ اور عمدہ الفاظ میں لکھی گئی تحریریں پڑھی تھیں۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ساتھی بریٹا ''سٹیٹسمین'' (کلکتہ اور دہلی) کے لیے کام کرتا تھا اور جن لڑکیوں کے بارے میں اس نے لکھا ان میں سے بیشتر لڑکیاں دہلی کے کافی ہاؤس کے حلقے میں معروف تھیں اور آسانی سے پہچانی جا سکتی تھیں۔ وہ قابل فہم طور پر بریٹا کے ''اعترافات'' سے پریشان تھیں۔ تب وہ لندن میں رہتا تھا' کسی انجینئرنگ یا کیمیکل فرم کے لیے کام کرتا تھا اور شاید ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی یا ویسے ہی اس کے ساتھ رہتا تھا۔

ساتھی بریٹا نے لندن سے مجھے فون کر کے بتایا کہ اس کا ہندوستان آنے کا ارادہ ہے اور اگر میں اسے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کے لیے مضامین کا ایک سلسلہ لکھنے کا کام سونپ دوں تو وہ اپنے ہندوستان کے قیام کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں فوری طور پر ایسا کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے مجھے تاج محل ہوٹل میں اپنے لیے ایک کمرہ مخصوص کروانے کے لیے کہا' میں نے ایسا ہی کیا۔

جس شام وہ پہنچا میں نے اسے اپنے اپارٹمنٹ میں مے نوشی کے لیے مدعو کیا۔ میں نے اپنے بیٹے راہول اور ایک پرکشش پارسی لڑکی ڈینا وکیل کو' جو ٹائمز آف انڈیا گروپ آف پیپرز سے شائع ہونے والے ایک رسالے میں کام کرتی تھی' مدعو کیا۔ ساتھی ایک پست قامت' بکرا ڈاڑھی والا باتونی شخص نکلا۔ جب ہم ہنوز ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اچانک ڈینا وکیل کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا: ''کیا تم کنواری ہو؟''

ڈینا شرمائی نہیں۔ اس نے ایک بار بھی پلک تک نہیں جھپکی اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: ''یہ تو مردوں کو پانا ہوتا ہے'' میں نے جانا کہ ساتھی لوگوں کی توجہ مبذول کروانے کے لیے انہیں دھچکا پہنچانا چاہتا ہے۔

ساتھی نے تاج محل میں ایک ہفتہ بسر کیا اور اپنے دوستوں کی شاہانہ خاطر تواضع کی۔ اپنے قیام کے اختتام پر اس نے بل پر اس نوٹ کے ساتھ اپنے دستخط کر دیئے کہ اسے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کے مدیر کو بھیج دیا جانا چاہیے۔ میں نے اس کی ادائیگی سے انکار

کر دیا کیونکہ ساتھی نے مجھے کوئی مضمون لکھ کر نہیں دیا تھا اور میں نے کمرہ صرف اسی کے نام سے مخصوص کروایا تھا ''ویکلی'' کے نام سے نہیں۔ مثلثی مراسلت ہوٹل' ساتھی اور میرے درمیان کئی ماہ جاری رہی۔ آخرکار ہوٹل کی ڈائریکٹر کیمیلیا پنجابی نے بل منسوخ ہی کر دیا۔

☆☆☆

میں معاصر ادیبوں میں وی۔ ایس۔ نائپال کو بہترین ادیب کا درجہ دیتا ہوں۔ اس کا لکھا ہوا پہلا ناول جو میں نے پڑھا ''اے ہاؤس فار مسٹر بسواس'' تھا۔ اگرچہ میں کبھی کیریبیئن میں نہیں رہا تاہم میں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہاں آباد ہونے والی ہندوستانی نژاد کمیونٹی کا مصدقہ بیان تھا۔ تمام کردار زندہ لگتے تھے اور ان کے مکالمے بہت پرلطف تھے۔ انگریزی ادب کی دنیا میں ابھرتے ہوئے ستارے کے طور پر پذیرائی ہونے کے کچھ عرصے بعد نائپال اپنے آباؤاجداد کی سرزمین کی سیر کرنے کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی' ایک بہت ناخوش دکھائی دینے والی انگریز عورت تھی۔ جس وقت وہ دہلی پہنچے تو جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ اس پر خواب بکھر جانے کی شدید کیفیت میں تھے۔ نائپال کو توقع تھی کہ اس کا ہندوستان کے فرزند کے طور پر استقبال کیا جائے گا اور شاید اس نے اپنی بیوی کو ظاہر کر رکھا ہو کہ اس کو کتنا سراہا جاتا تھا۔ اس وقت تک بہت ہی کم تعداد میں لوگوں نے نائپال کو پڑھا تھا۔

میں ان کا گائیڈ بن گیا۔ میں انہیں اپنے دوستوں کے گھروں میں لے گیا: ان میں سے چند اسے پڑھ چکے تھے۔ اس کی عزت نفس بحال کرنے کے لیے میں اسے کتابوں کی دکانوں پر لے گیا' یہ دکھانے کے لیے کہ اس کے ناولوں کی طلب کتنی زیادہ ہے۔ میں جوڑے کو سورج کنڈ لے گیا۔ فروری کا مہینہ کافی گزر چکا تھا اور دلی کے قدیم شہر کے کھنڈرات کے ساتھ واقع یہ وادی پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی تابش سے دہک رہی تھی۔ ہم نے تغلق آباد قلعے کی اونچی اونچی دیواروں کے نیچے کافی اور سینڈوچز کا ناشتہ کیا۔ قریبی بستی کے بچے ہمیں دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کے کپڑے پھٹے پرانے تھے' ان کی ناکیں بہہ رہی تھیں اور مکھیاں ان کی گندی آنکھوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ اپنے ''ایریا آف ڈارک نیس'' میں نائپال نے سورج کنڈ کے دلفریب منظر کو چار لفظوں میں نمٹا دیا مگر بستی کے میلے کچیلے بچوں کو بہت تفصیل سے لکھا۔ اس نے کشمیر کے زعفران کے کھیتوں کو بھی اسی طرح بیان کیا ـــــ خزاں کے جوبن پر آئے ہوئے کیسو پھولوں کا سرسری حوالہ' رفع حاجت کے لیے اپنے لمبے فرانوں کو اٹھاتی ہوئیں کشمیری عورتوں کا نہایت تفصیلی تذکرہ۔ یوں لگتا ہے نائپال کو گندگی اور غلاظت کا

خبط ہے۔

وہ بہت کم آمیز بھی تھا۔ وہ جسمانی ربط سے کتراتا تھا اور اگر کوئی اسے گلے مل کر خوش آمدید کہنا چاہتا تو وہ اسے دھکیل دیا کرتا تھا۔ اسے تصویریں اتارے جانے سے بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اپنے متواتر دوروں میں اس کو ویسی ہی پذیرائی حاصل ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اسے مدعو کیے جانے کا بہت شوق تھا: اس سے اسے اپنی لکھی جارہی کتاب کا مواد ملتا تھا۔ میں اسے ایک پارٹی میں لے گیا جہاں مجھے ایک مودی نے مدعو کر رکھا تھا۔ ہم پہلے پہلے پہنچنے والوں میں تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ خوبصورت عورتوں کا جھرمٹ لگا ہوا تھا۔ ہم تو ان کے لیے شہد کی مکھیاں بن گئے' صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہ انگریزی نہیں بول سکتی تھیں اور کال گرلز تھیں جنہیں اکتاہٹ کے شکار کاروباریوں کی تفریح کے لیے لایا گیا تھا۔ تاہم ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ میں اسے اور اس کی رفیق کو انیس جنگ کی طرف لے گیا جہاں کابینہ وزیر رام نواس مرتھا بھی موجود تھا۔ مرتھا نے نائپال کی ہر کتاب پڑھی ہوئی تھی۔ وہ شام بہت دھیرج سے گزری۔

کم از کم دو مواقع پر مجھے ''نیویارک ٹائمز'' کے ادبی مدیر نے فون کر کے وی۔ ایس۔ نائپال کا خاکہ لکھنے پر تیار رہنے کے لیے فون کیا کیونکہ اسے توقع تھی کہ اس برس کا نوبل پرائز وی۔ ایس۔ نائپال کو ملنا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس وقت وہ انگریزی میں لکھنے والے کسی رنگ دار شخص کو کبھی یہ انعام نہیں دیں گے۔ برطانوی حکومت نے نائپال کو نائٹ ہڈ عطا کر کے ترمیم تو کر دی تھی تاہم یہ نوبل پرائز حاصل کرنے کے مماثل نہیں تھا۔ نائپال کبھی اپنے نام کے شروع میں ''سر'' (Sir) نہیں لکھتا ہے اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ جب ایک مرتبہ اسے پتا چل گیا کہ اسے نوبل پرائز نہیں ملے گا تو اس کی تحریر کے معیار میں زوال آ گیا۔

ودیا نائپال کے توسط سے میں اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی شِو سے واقف ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وی۔ ایس کے پاس دونوں کے لیے کافی زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ ہم نے کئی مرتبہ اس کی ماں کو کھانوں پر بلایا۔ یہ واضح تھا کہ شِو اس کا پسندیدہ بیٹا ہے۔ میں اسے دہلی کی چند کتابوں کی دکانوں میں لے گیا۔ وہاں وی۔ ایس۔ نائپال کی کتابوں کی صفوں میں نمائش کی گئی تھی مگر شِو کی شاذ ہی کوئی ایک تھی۔ ''تم نے میرے شِو کی کتابیں زیادہ کیوں نہیں رکھیں؟'' اس نے دکانداروں سے دریافت کیا تھا۔ اس کی چند ہی سہیلیاں تھیں اور میرا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کی سیر سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوئی تھی۔

اگرچہ میں شو سے چند ایک مرتبہ ہی ملا (میرا بیٹا اسے زیادہ مرتبہ مل چکا ہے) وہ ہندوستانی ماحول میں اپنے بھائی یا ماں سے زیادہ پرسکون دکھائی دیتا تھا۔ وہ باہر زیادہ آیا جایا کرتا تھا اور آسانی سے دوست بنا لیتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ لندن یا ٹرینی ڈاڈ کی بجائے ہندوستان میں گھر بنانے کو ترجیح دے گا۔

☆☆☆

ایک کرسمس پر گروو پریس کے میرے امریکی پبلشر بارنی روزیٹ نے مجھے گنز برگ کی نظم ''دی ہاؤل'' تحفے کے طور پر بھیجی۔ میں اس کی دھماکہ خیز قوت سے متاثر ہوا اور میں نے شکریے کے خط میں اس سے اس شاعر کے بارے میں مزید پوچھا۔ چند ماہ بعد میں نیویارک میں اپنے دوستوں' کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جان ہیزرڈ اور اس کی بیوی سوسن کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ روزیٹ نے مجھے اپنے ساتھ گرین وچ ولیج میں ایک ریستوراں میں ڈنر کی دعوت دی۔ ایلن گنز برگ اس کا دوسرا مہمان تھا۔

گنز برگ بہت سامی قسم کا' جان بوجھ کر پراگندہ حال اور میلا کچیلا بنا ہوا شخص تھا۔ اس نے مجھے دھچکا پہنچانے کی کوشش کی۔ ''کیا تم مشت زنی کرتے ہو؟ کیا تم ہم جنس پرست ہو؟ کیا تم چرس پیتے ہو؟'' مجھے تو یہ بہت بچگانہ سا لگا۔ اس نے ایک سگریٹ بنایا' تمباکو میں تھوڑا سا سفید پاؤڈر ملایا اور چند لمبے لمبے کش کھینچے اور نتھنوں کے ذریعے دھواں خارج کیا۔ ''کیا تم اسے چکھنا پسند کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں پسند کروں گا'' میں نے جواب دیا ''مگر مجھے دھواں کھینچنا نہیں آتا۔ مجھے تھوڑا سا دو اور میں سونے سے پہلے اس کی آزمائش کروں گا۔'' ہیزرڈ میاں بیوی کے ساتھ واپس آتے ہوئے میں نے گنز برگ کے دئے ہوئے سگریٹ پینے کی کوشش کی۔ مجھے تو فقط کھانسی کا شدید دورہ ہی پڑا — کسی قسم کا کوئی تخیلی تحرک پیدا نہیں ہوا۔ مجھے دھواں اندر کھینچنا نہیں آتا تھا۔

کوئی دو برس بعد گنز برگ اور اس کا بوائے فرینڈ پیٹر اورلووسکی دہلی میں میرے گھر آ پہنچے — دونوں نے کھادی کی قمیصیں' لنگیاں اور چپلیں پہنی ہوئی تھیں' دونوں نے شیو نہیں کی ہوئی تھی' بالوں میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی اور بہت گندے دکھائی دے رہے تھے۔ گنز برگ کو چھوٹے قد اور گہرے رنگ کی وجہ ہندوستانی سمجھا جا سکتا تھا جبکہ اورلووسکی کو لمبا اور خاکستری سنہرے رنگ والا ہونے کی وجہ سے ہندوستانی لباس میں کوئی سکینڈے نیویائی سمجھا جا سکتا تھا۔ مجھے ان کا انتظار کئی مہینوں سے ختم ہو گیا تھا کیونکہ وہ ورناسی' پٹنہ' کلکتہ' میں جتنا ہو سکتا تھا

ہندوؤں کے یاترا استھانوں کی سیریں کرتے پھر رہے تھے۔ وہ سادھوؤں میں رہتے' چلموں میں گانجا پیتے' دریاؤں کے قریب گھاٹوں میں سوتے جہاں قریب ہی لاشیں جل رہی ہوتیں' شاعری کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ لواطت کرتے رہے تھے۔ ابھی ہندوستان دیکھنے کی ان کی خواہش آسودہ نہیں ہوئی تھی جب وہ اپنے ویزوں کی میعاد بڑھوانے کے لیے مدد مانگنے امریکی سفارت خانے گئے تھے۔ قونصیلٹ نے انہیں سرکاری ہدایت کی تھی کہ وہ کسی ہندوستانی شہری سے اچھے کردار کا سرٹیفکیٹ لائیں۔ وہ میرے پاس چلے آئے۔ گنز برگ کے بال لمبے لمبے تھے' ڈاڑھی جنگل کی طرح اگی ہوئی تھی اور اس کے بدن پر بھی بہت بال اگے ہوئے تھے۔ اورلووسکی اپنے دوست کا نوجوان روپ تھا۔ انہوں نے جو دیکھا اور کیا تھا سب مجھے سنایا— ان میں سے کوئی بھی اچھے کردار کے سرٹیفکیٹ کا مستحق نہیں تھا۔ تاہم وہ مجھ سے جو چاہتے میں نے لکھ دیا۔ ہندوستانی حکومت نے ان کے ویزوں کی میعاد میں توسیع کر دی۔ پھر میں نے کبھی گنز برگ یا اورلووسکی کو نہیں دیکھا۔

گنز برگ پرنسٹن آیا تھا جب میں وہاں پڑھا رہا تھا۔ وہ ایک مسلک کا بانی بن گیا تھا اور اس کے خطاب سننے کے لیے بہت بڑی تعداد میں لوگ کھینچے چلے آتے تھے۔ میں نے اس کے ہوٹل فون کیا۔ اس نے بہت پرجوش انداز میں خیر مقدمی کلمات ادا کیے تاہم میں نے محسوس کیا کہ وہ پچھلی ملاقات کا حال بھول چکا ہے۔

حال ہی میں اس نے جو نظمیں ہندوستان میں کہی تھیں پینگوئن (ہندوستان) کو پیش کیں۔ میرے رفقائے کار ڈیوڈ ڈیویڈر اور ضمیر انصاری اسے قبول کر رہے تھے کیونکہ گنز برگ کا امریکی پبلشر انہیں بہت کم قیمت پر پیشکش کر رہا تھا۔ انہوں نے منظوری کے لیے امریکی ایڈیشن مجھے دیا۔ اتفاق (اور خوش قسمتی) سے میری نظر کالی گھاٹ پر لکھے گئے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ گنز برگ نے زبردست جوش و جذبے کے ساتھ لکھا تھا کہ ہندو دیویوں کے ساتھ کیا کرے گا کیونکہ ''وہ سب طوائفیں تھی۔'' میں نے اپنے رفقا کو فون کیا۔ ''اف! میرے خدا!'' انہوں نے اظہار تاسف و حیرت کیا۔ ''ہمیں اس ٹکڑے کو فی الفور خارج کر دینا چاہیے۔'' ہم نے ایسا ہی کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''شیطانی آیات'' شائع کرنے کی وجہ سے پینگوئین وائکنگ کے خلاف مسلمان بنیاد پرستوں کا اشتعال اپنے عروج پر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم گنز برگ کی ہندوستان پر لکھی ہوئی نظموں کے خارج کیے ہوئے اشعار شائع کر دیتے تو وہ پینگوئن ہندوستان' اس کے ہندوستانی مالک ''آنند بازار پتریکا'' کے سرکار خاندان' ڈیوڈ ڈیویڈر

ضمیر انصاری اور میرا خاتمہ ہی رہا ہوتا۔

☆☆☆

کسولی میں بہت زیادہ ادیب نہیں آتے۔ تاہم ایک موسم گرما میں دو مشہور ہندی ناول نگار اوپندر ناتھ اشک اور راجندر یادیو جو کلیان ہوٹل میں قیام پذیر تھے مجھ سے ملنے آئے۔ میں ان کے ناموں سے تو واقف تھا مگر میں نے ان کی کوئی چیز پڑھی ہوئی نہیں تھی۔ وہ دونوں ہندی ادب میں اپنے کارناموں کے بارے میں مجھے بتانے کے بہت مشتاق تھے۔ یادیو کسی حد تک اپنی تعریف کرنے میں قدرے محتاط تھا اور اس نے اپنی بیوی منو بھنڈاری کا حوالہ دیا جو ادیب تھی اور ایک ناول ''مہا بھوج'' لکھ چکی تھی۔ منو بہت شہرت حاصل کر چکی تھی۔ اس کا ناول بیسٹ سیلر ثابت ہوا اور اس پر فلم بنی تھی۔ ایک صبح ناشتے پر اشک نے میری بیوی کو بتایا کہ وہ صرف سات سال کا بچہ ہی تھا جب اسے ادراک ہوا کہ مہا لکھاری بننا اس کا مقدر ہے۔ وہ اچھا افسانہ نگار تھا' اس کے اپنی پہلی بیوی' جس سے وہ چھٹکارہ پانا چاہتا تھا' کے ساتھ جھگڑے مزاحیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظالمانہ بھی تھی۔ اشک نے بہت سے ناول لکھے تھے اور اس نے الٰہ آباد میں اپنا پبلشنگ ہاؤس قائم کیا ہوا تھا۔ شہرت کے باوجود وہ روپے کا سخت حاجت مند رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ڈرامائی طور پر اعلان کیا کہ وہ لکھنا چھوڑ دے گا کیونکہ اس میں پیسہ نہیں ہے اور اس کے بجائے سبزیوں کی دکان کھول لے گا کیونکہ ناول لکھنے سے زیادہ پیسہ آلو گوبھی بیچنے میں ہے۔ اس ڈرامے نے اسے کافی مشہوری دلوا دی تھی۔

ادب کی دنیا میں انکسار کو بہت تھوڑا جانا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی ادیب یورپیوں کے مقابلے میں کم وضعدار ہیں۔ وہ اپنی تعریف کرنے کو گھٹیا پن کی ایک قسم تصور نہیں کرتے۔ علاقائی زبانوں کے ادیب اپنے کارناموں کے بارے میں کھلم کھلا تعریفیں کرتے ہیں۔ اردو زبان کے عظیم ترین شاعر غالب نے شیخی بگھاری تھی کہ درجنوں دوسرے لوگ شاعری لکھ رہے ہیں' تاہم اس کا اسلوب اور سوچ اسے دوسرے سے منفرد بناتے ہیں۔ جدید ادیب اپنی سالگرہ مناتے ہیں' اپنے حاشیہ برداروں سے اپنی تعریفیں کرواتے ہیں اور ابھینندن گرنتھیں (تعریفوں کی کتابیں) شائع کر کے تقسیم کرواتے ہیں۔

انگریزی میں لکھنے والے کچھ ہندوستانی ادیب بھی اپنی تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ زیادہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے' بہت کم سیاستداں اور سول ملازم کتابیں پڑھتے ہیں جبکہ عوامی حافظہ کمزور ہے اس لیے اپنی تعریف خود کرنے سے دلکش فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے

درجے کے ادیب ان لوگوں کے فیصلوں سے اعزازات حاصل کرتے ہیں جنہوں نے ان کی کتابیں پڑھی نہیں ہوتیں۔ وہ سفارتی ذمہ داریاں حاصل کرتے ہیں اور پارلیمنٹ کے ایوان بالا کے لیے نامزد ہوتے ہیں۔ جو لوگ دوسرے درجے کے ادیبوں کی پذیرائی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں انہیں حاسد کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اعزازات کے لیے کنویسنگ معمول بن چکی ہے۔ زیادہ انوکھے تو ہندوستانی ادیبوں کے وہ دعوے ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں کہ انہیں نوبل پرائز کے لیے متوقع ادیبوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس اعلیٰ ترین ادبی اعزاز کا اولین متمنی میرا دوست گووند ڈیسائی تھا۔ اس نے صرف ایک ناول ''آل اباؤٹ ایچ ہیٹر'' (All About H. Hatter) اور ایک منظوم ڈرامہ ''حالی'' لکھا تھا۔ ''ہیٹر'' بلاشبہ حیرت ناک حد تک اچھا ناول تھا مگر میں بمشکل ہی سوچ سکتا تھا کہ کوئی شخص ڈیسائی جتنے مختصر سے تخلیقی کام پر نوبل انعام کا آرزومند ہو۔ اس کے باوجود پیارے گووند نے مجھے پرچا لیا (میں اس وقت لندن میں پریس اتاشی تھا) کہ میں اس کا نام ہندوستانی حکومت کے نامزد ادیب کے طور پر انتخابی کمیٹی کو بھیجوں۔ معاملہ ڈاکٹر رادھا کرشنن' جو اس وقت ماسکو میں سفیر تھا' کو بھجوا دیا گیا۔ اس نے تو مجھے سخت سست کہا۔

ایک برس ایسا ہوا کہ دہلی کے اخبارات کے صفحات اول پر خبر شائع ہوئی کہ ہندی ادیب وتسائن کو' جو اجے کے قلمی نام سے لکھتا تھا' اطلاع دی گئی تھی کہ اسے اس سال نوبل انعام دیا گیا ہے۔ اگلے چند دن کے اخبارات ہندی کو حاصل ہونے والی زبردست توقیر کے تذکروں اور اس کی اس وقت کی بیوی کپل کے انٹرویوز سے بھرے پڑے تھے۔ چند دن بعد اعلان ہوا کہ انعام اسرائیلی ادیب ایگنن کو دیا گیا ہے۔ جب سوال کیا گیا کہ یہ غلط اطلاع کس طرح پھیلی تو وتسیائن میاں بیوی نے معصومانہ وضاحت دی کہ ٹیلیگراف کلرک نے غلطی سے ایگنن کو اجے پڑھ لیا تھا۔ کون سا ٹیلیگراف کلرک' کون سا ڈاکخانہ کسی کو واضح پتا نہیں تھا۔

اپنے تاثر کو چمکانے کی سب سے زیادہ ڈھٹائی والی کوشش ڈاکٹر گوپال سنگھ ڈارڈی نے کی تھی۔ میں پہلے ہی اس کی اپنے بارے میں پھیلائی ہوئی افواہ اور اس سے حاصل کیے ہوئے فوائد کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

چند سال بعد خبریں پھیل گئیں کہ ملیالم شاعرہ کملا داس کو نوبل پرائز کے متوقع حاصل کنندگان کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ خبر بھی تمام اخبارات کے صفحاتِ اول پر شائع ہوئی۔ کملا محض اپنی زبان کی شاعرہ کے طور پر شہرت رکھتی تھی اور اپنی ازدواجی جنسی زندگی کی

بے باکانہ تصویر کشی کے ساتھ ایک آٹو بائیوگرافیکل ناول لکھ چکی تھی۔ وہ ایک اچھا ناول نہیں تھا تاہم اسے وسیع مشہوری حاصل ہوئی تھی۔ میں نے کملا کے نوبل پرائز کے لیے متوقع حاصل کنندگان کی فہرست میں شامل کیے جانے کی خبریں پھیلنے کے حوالے سے لکھا اس جیسی عمدہ عورت کو اپنے آپ کو مشہوری دینے کا لالچ ہونا ہی چاہیے تھا۔ وہ بہت ناراض ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے فون کیا اور فون پر ہی چیخنی چلائی۔ اس کے بیٹے نے مجھے معذرت کرنے کے لیے ایک قانونی نوٹس بھجوایا اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔

بہت سے رسالوں' اخباروں اور ہندوستان میں پینگوئن وائکنگ کا اعزازی ایڈیٹر ہونے کے ناطے نوجوان ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کے لیے جو کچھ بھی تھوڑا بہت میں کر سکتا تھا' کیا ہے۔ جن میں ٹیلنٹ تھا' وہ ترقی کر گئے ان میں سے ایک ایم۔ جے اکبر ہے جو عروج پا کر ''ٹیلیگراف'' کلکتہ کا مدیر بنا' پھر پارلیمنٹ کا رکن بنا اور وہ سیاست اور معاشرتی مسائل پر کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ ایک اور ہے باچی کرکیریا' جسے میں نے بمبئی ڈائنگ (Bombay Dyeing) کے واڈیاؤں پر ایک کتاب کے لیے ہم کار کے طور پر چنا تھا۔ (واڈیاؤں نے متن کو پسند نہ کیا اور اسے شائع نہیں کیا گیا) میں نے اس کا نام ہوٹل کے کاروبار کے مالک ایم۔ ایس۔ اوبرائے کی سوانح عمری کے لیے تجویز کیا تھا' جسے پینگوئن وائکنگ نے شائع کیا تھا۔ رسالوں' ریڈیو اور ٹی وی کے کتابوں کے تبصرہ نگار کے طور پر میں کئی ابھرتے ہوئے ادیبوں کو نمایاں کرنے کے قابل ہوا مثلاً اینتا گھوش' اپمنیو چیٹر جی' گیتھا ہری ہرن' شمع فتح علی' ایلن سیلی' رکن ایڈوانی' رمیش مینن' مکل کیسون اور سب سے بڑھ وکرم سیٹھ۔ میں نے اپنے ''گولڈن گیٹ'' کے تبصرے میں لکھا کہ آخرکار ہندوستان نے بین الاقوامی معیار کے ادیب کو جنم دے دیا ہے جو اپنے ملک کے لیے اعلیٰ ترین کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس کے ناول ''اے سوٹ ایبل بوائے (A Suetable Boy) کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ میری پیش گوئی غلط نہیں تھی۔

امید سے معمور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں اپنی دردسری بھی ہے۔ ادب کی دنیا میں میرے لائے ہوئے لوگوں میں برے نتائج سے دوچار ہونے والی ایک ادیبہ اندرانی ایکتھ۔ گیلٹسین تھی ـــ بہار سے تعلق رکھنے والی ایک بنگالی لڑکی جس کی شادی ایک تبتی شجر کار سے ہوئی تھی جس کی دارجیلنگ کے نزدیک زمینیں تھیں۔ ہم دونوں جرمن سفیر کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے جو کہ گلین برن ٹی ایسٹیٹ میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ہم نے

ایک دوسرے کو خط لکھنے شروع کر دیئے۔ اس نے مجھے اپنی چند نظمیں بھیجیں۔ میں نے صاف صاف اعتراف کرتے ہوئے اسے خط لکھا کہ میں شاعری کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں البتہ اگر وہ کوئی ناول یا افسانے لکھے تو میں اس کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنے خرچ پر اپنی نظمیں چھپوائیں اور انہیں میرے نام معنون کیا۔ میں بہت خوش ہوا اور اس سے اصرار کیا کہ وہ فکشن لکھنے کی طرف توجہ دے۔ اس نے مجھے اپنے ناول ''ڈاٹرز آف دی ہاؤس'' (Daughters of the House) کے ابواب بھیجنا شروع کر دیئے' جسے پینگوئن وائکنگ کے میرے دوست ڈیوڈ ڈیویڈر نے فوری طور پر قبول کر لیا اور انگلینڈ اور امریکہ میں پبلشروں کو فروخت کر دیا۔ اندرانی کے نئے کریئر کا آغاز ہو گیا۔ مگر وہ کامیابی کے لیے پر جوش اور بے صبر تھی۔ وہ فوری شہرت کی خواہاں تھی۔ ایک مرتبہ جب کلکتہ کتاب میلے میں میرے ساتھ تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا: ''کسی نے مجھ سے آٹوگراف کیوں نہیں مانگا؟'' میں نے اسے دلاسا دیا کہ لوگ اس کے کچھ مزید ناول لکھنے کے بعد ایسا کریں گے۔ کتاب میلے آخری چند دنوں میں اس کا دوسرا ناول ''کرینز مارننگ''(Cranes Morning) شائع ہوا (اس کا انتساب بھی میرے نام تھا) ہندوستان میں اس پر عمدہ تبصرے شائع ہوئے اور اسے غیر ملکی پبلشروں نے قبول کیا۔ یہ اس کے نزدیک بہت اچھا نہیں تھا' وہ اپنے آپ کو مشہور دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے کلکتہ کے ''سٹیٹسمین'' کے لیے ہفتہ وار کالم لکھنے کا کام سونپا گیا۔ وہ اس ذمہ داری پر بہت خوش اور پر جوش تھی کیونکہ اس کے بیشتر دوست ''سٹیٹسمین'' پڑھا کرتے تھے۔ اس نے ایک کالم نگار کو مطلوب محنت نہیں کی۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اسے تنبیہہ کی کہ جو کچھ ذہن میں ہو اسے اگل دینا بہت اچھا نہیں ہوا کرتا۔ دو ماہ کے بعد ''سٹیٹسمین'' نے اس کا کالم لینا بند کر دیا۔ اس سے اس کو بہت صدمہ پہنچا۔ عین اسی وقت اس کے اپنے خاندان کے ساتھ تعلقات ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ وہ اپنے بیمار باپ کی دیکھ بھال کرنے کے لیے دارجیلنگ سے چیبا سا (بہار) چلی گئی۔ اس کو فالج ہوا تھا اور اب وہ مفلوج پڑا تھا۔ جب وہ مرا تو وہ اس کے سرہانے موجود تھی۔ اس کے تعلقات اپنی ماں اور بہن کے ساتھ کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ اس کے باپ کی کانوں اور چیبا سا کے گھرپر ان کے درمیان اختلاف تھے۔ مگر اندر ہی اندر کوئی زیادہ سنگین شے اسے گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ میرے نام اس کے خط بہت مختصر ہونے لگے اور وہ مایوسی کی باتیں کرنے لگی۔ پینگوئن وائکنگ اس کا تیسرا ناول قبول کر چکا تھا مگر اس سے اس کی مایوسی میں تھوڑی سی ہی کمی ہو سکی۔ انوکھے اتفاق کے تحت اس ناول کا عنوان تھا

"تھام لو میرا ہاتھ میں مر رہی ہوں" (Hold My Hand I am Dying)۔ ایک صبح وہ اپنے بستر کے ساتھ فرش پر بے ہوش پڑی پائی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس کے شوہر کو کلکتہ سے بلا بھیجا گیا۔ اگلے روز وہ مر گئی' کسی نے اس کا ہاتھ تھاما نہیں ہوا تھا۔

اندرانی نے اپنی موت سے ایک روز پہلے مجھے ایک مختصر سا خط لکھا تھا۔ اس سے اشارہ ملتا تھا کہ کوئی شے اسے پریشان کیے ہوئے ہے۔ میرے پاس یہ شبہ کرنے کا جواز ہے کہ اس نے اپنی جان اپنے ہاتھوں لے لی تھی۔ جب ہر چیز اس کے حق میں جا رہی تھی تو اس نے کیوں اپنے کیریئر کو خود ختم کر لیا؟

ایک امکانی جواب چند ماہ بعد ملا جب پینگوئن وائکنگ کو ایک قانونی نوٹس موصول ہوا کہ "کریز مارننگ" کے بعض حصے چوبیس سال پہلے شائع ہونے والے ایک امریکی ناول سے لیے گئے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ امریکی ناول کے پبلشروں کی توجہ اس طرف مبذول ہونے سے پہلے اسے اپنے قارئین کی طرف سے ادبی چوری کے الزامات والے خطوط موصول ہو چکے تھے۔ اندرانی نے لازماً محسوس کیا ہوگا کہ اس کی بدقسمتی سے کہ اس پر ادبی چوری کا الزام لگے گا اور مشہور و معروف ادیبہ بننے کے اس کے خواب خاک میں مل کر رہ جائیں گے۔ میں نے دونوں ناولوں کے متعلقہ ٹکڑوں کا معائنہ کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے انہیں معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ دوسرے ناول سے لیا تھا۔ یہ بھی بالکل واضح تھا کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ کسی بھی ادیب کی طرح زبان کو بہتر استعمال کر سکتی تھی۔ یہ محض اس کا اضطراب اور بے صبری تھی کہ ناول کو جلد از جلد مکمل کیا جائے جس کی وجہ سے اس نے اتنا احمقانہ خطرہ مول لیا۔ میں اس پر دباؤ ڈالنے کے حوالے سے اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ میں تو اس کو بہت چاہنے لگ گیا تھا۔ وہ میری زیر سرپرستی تھی' میری بیٹی تھی اور میری سویٹ ہارٹ سبھی کچھ تھی۔ میں نے اس کی فریم شدہ تصویر اپنی لائبریری میں لگا رکھی ہے۔

☆☆☆

ادیب بننے کے لیے کیا ضروری ہوتا ہے؟ اول' ایک ادیب بننے کا زبردست جنون۔ جذبہ' محرکہ پیسہ نہیں ہوتا ہے (کوئی کھانے یا پان سٹال یا گیس سٹیشن چلانے میں یا قانون اور طب میں زیادہ پیسہ ہے)' نہ ہی شہرت و مقبولیت کی جستجو: تم اسے زیادہ آسانی سے سیاست یا فلموں کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے تو بیشتر ادیبوں کو واضح نہیں پتا ہوتا کہ انہوں نے ادب کو کیوں منتخب کیا سوائے کس قسم کی داخلی تمنائے بے تاب کے جس نے انہیں اس طرف آنے پر مجبور کیا۔ بیشتر مثالوں میں تو تمنائے بے تاب تب دکھی

پڑ گئی جب ان پر کھلا کہ ادیب بننے کی خواہش کو روبہ عمل لانے میں تو پڑتی ہے محنت زیادہ۔ یہ تمنائے بے تاب بار بار ابھرتی ہے' کچھ لوگ مختصر مضامین لکھ کر' ادھورے افسانے یا ناول لکھ کر شکست تسلیم کر لیتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں کہ ان کے اندر ادیب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بیشتر حساس لوگوں کے اندر شاعری کا ذخیرہ ہوتا ہے جوان کی نوجوانی کے آغاز میں چھلک پڑتا ہے۔ یہ بعد کے برسوں میں بالکل دب جاتا ہے۔ نثر لکھنا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے کلاسیکی اور جدید ادب کا وسیع مطالعہ' وسیع ذخیرۂ الفاظ اور سب سے بڑھ کر کام مکمل ہونے تک صبر کی قوت درکار ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ سخت محنت کی اہلیت' خالی کاغذ کو سامنے رکھے گھنٹوں بیٹھے رہنے کی صلاحیت' اس کو تحریر سے پر کرنے تک نہ اٹھنے کا پختہ عزم ہونا چاہیے۔ کاغذ کو تم جس تحریر سے پر کرتے ہو ممکن ہے اس میں بہت کچھ بے کار ہو' کچرا ہو تاہم ضبط قیمتی ثابت ہو گا۔ جلد ہی تحریر موثر ہو جائے گی' جلد ہی ادیب کے اندر کی بہترین شے کا اظہار ہونے لگے گا۔ میرا یقین ہے کہ روزانہ ڈائری لکھنا ایک فائدہ مند عمل ہے۔ دوستوں کو لمبے لمبے خط لکھنا بھی ایک اچھی ریاضت ہے۔ اخباروں کے لیے باقاعدگی سے کالم لکھنا اور کسی مقررہ تاریخ کی پابندی کرنا اچھا ضبط و نظم (ڈسپلن) ہے۔ چند دنوں کے لیے لکھنا ترک کر دینے کے نتائج کسی حد تک تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

مجھے ادب سے کیا حاصل ہوا؟ میں جن اخباروں اور رسالوں میں کالم لکھتا ہوں ان سے کافی پیسہ حاصل ہوتا ہے۔ اپنی کتابوں سے میں نے زیادہ پیسہ نہیں حاصل کیا ہے۔ تاہم ان دونوں سے حاصل ہونے والی آمدنی نے مجھے ٹیکس ادا کرنے والوں کے اونچے درجے میں شامل کروا رکھا ہے۔ میرا مسئلہ آمدنی (انکم) نہیں بلکہ انکم ٹیکس ہے۔ پیسے سے زیادہ طمانیت و آسودگی ہے کہ بہت سے لوگ مجھے پڑھتے ہیں اور میں ہندوستان میں کہیں بھی جاؤں مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ عظیم شخصیت ہونا ایک خمار آگیں تجربہ ہو سکتا ہے۔ تاہم پیسے یا شہرت سے زیادہ یہ آسودگی کا احساس ہے جو ادب نے مجھے دیا ہے۔ میں نے اسے قانون کی پریکٹس کرتے ہوئے' سفارت یا تدریس میں حاصل نہیں کیا' میں اسے ہر روز بہت زیادہ لکھنے سے حاصل کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے میں اس وقت تک ایسا ہی کرتا رہوں گا جب تک کہ میرے ہاتھ سے قلم (Pen) گر نہیں جاتا۔

❁ ❁ ❁

اٹھارہواں باب

آخری مگر واحد باب

میں نے اپنی آپ بیتی کے پہلے باب میں واضح کیا تھا کہ میں نے کن وجوہات کے تحت محسوس کیا کہ اسے تحریر کیا جانا چاہیے۔ میں اسے بڑے سکون کے ساتھ دھیرے دھیرے لکھ رہا تھا مجھ سے کم عمر میرے تین دوستوں کی اچانک موت نے مجھے انتباہ کیا کہ مجھے تیزی سے کام کرنا چاہیے یا یہ ادھوری لکھی ہوئی ہی رہ جائے گی۔ چونکہ میں خالصتانی دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ پر بھی ہوں چنانچہ میرا انجام میری توقع سے بھی جلدی ہوسکتا ہے۔ میں ہرجندر سنگھ جندا سے دو مرتبہ بال بال بچا تھا۔ پونا میں جنرل ویدیا کو قتل کرنے کے بعد وہ مجھے مارنے کے لیے دہلی واپس آیا۔ وہ میرے اپارٹمنٹ آیا' اس نے میرے باورچی سے پانی کا ایک گلاس مانگا اور میرے کمرۂ نشت (سٹنگ روم) پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر اس نے کسولی تک میرا تعاقب کیا۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو خفیہ نگرانی میں محسوس کیا اور دہلی واپس جا کر میرے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ پکڑا گیا اور ویدیا کو قتل کرنے پر اسے پھانسی دی گئی۔ میرے اپارٹمنٹ کا ایک پلان اس نے ذاتی طور پر بنایا تھا۔ تفتیش کے دوران میں اس نے اعتراف کیا کہ اسے خالصتان کے دشمن کے طور پر مجھے قتل کردینے کی ہدایات ملی تھیں۔ میں ایک آسان نشانہ تھا اور میرے قتل سے انہیں کچھ مشہوری مل جاتی جس کی دہشت گردوں کو شدید ضرورت تھی۔ علامہ اقبال نے زندگی کے ناقابل پیشگوئی ہونے کو ایک خوبصورت قطعے میں پیش کیا ہے:

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں [1]

---

[1] خوش ونت سنگھ کو سہو ہوا ہے' نہ تو یہ قطعہ ہے اور نہ علامہ اقبالؒ کی تخلیق ہے۔ یہ ایک شعر ہے اور اس کے خالق مرزا غالب ہیں۔ (اردو مترجم)

تینوں دوست 1990ء میں فوت ہوئے۔ پہلا سیتندر سنگھ تھا۔ جیسا کہ کلیشے ہے' وہ ہر اعتبار سے جیون سے بڑا انسان تھا۔ وہ چھ فٹ لمبا تھا' اپنے چھدری ڈاڑھی والے گالوں سے لے کر پیٹ تک پھولا ہوا تھا۔ اس کی آواز بہت اونچی تھی اور وہ بہت زیادہ فحش لطیفے سنایا کرتا تھا۔ واقعات' تاریخوں اور شخصیات کے لیے وہ کمپیوٹر جیسی یادداشت کا حامل تھا۔ اس کے پاس اردو شاعری کا ناقابل یقین حد تک وسیع ذخیرہ تھا۔ وہ زبردست مے نوش تھا اور اگر اس کے استعمالات کا یقین کیا جا سکے تو وہ شیمپئین سے گویا زنا بھی کرتا تھا۔

وہ چند گھنٹوں ہی میں ڈیڑھ بوتل رم پی سکتا تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولنے والا' باتونی' جھگڑالو اور تشدد پر مائل شخص تھا۔ وہ انتہائی گداز دل اور جذباتی بھی تھا۔ اس کے یہ سب خواص اس کی بیوی کے جانے کے بعد نمایاں ہو گئے تھے' جو ایک بہت خوبصورت عورت تھی اور اس سے مار کھانے کے بعد دو بیٹیوں سمیت اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ تو کچل کر رہ گیا تھا۔ وہ چڑچڑا اور منتقم مزاج ہو گیا۔ میں نے اسے قائل کیا تھا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ تاہم میں اسے شراب کم کرنے کا قائل نہیں کر سکا۔ میں نے اسے کچھ افیئرز قائم کرنے کے لیے حوصلہ افزائی دی اور کچھ تعلقات کو کم کرنے کی تاکید کی تھی تاکہ اس کی خود کو پہنچائی گئی اذیت کم ہو سکے۔ میں اس سے آخری مرتبہ اپنی کتاب ''نیچر واچ'' (Natuer Watch) کے اجرا کے لیے منعقد کی گئی رولی بکس کی تقریب میں ملا تھا۔ وہ ہوٹل تک لفٹ لینے کے لیے میرے گھر آیا تھا۔ اس میں سے الکوحل کی بدبو آ رہی تھی۔ مجھے اپنی کار کا ایئر کنڈیشنر بند کرنا پڑا تھا اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکیوں کے شیشے نیچے کرنے پڑے تھے۔ میں نے تقریب میں اسے ایک گروپ سے دوسرے کی طرف جاتے ہوئے' سکاچ کے گلاس خالی کرتے ہوئے اور اپنی جان پہچان والی عورتوں سے گلے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب ہمارے رخصت ہونے کا وقت آیا تو میں نے اسے ساتھ آنے کا کہا۔ ''نہیں'' اس نے قطعیت سے کہا تھا ''میں روی اور مالا سے لفٹ لوں گا۔''

اگلے روز ہم صبح سویرے کی گاڑی سے کسولی روانہ ہو گئے۔ اور اس سے اگلے دن میں نے چندی گڑھ کے ''ٹریبیون'' میں اس کے مرنے کی خبر پڑھی۔ جب میں دہلی واپس آیا تو میں نے اپنی بیٹی مالا سے تفصیلات حاصل کیں۔ پارٹی کے بعد' وہ اتنا زیادہ نشے میں تھا کہ سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور روی اسے اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچا کر آئے۔ اگلی صبح جب اس کا نوکر چائے کا کپ لے کر اس کی خواب گاہ گیا اور اس کے دروازے

پر دستک دی تو اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دو تین مرتبہ دستک دی اور پھر پریشان ہو گیا۔ اپنے آقا کے جن واحد دوستوں کو وہ جانتا تھا ہم تھے۔ وہ ہمارے اپارٹمنٹ پر پہنچا اور قسمت سے اسے میری بیٹی وہاں ملی۔ اس نے سیتندر کے بہنوئی اندر ملہوترا کو فون کیا۔ دونوں نے اس کی خواب گاہ کا دروازہ توڑ کر اندر جانے کے لیے پولیس کو بلایا۔ وہ مرا پڑا تھا۔ رم کی ایک آدھی خالی بوتل اس کے بستر کے نیچے پڑی تھی۔ سیتندر ہماری زندگیوں میں گہرا سناٹا چھوڑ گیا۔

چرن جیت مجموعی طور پر مختلف کردار کا حامل تھا۔ اسے اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں خوش قسمتی ملی تھی جو ایک فرنیچر ساز' عمارت ساز اور ہندوستان میں کوکا کولا کا مالک تھا۔ چرن جیت چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ وہ لندن میں سلے ہوئے مہنگے سوٹ پہننے کا شوقین تھا اور مہنگی خوشبوئیں استعمال کرتا تھا۔ وہ کاروں کے ایک بیڑے کا مالک تھا ـــ کئی ٹویوٹا' ایک مرسیڈیز اور ایک رولز رائس۔

اس کے دوست اسے بے بی کہا کرتے تھے۔ اس نے ایک غیر معمولی حد تک حسین وجمیل لڑکی ہر جیت کور سے شادی کی تھی۔ اس کی عرفیت ببلز تھی کیونکہ وہ ہر وقت قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اگرچہ وہ اپنے باپ کے دو بیٹوں میں چھوٹا تھا تاہم اسی نے خاندانی کاروبار کو سنبھالا اور اسے وسعت بخشی۔ وہ سیاسی عزائم بھی رکھتا تھا۔ نئی دہلی میونسپل کمیٹی کا صدر بننے کے بعد اس نے مسز گاندھی اور اس کے خاندان کو دوست بنا لیا۔ وہ انہیں جب ضرورت پڑتی ہر مقصد کے لیے اور ہر موقع پر کاریں اور پیسہ فراہم کیا کرتا تھا۔ اسے جنوبی دہلی کی پارلیمنٹ کی نشست کے لیے انتخاب لڑنے کی خاطر کانگرس کی ٹکٹ دی گئی تھی۔ اور وہ پارلیمنٹ کا رکن بن گیا تھا۔ ہمارے خاندان ایک دوسرے کو دہلی میں آباد ہونے کے وقت سے جانتے تھے۔ ہم انہیں نو دولتیے تصور کرتے تھے اور وہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ دولت کمانے میں ہم سے زیادہ ہو گئے تھے۔

چرن جیت سے میرے ذاتی تعلقات 1984ء میں مسز گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں ہونے والے سکھ مخالف تشدد کے بعد قائم ہوئے تھے۔ چرن جیت نے سب سے بدترین نقصان اٹھایا تھا: مشتعل ہندو بلوائیوں نے اس کے کمپا کولا کے تین پلانٹ تباہ کر دیئے تھے۔ اس امر کے واضح ثبوت تھے کہ ان غنڈوں کو مشروبات بنانے والے اس کے رقیبوں نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ چرن جیت کو نئے سرے سے سب کچھ شروع کرنا پڑا تھا۔ اس نے نئی مشینری

درآمد کرنے کے لیے لائسنس حاصل کیے۔ جب وہ بمبئی پہنچی تو کسٹمز والے اس کے اجرا میں تاخیر کے لیے ایک کے بعد ایک تیکنیکی اعتراض اٹھانے لگے۔ اس مرتبہ بھی اس کے کاروباری حریف نے عملے کو اجرا میں تاخیر کرنے کے لیے رشوت دے دی تھی تاکہ اسے شمالی ہندوستان میں کمپا کولا کی مارکیٹ پر قبضہ کرنے کا وقت مل جائے۔ چرن جیت کی نئے وزیراعظم راجیو گاندھی سے مل کر کلیئرنس کے احکامات حاصل کرنے کی کوششیں رنگ نہیں لاسکی تھیں۔ وہ اس وقت راجیہ سبھا میں موجود تھا جب نومبر 1984ء کے قتل عام میں متاثر ہونے والے خاندانوں کے لیے بیرون ملک رہنے والی سکھ کمیونٹیوں کی طرف سے بھیجے گئے کمبلوں' سوئیٹروں اور دیگر گرم کپڑوں کی ریلیز کا سوال اٹھایا گیا۔ میں ایک گزشتہ باب میں بیان کر آیا ہوں کہ وہ چیزیں کس طرح ریلیز ہوئی تھیں۔ مباحثے کے بعد چرن جیت لابی میں مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔

''تم میری مشینری چھڑوانے میں میری مدد کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے پوچھا

میں نے اپنی سی بہترین کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ کوئی دو دن بعد وزیراعظم نے تشدد سے متاثر ہونے والے سکھوں کی بحالی کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر تبصرے کے لیے اپنی کابینہ کے سینئر اراکین اور حزب اختلاف کی جماعتوں کے کچھ اراکین پارلیمنٹ اور لیڈروں سے مشاورت کے لیے ایک میٹنگ کی۔ چرن جیت کے دوست کے طور پر مشہور رانی کرشنن سمیت دوسروں کے ان انتظامات پر اطمینان کا اظہار کرنے کے بعد میں نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی سنا جائے۔ میں نے وزیر داخلہ بوٹا سنگھ کے بیان سے اختلاف کیا اور چرن جیت کے ساتھ سرکاری افسروں کی ناانصافی کو واضح کرنے والی دستاویزات ثبوت کے طور پر پیش کیں۔ اسی سہ پہر چرن جیت کو مشینری کی کلیئرنس مل گئی۔ وہ شام کے وقت ایک بڑے گلدستے کے ساتھ مجھے ملنے کے لیے آیا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے اپنا کام کرنے کے لیے دوسرے اراکین پارلیمنٹ کو بڑی بڑی رقمیں دی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم پیسا قبول کرتے ہو تو میں بہت پہلے ہی تمہیں دے چکا ہوتا۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

اس کے بعد چرن جیت خاندان ہمارے گھر باقاعدہ آنے والوں میں شامل ہو گیا۔ وہ اچھا کھانا اور عمدہ شرابیں پسند کرتا تھا' میرے گھر میں اسے دونوں ہی میسر ہوتے تھے۔ وہ ہماری مہمان نوازی کے جواب میں' ہمیں اپنے گھر منعقد ہونے والی تقریبات میں یا اپنے نئے بنائے ہوئے ہوٹل لی میریڈین میں مدعو کیا کرتا تھا۔ وہ تحفے دینے میں فراخ دل تھا۔ بین'

سونے کی گھڑیاں اور ہاتھ کے بنے ہوئے شیشے کے جام' جن پر ہمارے نام کھدے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ ایک نازک مزاج شخص تھا۔ جب وہ ہمارے گھر ڈنر کرنے آتا تو ہمیشہ ایک مخصوص کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کرسی کے سامنے ہی غسل خانہ تھا اور اگر غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوتا اور اندر کا منظر دکھائی دے رہا ہوتا تو وہ تب تک شراب نوشی نہیں کیا کرتا تھا جب تک کہ وہ دروازہ بند نہیں کر دیا جاتا۔ میں ایک پدر شخصیت (فادر فگر) میں ڈھل گیا تھا (وہ مجھ سے پچیس برس چھوٹا تھا)' وہ جب کبھی کسی مشکل میں ہوتا میرے پاس آ جایا کرتا تھا۔ اگرچہ مجھے ہوٹل کے کاروبار' مالیات' یا کمپنی لا کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا تاہم اس نے مجھے لی میریڈین کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر لیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا آخری برس تھا جب میں نے توجہ دی کہ وہ چڑچڑا اور تیز مزاج کا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اس بارے میں کہہ دیا تھا۔ جب ہم چھتر پور کے نزدیک اس کے فارم ہاؤس میں ویک اینڈ گزار رہے تھے تو میں نے فشار خون (بلڈ پریشر)' ذیابیطس اور یورک ایسڈ کی بہت سی ادویات دیکھیں ساتھ ہی کئی قسم کی ملٹی وٹامن گولیاں۔ ''تم کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟'' میں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا تھا۔ اس نے جواب دیا تھا: ''کتابوں کے مطالعے کے لیے ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے ذہنی سکون حاصل نہیں ہے۔'' یہ درست تھا' وہ سکون سے محروم شخص تھا۔ جب وہ مشکل میں ہوتا تو نجومیوں' دست شناسوں سے مشورہ کرتا اور سعد پتھر پہنا کرتا تھا۔ وہ مذہبی رسومات میں اور لدھیانہ کے نزدیک اپنے پسندیدہ سنت سے ملاقاتیں کرنے میں سکون ڈھونڈا کرتا تھا۔ اس کے غیر عقلی عقائد کے حوالے سے میرے مذاق نے بھی اس میں ہلکی سی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

1989ء کے موسم گرما میں اسے دورہ پڑا تھا۔ اسے بروقت بچا لیا گیا تھا میں ایسکارٹس ہسپتال میں اسے ملنے گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے تسلی دی کہ جو لوتھڑا اس کے دل کی طرف جا رہا تھا اسے مہلک ثابت ہونے سے پہلے ہی انہوں نے تحلیل کر دیا تھا۔ یہ تسلی پا کر کہ وہ خطرے سے باہر تھا میں ایک ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے گلاسگو روانہ ہو گیا۔ جب تین ہفتوں کے بعد میں واپس آیا تو جرن جیت گھر پر تھا لیکن اسے ملاقاتیوں سے نہ ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہم واحد مستثنیات تھے اور ہمیں اس سے ہر شام ملاقات کرنے کی اجازت تھی۔ باغ میں تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد وہ لیٹ کر ویڈیو کیسٹیں دیکھتا رہتا تھا۔ آخری شام اس نے پوچھا کہ میرا ارادہ دوبارہ کب بیرون ملک جانے کا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میرا تو کوئی

منصوبہ نہیں ہے۔" "تم اگلی گرمیوں میں میرے ساتھ چلنا۔ انگلینڈ سے ہم امریکہ چلیں گے:
مجھے دوسری مرتبہ معائنہ کروانا ہوگا یہاں کے لوگوں کو دل کے بارے میں زیادہ پتا نہیں ہے۔"

اگلی صبح جب میں ٹینس کھیل کر واپس آیا تو میری بیوی نے چپکے سے مجھے اطلاع دی:
"مجھے ابھی ابھی چرن جیت کے گھر سے کال آئی ہے وہ مر گیا ہے۔" یہ واقعہ میرے بیٹے کی
پچاسویں سالگرہ (4/اکتوبر 1990ء) کو پیش آیا۔ چرن جیت صرف اکیاون برس کا تھا۔

تیسری موت میری بیوی کے کزن اُجل کی تھی۔ وہ رشتہ دار سے زیادہ ایک دوست
تھا۔ ہم میں بہت کم مشترک چیزیں تھیں۔ اسے گولف کا خبط تھا۔ وہ دہلی کی چیمپیئن شپ جیت
چکا تھا۔ اس کا بیٹا وکرم جیت اٹھارہ برس کی عمر میں ایشین امیچر گولف ٹائٹل جیتنے والا کم عمر ترین
شخص تھا۔ اُجل عالمی شہرت یافتہ لوگوں کے خلاف کھیلے گئے اپنے میچوں اور اپنے سٹائلش
سوئنگ اور درست پٹنگ پر حاصل ہونے والی تعریفوں کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں
اس کی آمد سے ڈرا رہتا تھا کیونکہ میں نے اسے بہت زیادہ اکتا دینے والا شخص پایا تھا۔
بصورت دیگر وہ عمدہ ذوق والا اچھا آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے قطب مینار کے قریب ایک
دلکش فارم ہاؤس تعمیر کروایا اور مجھے دعوت دی کہ جب کبھی میں دہلی سے جی چھڑانا چاہوں اسے
استعمال کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کی دعوت قبول کر لی اور اسے کہا کہ کلکتہ سے واپس آ کر ہم
ایک ویک اینڈ وہاں گزاریں گے۔ جس وقت ہم ائیر پورٹ روانہ ہونے کے لیے کار میں سوار
ہونے ہی والے تھے کہ اجل کی بیٹی نے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ اس کا باپ نیند ہی میں
فوت ہو گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنا دورہ ملتوی کر دیا۔

کلکتہ میں گزرے تین دنوں میں میرے پاس غور و فکر کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔
کیا میں ان تینوں کی طرح پیشگی آگاہی کے بغیر چلا جاؤں گا؟

"مہا بھارت" میں ایک عبارت ہے جو کہتی ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا معجزہ یہ
ہے کہ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ موت ناگزیر ہے' اٹل ہے' کوئی شخص بھی یقین نہیں رکھتا کہ ایک روز
وہ بھی مر جائے گا۔ موت دوسروں کو آتی ہے' ہم ہمیشہ جئے چلے جانے کی توقع رکھتے ہیں۔

موت اور مرنے کا فکر ہمیشہ انسانی خبط رہا ہے۔ میں نے اس سے نجات پانے کی
کوشش کی مگر خود کو جیسا کہ "دھم پد" کہتی ہے' ایک مچھلی کی طرح پایا جو خشک زمین پر پڑی ہو اور
خود کو موت کی قوت سے بچانے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ جب ایک مرتبہ بمبئی میں میری ملاقات
اچاریہ رجنیش سے ہوئی تو میں نے اس سے اس بارے میں سوال پوچھا تھا۔ واحد نسخہ جو اس نے

میرے خوف پر غالب آنے کے لیے تجویز کیا وہ تھا مرنے اور موت پر میرا خود کو کھول دینا۔ میں خود کئی برس سے ایسا ہی کرتا رہا تھا۔ میں مرے ہوئے رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ جاتا' جنازوں میں شرکت کرتا تھا' میں شادیوں میں کبھی کبھار شرکت کرتا ہوں اور اکثر نگم بودھ گھاٹ کے چتا سوزی کے میدان میں لاشوں کو آگ میں جلتا ہوا دیکھنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ اس نے ایک تزکیہ (کیتھارسس) کا سا کام دکھایا: اس نے مجھے حقیر وہموں سے نجات دلا دی' زندگی میں اپنی جدوجہد کے دوران میں سامنے آنے والی ناکامیوں کو برداشت کرنے میں میری مدد کی۔ میں اپنے گھر داخلی سکون کے ساتھ واپس آیا۔ تاہم اس سے مجھے اپنے مرنے کے خوف پر غالب آنے میں مدد نہیں ملی۔ اس کے برعکس راتوں کی نیندیں میرے مشاہدوں کے ڈراؤنے خوابوں کی وجہ سے برباد ہو گئی تھیں۔

موت درحقیقت ہے کیا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں تب سے اس سے خوف زدہ ہوں جب سے اس سے واقف ہوا ہوں۔ بنیادی طور پر اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے کہ اس کے وقوع ہونے کے بعد میں کہاں ہوؤں گا۔ رشتہ داروں کی موت نے کوئی جواب فراہم نہیں کیا ہے۔ وہ تو بس عدم میں گم ہو گئے ہیں۔ ٹام سٹاپرڈ کے ہاں کسی حد تک میرے خوف کی بازگشت ملتی ہے' جب وہ کہتا ہے: ''موت موجودگی کی عدم موجودگی ہوتی ہے' اس سے زیادہ نہیں...... کبھی واپس نہ آنے کا نہ ختم ہونے والا زمانہ......ایک خلا جسے تم دیکھ نہیں سکتے ہو اور جب ہوا اس میں سے گزرتی ہے تو یہ کوئی آواز پیدا نہیں کرتا۔'' یا جیسا کہ پال والیری نے اس کے بارے میں لکھا تھا: ''موت ہم سے ایک گہری آواز میں بولتی تو ہے تاہم کہنے کو کچھ نہیں رکھتی ہے۔''

صرف وہی لوگ جنہیں موت کا تجربہ ہو چکا ہے اس کے بارے میں بات کرنے کے مستحق ہیں۔ میں نے تو اس کا تجربہ نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اسے ایک ایسے اختتامیئے (فل سٹاپ) کے طور پر قبول کرنے پر راضی ہوں جس کے آگے ایک خلا ہے جس میں داخل ہونے کا کوئی بھی اہل نہیں ہے۔ وہ کوئی آنے والی کل نہیں رکھتا ہے۔ ''کسی آدمی کے لیے دنیا کیا ہوتی ہے جب اس کی بیوی ایک بیوہ ہوتی ہے؟'' ایک آئرش ضرب المثل پوچھتی ہے۔ میں اس سوال کا جتنا بہترین ہو سکتا ہے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

مرنے کا عمل ہمارے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں ذرہ ذرہ لیتا رہتا ہے' باقی ماندہ کو آخر کار ہڑپ کر جانے سے پہلے۔ جیسا کہ ''گڈ بک'' (Good Book) کہتی

ہے' ہم موت کے ساتھ رشتہ قائم کر چکے ہیں اور ہماری پلکوں پر اس کا سایہ پڑتا رہتا ہے۔ پھر ہم کیوں اس کے خوف سے مرے جاتے ہیں؟ کیا یہ کوئی بہتر ہوتا اگر ہم ٹھیک جانتے ہوتے کہ یہ کب واقع ہوگی؟ میں تو ایسا نہیں سوچتا۔ جب میعادی بیماریوں میں مبتلا لوگوں یا موت کی سزا پانے والوں کو بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے لیے جینے کی کتنی مدت رہ گئی ہے تو وہ اس پر قابو پانے سے قاصر ہوتے ہیں۔''

میرے بیشتر خوف پرماتما کی موجودگی' حیات بعد الموت یا دوسرے جنم کے امکان کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔ بھگود گیتا ہمیں دلاسا دیتی ہے: ''کیونکہ پیدا ہونے والے کے لیے موت یقینی ہے' اور مردہ کے لیے پیدائش یقینی ہے لہٰذا اس ناگزیر امر پر تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔'' میں اس تسلی کا پہلا حصہ قبول کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا ہے مگر میں دوسرا حصہ قبول کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ اس کا کوئی قائل کرنے والا ثبوت نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ میرے پاس جینے کے لیے صرف ایک زندگی ہے اور یہ علم نہیں ہے کہ یہ کب اختتام کو پہنچ جائے' میں اس سے جو کچھ بھی حاصل کر سکتا ہوں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے حواس کو پوری طرح استعمال کروں گا' دنیا میں جو کچھ خوبصورت ہے اسے دیکھوں گا' اس کے پہاڑ' جھیلیں' اس کے سمندروں کے ساحل اور اس کے صحرا' میں بارش برسانے والے بادلوں کو دیدۂ حیرت سے اڑتے ہوئے دیکھوں گا اور افقوں پر محیط ہونے والی قوس قزح پر تحیر کروں گا۔ میں مختلف ملکوں کی خوبصورتیوں کے مزے لوں گا اور ان کی شرابیں چکھوں گا' میں اچھی مغربی اور ہندوستانی موسیقی سنوں گا اور سٹیج پر خوبصورت بیلے رقاصوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھ کر مست ہو جاؤں گا۔ میں پھولوں' جڑی بوٹیوں کی خوشبو دار پرفیومز اور خشک زمین پر بارش کا پہلا قطرہ گرنے کے بعد اٹھنے والی خوشبو کو مشام جاں میں بساؤں گا۔ میں خوبصورت عورتوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھوں گا' ان کو دعوت وصال دوں گا اور اگر انہوں نے قبول کیا تو ان کے ساتھ محبت کا عمل کروں گا۔

میں لذت پرست نہیں ہوں جو خود کو محض لذت کے حصول کے لیے شہوت رانی میں ملوث کر لیتا ہے۔ زندگی کی اچھی چیزوں سے صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو خود کو دن بھر ایسے محنت کے کام میں مصروف رکھتے ہیں جو انہیں طمانیت و آسودگی کا احساس عطا کرتا ہے۔ میں نے صحافت اور تخلیقی ادب سے طمانیت و آسودگی حاصل کی ہے۔ فقط تبھی ایسا ہوا کہ میں نے فطرت کی نعمتوں سے اپنی محنت و مشقت کے جائز انعام کے طور پر حقیقتاً لطف اندوز

ہونا شروع کیا۔

میں زندگی کے اختصار سے مکمل طور پر آگاہ ہوں: اس میں کرنے کو بہت زیادہ ہے جبکہ کرنے کا وقت بہت تھوڑا ہے۔ درست بات تو یہ ہے کہ میں نے زندگی کی ابتدا میں وقت کو ایسے ہی مشاغل میں ضائع کر دیا جیسے پوجا' مراقبہ' مذہبی رسومات' دوستوں کے ساتھ گپ شپ' کاک ٹیل پارٹیاں اور ڈنرز (جب تک یقین دہانی نہ کروا دی گئی کہ سکاچ اور عمدہ کھانا ٹھیک مقررہ وقت پر پیش کر دیا جائے گا)۔ میں نے مذہبی صحیفوں پر ادب کے کلاسیکوں کو قدر و اہمیت دینا شروع کر دیا' جنہیں میں نے اکتا دینے والے' یکسانیت زدہ اور غیر متاثر کن پایا تھا۔

مجھے ان لوگوں کی سمجھ نہیں آتی جو شکوہ کرتے ہیں کہ وقت ان پر بھاری ہے۔ مجھے اکتاہٹ (Boredom) کی سمجھ نہیں آتی' یہ ایک خود طاری کردہ' وقت ضائع کرنے والی بیماری ہے جو ان لوگوں کو لاحق ہوتی ہے جو پیدائشی طور پر کاہل اور سست الوجود ہوتے ہیں۔ اور اس پر بھی یہی لوگ موت سے ان لوگوں کی نسبت زیادہ خوف زدہ ہوتے ہیں جو اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اس کے بارے میں سوچنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ جو لوگ ''تم اسے اپنے ساتھ لے کر نہیں جا سکتے'' والے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر تم اپنا کمایا ہوا پیسہ یا اپنی ملکیتی کوئی بھی دنیاوی چیز مرتے ہوئے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے ہو تو جیتے جی یوں خون پسینہ بہانے میں کیا حکمت مضمر ہے؟ یہ سچ ہے کہ کفن میں جیبیں نہیں ہوتیں تاہم ایسی چیزیں ہیں جو موت سے بچ رہتی ہیں۔ پیسہ موت سے بچ رہتا ہے۔ سو اسے اپنے بچوں کو دو اور خیراتی ادارے قائم کر کے ورثے میں چھوڑ جاؤ۔ ایک شخص کی تعلیم' دانش جو وہ کتابوں سے حاصل کرتا ہے اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے مگر جو کچھ وہ کاغذ پر تحریر کرتا ہے وہ اس کے جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ ادھر اس کی شہرت بھی ہے' اچھی یا بری' جو موت سے بچ رہتی ہے۔

تالمود کہتی ہے: ''جب موت انسان کو خالق کے سامنے حاضر ہونے کے لیے بلاتی ہے تو اس کے تین دوست ہوتے ہیں: ''اول وہ جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے پیسہ ہے۔ تاہم پیسہ اس کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا ہے۔ دوم اس کے رشتہ دار ہیں۔ تاہم وہ اس کا ساتھ صرف قبر تک دے سکتے ہیں اور منصف کے روبرو اس کی صفائی نہیں دے سکتے ہیں۔ یہ تو اس کا تیسرا دوست ہوتا ہے' جسے وہ بہت زیادہ احترام نہیں دیتا ہے' اس کے اچھے کام' جو اس کے ساتھ جا سکتے ہیں اور ''بادشاہ'' کے سامنے حاضر ہو سکتے ہیں اور اس کی بریت کروا

سکتے ہیں۔'' اس قسم کی دلیل صرف انہیں کو قائل کرتی ہے جو اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ادھر کوئی غیر جسمانی شے بھی ہے جو کہ بدن میں برقرار رہتی ہے۔ ایک زیادہ درست لفظ کی خواہش میں وہ اسے روح کہتے ہیں۔ کسی کو بھی دھندلا سا اندازہ نہیں ہے کہ روح درحقیقت کیا ہے؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ انسان گوشت' خون اور ہڈیوں سے زیادہ کچھ ہے۔ وہ ایک بولنے والا' سوچنے والا جانور ہے مع ایک کردار کے جو کہ انفرادی طور پر اسی کا ہوتا ہے۔ کیا یہ اس کے غیر جسمانی اوصاف ہیں جنہیں روح کہا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ شخص کے مرتے ہی معدوم ہو جاتے ہیں۔ روح انسانی تخیل کا ایک اور شاخسانہ ہے جسے بعد کی زندگی کے تصور کو مستحکم کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ ایسا ہی معاملہ سورگ کا ہے جہاں قوس قزح کبھی مٹتی نہیں ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ اگرچہ ہر شخص سورگ میں جانے کا آرزومند ہے تاہم کوئی بھی زمین کی اس زندگی کو چھوڑنے کا بہت زیادہ شوق ظاہر نہیں کرتا جسے وہ جہنم تصور کرتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو اگر کوئی سورگ ہے تو اسے دھرتی پر ہونا ہوگا۔ میں بہت سے ملکوں کے کئی ایسے مقامات کو جا چکا ہوں جو میرے سورگ کے تصورات کا بھرپور جواب تھے۔ راکیز (Rockies)' تھاؤزینڈ آئی لینڈز (Thousand Islands)' لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) اور نیاگرا آبشار کا مرعوب کر دینے والا شکوہ و عظمت' انگلینڈ کی لیک ڈسٹرکٹ اور کوٹس ولڈز (Cotswolds)' اطالوی جھیلیں' گارڈا (Garda) اور میگیئر (Maggiore) نیوزی لینڈ میں واقع زیر زمین غاریں جنہیں ہزاروں جگنوؤں نے روشن کیا ہوتا ہے۔ آسٹریلیا میں واقع قبل از تاریخ کی پرشکوہ آئرز راک (Ayers Rock)۔ یوگنڈا سے باہر بہنے والے دریائے نیل پر مرکیسن آبشار میں بہت زیادہ تعداد میں جنگلی حیات۔ ریوڈی جنیرو' کووالم اور گوا کے ساحل۔ کشمیر کے پہاڑ اور ندیاں' تاج محل کا جاوداں جمال ___ طلوع سحر کے وقت کی گلابی کے ساتھ' اس کی دوپہر کے وقت سورج تلے خیرہ کن تابندگی' شام کے دھندلکے میں اس کی گداز عنبریں چمک' اور چاندنی میں اس کا ریشمیں حسن۔ دنیا بھر میں ہزاروں سورگیں بکھری ہوئی ہیں۔ میں شفاف پانی کی تیزی سے رواں ندیوں اور اپنی دوشیزگی کو بحال کر لینے والی عورتوں کے مریضانہ خوابوں کی جگہ ان کی زمینی حقیقت کو قبول کر کے خوش ہوؤں گا۔ دوشیزگی کا خواہش مند ہی کون ہے؟ تجربے' زندہ دلی اور ذہانت رکھنے والی دلکش عورتیں زیادہ بہتر محبوب اور دوست ہوتی ہیں۔

اس سب کی کیا قدر و قیمت ہے؟ بہت زیادہ نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں آیا کہاں

سے ہوں، میں نہیں جانتا کہ میری ہستی کا کیا مقصد ہے، میں نہیں جانتا کہ جب میں مروں گا تو کہاں جاؤں گا۔ چونکہ میں اپنی پیدائش کی تاریخ نہیں جانتا اسی لیے میں تو یہ جاننے کے لیے زائچہ بھی نہیں بنوا سکتا کہ میں کتنی مدت زندہ رہوں گا۔ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک سوامی جس کے پاس ''بھرگو سمہت'' کی ایک جلد تھی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس میں میرے نام کے ساتھ میرے مستقبل پر ایک صفحہ ہے۔ اس کے استقبال کا وقت اور تاریخ بھی درج تھی۔ اس میں کچھ اس طرح کہا گیا تھا: سمندر کے کنارے واقع ایک شہر میں جس کا نام ب سے شروع ہوتا ہے وکی عہد کے پانچویں مہینے کے پانچویں دن گیارہ بجے خوش ونت کیسری (بمعنی سنگھ) نامی ایک شخص اپنے بارے میں سوالات پوچھے گا۔'' اس میں مزید لکھا ہوا تھا کہ میں اپنے پچھلے جنم میں بے عقیدہ رہا تھا اور عقیدہ نہ ہونے کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا رہا تھا۔ وہ بے عقیدگی میری موجودہ زندگی میں ایک قسم کے خمار کے طور پر باقی ہے۔ بزرگ بھرگو نے مجھے میرے خطا پر اصرار پر تنبیہہ کی تھی۔ اس نے یہ بھی ''پیشگوئی'' کی تھی کہ میری زندگی کا بیشتر حصہ کاغذ اور قلم کے ساتھ گزرے گا۔ اس نے میری موت کا ٹھیک ٹھیک وقت، دن، مہینہ اور سال بتایا تھا۔ اس کے مطابق میں 1999ء تک زندہ رہوں گا اور صدی کے ختم ہونے سے چند ماہ پہلے مر جاؤں گا۔ انوکھی بات ہے کہ ناسٹراڈیمس کی بھی پیش گوئی ہے کہ زمین پر زندگی 31 جولائی 1999ء کو ختم ہو جائے گی۔ اگر اس کی پیشگوئی درست نکلی تو پھر میرے پڑھنے والے بھی اسی وقت مر جائیں گے جس وقت میں مروں گا۔

مجھے ڈر ہے کہ اپنی موت کے وقت میں احمق بن سکتا ہوں — بیشتر لوگ بنتے ہیں۔ میں مدد کے لیے چلانا نہیں چاہتا یا پرماتما سے گناہوں کی معافی نہیں مانگنا چاہتا اور کمزوری کا کوئی اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے باپ کی طرح جو اپنی شام کی سکاچ پینے کے چند منٹ بعد مر گیا تھا، میں بھی لمبے راستے پر گامزن ہونے سے پہلے ایک جام لینا چاہوں گا۔ میں اس طرح جانا چاہوں گا جس طرح علامہ اقبال نے مضبوط انسانوں سے جانے کی تاکید کی تھی

نشان مرد مومن باتو گویم؟
چوں مرگ آید، تبسم برلب اوست

(تم مجھ سے مومن کی نشانی پوچھتے ہو جب موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے)

پس نوشت: نومبر 2001ء

کٹائی کا موسم

میں نے چھ سال پہلے اس آپ بیتی کا مکمل کر لیا تھا اور اس کا مسودہ اپنے پبلشر کے حوالے کر دیا تھا۔ روی دیال کے پاس اس کا ٹائپ سیٹ تھا' گرد پوش کا ڈیزائن تیار ہو گیا تھا اور وہ اس کی چھپائی اور فروخت پر آمادہ تھا۔ پیشگی مشہوری (پبلسٹی) حاصل کرنے کے لیے اس نے ''انڈیا ٹوڈے'' ''ٹیلیگراف'' اور ''ہندو'' کو ایک ایک باب پیش کیا۔ ''انڈیا ٹوڈے'' نے اپنے 31 راکتوبر 1995ء کے شمارے میں وہ باب شائع کیا جس میں مانیکا گاندھی کے اپنی ساس اندرا گاندھی کے گھر سے نکالے جانے کا تذکرہ بیان کیا گیا تھا' جب مؤخرالذکر ہندوستان کی وزیراعظم تھی۔ میں نے اس کی بنیاد یہ واقعہ رونما ہونے کے وقت ''انڈیا ٹوڈے'' میں جو کچھ شائع ہوا نیز پوپل جیاکر اور وید مہتہ کی لکھی ہوئیں مسز گاندھی کی سوانح عمریوں اور مانیکا گاندھی اور آخری تماشے کے وقت موجود اس کی بہن امبیکا کی مجھے فراہم کردہ اضافی تفصیلات پر رکھی تھی۔ 12 ردسمبر 1995ء کو اسے دہلی ہائیکورٹ سے کتاب کو شائع نہ کرنے کا حکم امتناعی موصول ہوا۔ ہم نے فوری طور پر اس کے خلاف اپیل کر دی۔ دہلی ہائیکورٹ کے جسٹس کے۔ راما مورتھی نے کئی ماہ بعد دونوں فریقین کے دلائل سنے۔ قریباً ڈیڑھ برس کے بعد فیصلہ دیا کہ میں نے مانیکا کے خلوت کے حق کی خلاف ورزی کی ہے اور کتاب کی اشاعت پر امتناع کو برقرار رکھا۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر اپیل دائر کی۔ اسے ہائیکورٹ میں سماعت میں آتے آتے چار سال لگ گئے۔

اس طویل تاخیر کو مکمل طور پر ہمارے قانونی نظام کی سستی پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اول میرے سینئر وکیل سولی سوراب جی کو اٹارنی جنرل بنا دیا گیا: اب وہ میرے لیے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا اسسٹنٹ ایم۔ مدگل جج تک ترقی پا گیا: اب وہ میرے لیے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ کپل سبل میرا مقدمہ لینے پر راضی تھا۔ وہ راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہو گیا اور اس کے پاس قانونی پریکٹس کے لیے تھوڑا وقت رہ گیا۔ صرف سری دھر چتلے' جو ہمارا جونیئر وکیل رہا تھا' اپیل کو نمٹانے کے لیے بچ گیا۔ ہمارا مقدمہ سی۔ اے سندرم نے لڑا جس کے معاونت چتلے نے کی۔

میری بیٹی اور میں جسٹس دیوندر گپتا اور سنجے کرشن کول پر مشتمل ڈویژن بنچ کے سامنے پورے دلائل کے دوران میں بیٹھے۔ ہم نے مانیکا کے وکیل کی اکتا دینے کی حد تک گھنٹوں پر محیط بہت لمبی بحث سنی جو کہ جسٹس راما مورتھی کے روبرو اس کی بحث سے بھی زیادہ طویل تھی۔ ہمارا وکیل سی۔اے۔سندرم دو مرتبہ آدھے آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں بولا۔ میں نے اظہار کی آزادی کے حق میں اس سے پہلے اتنے زوردار دلائل کبھی نہیں سنے تھے۔ شاید میں جانبدار تھا کیونکہ وہ میری طرف سے بول رہا تھا۔ میں ادراک کر سکتا تھا کہ اس نے جج کو اپنا قائل کر لیا ہے۔ فیصلہ تین ہفتے بعد سنایا گیا۔ میری بیٹی اور داماد رانی کھیت میں تھے۔ میرے ساتھ میرا بیٹا راہول اور میری پوتی تھی۔ فیصلہ جسٹس کول نے پڑھا۔ میری آپ بیتی کی اشاعت کے خلاف امتناع ہٹا دیا گیا تھا اور مانیکا کو دس ہزار روپے اخراجات کی مد میں ہمیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ہم نے مانیکا کے خلوت کے حق کی خلاف ورزی کے الزام سے برأت کی بجائے اظہار کی آزادی کے حوالے سے اپنی برأت کے لیے دلائل دینے میں زیادہ وقت صرف کیا تھا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیصلے کی خبر محاورے کی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ فون پر ہر چند منٹ بعد مبارک دینے والے لوگوں کی کال آ رہی تھی۔ میڈیا کے لوگوں نے بشمول ٹی وی ٹیموں کے میرا ردعمل جاننے کے لیے میری خلوت پر یلغار کر دی۔ میری پوتی نے اس موقع کی خوشی منانے کے لیے مجھے آئس کریم خرید کر دی۔

مانیکا ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر چکی ہے اور ممکن ہے وہ اب بھی مجھے ہتک عزت کے الزم کے تحت عدالت میں لے جائے۔ اس صورت میں اسے وزیراعظم کی رہائش گاہ سے نکالے جانے میں اپنے کردار کے حوالے سے تفصیلی جرح کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ندامت انگیز ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرصورت جس وقت مقدمہ فیصل ہو گا امکان ہے کہ میں اس کی پہنچ سے دور جا چکا ہوں گا۔ اب میں اٹھاسی برس کا ہو رہا ہوں۔ جسٹس راما مورتھی کے فیصلے کے خلاف مجھے سب سے بڑی شکایت اس کی ادیبوں کو کی گئی خوامخواہ کی ہدایت سے ہے۔ اس نے کہا: ''......جہاں تک عمومی جان کاری کا تعلق ہے تو وہ (بالفاظ دیگر میں) وسیع تجربے کا حامل دانا شخص ہے جو ہندوستان اور بیرون ملک میں عظیم شخصیات کے ساتھ رہا ہے۔ ہر شخص اس سے معاشرے کے لیے مفید مواد کی توقع کرے گا جو کہ نوجوان نسل کو متاثر کرے......عمومی طور پر لوگ عظیم ادیبوں سے عظیم فکر، اعلیٰ تر زندگی اور اعلیٰ علم کی توقع کرتے ہیں۔ ہندوستان کا قانون افراد کو فقط شخصی عداوتوں سے ابھرنے والی تحریکات کی تسکین کے مقصد کے تحت لکھنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔'' شکریہ جسٹس راما مورتھی مجھے یہ بتانے کا کہ مجھے کیا اور کیسے لکھنا چاہیے۔ میں ہونٹوں پر مسکراہٹ اور دل میں توہین لیے آپ کی ہدایت کو

نظرانداز کرنے کا انتخاب کرتا ہوں؛ جس طرح کوئی بھی سچا ادیب کرے گا۔

☆☆☆

جب میں نے اس آپ بیتی کو شروع کیا تھا تو مجھے یقین تھا کہ یہ میری آخری کتاب ہو گئی جو میں اپنی زندگی میں لکھوں گا' میں غلطی پر تھا۔ میں نے گزشتہ چھ برسوں میں اس سے زیادہ کتابیں لکھ ڈالی ہیں جتنی کہ ماضی میں کسی بھی چھ برسوں میں لکھی تھیں۔ ان میں سے بیشتر میرے قارئین کے پاس سنبھالے ہوئے میرے مضامین پر مشتمل تھیں اور ان لطائف کا مجموعہ جو میں اپنے لکھے ہوئے ہر کالم کے آخر میں اضافہ کر دیا کرتا تھا۔ اب ایسے لطیفوں کے چھ مجموعے مارکیٹ میں ہیں اور ہر ایک کے درجنوں ری پرنٹس نکل چکے ہیں۔ ان کی رائلٹی نے مجھے سکاچ وہسکی کے پریمیئم برانڈز فراہم کر دیئے ہیں' ایک ایسی شے جس کو میں اپنے بڑھاپے میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے ایک ناول بھی لکھا ہے ''دی کمپنی آف ویمن'' (The Cmpany of Women) (پینگوئن وائکنگ)۔ میں اسے شائع شدہ دیکھنے کا بہت مشتاق نہیں تھا کیونکہ یہ ایک اسی سالہ بوڑھے (دوسرے لفظوں میں میری) جنسی فنتاسیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن پینگوئن۔ وائکنگ کے روی سنگھ نے میرے ساتھ کسولی میں ایک ہفتہ صرف کر کے منتشر اجزا کو ترتیب دی اور انہیں ایک کتاب کی صورت عطا کی۔ بغیر کسی استثنا کے تمام نقادوں نے ناول پر نکتہ چینی کی۔ اس سب کے باوجود یہ ایک بیسٹ سیلر بن گیا اور چھ ماہ سے زیادہ عرصے تک ہندوستان کی بیسٹ سیلر کتابوں کی فہرست میں سب سے اوپر رہا۔ اس نے مجھے میری کسی بھی دوسری کتاب سے زیادہ رائلٹی کما کر دی۔ اسی طرح نقادوں کے لیے بھی زیادہ!

کچھ دوسری کتابیں بھی بیسٹ سیلرز کی فہرست میں آئیں: ''ناقابل فراموش عورت'' (پینگوئن)' مہاراجا رنجیت سنگھ کی سوانح عمری کا ری پرنٹ (پینگوئن)'' ''دی سکھ'' (رولی بکس) رگھو رائے کی زبردست تصویریں کے ساتھ۔ میرا ایک محبت کی شاعری کے تراجم کا مجموعہ بھی ہے: ''چار زبانوں ٹیں اظہار محبت'' (پینگوئن) جو شاردا کوشیک کے ساتھ شائع ہوا۔ میری دو کتابیں زیر طبع ہیں: واشنگٹن کی ڈاکٹر سرجیت کور کے ساتھ ''سکھوں کے درمیان'' جو بیرونی ملکوں میں آباد سکھ کمیونٹیوں اور دولت اور شہرت کمانے والے ان کے مرد و خواتین کے بارے میں ہو گی۔ توقع ہے کہ یہ رولی بکس سے شائع ہو گی۔ ریما آنند کے اشتراک سے کیا گیا سکھوں کی شام کی مناجات ''ریہہ رس'' کا ترجمہ جو پینگوئن شائع کرے گا۔ میرے پاس شکوہ کناں ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

☆☆☆

میں نے گزشتہ چھ برسوں میں مذہب اور پرماتما کے ساتھ اپنی مساوات کو بھی بہتر بنایا ہے۔ لاادریت سے کسی شعوری مصالحت کے بغیر میں نے گولڈن ٹیمپل سے روزانہ نشر ہونے والی صبح کی عبادت ''اسادی وار'' سننا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بہت تسکین بخش پایا اور محسوس کیا کہ اس کا سننا میری بیمار بیوی کے لیے سہارا ثابت ہوا جو ایک زمانے میں بہت دیندار ہوا کرتی تھی۔ میں ہر شام کو شام کی مناجات ''ریہہ رس'' سنتا ہوں۔ اس سے یقیناً مجھے ریما آنند کی مدد سے اس کو ترجمہ کرتے ہوئے کافی سہارا ملا۔ ہم نے اسے ''نغمۂ شام'' کہنے کا فیصلہ کیا۔ مذہبی متنوں میں دلچسپی کے احیا سے زیادہ' سکھ کمیونٹی کے ساتھ میرے تعلق کے احساس کو' جسے میں اس کے احکامات کو ماننے سے زیادہ اہم تصور کرتا ہوں' تقویت ملی ہے۔ میرا نام خالصہ پنتھ کے قیام کی تین سو سالہ تقریب کے موقع پر ''نشان خالصہ'' کا اعزاز حاصل کرنے والوں میں شامل تھا۔ پھر گرونانک دیو یونیورسٹی نے کمیونٹی کے لیے میری خدمات کے صلے میں مجھے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا۔ میرے گھر کی دیواروں پر اعزازی ڈاکٹریٹ کا فرمان اور سکھ دربار کے سکوں کے ساتھ تانبے کی پلیٹ' جس پر ''نشان خالصہ'' کے الفاظ کندہ ہیں' آویزاں ہیں۔

مجھے ایک اور ایوارڈ پنجاب آرٹس کونسل چنڈی گڑھ نے دیا۔ درجنوں ہندوستانی اور پاکستانی موصول کنندہ تھے۔ درجنوں اکتا دینے کی حد تک طویل تقریریں بھی تھیں۔ مجھے سخت نزلہ ہو گیا اور میں دہلی واپس آ گیا۔ میں نے اپنی پوتی کی جھولی میں کرنسی نوٹوں کا پیکٹ ڈالا نہیں تھا کہ میرا نزلہ پراسرار طریقے سے غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ پیسے کو گندہ کیوں کہا جاتا ہے۔

گزشتہ چھ برسوں میں میرے لیے سب سے زیادہ اہم اور یقینی طور پر سب سے زیادہ نفع بخش واقعہ سلبھ انٹرنیشنل کی طرف سے مجھے ''سال کے سب سے دیانتدار شخص'' کا ایوارڈ ملنا تھا۔ اگر میں حقیقتاً ایک دیانتدار شخص تھا تو مجھے ایوارڈ لینے سے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر ٹیکس سے مبرا دس لاکھ روپے میرے لیے اپنی دیانتداری کے بارے میں سخن طرازی کے لیے بہت زیادہ ثابت ہوئے۔ وہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ دہلی کی سب سے بڑا ایف آئی سی سی آئی سماعت گاہ (آڈیٹوریم) گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے' کہ میں کتنا بددیانت ہو سکتا تھا میں نے آندھرا پردیش کے وزیراعلیٰ چندرا بابو نائیڈو' جس نے مجھے

چیک دیا اور وزیر خارجہ جسونت سنگھ' جس نے تقریب کی صدارت کی' دونوں کے قلمدانوں سے بال پوائنٹ پین چوری کر لیے۔ میرے ہاتھ کی صفائی کو وہاں موجود ممتاز شخصیات کی تقریروں سے بھی زیادہ بلند داد ملی۔

مجھے دوسرے واقعات یاد آ رہے ہیں جو میری زندگی کی اہم یادگاریں ہیں: میرے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' پر پامیلا روکس (Pamela Rooks) نے فلم تیار کی۔ اس نے نہایت معمولی سرمائے کے ساتھ اسے تیار کیا مگر نہایت شاندار۔ اسے ٹی وی پر دکھایا گیا اور پھر چند ماہ کے لیے ملک بھر کے سینماؤں میں بھی اس کی نمائش کی گئی۔ یہ فلم مجھے لندن لے گئی جہاں ہندوستانیوں' پاکستانیوں' بنگلہ دیشیوں اور برطانویوں کے ایک ملے جلے اجتماع نے اسے دیکھا۔ پیسہ پاکستان کے ایک ہسپتال کو چلا گیا۔

میرا ناول ''دہلی'' جرمن زبان میں ترجمہ ہوا۔ میرے جرمن پبلشرز نے مجھے مدعو کیا اور مجھے جرمنی اور آسٹریا کے مختلف شہروں میں اس کے اقتباسات کے انگریزی اور جرمنی میں پڑھ کر سنائے جانے کے موقع پر موجود رہنے کے لیے لے جایا گیا۔ ''ٹرین ٹو پاکستان'' نے مونڈیلو ایوارڈ (Mondello Award) جیتا۔ مجھے اٹلی کا ایک اور مفت ٹکٹ حاصل ہوا اور میں پالرمو کے میئر سے دو لاکھ روپے مالیت کا چیک لینے سسلی گیا۔

اور آخر میں میں نے روٹری انٹرنیشنل کی دعوت پر کراچی میں چار دن گزارے۔ میں کنونشن میں مرکزی مقرر تھا۔ جو کچھ میں نے کہا اسے ہندوستانی اور پاکستانی شرکا نے خوب سمجھا۔ انہوں نے مجھے ٹی وی چینلوں پر براہ راست (Live) دکھایا۔ میں نے یہی سب کہا کہ اگر ہم دوبارہ جنگ لڑے (وہ کارگل کے بعد تھا) تو وہ ہماری آخری جنگ ہو گی۔ نہ تو ہم بچیں گے اور نہ ہی تم بچو گے اور یہ علاقہ قبرستان کے امن کا حامل ہو گا۔

چھوٹی چھوٹی فتوحات کے ان برسوں کو میری بیوی کی صحت میں بتدریج زوال نے ماند کر دیا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بہتر حالت میں رہی تھی۔ اس کو آنتوں کی حرکت کے حوالے سے کبھی کوئی مسائل نہیں رہے تھے اور ہر صبح وہ فتح مندی سے کہتی تھی ''سیٹی کی طرح صاف'' اور اکثر ایک یا دو گھنٹے بعد فرانسیسی میں ''دوسری صفائی''۔ اس کے برعکس مجھے اپنے سست جگر کو جلاب آور دواؤں' گلیسرین کی بتیوں اور اینیما کے ذریعے بمشکل فعال کروانا پڑتا تھا۔ وہ شاذ ہی بیمار پڑتی تھی۔ مجھے مستقلاً نزلہ لگ جاتا اور میں اکثر سر درد میں مبتلا رہتا تھا۔ جب بھی ہم چہل قدمی کرنے جاتے تھے وہ مجھ سے آگے نکل جایا کرتی تھی اور مجھے اسے یاد کروانا پڑتا تھا کہ

ہندوستانی بیویاں اپنے شوہروں کے آگے نہیں بلکہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ ہماری شادی کے ابتدائی برسوں میں وہ جوش و ولولے کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتی تھی۔ ادھیڑ عمری میں ہم گولف کھیلتے تھے' وہ ہمیشہ مجھ سے بہتر کھیلتی تھی۔ جب اس نے کھیل ترک کر دیئے تو اس کے بعد وہ پیدل چلنے لگی۔ وہ کار پر لودھی گارڈنز جاتی اور پارک میں کسی کے ساتھ بات کیے بغیر چکر لگایا کرتی تھی۔ سب باقاعدگی سے آنے والے اسے پہچانتے تھے۔

وہ ہمیشہ گھر سجانے کی دھن میں رہتی تھی' وہ نوکروں کو احکامات دیئے چلی جاتی یہاں تک کہ ہر شے سنور جاتی۔ وہ مجھے کسی پنج ستارہ (فائیوسٹار) ہوٹل سے زیادہ لذیذ کھانے مہیا کرتی تھی۔ ہر صبح وہ پکوانوں کی کتابوں سے کچھ ترکیبیں پڑھتی اور باورچی چندن سنگھ کو ہدایات دیتی کہ کھانا کس طرح تیار کرنا ہے۔ سو ہم فرانسیسی' اطالوی' چینی اور کبھی کبھی ''دیسی'' کھانے کھاتے جو بہت خوش ذائقہ ہوتے تھے۔ وہ ہمارے باغ کی دیکھ بھال کرتی اور موسم بدلنے پر سبزیاں اگایا کرتی تھی۔ وہ کسی عقاب کی طرح ان پر پہرا دیتی تھی اور پکے ہوئے پھل اور سبزیاں چرانے کے لیے باغ میں داخل ہو جانے والے گلی کے شرارتی بچوں کو بھگا دیتی تھی۔ وہ نوکروں کے بچوں کو ہندی اور انگریزی پڑھانے میں ایک یا دو گھنٹے گزارتی تھی اور جب وہ سکول کی تعلیم حاصل کر لیتے تو انہیں ملازمتیں ڈھونڈ دیتی تھی۔

وہ زندگی کا ذوق رکھتی تھی' وہ مجھ سے زیادہ وہسکی پی سکتی تھی۔ بدقسمتی سے اس کا حافظہ کمزور تھا اور اسے جلد غصہ آ جاتا تھا۔ اس میں سمتوں کا شعور نہیں تھا۔ کبھی کبھی مجھے جم خانہ کلب پہنچانے کے بعد وہ اپنے آپ کو پالم ائرپورٹ والے روڈ پر پاتی۔ ہماری ازدواجی زندگی کے برس جھگڑوں سے بھرے ہوئے تھے جنہوں نے دوسری صورت میں ہماری پرمسرت ازدواجی زندگی کو دھندلا دیا تھا۔ مجھے ایک ایسے پیشے کا زبردست فائدہ حاصل تھا جس میں مجھے روزانہ کئی گھنٹے تنہائی مطلوب ہوتی تھی۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ دیتی۔

اچانک معاملات تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ اس نے تمام ورزشیں ترک کر دیں۔ اس نے مے نوشی اور مطالعہ بھی ترک کر دیا۔ میں ہمیشہ اپنے اتوار کو شائع ہونے والے کالم پر اس کے تبصروں کا منتظر رہتا تھا۔ اس نے انہیں پڑھنا چھوڑ دیا' نہ ہی وہ میری کتابوں کو پڑھنے کی پروا کرتی تھی جو اکتا دینے والی باقاعدگی سے چھپ رہی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ وہ ایک منفی شخصیت میں تبدیل ہو گئی۔ میں اس کو جو تجویز دیتا اس کا فوری جواب ہوتا نہیں۔ اس کی وجہ سے بہت غصہ آتا تھا کیونکہ میں نے ادراک نہیں کیا کہ اس کے اندر کوئی شے تبدیل ہو رہی

ہے جس کے اوپر اسے کوئی قابو نہیں ہے۔ یہ مجھ پر تب منکشف ہوا جب اس نے بیمار پڑنا شروع کیا۔ پہلی مرتبہ کسولی میں جب وہ افسردہ ہو گئی اور بولنا چھوڑ دیا' میں نے تعطیلات کو مختصر کیا اور دہلی واپس آ گیا۔ وہ چنڈی گڑھ میں ٹرین پر بمشکل چڑھ سکی۔ اس کے بعد کرسمس پر گوا میں ہماری تعطیلات کے تیسرے دن ہی وہ بیمار پڑ گئی۔ ہوٹل کی منیجر شیوانی رار کی اس کے کھانے اس کے کمرے میں بھجوا دیا کرتی تھی اور اس کی دیکھ بھال یوں کرتی تھی گویا وہ اس کی ماں ہے۔ مجھے ان تعطیلات کو بھی مختصر کرنا اور دہلی واپس آنا پڑا۔ ہمارے خاندانی ڈاکٹر آئی۔ پی۔ ایس۔ کرلا نے مشورہ دیا کہ میں کسی نفسیاتی معالج سے مشورہ کروں اور ایک ہمہ وقتی نرس کو ملازم رکھوں۔ وہ برہم ہو گئی اور اس نے دونوں مشوروں کو مسترد کر دیا۔ وہ اپنے قدموں پر غیر مستحکم رہنے لگی اور اسے چکر آنا شروع ہو گئے۔ جب وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ دو مرتبہ اپنے بستر سے گر گئی اور اس کی پیشانی بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ زخموں کو ٹانکے لگوانے اور اسے تشنج سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوانا پڑا تھا۔ اسے کوئی درد محسوس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ درد کا احساس کھو چکی تھی۔ ہر وقت اس کے ساتھ رہنے کے لیے مجھے دن رات کی دو نرسیں ملازم رکھنا پڑیں۔ میری بیٹی کا ایک دوست ڈاکٹر روی نہرو' ایک خوبصورت کشمیری کنوارا' جو اس قسم کی بیماریوں کا سپیشلسٹ تھا۔ وہ اسے میری بیوی کو دکھانے کے لیے لائی۔ اس نے اس کے ساتھ ایک گھنٹہ باتیں کرنے میں گزارا اور اسے اپنے ساتھ چند قدم چلایا۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے سادہ لفظوں میں مجھے بتایا: ''اسے الزائمر ہے اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔ جو بہترین ہم کر سکتے ہیں یہی ہے کہ اس کی حالت جہاں ہے وہیں ٹھہرا دیں۔'' اس نے ایکسیلون تجویز کی' یہ دوا سابق امریکی صدر ریگن کو بھی دی جاتی رہی ہے۔ یہ ہلاکت خیز حد تک مہنگی ہے۔ وہ دوا' نرسیں اور ڈاکٹر (روی نہرو مجھ سے کچھ نہیں لیتا تھا) بہت مہنگے پڑے۔ میں اس ہستی کے لیے اپنا پیسہ بے دریغ خرچ کرتے ہوئے بے حد مسرور تھا' جو کہ میری زندگی کے ساٹھ سے زیادہ برس میرے ساتھ رہی تھی۔ مگر میرے لیے ایک ایسے شخص کے ساتھ بیٹھ کر اسے دن بھر دیکھتے رہنا مشکل ہے جو زندگی کا اتنا شوقین اور زندگی سے بھرپور تھا اور اب ایک لاشخص (Non-person) بن چکا تھا۔ ناکارہ ہوتی ہوئی یادداشت' کم کم گفتگو۔ کمزور ہو کر ڈھانچہ بنی ہوئی اور دھیرے دھیرے کمھلاتی' بے جان ہوتی ہوئی۔ مجھے ہمیشہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے کئی برس زیادہ جئے گی۔ اب مجھے یقین نہیں رہا کہ وہ مجھ سے زیادہ جئے گی۔ تاہم مجھے ایک مضبوط احساس ہے کہ اگر وہ مجھ سے پہلے چلی گئی تو میں اپنا قلم (Pen) پرے دھر دوں گا اور مزید کچھ نہیں لکھوں گا۔

❀ ❀ ❀